چاند نگر گروپ آف پبلیکیشنز

کرن

MEMBER
APNS
CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ایڈیٹرز

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

خط و کتابت کا پتہ

کرن

37 - اردو بازار کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700	روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ	5000	روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000	روپے

مستقل سلسلے

اگست 2015

جلد 38 شمارہ 5

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ کرن، 37- اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابنِ حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872

Email: kiran@khawateendigest.com Website: www.khawateendigest.com

مدیرہ

ماہ اگست کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔
یہ مہینہ ہمارے لیے بڑی تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ کیونکہ اسی ماہ ۱۴ تاریخ کو ہمارا یہ وطن عزیز معرض وجود میں آیا تھا۔
مسلمانان ہند کی تقریباً ایک صدی کی انتھک کوششوں، محنتوں اور لاکھوں افراد کی قربانیوں کے بعد اس وطن کا حصول ممکن ہوا تھا۔ یہ وطن ہمارے بزرگوں کی لازوال قربانیوں کی داستانیں تاریخ کے اوراق میں سموئے ہوئے ہے۔
ہمیں اس مملکت خداداد کی قدر کرنی چاہیے۔ خداوند کریم نے اس ملک کو ہر قسم کی نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ جس کے وسائل لامحدود ہیں۔ جس کی ترقی کی راہیں کشادہ ہیں۔ لیکن پاکستان کے قیام کے سلسلے میں ہمارے بزرگوں نے جو قربانیاں دیں، ہم وہ فراموش کرتے جا رہے ہیں۔ ہمیں سوچنا ہوگا اپنے ملک کی بقا کے لیے۔ بحیثیت مسلمان پاکستانی صرف ایک بار صدق دل سے پوچھ لیں کہ ہم نے اپنے ملک کے لیے کچھ کیا ہے یا نہیں؟
یوم آزادی کے پرمسرت موقع پر اللہ رب العزت سے پاکستان کے بقائے دوام اور خوش حالی کے لیے دعا کریں کہ رب کریم اس وطن کو ہمیشہ سلامت رکھے اور ہمیں جذبے، لگن، خلوص، محبت اور محنت سے اس کا وقار دنیا میں بلند کرنے کی ہمت اور قوت عطا فرمائے۔ آمین۔
قارئین کرام کو یوم آزادی مبارک۔

محمود خاور،

کچھ لوگ دنیا میں محبتیں بانٹنے اور سمیٹنے آتے ہیں۔ محمود خاور بھی ایسی ہی ہستی تھے۔ بچوں اور بڑوں میں یکساں مقبول اور سب سے محبت کرنے والے تھے۔ آج بھی وہ ہمارے اور اپنے چاہنے والوں کے دلوں میں زندہ ہیں۔
۲۰ اگست کو محمود خاور صاحب کی برسی کے موقع پر قارئین سے دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خطاؤں کو درگزر کرے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- "میری سوچ، میرا پاکستان" چودہ اگست کے حوالے سے شاہین رشید کا خصوصی سروے،
- اداکارہ "مایا علی" کہتی ہیں۔ میری بھی سنیے،
- اداکارہ زرنش خان سے شاہین رشید کی ملاقات،
- اس ماہ ماہ نور منتخار کے مقابل ہے آئینہ،
- "راپنزل" تنزیلہ ریاض کا سلسلے وار ناول،
- "دردِ لئے وفا" فرحین اظفر کا سلسلے وار ناول،
- "میں گماں نہیں یقین ہوں" نبیلہ ابر راجہ کا مکمل ناول،
- "زندگی خاک نہ تھی" قرۃ العین خرم ہاشمی کا مکمل ناول،
- "رفاقتوں کے گلاب" نزہت جبیں ضیا کا ناولٹ،
- "اعتبار کر دیکھو" یاسمین نشاط کا دلکش ناولٹ، "بہار آئی" عزہ خالد کا ناولٹ،
- "خالہ، سالا اور پروالا" فائزہ گل کی دلچسپ مزاحیہ تحریر کی آخری قسط،
- سعدیہ عزیز آفریدی، سیما بنت عاصم، مصباح علی، حمیرا نوشین اور روزینہ حنیف کے افسانے اور مستقل سلسلے،

ھمقت،

"خوبصورت اور بامعنی نام" کرن کے ہر شمارے کے ساتھ علیحدہ سے مفت پیش خدمت ہے۔

ہے غفّار و ستّار و رحمٰن تو ہی!
ہے بخشش کی امّید رحمت سے تیری

تیری ذات ہے عاصیوں کا سہارا
نہیں کوئی غفّار ہے تیرے جیسا

کرم کی نظر ہو بڑی شان والے
ندامت کے آنسو سے بھیگے ہیں چہرے

نہیں تیرے جیسا خطا پوش کوئی
عیوب و گناہ کو چھپا لے الٰہی

تیری حمد سے سب زبانیں ہیں عاجز
نہیں عظمتوں کی تری حد ہے ہرگز

ترے در پہ آیا ہے یہ پھول احقر
اُسے بخش دے تُو، کرم کی نظر کر

تنویر پھول

خُدا کی حمد نعتِ مُصطفیٰؐ ہے
ثنائے مصطفیٰؐ حمدِ خُدا ہے

خُدا کے بعد اُنؐ کا نامِ نامی
بڑوں سے بھی بڑا، سب سے بڑا ہے

خود اُن کا نام ہے اُن کا قصیدہ
قصیدہ گو بذاتِ خود خُدا ہے

مراتب آپؐ کے اللہ اکبر
کوئی حد ہے نہ کوئی انتہا ہے

تہی دست تو تہی داماں بظاہر
مگر خاکِ قدم بھی کیمیا ہے

دِیا مٹّی کا حجرے کا مقدّر
مگر حجرہ نشیں بدر الدُّجیٰ ہے

اقبال عظیم

اس میں کوئی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں کہ پاکستان کو ہم نے بڑی قربانیوں کے بعد حاصل کیا۔ ہمارا مطالبہ حق وصداقت پر مبنی تھا۔ ہمیں پاکستان سے محبت ہے۔ ہماری شناخت صرف اور صرف پاکستان ہے۔

آج ہمارا ملک مشکل دور سے گزر رہا ہے لیکن اس کے باوجود قدرت نے پاکستان کو ہر نعمت سے نوازا ہے۔ اس ملک کے رہنے والے ہنر مند ہیں۔ وہ تجارتی 'صنعتی اور زرعی میدان میں بھی خوب ترقی کر رہے ہیں۔ مزید اعلا کارکردگی کے لیے 'ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پاکستان کے لیے اپنی سوچ مثبت رکھیں اور اس کی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں وہ اپنی بساط کے مطابق کریں۔

14 اگست کی مناسبت سے ایک سروے حاضر خدمت ہے۔

سوالات

☆ آپ پاکستان کے لیے کیا سوچتے رسوچتی ہیں؟

☆ آپ پاکستان کے لیے کیا کرنا چاہتے رچاہتی ہیں؟

میری سوچ میرا پاکستان

شاہین رشید

منشا پاشا

1 پاکستان کی ترقی کے لیے ہی سوچتی ہوں کہ ایک محب وطن یہی کچھ سوچ سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے وطن کو قائم و آباد رکھے (آمین)

2 پاکستان کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں مگر میرے پاس وسائل کی کمی ہے۔ خواتین کے حقوق کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ تمام خواتین سے میری گزارش ہے کہ اعلا تعلیم ضرور حاصل کریں' اپنے والدین اور اپنے شوہر پر زیادہ ٹرسٹ نہ کیا کریں۔ اپنی زندگی کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خود کام کریں اور اپنی زندگی کو خود بنائیں۔

عروۃ الوثقی

1 بہت سوچتی ہوں پاکستان کے بارے میں جب کبھی ملک سے باہر جانے کا اتفاق ہوتا ہے کہ ہمارا ملک اتنا ترقی یافتہ کیوں نہیں ہے۔

2 میں اپنے پیارے وطن کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میرے پاس اتنے وسائل ہی نہیں

ہیں۔ ہاں اپنے طور پر مجھ سے جو ہو سکتا ہے میں کرتی ہوں اور یہ کسی پہ احسان نہیں ہے۔

سائرہ یوسف :۔

1 بہت فکر مند رہتی ہوں کہ ہمارے ملک کا کیا ہو گا۔ مگر پھر کبھی کبھی پاکستان کا فیوچر برائٹ بھی لگتا ہے۔ امید پہ تو سب دنیا قائم ہے۔

2 میں اپنے ملک میں قانون کا بول بالا کرنا چاہتی ہوں۔ کیونکہ ساری خرابی یہ ہے کہ ملک میں قانون سب کے لیے یکساں نہیں ہے۔ یکساں قانون ہو جائے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔
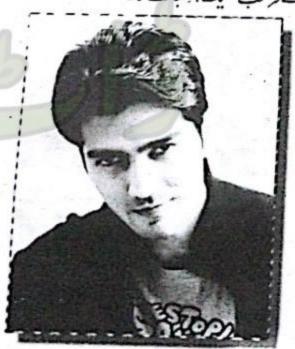
شہزاد شیخ

1۔ میرا دل' میری جان' پاکستان پاکستان اپنے ملک

کے بارے میں ہمیشہ اچھا ہی سوچتا ہوں۔ ان شاء اللہ بہت جلد ہم پاکستان کو ترقی کرتا ہوا دیکھیں گے۔

2۔ میرا دل تو بہت چاہتا ہے' مگر ایک اکیلا انسان کر بھی کیا سکتا ہے۔

عینی جعفری

1۔ پاکستان کے لیے اچھا ہی سوچتی ہوں۔ کون ہو گا جو اپنے ملک کے لیے برا سوچتا ہو گا۔ ہماری جڑیں ہیں یہاں اس لیے محبت بھی ہے۔ دھرتی ماں ہے یہ ہمارا وطن۔

2۔ میں چاہتی ہوں کہ پاکستان کے حالات اچھے ہو جائیں' مگر ایسا اب ممکن نظر نہیں آتا۔

رؤف لالہ

1۔ میں سوچتا ہوں کہ ہم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔

کیوں ہم اپنے وطن کے دشمن ہو گئے ہیں۔ کتنی قربانیوں کے بعد ہم نے یہ ملک حاصل کیا اور اب ہم نے اس کا کیا حشر کر دیا ہے آخر ہم اس کی قدر کیوں نہیں کرتے۔

2۔ ہم اگر چاہیں تو تمام فنکار ایک ہو کے اس ملک کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہیں اور اس کام کے لیے سب کے پاس جذبہ تو ہے مگر ٹائم نہیں ہے۔

مومل شیخ

1۔ بہت کچھ سوچتی ہوں۔ 14 اگست آتا ہے تو اپنا بچپن یاد آجاتا ہے' کتنا جوش و خروش ہوتا تھا سب میں۔ سب کا جذبہ دیکھ کر اپنا جذبہ بھی ڈبل ہو جاتا تھا۔ مگر اب ایسا کچھ نہیں ہے۔ اب دہشت گردی کے ڈر سے کہیں آجا بھی نہیں سکتے۔

2 پاکستان کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ اگر میرے اختیار میں ہو تو ایک ٹیم بناؤں اور ان کے ساتھ کام کروں تاکہ پاکستان کو بہتر سے بہتر بنا سکوں' اس کے مسائل کو ختم کر سکوں یا حل کر سکوں۔

سمیرا احسن

1۔ پاکستان کے اچھے مستقبل کے بارے میں سوچتی ہوں کہ اللہ ہمارے ملک کو ترقی دے اور تمام مشکلات کو دور کرے۔

2۔ کیا کرنا چاہتی ہوں؟... میں جب برطانیہ جاتی ہوں اور وہاں کے قوانین اور وہاں کا ڈسپلن اور بہت ساری خوبیاں دیکھتی ہوں تو میرا دل چاہتا ہے کہ ہمارے ملک میں بھی سب کچھ ویسا ہی ہو جائے۔

مصطفیٰ چوہدری

1۔ پاکستان تو میری جان ہے۔ پیار ہے مجھے اس سے' اس کے ایک ایک ذرہ سے' ایک ایک انچ سے یہ بہت خوب صورت ملک ہے اس کے بارے میں ہمیشہ پوزیٹو ہو کے سوچتا ہوں۔ مجھے غصہ آتا ہے ان لوگوں پر جو انڈیا کے ساتھ پاکستان کا موازنہ کرتے ہیں یہ پاکستان کے ساتھ ناانصافی ہے۔ ہم کسی سے کم نہیں اور انڈیا سے تو بالکل بھی کم نہیں ہیں۔ بہت قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے پاکستان اور جو اس آزادی کی قدر نہیں کرتا وہ پاکستانی تو کیا میں اسے انسان ہی نہیں سمجھتا۔

2۔ پاکستان کے لیے جان دے سکتا ہوں۔

عشنا آغا

1۔ وہ پاکستان جو ہم ٹی وی میں دیکھتے ہیں۔ میں ویسا خوب صورت اور حسین پاکستان کے بارے میں سوچتی ہوں اور ویسا ہی پاکستان دیکھنا چاہتی ہوں۔

2۔ کیا کرنا چاہتی ہوں؟ بہت کچھ کرنا چاہتی ہوں۔ مگر میں پاور میں نہیں ہوں' اس لیے کچھ نہیں کر سکتی۔

سلمیٰ حسن

1۔ اللہ ہی ہمارے ملک پر رحم کرے۔ اللہ ہی بھلا کرے ہمارے پاکستان کا۔

2۔ ایک اکیلا انسان بھلا کیا کر سکتا ہے۔

فارس شفیع

1۔ میں تو اچھا ہی سوچوں گا۔ کیونکہ مجھے اپنے وطن سے پیار ہے میں تو ہمیشہ اس کے لیے پوزیٹو تھنک ہی رکھتا ہوں۔

2 میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں۔ جن کے اختیار میں ہے، جو پاور میں ہیں، وہ کچھ نہیں کر رہے تو میں تو ایک عام سا انسان ہوں، جس کے پاس کوئی پاور بھی نہیں ہے۔

سوہائے علی ابڑو

1۔ یہی سوچتی ہوں کہ جو عزت و مقام ہمارے ملک

میں ہمیں حاصل ہے کسی اور ملک میں نہیں ہے اس لیے اللہ تعالیٰ ہمیشہ ہمارے ملک کو قائم و آباد رکھے اور اسے بہت ترقی دے۔

2۔ کوئی بھی انسان کچھ نہیں کر سکتا اس وقت تک جب تک انسان کی سوچ میں تبدیلی نہ آئے۔ لوگوں کی سوچ کو بدلنا بہت ضروری ہے۔

صنم سعید

1۔ کیا سوچتی ہوں؟ وہ ہی کچھ سوچتی ہوں جو ایک محب وطن پاکستانی کو سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ملک کے حالات اچھے کر دے۔ کیونکہ پاکستان ہے تو ہم ہیں۔

2۔ میں عورتوں کی تعلیم کے لیے اور غریبوں کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔

شہروز سبزواری

1۔ سوچنا کیا ہے جی، پاکستان کو تو اس عوام نے اپنے باپ کا مال سمجھ لیا ہے۔ اپنے باپ کا ملک سمجھ کر خوا چودہ اگست ہو یا کوئی اور تہوار، سائیلنسر نکال کر سگنل توڑ کر سڑکوں پر دندناتے پھرتے ہیں۔ ہم سدھرنے والی قوم ہی نہیں ہیں۔

2۔ بہت کچھ کرنے کو دل چاہتا ہے... مگر ایک اکیلا انسان کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہم سب کو باہم مل کر ا ملک سدھارتا ہو گا۔

بلقیس ایدھی

1۔ ہم سے کیا پوچھ رہی ہیں۔ ہم نے تو جو سوچا کر کے دکھا دیا۔ بس دل دکھتا ہے پاکستان کے حالات دیکھ کر، لوگوں کی بے حسی اور بے بسی دیکھ کر قائداعظم نے ایسا پاکستان تو نہیں سوچا ہو گا۔ سارے خواب ہی چکنا چور کر دیے۔

2۔ کیا کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی بھی کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ جیسے بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

عیشا نور

1۔ اپنے ملک سے اچھا کوئی ملک نہیں۔ اس کے لیے ہمیشہ پر امید رہتی ہوں۔ اس کی ترقی کے لیے دعائیں کرتی ہوں۔

2۔ میں پاکستان کے لیے کیا کرنا چاہتی ہوں تو سچ بتاؤں میں تو یہ چاہتی ہوں کہ سب برے لوگوں کو ملک بدر کر دوں اور تمام ایمان دار اور اہل لوگوں کو اہم عہدوں پر فائز کر دوں۔ تاکہ ملک پاک صاف ہو جائے۔

سجل علی

1۔ کہ کاش یہاں سب کچھ اچھا ہو جائے۔ بہت پیارا ملک ہے ہمارا، مگر کچھ مفاد پرستوں نے اسے برباد کر کے رکھ دیا ہے۔

2۔ میں پاکستان میں تعلیم غریبوں کے لیے مفت کر دیتی، کیونکہ غریبوں کو بھی پڑھنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا امیروں کو ہے۔

تنویر آفریدی

1۔ پاکستان زندہ باد سوچتا ہوں اور لوگوں کو اس کے فیوچر سے بہت مایوس دیکھتا ہوں تو ان کو کہتا ہوں کہ آپ سب لوگ تسلی رکھیں، پاکستان کا فیوچر انتہائی تابناک ہے۔ کیونکہ ہم مشکلات کی آخری حدود کو بھی کراس کر چکے ہیں۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔

2۔ بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں اور ان شاء اللہ کروں گا۔ قبل از وقت بتانا میرے خیال سے مناسب نہیں ہے۔

ارتج فاطمہ

1۔ میں کافی عرصہ ملک سے باہر یو ایس اے میں رہی ہوں' وہاں ہمارا اپنا گھر ہے۔ لیکن مجھے پاکستان میں رہنا اچھا لگتا ہے اور جس جگہ سے پیار ہو اس کے بارے میں ہمیشہ پوزیٹو سوچ رکھنی چاہیے۔ تو میں دعا کرتی ہوں کہ پاکستان ہمیشہ قائم ودائم رہے' آمین۔

2۔ میں تو یہاں پاکستان آئی ہی "این جی اوز" بنانے تھی۔ اور ان شاء اللہ جلد ہی بناؤں گی اور بچوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنا چاہتی ہوں۔

نازیہ ملک

1۔ سوچتی ہوں کہ یہ کب سدھرے گا۔ کب امن و امان ہو گا اور کب ہم بھی خوشحال پاکستان کے خوشحال لوگ کہلائیں گے۔

2۔ پاکستان کے لیے لاء اینڈ آرڈر کی صورت حال کو ٹھیک کرنا چاہتی ہوں مگر میں کیسے کر سکتی ہوں۔ میرے پاس کونسی پاور ہے۔ مگر خواہش تو کر سکتی ہوں نا۔

فیضان خواجہ

1۔ پاکستان کے فیوچر سے بہت سی امیدیں وابستہ ہیں۔ سوچتا ہوں کہ کیا ہمیں اپنی زندگی میں یہ دیکھنا نصیب ہو گا کہ پاکستان ترقی کر رہا ہے۔

2۔ پاکستان کے لیے یہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ تمام قوانین جو صرف کاغذات میں نظر آتے ہیں ان پر عمل در آمد کراؤں' کیونکہ ان پر عمل نہ ہونے کی وجہ سے ہی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

راشد فاروقی

1۔ یہی کہ یہ ملک بہت پیارا ہے۔ اس نے ہمیں عزت دی' پہچان دی اور ہمیں سب کچھ دیا۔ ہمیں آزادی کی قدر و قیمت نہیں ہے اور یہی ہماری سب سے بڑی بد قسمتی ہے۔

2۔ میں تو پاکستان کے لیے اپنی جان بھی دے سکتا ہوں۔

☆ ☆ ☆

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	مدیحہ
میک اپ	روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	موسیٰ رضا

زرنش خان سے ملاقات

شاہین رشید

پیارے خدوخال والی "زرنش خان" کو اس فیلڈ میں قدم رکھے کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن چند اچھے پروجیکٹ کرکے اور بہترین پرفارمنس دے کر اس فنکارہ نے فیلڈ میں اپنی جگہ مستحکم کرلی ہے۔۔۔ آج کل آپ انہیں "اے زندگی" میں دیکھ رہے ہیں۔

★ "کیسی ہیں زرنش۔۔۔ اور کیا مصروفیات ہیں؟"

☼ "جی اللہ کا شکر ہے اور مصروفیات تو بس ڈراموں کی ہی ہیں کچھ آن ایر ہیں اور کچھ انڈر پروڈکشن ہیں۔ تو بس اللہ کا شکر ہے کافی مصروف زندگی گزر رہی ہے اور میرے جتنے بھی آنے والے سیریلز ہیں ان سب میں میرے لیڈ رولز ہی ہیں۔"

★ "سب پوزیٹو ہیں یا کوئی نگیٹو بھی ہے؟"

☼ "صرف ایک میں نگیٹو ہے۔ وہ آن ایر ہو تو آپ دیکھیے گا باقی سب میں پوزیٹو اور اچھے رولز ہیں۔"

★ "آپ بہت ہی دھیمے لہجے میں بات کرتی ہیں اور شکل میں بھی معصومیت ہے تو نگیٹو رول کرنے میں مشکل تو ہوئی ہوگی؟"

☼ "نہیں میرے خیال میں مشکل تو نہیں ہوگی' کیونکہ ڈائریکٹرز حضرات اتنے قابل ہوتے ہیں کہ وہ فنکار سے ہر طرح کے رول کروا ہی لیتے ہیں اور مجھے خود بھی امید ہے کہ ان شاء اللہ اچھا ہو جائے گا۔"

★ "کیوں نہیں۔۔۔ کچھ اپنے بارے میں بتائیں پھر پوچھیں گے کہ فیلڈ میں کیسے آئیں؟"

☼ "جی میرا پورا نام زرنش خان ہے جس کا مطلب پھول کا ہے۔ لاہور میں پیدا ہوئی 1993ء میں ہم تین بہنیں ہیں اور ایک ہی بھائی ہے جبکہ میرا نمبر آخری ہے۔۔۔ اس لیے گھر بھر کی لاڈلی ہوں اور گریجویٹ ہوں۔ بی اے کیا ہے میں نے اور کافی

عرصہ یو ایس اے میں رہی اور وہیں سے اپنی تعلیم مکمل کی اور جب میں پاکستان آئی تو ڈراموں میں کام کرنے کی آفرز آئیں تو سوچا کہ کیوں نہ قسمت آزمائی جائے اور قسمت نے ساتھ دیا اور میں کامیاب ہوئی اور میں شوقیہ اس فیلڈ میں آئی اس کو اپنا کیریئر بنانے کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور مجھے ہر نئے کام میں ہاتھ ڈالنے کا شوق ہے۔ تو بس اس فیلڈ کو بھی دیکھنے کا شوق بھی تھا اور ٹرائی کرنے کا بھی شوق تھا کہ دیکھیں کہ کیا ہوتا ہے۔ مگر اللہ نے تو بہت کامیابی دے دی۔ دیکھیں کہ میں اس فیلڈ میں کب تک رہتی ہوں اور ہاں آپ کو یہ بھی بتادوں کہ میرا نکاح ہوچکا ہے اور ان شاء اللہ جلد ہی رخصتی بھی ہوجائے گی۔"

★ "اچھا گڈ... شادی کچھ جلدی نہیں ہوگئی؟"

☼ "ہاں ... ہماری فیملی پٹھان ہے تو ہمارے یہاں جلدی شادی کا رواج ہے تو تقریباً" ساڑھے تین سال قبل میرا نکاح ہوا... اور ایسا نہیں ہے کہ شادی کے لیے کوئی زور زبردستی کرتا ہے آپ کی اپنی چوائس بھی ہوتی ہے۔"

★ "والدین تو چاہتے ہوں گے کہ جلدی رخصتی ہو جائے؟"

☼ "نہیں، میرے والدین کو میری رخصتی کا سن کر بہت ہول اٹھنے شروع ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان شاء اللہ جلدی ہی رخصتی ہو جائے گی اور رخصت ہو کر ان شاء اللہ دبئی چلی جاؤں گی۔"

★ "والدین کی پسند ہیں یا...؟"

☼ "بالکل والدین کی پسند ہے اور میں تو سب سے یہی کہوں گی کہ شادی اس سے ہی کریں جو والدین کو پسند ہو۔ اس طرح زندگی خوشگوار گزرتی ہے۔ والدین کی دعائیں آپ کے ساتھ رہتی ہیں... میں نے اپنا بچپن ٹام بوائے کی طرح گزارا۔ تو مجھے تو شادی کے لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ تو میرے والدین نے میری شادی کے بارے میں انہیں پسند کیا' اور ماشاء اللہ میں بہت خوش ہوں کہ میرے شوہر بہت اچھے ہیں۔"

★ "شوبز کی فیلڈ میں کون لے کر آیا؟"

☼ "عفت چوہدری جو اس فیلڈ میں کافی عرصے سے ہیں ان سے ہماری ہیلو ہائے ہے' وہ ہماری فیملی فرینڈ بھی ہیں تو جب ہم لاسٹ فروری میں پاکستان آئے تھے تو عفت چوہدری نے ہی خواہش ظاہر کی کہ ڈرامہ سیریل "محبت اب نہیں ہوگی" میں کام کروں... اور انہی کا اصرار تھا کہ میں اس رول کو کروں اور میں نے انہی کی فرمائش پر کام کرلیا... اور ماشاء اللہ میرے کام کو اتنا پسند کیا گیا کہ اس کے آن ایئر ہونے کے بعد مجھے کراچی سے کال آئی اور ایک سوپ میں اور سیریل میں لیڈنگ رول کی آفر ہوئی اور بس مجھے بھی اچھا لگا اور بس پھر باقاعدہ طور پر اس فیلڈ میں آگئی۔

★ "گھر والے خوش ہوئے آپ کے اس فیلڈ میں آنے سے اور سب سے زیادہ سپورٹ کس نے کیا؟"

☼ "یہ فیلڈ میرا پروفیشن نہیں ہے۔ میں تو بس شوقیہ آگئی اور گھر والوں کو پتا ہے کہ میں شوقیہ کرتی ہوں اور ویسے بھی انہوں نے کبھی کسی کام سے منع نہیں کیا تو جب ڈراموں میں کام کیا تو انہیں بتا کر کیا اور انہوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا۔ میری بہت حوصلہ افزائی کی

اور انہیں پتا ہے کہ مجھے نئے نئے کام اور نئے نئے تجربات کرنے کا شوق ہے۔ اور جب اس کام سے اس کا دل بھر جائے گا تو اس نے اس کام کو چھوڑ دینا ہے۔"

★ "اچھا!.... خیر متاثر کیا اس فیلڈ نے؟ اچھی ہے یہ فیلڈ؟"

☼ "اچھے لوگوں کے لیے اچھی ہے اور برے لوگوں کے لیے بری ہے.... تو بس یہی اس کا مختصر سا جواب ہے۔"

★ "کبھی ضد میں آکر کوئی کام کیا؟"

☼ "ایسا موقعہ آیا تو نہیں کبھی۔ لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ میری طبیعت میں ضد ہے۔ کسی کام کو کرنے کا سوچ لوں یا ٹھان لوں تو پھر ضرور کرتی ہوں۔ اور میرے والدین کی تربیت کا انداز بہت خوب صورت ہے۔ میں اپنے والد کو اپنا آئیڈیل مانتی ہوں کیونکہ مجھے نہیں یاد کہ بچپن سے لے کر آج تک میرے والد نے کبھی ڈانٹا ہو یا ہاتھ اٹھایا ہو' بس ان کی آنکھ کافی ہوتی تھی پتا نہیں ان کی آنکھوں میں کیا تھا کہ بس وہ ہی کافی ہوتی تھی۔"

★ "انسان کا دنیا میں آنے کا کیا مقصد ہے؟"

☼ "دیکھا جائے تو ہم انسانوں کا اس دنیا میں آنے کا بہت بڑا مقصد ہے۔ ہم یہاں ایک امتحان دینے آئے ہیں کہ ہمیں واپس اپنے خدا کے پاس بھی جانا ہے اور ہمیں اپنے امتحان میں پورا اترنا ہے' مگر بدقسمتی سے انسان اس دنیا کی رنگینیوں میں کھو گیا ہے اور آخرت کی اس نے کوئی تیاری نہیں کی ہے میری تو کوشش ہوتی ہے کہ میں دین اور دنیا ساتھ ساتھ لے کر چلوں۔"

★ "گو کہ آپ نے اس فیلڈ میں زیادہ عرصہ نہیں رہنا' لیکن پھر بھی کوئی خواہش کہ فلاں کردار کروں؟"

☼ "نہیں ایسا تو کچھ نہیں سوچا۔ بس کوئی اچھا سا رول کرنا چاہتی ہوں جیسا کہ ہر آرٹسٹ کی خواہش ہوتی ہے کہ اسے پاورفل رول ملیں اور وہ اپنی بھرپور صلاحیتوں کے ساتھ کرے۔"

★ "ڈراموں کی کہانیوں کے بارے میں کیا کہیں گی؟"

☼ "کہانیاں حقیقت سے ہی بنتی ہیں یا نکلتی ہیں کہیں نہ کہیں کچھ ہو ہی رہا ہوتا ہے تو کہانی بنتی ہے.... تو میں تو یہی کہوں گی کہ ہمارے ڈراموں کی کہانیاں ہمارے معاشرے کی کہانیاں ہی ہوتی ہیں۔"

★ "اپنی لائف کے لیے کیا پلاننگ ہے؟"

☼ "میں نے شادی کرنی ہے۔ اپنا گھر بنانا ہے۔ پھر اپنی تعلیم بھی مکمل کرنی ہے۔ ملک سے باہر جا کر' پھر میرا "بزنس مائنڈ" ہے تو بزنس کرنا چاہتی ہوں اور ابھی بھی بزنس میں ہی ہوں۔ اور یہ میرا جنون ہے۔"

★ "زرلش آپ بتا رہی ہیں کہ آپ کے والدین نے کبھی آپ پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ لیکن اگر ڈرامے میں کوئی ایسا سین آجائے تو؟"

☼ "جب ڈراموں میں کام کرنا شروع کیا تھا تو یہ بات پہلے سے بتا دی تھی کہ میں ایسا کوئی سین نہیں کروں گی اور نہ ہی کسی کو اجازت دوں گی کہ کوئی مجھ پر ہاتھ اٹھائے۔ کیونکہ میری فیملی نے مجھے بہت پیار اور لاڈ سے پالا ہے۔ ویسے ابھی ایسا کوئی کردار ملا بھی نہیں ہے۔"

★ "ملک سے باہر جا کر پاکستان کے بارے میں کیا سوچتی ہیں اور سیاست سے لگاؤ ہے؟"

☼ "نہیں جی سیاست سے کوئی لگاؤ نہیں ہے.... لیکن مجھے عمران خان بہت پسند ہیں۔ میں ان کی بہت بڑی سپورٹر بھی ہوں.... اور پاکستان کے لیے یہ سوچتی ہوں کہ یہاں غربت ختم ہو جانی چاہیے' اللہ پر بھروسہ پختہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ یہاں کے لوگوں کی نیتیں اچھی نہیں ہیں اور اگر نیت اچھی نہیں ہو گی تو آپ کبھی بھی ترقی نہیں کر پائیں گے.... اور یہاں کچھ بھی اچھا نہیں ہے "آوے کا آوا" ہی بگڑا ہوا ہے۔"

★ "جھوٹ بولتی ہیں؟"

☼ "میری یہ عادت ہے کہ میں جھوٹ نہیں بولتی' لیکن کوئی ایسا کام جس کے لیے مجھے پتا ہوتا ہے کہ بہت ڈانٹ پڑے گی وہ اس وقت نہیں بتاتی۔ جب اس بات کو سب بھول جاتے ہیں تو پھر بتاتی ہوں یہ غلطی مجھ سے ہوئی تھی۔ مگر موقع پر کوئی پوچھے کہ یہ تم نے کیا تھا

تو میں صاف مکر جاتی ہوں کہ کیوں کیا ہوا؟ تو جب ڈانٹ والا موڈ ختم ہو جاتا ہے تو بتاتی ہوں۔"

★ "گھر آکر پہلی ترجیح کیا ہوتی ہے۔ ٹی وی دیکھنا یا گپ شپ کرنا؟"

☼ "ٹی وی دیکھنا مجھے زیادہ پسند نہیں ہے۔ لیکن کبھی موڈ بن جائے تو 8Xn دیکھ لیتی ہوں۔ اسٹار ورلڈ دیکھ لیتی ہوں۔ ہم ٹی وی دیکھ لیتی ہوں یا پھر کوئی اچھی سی مووی۔ لیکن گھر آکر پہلی ترجیح امی سے گلے لگنا اور سارا دن کی روداد سنانا ہے۔"

★ "شاپنگ کرنے میں کہاں مزا آتا ہے؟"

☼ "شاپنگ کی تو میں بہت شوقین ہوں اور میرا خیال ہے کہ "تھائی لینڈ" سے بہتر کوئی جگہ ہی نہیں ہے۔ کیونکہ وہاں چیزیں اچھی اور معیاری بھی ہوتی ہیں اور کم قیمت بھی ہوتی ہیں۔"

★ "وہاں سب سے اچھی چیزیں کیا ہوتی ہیں بیگز یا جیولری یا کپڑے وغیرہ؟"

☼ "وہاں جیولری بہت اچھی اور خوب صورت ہوتی ہے اور قیمت بھی انتہائی مناسب.... اور آپ دبئی چلی جائیں وہاں بھی شاپنگ کرنے کا بہت مزا آتا ہے.... تو جیولری ہوگئی، بیگز ہوگئے۔ بہت اچھے ہوتے ہیں۔"

★ "زرنش آپ بتا رہی ہیں کہ موبائل فون اور SMS سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے.... تو جس دن موبائل سروس آف ہوتی ہوگی۔ آپ کی عید ہو جاتی ہوگی؟"

☼ قہقہہ... "آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ سچ میں بہت سکون ہوتا ہے۔ کوئی ٹینشن نہیں ہوتی اور بہت اچھا دن گزرتا ہے۔"

★ "کوئی ایسے سین جن کو کرنے سے تھوڑی دشواری ہوتی ہے؟"

☼ "مجھے رومانٹک رول کرنے میں تھوڑی سی دشواری ہوتی ہے۔ میری بہت ری ٹیکس ہوتی ہیں۔ اور ایمان داری سے بتاؤں کہ اس قسم کے سین کرنے میں میں بالکل بھی ایزی فیل نہیں کرتی، میری ڈائریکٹر مجھے کہتی رہتی ہیں کہ پلیز اپنے فریم سے نکل آؤ ایسے کرلو۔ یوں کرلو.... تو بس ذرا مشکل ہوتی ہے۔ مگر ہو جاتے ہیں۔"

★ "ملک کا مستقبل کیسا دیکھ رہی ہیں؟"

☼ "اللہ ہی خیر کرے.... بس دعا ہی کر سکتی ہوں۔"

★ "کھانے پینے کی شوقین ہیں؟"

☼ "بہت زیادہ اور خود بھی اچھا پکا لیتی ہوں، لیکن ہماری شیف کے ہاتھ میں بھی بہت لذت ہے۔ بہت مزے کا کھانا ہوتا ہے ان کے ہاتھ کا۔"

★ "کس قسم کے کھانے پسند ہیں۔ دیس کے یا پردیس کے؟"

☼ "آئی لو کانٹی نینٹل فوڈ.... ویسے بھی مجھے نئے نئے کھانے ٹرائی کرنے کا شوق ہے تو اکثر اپنا یہ شوق پورا کرتی رہتی ہوں اور میں خود بھی بہت اچھا پکا لیتی ہوں اور چائنیز تو بہت ہی خوب بناتی ہوں۔"

★ "اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

☼ "بس لوگوں سے کہنا چاہوں گی کہ اپنا فارغ وقت اچھے اور کار آمد کاموں میں گزارا کریں لوگوں پر تبصرہ کر کے یا غیبت کر کے اپنا وقت ضائع نہ کریں کہ ان سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے زرنش خان سے اجازت چاہی۔ اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے ہمیں وقت دیا۔

☼ ☼ ☼

میری بھی سنیے

مایا علی

شاہین رشید

1 "میرا اصلی نام؟"

"مریم تنویر علی... شوبز میں آئی تو "مایا علی" رکھ لیا- کیونکہ مجھے سب پیار سے "مایا" کہتے تھے۔"

2 "تاریخ پیدائش / آبائی شہر؟"

"27جولائی'1989ء/سیال کوٹ۔"

3 "بہن بھائی میرا نمبر؟"

"میں اور میرا بھائی- میرا نمبر پہلا ہے- بابا بزنس مین ہیں اور ماما ہاوس وائف۔"

4 "تعلیم؟"

"ایم اے ماس کمیونکیشن۔"

5 "گھر میں میری دوستی ہے؟"

"ماما سے 'بابا سے بھی ہے مگر وہ غصے کے تھوڑے تیز ہیں۔"

6 "شوبز میں آمد؟"

"اتفاقاً"... ایک چینل پہ انٹرن شپ کر رہی تھی۔ اتفاق سے ایک پروگرام کی اینکر پرسن نہیں آئیں تو مجھے میزبانی کے فرائض دے دیے گئے بس... کامیاب ہو گئی اور راستہ ہموار ہو گیا۔"

7 "گھر والوں کا رد عمل؟"

"بابا ناراض ہوئے 'مگر پھر مان گئے کہ اعتماد کو ٹھیس نہ لگنے دینا۔"

8 "شہرت ملی؟"

"ایک نئی سنڈریلا۔"

9 "پہلے کون بیدار ہوتا ہے میں یا سورج؟"

قہقہہ... "سورج... میں تو اپنی نیند پوری کر کے ہی اٹھتی ہوں 'ہاں جب شوٹ پہ جانا ہو تو پھر تھوڑا جلدی اٹھ جاتی ہوں۔"

10 "پہلی کمائی؟"

"7ہزار۔"

11 "پچھتاوا ہوتا ہے؟"

"ڈھیر ساری شاپنگ کرنے کے بعد کہ اتنا پیسہ خرچ کر دیا- پھر بھول جاتی ہوں اور وہی کام دوبارہ کر دیتی ہوں۔" (ہنستے ہوئے)

12 "بہترین کامیابی کے لیے ضروری ہے؟"

"محنت کی جائے 'جھوٹ نہ بولیں کسی کو تکلیف نہ دیں- اپنے کام سے کام رکھیں۔"

13 "شادی؟"

"ان شاء اللہ جلدی کروں گی... اللہ کی طرف سے وقت مقرر ہوتا ہے۔"

14 "مزاج میں غصہ ہے یا نرمی ہے؟"

''ایک زمانے میں غصے کی تیز بھی ہوتی تھی اور پیر پٹختی بھی' اب نرمی آگئی ہے مزاج میں .... اب خاموش رہتی ہوں۔''

15 ''فوری فیصلہ کرتی ہوں یا مشورہ لیتی ہوں؟''

''فوری فیصلہ کبھی نہیں کرتی۔ بہت سوچتی ہوں پھر کوئی قدم اٹھاتی ہوں۔ کبھی کبھی مشورہ بھی لے لیتی ہوں۔''

16 ''اس فیلڈ میں اگلا قدم؟''

''فلم.... بڑی اسکرین' ان شاء اللہ ضرور یہ خواہش پوری ہوگی۔''

17 ''میں چاہتی ہوں کہ؟''

''کہ لوگ مجھے ہمیشہ اچھے لفظوں میں یاد کریں۔ میری غیر موجودگی میں بھی اور میرے دور چلے جانے پہ بھی۔''

18 ''میں احسان مند ہوں؟''

''ان لوگوں کی جنھوں نے میرا دل دکھایا۔ جنھوں نے مجھے برا کہا۔ کیونکہ جب تک ایسے لوگ آپ کی زندگی میں نہیں ہوں گے آپ کامیاب نہیں ہوں گے۔''

19 ''پسندیدہ کھانے' دیسی یا بدیسی؟''

''دیسی صرف دیسی' نہیں مگر بدیسی بھی پسند ہیں مگر ذرا کم۔ بریانی' کڑاہی' نہاری' بہت پسند ہیں۔''

20 ''کوکنگ سے لگاؤ؟''

''بہت لگاؤ ہے کوکنگ سے اور جن کو کھانے کا شوق ہوتا ہے انہیں پکانے کا بھی ہوتا ہے۔''

21 ''کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟''

''کسی ملک کی نہیں' اپنا ملک' اپنا پاکستان بہت اچھا ہے۔''

22 ''میری ایک عادت جس سے گھر والے بے زار ہیں؟''

قہقہہ.... ''جب فون کی گھنٹی بج رہی ہو اور میں اسے نظر انداز کردوں۔''

23 ''شہرت سے ڈر لگتا ہے؟''

''جی بالکل لگتا ہے' کیونکہ اعلا مقام انسان بڑی مشکل سے بناتا ہے۔ اس کو قائم رکھنے کے لیے بہت سوچ سمجھ کر قدم رکھتی ہوں۔''

24 ''مجھ میں تبدیلی آئی؟''

''شوبز میں آنے کے بعد مجھ میں خاصی تبدیلی آئی ہے۔ وہ اس طرح کہ مجھ میں برداشت اور صبرو تحمل بہت آگیا ہے۔''

25 ''محنت سے پیسہ آتا ہے یا قسمت سے؟''

''محنت سے پیسہ آتا ہے اور قسمت انسان خود بناتا ہے اگر یہ سوچ کر جو قسمت میں لکھا ہے مل جائے گا ہم کبھی بھی کچھ حاصل نہیں کرپائیں گے اپنی قسمت محنت سے کھولنی پڑے گی۔''

26 ''خوشیاں بازار سے ملتی تو کیا خرید تیں؟''

''اپنے بابا اور ماما کے لیے ہمیشہ رہنے والی خوشیاں اور غریب بچوں کے لیے خوشحالی خریدتی۔''

27 "جب مایوس ہو جاتی ہوں تو؟"

"پہلے تو جی بھر کے روتی ہوں۔ اللہ سے دعائیں مانگتی ہوں کہ کوئی راستہ دکھادے اور پھر سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیتی ہوں اور پھر وہ کوئی نہ کوئی راستہ دکھا بھی دیتا ہے۔"

28 "اپنے ملک کے لیے میری سوچ؟"

"کہ ہمارے ملک کا کیا بنے گا' ہر حادثہ پہ سوچتی ہوں کہ اب کسی نہ کسی بے گناہ کا خون ضرور رنگ لائے گا۔ مگر کچھ نہیں ہوتا۔"

29 "مطالعہ کرتی ہوں؟"

"ہر وہ کتاب' ناول اور میگزین جو ہاتھ میں آجائے۔ ضرور اس کا مطالعہ کرتی ہوں۔"

30 "دنیا کو بدلنا چاہتی ہوں؟"

"اپنے آپ کو تو بدلنے کا ٹائم نہیں دنیا کو کیا بدلوں گی۔ اللہ اپنے نظام کے تحت دنیا چلا رہا ہے۔"

31 "میرے مشہور ڈرامے؟"

"اک نئی سنڈریلا" "در شہوار" "شناخت" "کھویا کھویا چاند" "میری زندگی ہے تو" "لاڈوں میں پلی" "دیار دل" "گھر ایک جنت" "عون زارا" "رنجش" "اور کچھ تو ذہن میں آبھی نہیں رہے ہیں۔"

32 "اگر اس فیلڈ میں نہ ہوتی تو؟"

"ہونا تو مجھے اس فیلڈ میں تھا... لیکن اگر نہ ہوتی تو پھر گھر ہوتا شوہر ہوتا اور بچے ہوتے۔ عورت کی کل کائنات۔"

33 "بچوں کے لیے بہترین نعمت؟"

"پڑھو لکھو اور بنو نواب۔ تعلیم سے بڑھ کر نہ کوئی دولت ہے نہ کوئی زیور۔"

34 "اس فیلڈ میں میرا اگلا قدم؟"

"جی ایک پاکستانی فلم کے لیے بات ہو چکی ہے۔ جس کی شوٹ ان شاء اللہ جلدی شروع ہو گی۔"

35 "پسندیدہ گیمز؟"

"مجھے ہر گیم پسند ہے۔ کیونکہ میں نے ہر گیم کو تھوڑا تھوڑا ٹرائی کیا ہے۔ باسکٹ بال' نیٹ بال' والی بال اور بیڈمنٹن سب کھیل چکی ہوں اور کرکٹ میں' صرف پاک انڈیا میچ پسند ہے۔ بلکہ دیکھتی ہوں۔"

36 "حکومت میں اگر کوئی عہدہ مل جائے تو؟"

"توبہ کریں، آرام سے سوری، ایکسکیوزمی کر کے ایک طرف ہو جاؤں گی۔"

37 "یادیں سنبھال کر رکھتی ہوں یا بھول جاتی ہوں؟"

"یادیں سنبھال کر رکھتی ہوں مگر اچھی یادیں.... بری کو بھولنا چاہتی ہوں۔"

38 "موبائل زندگی کے لیے کتنا ضروری ہے؟"

"جو کام جو چیز عادت بن جائے وہ زندگی کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔ اس لیے موبائل فون بہت ضروری ہے۔"

39 "موبائل سروس آف ہو تو؟"

"تو اس دن سکون کا سانس لیتی ہوں، کیونکہ سب جگہ سروس بند ہوتی ہے۔ تو اطمینان ہوتا ہے۔"

40 "تھک جاؤں تو؟"

"دل چاہتا ہے کہ لمبی چھٹیاں لے لوں اور کہیں گھومنے پھرنے نکل جاؤں اپنی فیملی کے ساتھ۔"

41 "بیگ میں کیا کیا چیزیں رکھتی ہوں؟"

"کیا کیا چیزیں؟.... ارے بھئی کیا نہیں رکھتی، ہر چیز آپ کو میرے بیگ سے ہی ملے گی۔"

42 "کن لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اچھا لگتا ہے؟"

"ذہین اور خوش اخلاق اور مزاح کو سمجھنے والے لوگوں کے ساتھ۔"

43 "کس دن کے آنے کا انتظار رہتا ہے؟"

"کسی بھی دن کا نہیں.... ہر دن اپنے آپ کو ڈسکور کرتی ہوں۔"

44 "نرم گوشہ کس میں ہوتا ہے مردوں میں یا عورتوں میں؟"

"میرا خیال ہے عورتوں میں۔ شاید میں خود ایک لڑکی ہوں اس لیے۔"

45 "کیا چیزیں لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتی؟"

"بیگ تو ہوتا ہی ہے۔ گاڑی میں لگانے کے لیے اچھی سی "سی ڈی" اور موبائل فون۔"

46 "کبھی سی این جی کی لائن میں لگی؟"

"ہاں دو بار لگی تھی۔ پھر توبہ کی کہ اب نہیں لگوں گی۔ اتنی لمبی لائن.... آف؟"

47 "مجھے فخر ہے؟"

"مجھے اپنی چند دوستوں پر فخر ہے.... نام نہیں لوں گی پھر وہ بگڑ جائیں گی۔" قہقہہ۔

48 "شاپنگ خود کرتی ہوں یا دوستوں کے ساتھ؟"

"زیادہ تر اپنی فرینڈز کے ساتھ اور اپنی کزنز کے ساتھ۔"

49 "دام کم کرنے میں ماہر ہوں؟"

"نہیں بھئی... جو پرائس ٹیگ ہوتے ہیں وہ ہی دیتی ہوں۔ بڑے شاپنگ مالز میں ایسا رواج کب ہے... عام جگہوں پہ بھی ایسا نہیں کرتی۔"

50 "میوزک جنون یا شوق؟"

"جنون ہے... میوزک کے بغیر تو زندگی ادھوری لگتی ہے۔"

51 "پسندیدہ فلمی فنکار؟"

"شان اور رنبیر کپور۔"

52 "ایس ایم ایس کا جواب دیتی ہوں؟"

"سب کو نہیں، ضروری SMS کے جواب دیتی ہوں۔"

53 "سالگرہ؟"

"جی بہت شوق سے، بہت دھوم دھام سے خوب ہلا گلا کرکے مناتی ہوں۔"

54 "ایک خواہش جس کی تکمیل چاہتی ہوں؟"

"ہاں ایک خواہش ہے اس کی تکمیل چاہتی ہوں۔ مگر ابھی بتاؤں گی نہیں۔"

55 "میاں بیوی گاڑی کے دو پہیے ہوتے ہیں؟"

"بالکل۔ اگر دونوں ایک دوسرے کا ساتھ دیں تو زندگی میں بہت سی کامیابیاں مل سکتی ہیں۔"

56 "عورت کی صلاحیتوں کو کب تسلیم کیا جائے گا؟"

"جب مرد اپنے آپ کو حاکم سمجھنا چھوڑ دے گا۔"

57 "ایک بات جو تجھے دوسروں میں ممتاز کرتی ہے؟"

"خوش رہتی ہوں اور دوسروں کو خوش رکھتی ہوں۔ مسکرانا میری فطرت ہے۔"

58 "اپنے آپ کو بچا کر رکھتی ہوں؟"

"ٹینشن سے؟ ٹینشن بھی ہو تو مصروف ہو کر اسے دور کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

59 "ایک دعا جو ہر وقت مانگتی ہوں؟"

"اللہ سب کو صحت و تندرستی کے ساتھ سلامت رکھے اور کسی کو کوئی برا وقت نہ دکھانا۔"

60 "میرے مشکل وقت میں کون سب سے پہلے آئے گا؟"

"میرے خیال میں سب ہی آئیں گے۔ مگر ماں سب سے پہلے آئیں گی، کیونکہ وہ مجھ سے بہت محبت کرتی ہیں۔"

61 "ایک تحفہ جو ماں کو دینا چاہتی ہوں؟"

"اپنی ماما کو ایک گھر کا تحفہ دینا چاہتی ہوں۔"

62 "اپنا اسٹائل اپناتی ہوں یا وقت کے ساتھ چلتی ہوں؟"

"وقت کے ساتھ اور زمانے کے ساتھ چلنا چاہیے۔"

63 "کوئی کام کرتے وقت انجام سوچتی ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔ رزلٹ پہ نظر رکھیں مگر امیدیں نہ لگائیں۔"

64 "فارغ اوقات کے مشاغل؟"

"میوزک سننا، گھومنا پھرنا، لائف کو انجوائے کرنا۔"

☆☆☆

اعتذار

کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر فائزہ افتخار "شاید" کی قسط نہ لکھ سکیں۔

اس ماہ ان کی قسط شامل اشاعت نہیں ہے۔ اس کے لیے قارئین سے معذرت۔ ان شاءاللہ آئندہ ماہ بہنیں "شاید" کی قسط پڑھ سکیں گی۔

تنزیلہ ریاض

دوسری قسط

وہ اویس تھا۔اس کا چھوٹا بھائی۔

سمیع نے ایک نظر اسے دیکھا، جو انہیں دیکھ کر اب لاتعلق ہو کر آگے بڑھ گیا تھا۔اس کی آنکھوں میں شناسائی کی ذرا سی بھی رمق نہیں تھی۔دوسری نظر اس نے شہرین پر ڈالی، جو اپنے بھائی کو وہاں پا کر کچھ ملی جلی کیفیات کا شکار نظر آتی تھی۔سمیع اس سے پہلے کہ اسے کچھ کہتا، وہ یکدم بونٹ سے اتری اور بھاگ کر اویس کی طرف جا پہنچی۔تب تک وہ ان سے کچھ فاصلے پر جا چکا تھا۔

"اویس... کیسے ہو۔" اس نے جاتے ہی اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔سمیع کو مجبوراً اس کے تعاقب میں آنا پڑا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔کون ہو تم...؟" اویس نے سخت نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

گرمیوں کے دن تھے۔ایسی جگہ پر لوگوں کا آنا جانا عام سی بات تھی لیکن چھٹی کا دن نہ ہونے کے باعث، بہت
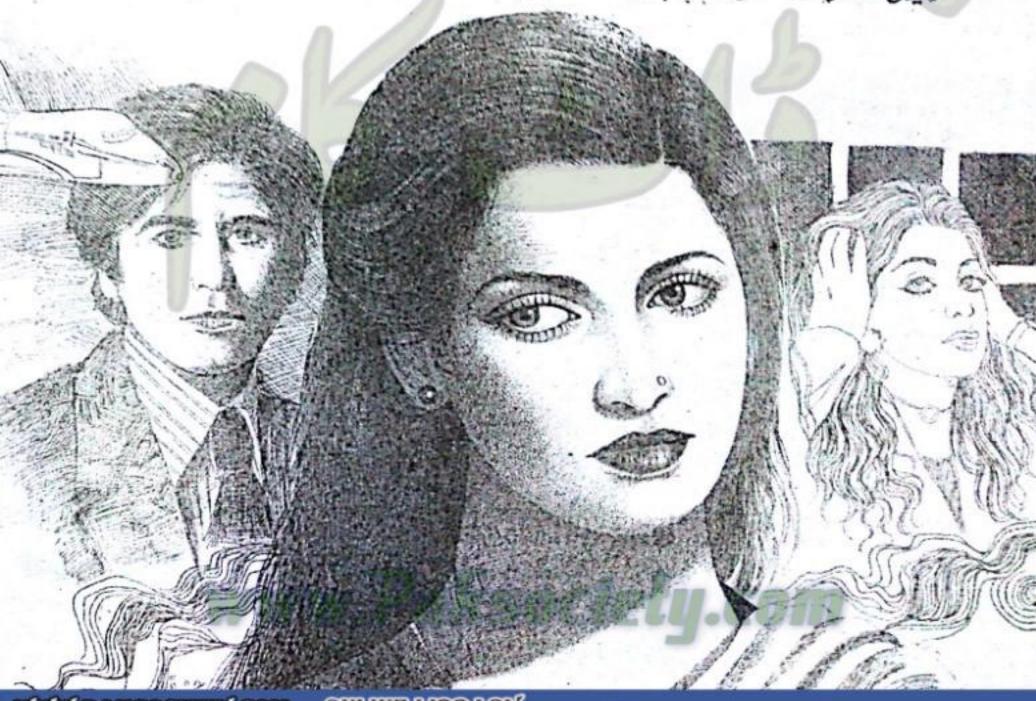
پبلک بھی نہیں تھی لیکن اتنی کم بھی نہیں تھی کہ کوئی با آواز بلند کسی کو دھتکارتا اور قریب سے گزرتے لوگوں تک آواز بھی نا پہنچتی۔ کچھ ایک چہروں نے پلٹ کر بھی دیکھا تھا۔

"ایسے بات کیوں کر رہے ہو اویس... تم تو میرے اتنے لاڈلے تھے۔ اس طرح تو مت کرو" شہرین کی آواز میں لجاحت اور اویس کی آنکھوں میں کرختگی ایک ساتھ بڑھی تھی۔ شہرین نے پھر اپنا ہاتھ اس کے کندھے پر رکھنا چاہا تھا۔ وہ بدک کر پیچھے ہٹا۔

"معاف کرو بی بی... میں نہیں جانتا تم کون ہو" اس نے مزید کرختگی لہجے میں سموئی۔

"شہرین چلو یہاں سے" سمیع کو اس کا انداز سخت برا لگا۔ وہ شہرین سے کافی چھوٹا تھا لیکن اچھا قد کاٹھ نکال لیا تھا اس لیے اب وہ اس کے کندھوں تک ہی آتی تھی۔ سمیع کے ٹوکنے پر اویس نے ایک نظر اس پر ڈالی۔ کیا نہیں تھا اس نظر میں... نفرت حقارت اور انتہائی سرد مہری۔ سمیع کو مزید تپ چڑھی۔ اس نے آگے بڑھ کر شہرین کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا۔

"مجھے ایک منٹ بات تو کرنے دو سمیع۔" وہ جیسے چڑ کر بولی۔ سمیع اس کے رویے پر حیران رہ گیا۔

"میں تم سے بات کرنا ہی نہیں چاہتا... خوامخواہ گلے مت پڑو۔ تم مر چکی ہو ہم سب کے لیے اپنا راستہ ناپو بلکہ میں ہی یہاں سے چلا جاتا ہوں' میں اپنے دوستوں کے ساتھ آیا ہوں' دوبارہ مجھے مخاطب کر کے ان کے سامنے میرا تماشا بنوانے کی ضرورت نہیں ہے" وہ بے حد بدتمیزی سے بولا تھا۔ اب لوگ بھی رک کر دیکھنے لگے تھے۔

اویس آگے بڑھا تھا تو شہرین نے پھر اسے پیچھے سے جالیا۔

"اچھا میں چلی جاتی ہوں لیکن یہ تو بتا دو... امی ابو کیسے ہیں... ان کو میرا سلام کہنا... میں بہت یاد کرتی ہوں" اس کے رویے میں منت و لجاحت بڑھنے لگی تھی۔ ایسا لگتا تھا اسے اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کوئی نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ سمیع کا غصہ بڑھنے لگا۔

"ان کو تمہارے سلام کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنے سلام کو اپنی اس یار تک محدود رکھو" اویس نے سمیع کی طرف اشارہ کیا تھا۔

"تمیز سے بات کرو۔ تمہیں کسی نے اتنا بھی نہیں سکھایا کہ بڑی بہنوں سے کیسے بات کرتے ہیں" سمیع نے اسے کم اور شہرین کو زیادہ 'کھا جانے والی نظروں سے دیکھا تھا۔

"تم تمیز کی بات کرتے ہو... میں تو تم سے بات ہی نہیں کرنا چاہتا... دو ٹکے کے لوفر آدمی... اونہہ! دوسروں کی بہنوں کو ورغلا کر راہ راست سے بھٹکانے والے' مجھے نصیحتیں کرنے آ گئے ہیں۔" اس کا لہجہ اور انداز اتنا گستاخانہ تھا کہ سمیع کو اپنا بلڈ پریشر ہائی ہوتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

"میں تم سے' بات کرنے کے لیے مرا نہیں جا رہا۔ تم جیسوں کو تو میں منہ بھی نہیں لگایا کرتا۔ تمہارے الفاظ ہی تمہاری تربیت کا پتا دیتے ہیں" سمیع چبا چبا کر بولا تھا۔ اویس کے چہرے پر استہزائیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"یہ بات اپنی اس بیوی کو بھی سمجھا لو نا پھر... اور تربیت کرنے کے لیے اللہ نے تمہیں اولاد دے دی ہے نا... اپنی بیٹی کو سکھانا یہ ساری باتیں..." اویس کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا لیکن سمیع نے "بیٹی" کا لفظ سنتے ہی اسے دھکا دیا تھا۔ لوگ اب رک کر ان کے قریب جمع ہو رہے تھے۔

"تڑپ اٹھتی ہے نا' دل میں... چٹکی کاٹتا ہے نا کوئی۔ تکلیف ہوتی ہے نا... جب اپنی بیٹی کا' اپنی بہن کا ذکر آتا ہے... سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے" وہ گردن ہلا کر جتا رہا تھا اور ساتھ ہی طنزیہ مسکراہٹ اس کے چہرے کا احاطہ کر رہی تھی۔

"سمیع تم چپ رہو۔۔۔ پلیز یہ میرا اور میرے بھائی کا معاملہ ہے۔ تم مجھے بات کرنے دو" شہرین بجائے اس کا ساتھ دینے کے ابھی بھی اپنے بھائی سے بات کرنے پر بضد تھی۔ سمیع کو اویس سے زیادہ اس پر غصہ آیا۔ اس نے شہرین کا ہاتھ پکڑا تھا اور کسی کی جانب دیکھے بنا اپنی گاڑی کی سمت جانے کے لیے پیچھے کی طرف مڑنا چاہا تھا۔ شہرین نے بے چارگی سے ایک بار پھر اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"سمیع پلیز۔ ایک منٹ۔۔۔ صرف ایک منٹ۔" وہ ابھی بھی وہاں سے ہٹنے کو تیار نہیں تھی۔ اویس نے سمیع کا غصے سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھ کر طنزیہ انداز میں مصنوعی قہقہہ لگایا تھا۔ سمیع کے ناک کے نتھنے پھول گئے تھے۔ اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ اٹھتا اس نے خود ہی وہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا تھا۔ سمیع کی توقع کے برخلاف شہرین وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"میں آج پہلے بیٹنگ کروں گا" سلیم نے بیساکھی لہرا کر کہا تھا۔ سارے بچوں نے ایک ساتھ گھور کر اسے دیکھا۔

"کل کس نے پہلے بیٹنگ کی تھی؟" برکت نے تیکھے چتون لیے سوال کیا تھا۔

"سلیم بھائی نے۔۔۔؟" سب بچوں نے یک زبان جواب دیا۔

"پرسوں کس نے پہلے بیٹنگ کی تھی؟" برکت نے ہی پوچھا تھا۔

"سلیم بھائی نے۔" سارے ایک ساتھ چلائے تھے۔

"تو بس پھر آج کون پہلے بیٹنگ کرے گا؟" یہ سوال سلیم نے کیا تھا۔ ایک بھی بچے نے اس کا نام نہیں لیا تھا۔

"اب کوئی نہیں بولا۔۔۔ سلیم بھائی۔۔۔ اب میرا نام لیتے سانپ سونگھ گیا سب کو۔۔۔ ظالموں" وہ چلایا تھا۔

"سلیم بھائی یہ بے ایمانی ہے۔۔۔ آپ روز پہلے باری لے لیتے ہیں پھر آؤٹ بھی نہیں ہوتے۔۔۔ ہماری باری تو آتی ہی نہیں ہے۔ لیکن لائٹ آجاتی ہے" اظفر اور حمزہ نے ایک ساتھ بیان جاری کیا تھا۔ بجلی کے جاتے ہی سارے بچے اپنے گھروں سے ٹارچ لا کر گلی میں جمع ہو کر کرکٹ کھیلنے لگتے تھے۔ سلیم بھی کاؤنٹر کے باہر پڑی ساری چیزیں اٹھا کر اندر رکھ دیا کرتا اور شٹر کا کچھ حصہ بھی نیچے کر دیتا تھا یا پھر اس کے ابا گھر میں موجود ہوتے تو وہ آکر دکان کے باہر کرسی رکھ کر بیٹھ جاتے اور سلیم صاحب کرکٹ کھیلنے میں لگ جاتے۔۔۔ وہ فیلڈنگ کر سکتا تھا نہ باؤلنگ لیکن وہیل چیئر پر بیٹھے بیٹھے بیٹنگ جما کر کرتا۔ وہ سب بچے دس سے بارہ سال کی عمروں کے تھے۔ ان سے اسے آؤٹ کرنا مشکل ہو جاتا اور جب وہ آؤٹ ہو جاتا تو دکان یا گاہک کا بہانہ بنا کر فوراً گیم سے الگ ہو جاتا۔ اس لیے بچے اسے باری دیتے نہیں تھے۔

"تم لوگ اچھی باؤلنگ کیا کرو نا کہ میں جلدی آؤٹ ہو جاؤں۔۔۔ اب اس میں بھی میرا قصور ہے کیا؟" وہ

کندھے اچکا کر بولا۔
"آپ چیٹر ہیں... آؤٹ ہو بھی جائیں تو مانتے نہیں ہیں" حمزہ نے بالنگ کو ہاتھوں میں گھماتے ہوئے کہا تھا۔ سلیم نے مصنوعی ناراضی کا اظہار کرتے ہوئے آنکھیں پھیلائی تھیں۔
"تم سب لوگ جلتے ہو مجھ سے۔ اس لیے کہ میں تم سب سے بہتر بیٹس مین ہوں... اس محلے کا شاہد آفریدی۔" احساس تفخر سے گردن اکڑائی گئی۔
"آیا وڈا (بڑا) شاہد آفریدی... شکل دیکھی ہے اپنی..." یہ آواز بچوں کی نہیں تھی، لیکن اس آواز کو سلیم آنکھیں بند کر کے بھی پہچان سکتا تھا۔ اس نے منہ اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آواز خالہ کے گھر سے آئی تھی لیکن تاریکی کے باعث کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ کھڑکی میں کوئی نہیں کھڑا تھا پھر اس نے ان کے دروازے کی جانب دیکھا۔ گھر کے دروازے سے باہر نکل کر جو چبوترا سا بنا تھا۔ نینا اس پر براجمان تھی۔
"نینا کی بچی تم اپنا منہ بند رکھو" آواز تو وہ پہچان ہی چکا تھا اس لیے چلا کر بولا۔ بچے بھی مسلسل چلا رہے تھے۔
"منہ بند بھی رکھ لوں مگر آنکھیں تو کھلی ہیں نا... جو صاف دکھا دیتی ہیں کہ پانی میں دس روپے والا سرف ایکسل ڈال کر بھی تمہیں غوطہ دیا جائے تو تم زیادہ سے زیادہ میلا بے ورد ھنے نظر آؤ گے۔" اس نے اسی کے انداز میں کہا۔ سلیم نے منہ بنا کر کوئی جواب نہیں دیا تھا۔
"اچھا تو بچو! میں کیا کہہ رہا تھا... پہلے باری میں لوں گا" اس نے وہیں سے سلسلہ کلام جوڑا تھا۔
"نہیں... نہیں، نہیں۔" اس بار سب متحد تھے۔
"دیکھ لو بھائی ہوں تم سب کا۔ پچھلی بار عید پر سب کو مفت آئسکریم کھلائی تھی میں نے" وہ اب منتوں پر اتر آیا تھا۔
"وہ دو سال پہلے کی بات ہے" وہ سب پھر چلا کر بولے تھے۔ سلیم نے گھور کر دیکھا۔
"اچھا افلاطونو اس سال بھی عید پر کھلاؤں گا... اب تو باری دے دو" وہ اسی منت بھرے انداز میں بولا تھا۔
بچوں کو بھی ترس اور لالچ نے مجبور کیا تھا کہ اس کی بات مان لیں۔
"اچھا لے لیں... لیکن یاد رکھیں بے ایمانی جس کا کام..." اظفر یاور تھا اس نے انگلی اٹھا کر تنبیہہ کرتے ہوئے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا جسے باقی بچوں نے پورا کیا۔
"ہندو کا فراس کا نام" یک زبان ہو کر نعرہ لگایا گیا۔
"بالکل بالکل..." سلیم نے گردن ہلائی اور پھر نینا کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی جانب متوجہ نہیں تھی۔
"نینا باجی ایمپائرنگ کریں گی" سلیم نے بچوں کو تسلی دی تھی۔ اس کا نام لینے پر وہ متوجہ ہوئی پھر سر ہلا کر بولی۔
اوکے ڈن... شاہد آفریدی صاحب..." اس نے طنزیہ انداز میں کہا تھا۔ سلیم نے پروا نا کرتے ہوئے وہیل چیئر گھسیٹ کر پوزیشن سنبھالی تھی اظفر نے پہلی بال ہی گھما کر پوری رفتار سے کروائی اور سلیم صاحب تیز شاٹ کھیلنے کے چکر میں سامنے کھڑے حمزہ کے ہاتھوں کیچ آؤٹ ہو گئے۔
"آؤٹ... آؤٹ... آؤٹ..." وہ سب پھر چلانے لگے۔
"کوئی نہیں، کوئی نہیں ابھی تو میں پریکٹس کر رہا تھا یہ کیا بات ہوئی۔" وہ مکر گیا تھا اور بیٹ بھی ہاتھ سے چھوڑنے کو تیار نہیں تھا۔
"بے ایمانی جس کا کام... ہندو کا فراس کا نام... بے ایمانی جس کا کام... ہندو کا فراس کا نام..." وہ سب پھر چلانے لگے تھے۔
"اچھا... نینا باجی سے پوچھ لو... وہ ایمپائر ہیں نا" اب کی بار نینا انہی کی جانب متوجہ تھی۔

"آوٹ۔۔۔ آوٹ۔" وہ سب نمنا کے سر پر سوار ہو گئے۔

"کوئی نہیں۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔ یہ تو نوبال تھی۔۔۔ میں نے خود دیکھا۔۔۔ ناٹ آوٹ۔۔۔" وہ ایمپائر کے انداز کی اداکاری کرتے ہوئے گردن اکڑا کر بولی۔ سلیم کے ساتھ آپس میں جتنے مرضی اختلاف ہوتے اس کے۔۔۔ بیرونی محاذوں پر وہ اکٹھے تھے۔ سلیم نے نعرہ لگاتے ہوئے بیٹ ہوا میں بلند کیا تھا۔

"بے ایمانی جس کا کام۔ ہندو کافر اس کا نام۔۔۔ نہیں بلکہ بے ایمانی جس کا کام۔۔۔ نمنا سلیم اس کا نام۔۔۔ نمنا باجی سلیم بھائی اس کا نام۔" وہ اب تعویدل کر چلانے لگے تھے۔

"جی نہیں بے ایمانی جس کا کام۔۔۔ حمزہ برکت اس کا نام۔۔۔ حمزہ اظفر اس کا نام" نمنا بھی اسی انداز میں چلانے لگی تھی۔ سارا محلہ ان کے شور سے گونج رہا تھا۔ ابا اسی وقت واپس آئے تھے' تاریکی کے باعث نمنا کو پتا نہیں چلا تھا لیکن گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے چبوترے پر بیٹھی اپنی بیٹی کے انداز کو ناپسندیدگی سے دیکھا تھا۔

"کیا دیکھ رہی ہو۔۔۔" کاشف نے آئینے میں نظر آنے والے اس کے عکس کو دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ وہ اسے تیار ہوتا دیکھ رہی تھی۔ فیروزی رنگ کی بڑے کالر والی شرٹ اور بڑے کف والے آستینوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے چیک والی ٹائی لگائے تازہ شیو" شیمپو اور ایوڈی ٹوائلٹ کی ملی جلی خوشبوئیں بکھیرتا اس کا شوہر۔۔۔ اس کا وجیہہ شوہر۔۔۔ اسے کبھی کبھی اپنے ذہنی تناؤ کی سب سے بڑی وجہ لگا کرتا تھا۔ رات کے اس پہر اس طرح سے تیار ہو کر جانا' اب اس کا روز کا معمول بن گیا تھا اور اسے اس طرح تیار ہو کر جاتے دیکھنا صوفیہ کا معمول بنتا جارہا تھا۔

پیسا ہن کی طرح برسنے لگا تھا اور ان کا باہمی رشتہ توجہ کو ترسنے لگا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ صوفیہ کو ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہتا تھا یا لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ جب بھی شہر کے سیٹھوں کے خاندان اکٹھے ہوتے تھے' کاشف اسے ساتھ چلنے پر اصرار کرتا تھا' لیکن بی بی جان کا کہنا تھا کہ وہ ان دنوں آرام کرے اور ہر ایرے غیرے سے ملنے میں احتراز برتے' تو وہ گھر سے کم ہی نکلتی تھی۔

"میرا خیال ہے میں آج کالا ٹیکا لگا ہی لوں۔۔۔ بیوی ٹکٹکی باندھ کر دیکھے اور دیکھتی ہی چلی جائے' تو اس کا مطلب شوہر واقعی خوب صورت ہے" وہ خود ہی ہنستا تھا۔ صوفیہ مسکرائی تک نہ تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" کاشف نے اپنی بات پر اس کا کوئی رد عمل نا دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"میں جب پانچویں کلاس میں تھی نا تو ہماری ایک نئی میڈم (ٹیچر) آئی تھیں' انہوں نے ہمیں ایک بہت دلچسپ بات بتائی۔ کہنے لگیں ہر انسان کی آنکھ کے بائیں جانب اندر کی طرف ایک چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے۔ جس کے متعلق آج تک یہ پتا نہیں چل سکا کہ اس کا فائدہ کیا ہے۔۔۔ یعنی اس کا ہونا اور نا ہونا ایک برابر ہے۔۔۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ مرد کی خوب صورتی بس آنکھ کا وہ چھوٹا سا سوراخ ہی تو ہوتی ہے۔۔۔ جس کے متعلق یہ نہیں پتا چل سکا کہ اس کا فائدہ کیا ہے۔" وہ سادہ سے انداز میں جو بات کہنے کی کوشش کر رہی تھی وہ اور کاشف دونوں جانتے تھے کہ اس قدر سادہ بھی نہیں ہے۔ کاشف نے اب کی بار مڑ کر اس کی جانب دیکھا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے ابھی جدا نہیں ہوئی تھی۔

"کیا کہنا چاہ رہی ہو بیگم۔ کھل کر کہو نا" وہ بیڈ کے دوسرے کنارے پر ٹک کر بیٹھا تھا۔

"ایک عام سی بات کہی ہے کہ مرد کی خوب صورتی بے فائدہ ہے۔" وہ اپنی بات سے پلٹی نہیں تھی۔

"مرد کی خوب صورتی عورت کے لیے ہی تو ہوتی ہے۔" وہ صوفیہ کے طنز کو سمجھ تو رہا تھا لیکن شوہرانہ عادت کے مطابق بات کو کھینچ کر لمبا کر رہا تھا۔

"عورت کو مرد کی خوب صورتی سے کیا غرض۔۔۔ اسے تو بنانے والے نے خود اتنا خوب صورت بنایا ہے۔۔۔ اسے کیا پروا۔۔۔ ایک طرح سے مرد کی خوب صورتی اس کے لیے وبال جان ہی ہے۔۔۔ عورت کا خانہ خراب کرنے

کے لیے تو اس کے پاس پہلے سے بڑے ہتھیار ہیں۔۔۔ اس کی مردانگی' طاقت' دولت' عورت پر روپیہ خرچ کرنے کا حوصلہ۔۔۔ میٹھی میٹھی باتیں کر کے اسے شیشے میں اتارنے کا گر۔۔۔ عورت تو ان باتوں سے ہی چاروں شانے چت کی جا سکتی ہے۔" وہ کچھ زیادہ اکتائے ہوئے انداز میں بولی تھی۔

"پتا نہیں تم کیا باتیں کر رہی ہو۔۔۔ میں تمہاری اس فلاسفی کو نہیں مانتا۔۔۔ میں تو اتنا جانتا ہوں کہ خوب صورتی صرف عورت کی میراث نہیں ہے۔۔۔ اللہ نے اسے برابر مرد اور عورت دونوں میں بانٹا ہے اور پھر خوب صورتی کا مفہوم کیا ہے۔۔۔ سیانے کہتے ہیں جو دل پسند ہے' وہی دلکش ہے باقی سب باتیں غیر ضروری ہیں" وہ دوبارہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"آگ لگے ان سیانوں کو۔۔۔ انہی کی باتیں تو دماغ خراب کرتی ہیں۔ انہوں نے ہی معیار قائم کر کے ہم جیسوں کو مصیبتوں میں ڈالا ہوا ہے۔ اچھا مرد ایسا ہوتا ہے۔ اچھی عورت ایسی ہوتی ہے۔" وہ انتہائی چڑ کر بولی تھی۔

کاشف کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہوئی۔

"سیانوں سے کیا دشمنی ہے بھئی تمہاری۔۔۔؟" وہ پرفیوم اسپرے کرنے لگا تھا۔

"زندگی کے کسی بھی جذبے کی' اپنی کوئی ذاتی تعریف نہیں ہوتی۔۔۔ یہ ہر شخص کے لیے اس کے اپنے حالات و واقعات کے مطابق ہوتی ہے۔۔۔ ہر شخص کا اپنا ذاتی تجربہ۔۔۔ سیانوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجھے بتائیں کہ دل پسندی ہی دلکشی ہے۔۔۔ میرے لیے مرد کا خوب صورت ہونا ایک غیر ضروری بے فائدہ بات ہے۔۔۔ تو ہے۔۔۔ میرے نزدیک مرد کی شرافت ہی اس کی سب سے بڑی دلکشی ہے۔ لیکن ٹھیک اسی طرح کسی دوسری عورت کے لیے مرد کا خوب صورت ہونا بہت بڑی بات بھی ہو سکتی ہے۔ وہ شرافت کو اپنی ہیل والی جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں گی۔۔۔ اس لیے سیانوں کو چاہیے کہ وہ ہر بات میں ٹانگ نا اڑایا کریں۔۔۔ عام انسانوں کو اپنے تجربات سے سیکھنے دیں۔۔۔ اور اگر کہے بغیر گزارا نہیں ہوتا تو ہر بات کہنے کے بعد بریکٹ میں لکھ دیا کریں۔۔۔ ادارہ نتائج کا ذمہ دار نا ہو گا" کاشف نے قہقہہ لگایا تھا۔

"اتنا غصہ۔۔۔ تمہارے ارادے آج کچھ نیک نہیں لگتے۔۔۔ کہو تو ڈاکٹر کے پاس لے چلوں" وہ ابھی بھی استہزائیہ انداز میں بات کو اڑا رہا تھا اور یہ امر صوفیہ کے لیے بڑا دکھ دینے والا تھا کہ وہ اس کی باتوں کو ہمیشہ مذاق میں ختم کر دیتا تھا۔

"ارادے نیک ہونے سے کیا ہوتا ہے کاشف صاحب۔۔۔ انسان نیک ہونے چاہئیں بس۔" یہ در پردہ طنز تھا۔

"کیا بات ہے بیوی!۔۔۔ بہت ذہانت والی بات کرنے لگی ہو" کاشف نے اپنے مزاج کے سابقہ رنگ کو برقرار رکھا تھا۔

"آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ آپ کو میرے جیسی ذہین بیوی چاہیے تھی۔۔۔ بی بی جان کو بھی ذہانت ہی درکار تھی تو بس۔۔۔ میں نے بھی ذہانت کو ہی گھول گھول کر پینے کا ارادہ کر لیا ہے" صوفیہ نے اب کی بار مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ مسلسل طنز اس کے شوہر کے مزاج پر گراں بھی گزر سکتا تھا۔

کاشف کی کچھ باتیں اسے یہ احساس بھی دلاتی تھیں کہ وہ اس کی پروا کرتا ہے اور اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ وہ خود بھی محبت کا وقتاً" فوقتاً" اظہار کرتا رہتا تھا' لیکن اپنی روش سے ہٹتا بھی نہیں تھا۔

"اٹھو تیار ہو جاؤ۔۔۔ کہیں باہر لے کر چلتا ہوں تمہیں۔۔۔ گھر میں پڑے رہنے سے تم کچھ زیادہ ہی ذہین ہوتی جا رہی ہو۔۔۔ اب اس قدر ذہانت بھی نہیں چاہیے مجھے۔" اس نے یکدم اس کی جانب مڑ کر کہا۔ صوفیہ کو دل ہی دل میں بڑی خوشی ہوئی۔ وہ خود بھی اس کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔

"بی بی جان۔۔۔؟" اس نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔

”ان سے میں پوچھ لیتا ہوں... تم تیار ہو کر نیچے آؤ“ وہ کمرے سے نکلتے ہوئے بولا تھا۔ صوفیہ خوشی خوشی تیار ہونے چل دی تھی۔

☆ ☆ ☆

”ناراض ہو سمیع“ شہرین نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ سمیع نے مڑ کر اسے دیکھا پھر ہاتھ میں پکڑا سگریٹ فوراً فرش پر پھینک کر اسے پاؤں سے مسلنے لگا۔ شہرین اس کے ساتھ آکھڑی ہوئی تھی۔ وہ کب سے بالکونی میں کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ شہرین کو دکھ بھی ہو رہا تھا لیکن وہ بھی کیا کرتی۔ ماں باپ کی یاد اسے بے چین ہی اس قدر رکھتی تھی۔ یہ فطری سی بات تھی جب ماں باپ ساتھ تھے تو سمیع کی کمی حاوی رہتی تھی۔ اب سمیع ساتھ تھا تو ماں باپ کی کمی جان لیوا محسوس ہوتی تھی۔

”ناراض رہا ہی نہیں جاتا تم سے... یہی تو مجبوری ہے۔“ وہ سادہ سے انداز میں بولا تھا۔

”شہرین چند لمحے اس کے انداز پر چپ کھڑی رہی‘ پھر اس نے بھی سمیع کے بالکل ساتھ کھڑے ہو کر بالکونی کی گرل پر ہاتھ جمائے تھے۔

”آئی ایم سوری... لیکن میں اپنے دل کا کیا کروں۔ وہ میرا بھائی ہے... چھوٹا لاڈلا بھائی“ عجب بے چارگی اس کے لہجے پر چھائی تھی۔

”میں نے اتنے دنوں بعد اسے دیکھا تھا... وہ وہاں تھا... میرے اتنے قریب... میں اس لیے بس... آئی ایم سوری سمیع۔“

”وہ وہاں تھا... یہ میں نے بھی دیکھ لیا تھا... لیکن کس انداز میں تمہیں دھتکارا اس نے... بات کیسے کر رہا تھا وہ تمہارے ساتھ... ایسے ہوتے ہیں چھوٹے بھائی... میرا بھائی ایسے کرتا نا مجھ سے تو میں دو تھپڑ اس کے منہ پر مار کر آتا۔ تمہارا لحاظ تھا ورنہ...“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ اویس کا طنزیہ قہقہہ ابھی بھی سماعتوں میں گونج رہا تھا۔ شہرین چند لمحے کچھ نہیں بولی۔ تاسف میں گھری اپنی انگلیاں مروڑتی رہی۔ سمیع نے اس کی جانب دیکھا پھر اسے بھی افسوس ہوا۔ شہرین کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

اسے کچھ بھی سمجھانا کبھی کبھی بے حد مشکل ہو جاتا تھا۔ ایک بار اس کی بہن کسی مال میں مل گئی تھیں‘ شہرین کے محبت سے گلے لگانے اور مخاطب کرنے کے باوجود انہوں نے اس کی بات کا جواب بھی نہیں دیا تھا اور تب بھی انہوں نے سمیع کو بے بھاؤ سنائی تھیں۔ اس کے گھر والے صاف ہی کہتے تھے کہ شہرین ہمارے لیے مر چکی ہے اور سمیع سے وہ سب شدید نفرت کرتے تھے۔ شہرین کے لیے یہ بات بہت بڑا صدمہ تھی۔ شہرین چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی پھر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تھا۔ آنسو ٹپ ٹپ کر کے بہنے لگے۔

”مائی گاڈ... شہنا پلیز... میرے ساتھ ایسے مت کرو۔“ عورت کے آنسو ہتھیار ہوتے ہیں اور من چاہی عورت کے آنسو اینٹی ہتھیار ہوتے ہیں۔ سمیع کو مزید تاسف نے گھیر لیا۔ وہ پھر بھی بے آواز روتی رہی۔

”تمہیں ذرا سا بھی اندازہ ہو نا شیری کہ تمہارے آنسو میرے ساتھ کیا کرتے ہیں تو تم کبھی ایک آنسو بھی نا بہاؤ۔“ وہ زچ ہو کر بولا۔

”میں زندگی میں کسی کو خوش نہیں کر پاؤں گی... نا تمہیں‘ نا کبھی اپنے گھر والوں کو... مجھے یہ شادی کرنی ہی نہیں چاہیے تھی... مجھے لگتا ہے مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی... بہت بڑی... ہم میں سے کوئی بھی خوش نہیں ہے۔ کوئی ایک بھی نہیں“ وہ روتے ہوئے بول رہی تھی۔ سمیع نے انتہائی افسوس بھرے انداز میں اسے دیکھا۔

”جب تم ایسے بی ہیو کرتی ہو نا... مجھے بہت دکھ ہوتا ہے۔ انتہائی دکھ... مجھے لگتا ہے تم اپنے فیصلے پر پچھتا رہی

ہو۔۔۔ تم میرے ساتھ خوش نہیں ہو۔۔۔"
"سمیع میں اپنے دل کا کیا کروں۔ وہ سب مجھے یاد آتے ہیں تو آنکھوں سے نیند اڑ جاتی ہے۔ سو نہیں پاتی کئی کئی گھنٹے۔ امی کی شکل آنکھوں کے سامنے گھومتی رہتی ہے۔ ان کی گود میں سر رکھنے کی خواہش بے چین کرنے لگتی ہے۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے ان سے ملے ہوئے۔۔۔ میں خود کو بہت اکیلا محسوس کرتی ہوں" وہ ہچکیوں سے رونے لگی تھی۔ سمیع کو وہ بالکل کسی چھوٹی سی بچی کی مانند لگی جو ماں باپ سے ضد کر کے اپنی بات تو منوا چکی تھی، لیکن اب پچھتاوے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ اس نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔

"میں ہوں نا تمہارا۔۔۔ تم کسی اور کے بارے میں کیوں سوچتی ہو۔۔۔ میرے بارے میں سوچا کرو۔۔۔ صرف میرے بارے میں۔۔۔" وہ اسے تسلی دے رہا تھا۔ وہ کبھی اس پر غصہ نہیں کر پاتا تھا۔

"کیا تمہارے لیے یہ احساس کافی نہیں ہے کہ تمہارا جیون ساتھی پورے کا پورا تمہارا ہے۔۔۔ مت رویا کرو۔۔۔ مت ہلکان کیا کرو خود کو، میں ٹوٹنے لگتا ہوں۔۔۔ دراڑیں پڑ جاتی ہیں مجھ میں، میرے بارے میں بھی تو سوچو۔۔۔ میرے ماں باپ بھی تو مجھ سے خفا رہتے ہیں، لیکن میں پھر بھی تمہارا ہو جانے پر خوش ہوں۔ میرا نقصان تم سے کہیں زیادہ ہے یار۔۔۔ تمہارا ہو جانے کے بعد میں تو اپنے آپ کا بھی نہیں رہا۔۔۔ پھر بھی تم رو رو کر مجھے ہی لیٹ ڈاؤن کرتی ہو۔۔۔ بتاؤ کیا کروں۔۔۔ مر جاؤں؟" وہ بے چارگی کی آخری حد پر کھڑا تھا۔

"اللہ نہ کرے۔۔۔ ایسی باتیں کیوں نکالتے ہو منہ سے۔۔۔ مرنا ہی ہے تو میں مر جاتی ہوں۔ اس بے چینی سے تو نجات ملے گی" وہ تڑپ کر بولی تھی۔

"میں تو جیسے بچ ہی جاؤں گا پھر۔" سمیع نے گردن جھٹکی تھی۔ شیریں کچھ نہیں بولی۔ تھکی ہوئی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ سمیع کی محبت اسے مسرور و مسرور تو کرتی تھی، لیکن ماں باپ کی ناراضی کی بے چینی بھی اپنی جگہ مستحکم تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ لیں آنسہ صوفیہ حلیمہ۔۔۔ چکن سوپ کا لطف اٹھائیں۔" حبیبہ نے اس کے سامنے پاؤل رکھتے ہوئے اسے اس کے مکمل نام سے مخاطب کیا تھا۔ یہ بھرپور طنز تھا ورنہ ایسے تو نہیں مخاطب کیا کرتی تھی وہ اسے۔ صوفیہ کے چہرے کے تاثرات بالکل سپاٹ ہو گئے۔ اسے اس عورت سے نفرت محسوس ہوتی تھی اور اس نفرت کو چھپانے میں اب دقت بھی ہونے لگی تھی۔ گھر سے نکلتے وقت اسے قطعا" اندازہ نہیں تھا کہ کاشف اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ سارا راستہ کاشف اس سے بہت محبوبانہ انداز میں باتیں کرتا رہا تھا۔ اس کی جھنجلاہٹ اور بے زاری کے لیے پریگننسی کو مورد الزام ٹھہراتا رہا۔ آنے والے مہمان کی باتیں کر کے اس کے مزاج کی اکتاہٹ کو ختم کرنے کی کوشش کرنے میں لگا رہا۔ اس لیے جب اس نے مجید بھائی کے گھر گاڑی روکی تو وہ چاہتے ہوئے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار نا کرپائی تھی۔ اس نے مجید بھائی اور حبیبہ کو پک کیا تھا اور وہ ایک ریسٹورنٹ میں آ گئے تھے۔ صوفیہ کی ساری حسیات حبیبہ کی جانب متوجہ تھیں، جبکہ حبیبہ کی ساری توجہ، سارا دھیان کاشف پر تھا۔ اس نے بغیر آستینوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کا ٹراؤزر اس کے ٹخنوں سے کافی اونچا تھا۔ وہ جس انداز میں بیٹھی تھی اس انداز میں اس کی پنڈلی تک نگاہ پڑتی تھی۔ اس کے سلکی بال اس کے گداز بازوؤں اور پنڈلیوں سے بھی زیادہ دل موہ لینے والے لگ رہے تھے، جو وہ ہر جملے کے بعد لہرا لہرا کر اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کاشف کے کندھوں پر بکھرانے کی پوری کوشش کرتی تھی۔ صوفیہ کو اپنا آپ اس کے سامنے بے حد کمتر لگا۔ حبیبہ کسی بھی عورت کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے تمام تر لوازمات سے لیس تھی اور صوفیہ پہلے سے فربہ ہو چکی تھی۔ اس کی رنگت اس کی جسمانی

تبدیلیوں کے باعث مزید سنولا چکی تھی۔ اس کا دل بجھ کر رہ گیا اور وہ جیبہ کے سامنے مزید دبتی ہوئی لگنے لگی۔ ایسی حالت میں بھوک ہونے کے باوجود اس نے کچھ بھی کھانے سے انکار کر دیا تھا۔

"شکریہ۔۔۔ مجھے نہیں چاہیے" کھانے کا آرڈر دے دینے کے بعد اس طرح سے انکار کرنا مناسب نہیں لگتا تھا لیکن اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔ سارا کا سارا آرڈر کاشف اور جیبہ نے مل کر دیا تھا۔ ان کے انداز بتاتے تھے کہ یہ ہوٹلنگ کا ان کا پہلا تجربہ نہیں تھا۔ اس بات کا احساس بھی صوفیہ کا دل توڑنے کو کافی تھا کہ وہ اکثر اکٹھے باہر جاتے رہتے تھے۔ اس کے دو ٹوک انکار کے بعد کاشف نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا تھا کہ وہ تھوڑا سا سوپ لے لے لیکن اس نے پروا نہیں کی تھی اور کرسی پر پیچھے ہو کر بیٹھی رہی، مگر چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ برقرار رکھی تھی۔ اب اس قدر بھی بے ادب اور بدتمیز نہیں تھی وہ۔ اور پھر نجانے وہ میزبان تھی یا مہمان۔۔۔ وہ تو اس بات کا تعین کرنے میں بھی ناکام ہوئی جا رہی تھی۔ کھانے کے سب ہی آئٹم، یہاں تک کہ کولڈ ڈرنکس تک میں جیبہ کی ہی مرضی چلی تھی۔ ہر چیز اس نے منتخب کی تھی۔

"سوپ نہیں چاہیے تھا تمہیں۔۔۔ یہاں کا سوپ زبردست ہے؟" جیبہ نے حیران ہونے کی کچھ زیادہ ہی اداکاری کی اور منہ کھول کر کاشف کی طرف دیکھنے لگی کہ جیسے اس کی تائید سننا چاہتی ہو۔

"تم یہاں کا سوپ پسند نہیں کرتی۔۔۔ یہ چکن کریم اینڈ ساور ہے۔۔۔ تھوڑا سا لے کر دیکھو ان کا شیف بہت محنت سے بناتا ہے" اس نے اسی انداز میں اصرار کیا تھا۔ کاشف نے پھر اسے اشارہ کیا کہ لے لو لیکن وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اسے جیبہ کے ساتھ بیٹھ کر جیبہ کا آرڈر کیا ہوا کچھ بھی نہیں کھانا تھا۔

"یہ پرانز ٹرائی کرو۔۔۔ سی فوڈ میں ان کا کوئی ثانی نہیں۔۔۔ میں نے اور کاشف نے تو بہت بار کھائے ہیں یہاں سے۔۔۔ اس کے تو فیورٹ ہیں بلکہ یہ تو ان کا مارکیٹنگ منیجر لگتا ہے۔۔۔ ہر جگہ اس ریسٹورنٹ کے سی فوڈ کی پروموشن کرتا نہیں تھکتا۔" جیبہ نے اس کے آگے سے سوپ باؤل اٹھا کر پلیٹ کر دی تھی تاکہ وہ کچھ اور کھا سکے لیکن وہ پھر بھی ٹس سے مس نا ہوئی۔

"مجھے بھوک نہیں ہے جیبہ بھابھی۔۔۔ آپ لوگ کھائیں" اس نے ہونٹوں کو مزید پھیلاتے ہوئے کہا تھا۔ جیبہ نے کاشف کی جانب دیکھا جس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو چکی تھیں۔

"آپ کھائیں سیٹھ صاحب۔۔۔ اسے بھوک ہوگی تو خود ہی لے لے گی" اپنے پیالے میں سوپ انڈیلتے ہوئے اس نے قطعیت سے کہا۔ صوفیہ نے سیٹھ صاحب کے لفظ پر چونک کر کاشف کو دیکھا۔ اپنے دوست کی بیوی کو مخاطب کرنے کا یہ کون سا انداز تھا۔ جیبہ بھی اس انداز تخاطب کی عادی لگتی تھی۔ وہ کندھے اچکا کر اپنے پیالے کی جانب متوجہ ہو گئی تھی۔ صوفیہ کا منہ مزید پھول گیا۔

"کھانے کا وقت ہے بھابھی۔۔۔ اچھا نہیں لگتا کچھ تو لیجیے نا۔ ہم سب کھائیں اور آپ بند منہ لیے بیٹھی رہیں۔" مجید بھائی نے کاشف اور جیبہ کے برعکس ابھی تک کچھ کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ صوفیہ کو کبھی اس شخص کی منطق بھی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ اچھا بھلا سمجھ دار باہوش انسان تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی بیوی شعلہ و جوالہ بنی کسی دوسرے آدمی کی بانہوں کا ہار بننے کی بھرپور کوشش کرتی رہتی تھی، لیکن وہ بالکل بھی برا نہیں مناتا تھا بلکہ منہ میں تمباکو مسالے والا پان ڈال اپنے پیلے دانت نکال کر ہنستا رہتا اور اپنی قیامت سے ذرا سی کم بیوی کی ہاں میں ہاں ملاتا چلا جاتا۔ صوفیہ کو اس آدمی سے بھی چڑ ہوتی تھی۔ یہ اگر جدید زمانے کے اصول تھے تو بہت عجیب تھے۔ ان کے خاندان میں تو ایسے آدمی کو "بے غیرت" کہا جاتا تھا اور یہاں سب نے اس کا نام "مجید بھائی" رکھا ہوا تھا۔

"مجید بھائی بھوک نہیں ہے۔۔۔ آپ پلیز شروع کیجیے۔۔۔ میں میٹھا ٹرائی کروں گی آپ کے ساتھ۔۔۔" اس

نے انہیں بھی سہولت سے انکار کیا تھا لیکن بعد میں میٹھا کھانے کی ہامی بھرلی تھی۔ کاشف کے چہرے پر بدلتے رنگ اب اس کی خفگی کو ظاہر کرنے لگے تھے جس سے صوفیہ کافی گھبرائی تھی۔

"ہاں... کچھ لوگوں کو اس حالت میں میٹھا کھانے کی بہت رغبت محسوس ہوتی ہے" حبیبہ نے عام سے انداز میں کہا تھا لیکن صوفیہ کو لگا وہ اس پر طنز کر رہی ہے۔

"زیادہ میٹھا کھانا اچھی بات نہیں ہے صوفیہ... ابھی تم اتنی فربہ ہو رہی ہو... آخری دنوں میں تو بالکل غبارہ بن جاؤ گی... اس لیے احتیاط کیا کرو۔" صوفیہ کو اس کا مشورہ انتہائی برا لگا اور اب کی بار وہ اپنی ناپسندیدگی چھپا نہیں پائی تھی۔

"آپ میرے لیے پریشان نا ہوں بھابھی... میں اپنا خیال خود رکھ سکتی ہوں" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تھی۔ حبیبہ سوپ سے بھرا چمچہ منہ تک لے جا رہی تھی اس کے جواب پر اس کے چہرے کا رنگ بدلا تھا لیکن وہ کچھ بولی نہیں بلکہ مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ سرہلا کر سوپ پینے لگی تھی۔ صوفیہ کو کہہ دینے کے بعد احساس ہوا کہ اسے ایسے نہیں کہنا چاہیے۔

☆ ☆ ☆

میری زیست کے ابواب کا عنوان محبت
میں خود ہوں محبت، میرا ایمان محبت
تخصیص نہیں ہے کوئی تفریق نہیں ہے
قدرت نے بنائے ہیں سب انسان محبت
دل کی ویرانیوں نے مجھی ہنس کر یہ کہا ہے
صدقے تیرے تو آئی ہے مہمان محبت

"ایسا کیا آ گیا ہے اخبار میں" وہ بہت احترام اور محبت کے ساتھ ایک ایک مصرع دیکھ رہا تھا جب کانوں میں آواز سنائی دی۔ اس نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹائی اور پھر اسے تہ لگا کر اس رخ سے کاؤنٹر پر رکھا کہ اس کی نظریں اس صفحے پر پڑتی رہیں جہاں اس کی غزل چھپی تھی۔ ایک مشہور روزنامے کے ادبی ایڈیشن پر نوآموز شاعروں کے لیے مخصوص صفحے پر اس کی نظم چھپی تھی۔ وہ آج بہت خوش تھا۔ صبح سے ہی اس کی بتیسی اندر نہیں جا رہی تھی۔ گاہکوں کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ عذرا باجی تھیں جنہوں نے اسے ٹوکا تھا۔ اس کی دکان پر ان کا روز کا آنا تھا۔

"ہمارے یہاں اخبار میں کچھ نہیں آتا... بس جاتا ہی جاتا ہے" وہ مسکرا کر بولا۔ اس کا اشارہ اخبارات سے بنی ان چھوٹی تھیلیوں کی جانب تھا جن میں وہ مرچ مسالے بیچتا تھا۔

"لوگ اخبار لے جاتے ہیں اور نقدی دے جاتے ہیں... فائدے کی بات ہی ہے" وہ ہنس کر بولی تھیں۔ اچھی خوش مزاج عورت تھیں۔

"اچھا فرمائیے صبح صبح کیوں تشریف لائی ہیں... کیا پیش کروں آپ کی خدمت میں۔" وہ وہیل چیئر کو گھسیٹ کر پیچھے ہوا تھا۔ ڈبل روٹی کے پیکٹ پیچھے پڑے تھے۔ صبح صبح زیادہ تر لوگ ڈبل روٹی انڈوں کے چکر میں ہی آیا کرتے تھے۔ اس نے ایک پیکٹ اٹھا کر انہیں دینا چاہا۔

"میں ہلدی لینے آئی تھی... ڈبل روٹی نہیں چاہیے" انہوں نے انکار کر دیا تھا۔ سلیم نے حیرانی سے انہیں دیکھا پھر ہلدی والی تھیلے کی طرف جاتے ہوئے پوچھ لیا۔

"کیا کریں گی ہلدی کا؟" اس کا چہرہ عذرا باجی کی طرف نہیں تھا ورنہ اس سوال پر ان کے چہرے پر جو بے زاری چھائی تھی وہ فورا" دیکھ لیتا۔

"اس میں کچا دودھ ملاؤں گی.... پھر جو کا آٹا ڈالوں گی.... لیموں کے چند قطرے اور شہد ڈال کر مکس کروں گی اور پھر۔" وہ اتنا ہی بولی تھیں کہ سلیم ہلدی ڈال کر مڑا تھا۔ ان کی بات کاٹ کر بولا۔

"اب خدارا یہ مت کہیے گا کہ یہ سب منہ پر لگائیں گی" عذرا باجی نے فورا" نفی میں سرہلایا۔

"نہیں نہیں یہ کب کہہ رہی ہوں.... میں تو اس آمیزے کو پراٹھے پر لگا کر ساس کو کھلاؤں گی پھر وہ جب میرے سر پر کوئی چیز غصے سے دے ماریں گی تو جو زخم آئے گا نا باقی آمیزہ اس زخم پر لگالوں گی" وہ طنزیہ انداز میں بولی تھیں۔ سلیم ہنستا رہا۔

"خدا خیر کرے... ایسی تو نہیں ہوا کرتی تھی آپ... کہاں سے سیکھ لیا یہ سب۔"

"جب پتا ہے کہ ایسی نہیں ہوں میرے بھائی تو پوچھ کیوں رہے ہو... ہلدی ہے... ہانڈی میں ڈالوں گی۔" وہ چڑ کر بولی تھیں۔

"میں نے تو ایک سوال ہی کیا تھا... آپ غصہ ہی کر گئی ہیں... میں تو اس لیے پوچھ رہا تھا کہ ابھی تو ناشتے کا وقت ہے ابھی سے ہانڈی کا سامان؟" اس نے وضاحت کی تھی۔

"بس میرے بھائی... کیا بتاؤں اپنے دکھ کی داستان صبح صبح بڑی نند کا فون آیا ہے کہ کھانے کے وقت آئیں گی اور کڑھی کھانے کی فرمائش کی ہے... اس لیے سوچا کہ ابھی چڑھا دوں چولہے پر... گرمیوں کے دن ہیں... زیادہ دیر باورچی خانے میں نہیں کھڑا ہوا جاتا" انہیں بھی ہر بات بتانی ضروری ہوتی تھی سلیم کو... جیسے وہ ان کی بچپن کی سہیلی ہو۔

"آپ غریب عورتوں کے بھی کتنے مسئلے ہوتے ہیں نا... ہمہ وقت کھانا پکانے، کپڑے دھونے اور گھر چمکانے میں لگی رہتی ہیں" وہ انہیں چڑا رہا تھا۔

"اچھا تو تم کوئی امیر عورت ڈھونڈ لینا اپنے لیے... جس کے ساتھ یہ سب کام کرنے کے لیے دو ملازمائیں بھی آئیں... ہم تو غریب ہی اچھے" انہیں اس کی عادت کا پتا تھا اس لیے وہ برا نہیں مناتی تھیں۔

"ایسے نصیب کہاں اپنے جناب... ہمیں کہاں ملے گی ایسی مہارانی۔"

"کیا پتا مل ہی جائے... معجزے بھی دنیا میں ہی ہوتے ہیں" وہ کاؤنٹر سے ہٹتے ہوئے کہنا نہ بھولی تھیں۔ سلیم ہنسا۔

"کیوں کسی غریب کو اونچے اونچے خواب دکھا کر اس کا ایمان خراب کرتی ہیں... مجھے کہاں ملے گی ایسی کوئی مہارانی... میں تو غریب بھی ہوں اور کم پڑھا لکھا بھی" وہ مصنوعی انداز میں منہ لٹکا کر بولا۔

"اس کے علاوہ اللہ نے تمہیں شکل بھی واجبی سی دی ہوئی ہے... قد کاٹھ بھی اتنا ہی ہے کہ اچھے سے اچھا کپڑا پہن کر بھی سلیم پپا (کنستر) ہی لگتے ہو... باقی رہی سہی کسر اس بیساکھی نے پوری کردی... اور بتاؤ... صبح صبح کچھ اور کھری کھری سننی ہیں یا کافی ہیں اتنی؟" یہ آواز عذرا باجی کی نہیں تھی۔ سلیم اور عذرا باجی دونوں کے منہ سے قہقہہ ابلا تھا۔

"نیناں کی بچی... تمہیں اللہ پوچھے... کبھی کوئی اچھی بات بھی نکال لیا کرو منہ سے" وہ ہنستا ہوا بولا تھا۔ وہ بیگ کندھے پر لٹکائے یونیورسٹی جانے کے لیے نکلی تھی۔ عذرا باجی بھی اس کی بات پر ہنستی ہوئی اپنے گھر کی راہ ہولی تھیں۔

"یہ اچھی بات ہی تھی... اب سچ تمہیں کڑوا لگتا ہے تو ہم کیا کریں۔" وہ کاؤنٹر کے قریب آگئی تھی۔ سلیم نے

دلچسپی سے اس کا انداز دیکھا۔ اسے پتا تھا اس وقت اگر وہ آئی ہے تو ایک آدھ ببل گم کے علاوہ کچھ درکار نہ ہوگا۔ اس نے کہے بغیر ہی ببل گم نکال کر اس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھ دی تھی۔

"تم اتنی صبح کیوں جا رہی ہو۔ ابھی تو آٹھ ہی بجے ہیں" سیم کو پتا تھا اس کی مرضی نہیں ہوگی تو جواب بھی نہیں دے گی لیکن پھر بھی پوچھ لیا اور اس کا موڈ بھی کچھ اچھا تھا اس لیے رازداری سے بولی۔

"مجھے نئی ٹیوشن مل گئی ہے۔ اسٹری لڑکی کو میتھس اور انگلش پڑھانی ہے۔ صبح پہلے وہاں جاؤں گی۔ پھر وہاں سے یونیورسٹی۔" سیم نے ناگواری کے احساس تلے گھر کر کچھ کہنا چاہا پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ وہ برا بھی منا سکتی ہے لیکن اسے اس کی پروا تھی کہ بغیر رہا بھی نہیں جاتا تھا۔

"نینا ایسی کون سی مصیبت آن پڑی ہے کہ پڑھائی کے ساتھ یہ جھنجٹ بھی پال لیے ہیں۔ ایک آدھ ٹیوشن کی خیر تھی لیکن تم نے تو پورا اسکول ہی کھول لیا ہے۔ خالو کی دکان بھی اب تو ٹھیک چل رہی ہے۔ تمہیں کس چیز کی کمی ہے۔"

"مجھے تمہارے خالو کی ہی کمی ہے۔ اور بس اب مزید کوئی سوال نا کرنا۔" وہ مزے سے ببل منہ میں رکھ کر دائیں طرف مڑ گئی تھی۔ سیم اس کی پشت کی طرف دیکھتا رہا پھر کچھ یاد آیا تو چلا کر بولا۔

"شام کو گھر چکر لگانا۔ تمہیں کچھ دکھانا ہے۔"

"سوچوں گی۔" اس نے مڑ کر کندھے اچکاتے ہوئے کہا تھا۔

"اونہہ سوچوں گی۔ باقی سب کام جیسے سوچ سمجھ کر کرتی ہو" وہ اسی انداز میں بولا تھا۔ نینا دور ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اماں یہ کچھ روپے ہیں۔ رکھ لیجئے۔ سب کی تنخواہیں دینی ہیں۔ اپنے ہاتھ سے دے دیجئے گا سب کو اور عبدالرحیم کے ساتھ جا کر گروسری وغیرہ لے آیئے گا۔" اس نے آملیٹ کے ٹکڑے کو فورک میں پرویا تھا۔ اماں رضیہ نے احساس تفاخر میں گھر کر ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی اور ملازم موجود ہے یا نہیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ سارے ملازم بن لیں کہ سمیع صاحب انہیں کس درجہ عزت دیتے ہیں۔ ویسے تو سب ملازمین ہی جانتے تھے لیکن کبھی کبھی انہیں سب کے سامنے یہ جتا کر خوشی ہوتی تھی۔ اسی لیے انہوں نے روپے پکڑتے ہوئے کچن کی جانب منہ کر کے آواز لگائی۔

"رانی، صاحب کے لیے گرم چائے لاؤ جلدی" سمیع نے پلیٹ پر سے نظریں بھی نہیں ہٹائی تھیں۔ اماں رضیہ اس کے رغبت بھرے انداز کو بہت محبت سے دیکھ رہی تھیں انہیں یہ لڑکا بہت فرمانبردار اور معصوم لگتا تھا۔ وہ دیکھتی تھیں اس کی زندگی میں بیوی اور اس کے آفس کے علاوہ کوئی دوسری مصروفیت ہی نہیں تھی۔ شہرین کی یاد آتے ہی انہوں نے نادانستہ طور پر سیڑھیوں کی جانب دیکھا۔ شہرین بیڈ روم میں ہی تھی۔ معمول کے مطابق سمیع اکیلے ہی ناشتا کر رہا تھا۔ اس نے شہرین کو چائے، پانی، جوس پہنچانے کے متعلق کوئی حکم اب تک نہیں دیا تھا۔ رانی چائے رکھ کر چلی گئی تھی۔ اماں کو یاد آیا بے بی ایمن کو کل بخار رہا تھا اور سمیع نے اس کی خیریت بھی دریافت نہیں کی تھی۔ بیوی پر جان چھڑکنے والا بیٹی سے نجانے اتنا لاپروا کیوں تھا۔ انہوں نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ سمیع نے سر اٹھا کر سوالیہ انداز میں انہیں دیکھا۔

"وہ بیٹا... میں کچھ بات کرنا چاہ رہی تھی... اگر تم برا نا مناؤ تو..." انہوں نے ٹھہر ٹھہر کر کہا تھا۔ سمیع نے فورک پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔

"جی جی کہیے... خیریت... مزید روپے چاہئیں۔" اسے ان کے انداز سے یہی لگا کہ شاید اس نے تھوڑی رقم

دے دی ہے۔

"نہیں نہیں۔۔۔ روپے پیسے والا معاملہ نہیں ہے۔" اماں نے فوراً" نفی میں گردن ہلائی۔

"تو پھر۔۔۔؟" اس نے چائے کی پیالی اپنے سامنے کی۔

"بیٹا بہو سے کہو تھوڑی ذمہ داریاں بچی کی بھی دیکھ لیا کرے۔ وہ ننھی سی جان' ملازموں کے سر پر ہے۔۔۔ میری بوڑھی جان۔۔۔ اپنی جانب سے پورا خیال رکھتی ہوں' لیکن ماں کا نعم البدل تو نہیں ہو سکتی نا۔۔۔ اسے ماں کی ضرورت ہے۔" انہوں نے رک رک کر کہا تھا۔ سمیع کے چہرے کے تاثرات ایک لمحے میں سپاٹ ہو گئے۔ اس نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی اور پیچھے ہو کر بیٹھتے ہوئے چائے کپ کو مزید اپنی جانب گھسیٹا تھا۔

"دیکھیں اماں رضیہ! اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ بچے ماؤں کے پلوؤں سے باندھ کر پالے جائیں۔ بچوں میں اعتماد نہیں پیدا ہوتا اس طرح میں خود شہرین سے کہتا ہوں کہ ایڈجسٹ کرے خود کو ایمن کے ساتھ۔۔۔ اسی میں ایمن کی بھلائی ہے۔۔۔ میں ویسے بھی سال دو سال میں اسے بورڈنگ بھجوا دوں گا۔۔۔ تب تک آپ اچھی طرح سنبھال رہی ہیں۔ آپ پر پورا بھروسہ ہے مجھے۔۔۔ تب ہی تو آپ کو بلوایا ہے۔۔۔ آپ اچھی دیکھ ریکھ کر رہی ہیں۔ میں مطمئن ہوں۔"

وہ چائے کا سپ بھرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اماں نے پریشان سا ہو کر گردن ہلائی۔ وہ توقع کر رہی تھیں کہ سمیع ان کی بات کو سن کر اس پر غور کرے گا۔

"میں تو اس لیے کہہ رہی تھی کہ لڑکی کی ذات ہے ترستی ہے پیار کے لیے۔ وہ بات بھی نا مکمل کر سکیں۔" سمیع نے ہاتھ اٹھا کر انہیں بولنے سے روک دیا تھا۔

"آپ کو مشکل ہو رہی ہے اگر ایمن کو سنبھالنے میں تو آپ بتا دیں۔۔۔ میں ایک اور میڈ کا انتظام کر لیتا ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" اب کی بار اس کا لہجہ اس قدر دو ٹوک تھا کہ اماں گھبرا ہی گئیں۔

"نہیں نہیں بھئی۔۔۔ میں نے تو بس ایسے ہی کہہ دیا۔۔۔ تمہاری مرضی بیٹا تم زیادہ بہتر سمجھتے ہو" انہوں نے اس کی جانب دیکھے بنا کہا تھا۔ وہ خود اس کے پاس آکر کافی مطمئن تھیں۔ آخری عمر میں ایک مستقل ٹھکانہ مل جانا کس قدر آسودگی کا باعث تھا یہ کوئی ان کے دل سے پوچھتا۔ وہ سمیع یا شہرین کے ساتھ بگاڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ انہیں یہاں بہت سکون اور اس سے بھی بڑھ کر اتھارٹی میسر تھی۔

"جی۔۔۔" سمیع نے اسی سپاٹ انداز میں کہا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"شہرین سو رہی ہے۔ نیند کی دوا کھا کر سوئی تھی رات۔۔۔ خود نا اٹھے تو جگائیے گا مت۔۔۔ لیکن ایک دو گھنٹے بعد میڈ کو بھیج کر چیک کرواتی رہیے گا کہ اٹھ گئی ہے یا نہیں۔ جوس یا آملیٹ وغیرہ یا جو بھی وہ چاہے اس کے اٹھنے پر فریش بنوائیے گا" یہ آخری حکم تھا۔ وہ رسٹ واچ کا زاویہ درست کرتا ڈائننگ لاؤنج سے باہر کی جانب جانے کے لیے دروازے کی سمت بڑھ گیا۔ اماں رضیہ نے تاسف سے میز پر پڑے ان پیسوں کی جانب دیکھا پھر گہری سانس بھری۔

"واہ رے مولا۔۔۔ اس عمر میں ان چند ہزار کی خاطر کیا کیا سہنا پڑتا ہے۔۔۔ ہمیں بھی کوئی اتنا چاہنے والا ساتھی عطا کیا ہوتا تو ہم بھی یوں دوسروں کے در کی ٹھوکریں نا کھاتے پھرتے۔"

☆ ☆ ☆

"تم بہت بد تمیز اور جاہل عورت ہو۔ چار لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا بھی سلیقہ نہیں تمہیں۔۔۔ سخت شرمندہ کروایا ہے تم نے مجھے" کاشف سخت بپھرا ہوا تھا۔ واپسی کا سارا وقت اس نے مخاطب کرنا تو دور کی بات صوفیہ کی جانب

دیکھا تک نہیں تھا۔ وہ گھر کے اندر نہیں آیا تھا بلکہ اسے گیٹ پر ڈراپ کر کے کچھ کہے بنا چلا گیا تھا۔ یہ اس کی ناراضی کا سخت ترین اظہار تھا' صبح کے وقت اس کی واپسی ہوئی یا وہ رات کو ہی آ کر گیسٹ روم میں سو گیا تھا۔ صوفیہ کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ کمرے میں صبح کے وقت ہی آیا تھا۔ رات بہت دیر بے چین رہنے کے بعد صوفیہ دو گھنٹے نیند لے کر اٹھ چکی تھی۔ اس کی آنکھیں پھر سوجی ہوئی تھیں اور سر میں سخت درد تھا۔ کاشف کو دیکھ کر اس نے خود ہی بات کا آغاز کیا تھا تو وہ پھٹ پڑا تھا۔

"آئی ایم سوری...." وہ اس سے زیادہ کیا کہتی۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے صوفیہ.... تمہیں احساس بھی ہے کہ تم کیا کرتی ہو میرے احباب کے ساتھ گھر سے نکلی تو بھی بے زار تھیں وہاں جتنی دیر رہی تب بھی ناک چڑھا کر بیٹھی رہیں۔" اس نے کاشف کا یہ جارحانہ انداز پہلی دفعہ تو دیکھا نہیں تھا لیکن پھر بھی اسے دکھ ہوا۔ حبیبہ کے معاملے میں وہ ہمیشہ جذباتی ہو جایا کرتا تھا۔

"آپ ان کو ساتھ کیوں لے گئے تھے.... میں آپ کے ساتھ کھلی فضا میں کچھ وقت گزارنے کی خواہش لے کر گھر سے نکلی تھی اور آپ نے ان کو بھی گھسیٹ لیا.... حبیبہ اینڈ کمپنی کو.... گھٹن ہو رہی تھی مجھے اس عورت کی موجودگی میں.... زہر لگتی ہے مجھے وہ...." وہ اپنے آنسو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی تھی۔ اس کا دل نجانے اللہ نے اتنی نرم مٹی سے کیوں بنایا تھا۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ چیخ چیخ کر غرا غرا کر کاشف سے اس معاملے میں بات کرے لیکن چیخنے چلانے سے پہلے ہی آنسو آنکھوں سے ٹپک ٹپک کر اسے لاچار کر دیتے تھے۔

"مجھے تو لگتا ہے تمہیں کوئی ذہنی عارضہ لاحق ہو گیا ہے.... تمہیں ہر عورت زہر لگتی ہے'.... ہر عورت تمہیں خلجان میں مبتلا کر دیتی ہے ہر عورت سے چڑتی ہو تم.... بالخصوص وہ عورتیں جو شکل و صورت میں تم سے بہتر ہیں' ان کو دیکھ کر تو تم مرنے والی ہو جاتی ہو.... کتنی بار کہہ چکا ہوں کہ تم میری بیوی ہو.... تمہاری جگہ کوئی نہیں لے سکتا.... باقی سب چیزیں موسموں کی طرح آتی جاتی ہیں۔ کاروباری تعلقات میں مضبوطی قائم رکھنے کے لیے' پتا نہیں کیا کیا کرتے ہیں لوگ.... میں تو صرف کھانا ہی کھا رہا تھا لیکن تمہارا شک ہی ختم نہیں ہوتا.... ایسا کرو تم مجھے کسی ڈبے میں پیک کر کے اپنی الماری کے آخری خانے میں چھپا کر رکھ دو.... تمہاری جان کو بھی سکون ہو جائے گا اور میری جان کو بھی" وہ چڑ کر بولا تھا۔ صوفیہ نے کچھ نہیں کہا' کیونکہ آنسوؤں کی روانی اور شدت سے آواز حلق سے باہر ہی نہیں نکل رہی تھی۔ کاشف باتھ روم میں گھس گیا تھا۔

"زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے میری.... بی بی جان کو بھی سارے زمانے میں یہی ایک ملی تھیں میرے لیے.... ناشکل نا عقل۔" وہ بڑبڑا رہا تھا۔ اس کے ہر جملے کے ساتھ صوفیہ کی سسکیاں بڑھتی جاتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

وہ کافی اچھے مزاج کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اسے جو نئی ٹیوشن ملی تھی انہوں نے پہلے ہی دن ادائیگی کر دی تھی اسی لیے وہ خوش تھی' لیکن اس کی خوشی بس وقتی ہوتی تھی۔ امی لان کا نیا چھما چھما تا سوٹ پہنے' چادر اوڑھے تیار بیٹھی تھیں۔ زری کی تیاری بتا رہی تھی کہ وہ بھی ساتھ جا رہی ہے۔ اس کا سارا جوش غائب ہونے لگا۔ اس نے تو سوچا تھا آرام سے گھر جا کر پزا آرڈر کرے گی۔ زری سے چائے بنوائے گی اور پارٹی کرے گی لیکن امی اور زری کے ایک ساتھ کہیں جانے کا مطلب تھا کہ اب نا صرف اسے اکیلے رہنا تھا بلکہ شام کے وقت کے کام بھی اس کے ذمے تھے۔ گھر کے کاموں سے ویسے بھی اس کی جان جاتی تھی اس لیے اس نے ناک چڑھائی تھی۔

"بڑا کوئی مہربان دن تھا آج.... جو میرا انتظار ہو رہا تھا' جس طرح کا مزاج تھا' منہ سے فقرہ بھی ویسا ہی نکلا تھا۔ امی نے دھیان نہیں دیا تھا بلکہ اپنی چادر کو کر سر پر اوڑھتے ہوئے بولیں۔

"کھانا کھالینا۔۔۔ آلو قیمہ پکا ہے۔۔۔ لوکی کا کل رات والا سالن بھی پڑا ہے۔۔۔ صرف روٹی پکانی ہے اور اگر ابا آجائیں تو ان کی شام کی چائے بنا دینا۔۔۔ ہم زرینہ کی طرف جارہے ہیں۔ اس کی ساس کا پتا چلا تھا کافی بیمار ہیں۔۔۔ ارادہ تو یہی ہے کہ جلدی آجائیں گے لیکن اگر دیر ہوگئی تو رات کے لیے تھوڑے سے چاول ابال لینا اور اپنے ابا سے کھانے کا پوچھ لینا۔" امی اس کی جانب دیکھے بنا سب حکم صادر کرتی باہر نکل گئی تھیں۔ زری نے آئینے میں دوپٹا درست کرتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ تھکی ہوئی لگتی تھی۔ آٹھ بجے گھر سے نکلی تھی اور اب دو بج رہے تھے۔

"مارکیٹ جانے کا بھی ارادہ ہے۔۔۔ تمہیں کچھ چاہیے تو بتا دو" اس نے سیڑھیاں اترنے سے پہلے سوال کیا۔

نمینا نے اپنی مخصوص بدمزاجی سے پہلے اس کا چہرہ دیکھا پھر منہ بنا کر بولی۔

"جی نہیں شکریہ۔۔۔ مہربانی، نوازش تم ماں بیٹی کے بھی بیانات نہیں ملتے۔۔۔ امی کہہ رہی ہیں کہ آنٹی زرینہ کی طرف جارہی ہیں اور تم کہہ رہی ہو مارکیٹ جارہے ہیں" وہی سڑا ہوا انداز جیسے کسی نے پیسے مانگ لیے ہوں۔

زری کو اندازہ تو تھا ہی کہ وہ اسی قسم کا ہی جواب دے گی لیکن پھر بھی اس کی بات کا برا منا کر بولی۔

"روز روز نہیں نکلا جاتا۔۔۔ اتنی گرمی ہے اب جارہے ہیں تو کچھ ضروری کام بھی نبٹا آئیں گے۔" نمینا نے کچھ دیر سوچا۔ زری بھی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"اچھا سنو۔۔۔ میرے دو دوپٹے ہیں ڈائی کروانے والے۔ وہ ڈائی کروالانا اور ایک شرٹ کے ساتھ میچنگ ٹراؤزر لے آنا" اسے اپنا کام یاد آہی گیا تھا۔ زری نے فوراً" نفی میں گردن ہلائی "نہیں بھئی ایسے کام نہیں کوئی چھوٹا موٹا کام بتاؤ۔۔۔ کوئی کلپ لانا ہو یا کوئی نیل پالش۔۔۔ یا پھر کوئی لیس فیتہ وغیرہ ڈائی والے کے پاس تو رش بہت ہوگا ہمیں مغرب سے پہلے واپس بھی آنا ہے۔"

"تو پھر جاؤ۔۔۔ میرا دماغ کھانے کیوں کھڑی ہوگئیں۔ کام تو ایسے پوچھا تھا جیسے کر ہی آئیں گی محترمہ" مزاج پھر سوا نیزے پر پہنچ گیا تھا۔ زری بھی ناک چڑھا کر نیچے سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ اس نے بھی ہمیشہ کی طرح بیگ وہیں پھینکا اور دھپ دھپ کرتی کمرے میں گھس گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ ارادہ تھا کہ گھنٹہ بھر سوئے گی پھر اٹھ کر اطمینان سے چائے بنائے گی اور کھانا کھالے گی۔ لائٹ گئی ہوئی تھی۔ پنکھا یو پی ایس پر چل رہا تھا، لیکن اس کی رفتار بہت آہستہ تھی۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی، مگر نیند نہیں آئی تھی۔ امی کی غیر موجودگی میں اکثر ایسا ہو جاتا تھا۔ اسے نیند نہیں آیا کرتی تھی۔ اس نے کچھ دیر لیٹ کر نیند کے مہربان ہو جانے کا انتظار کیا تھا پھر سونے کا ارادہ ترک کرکے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ امی نے بتایا تھا کہ آلو قیمہ بنا ہے۔۔۔ اسے پسند بھی تھا لیکن روٹی بنانی تھی سو اس کا کھانا کھانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ نہیں تھا کہ اسے کام کرنے آتے نہیں تھے بوقت ضرورت سب کام کرلیتی تھی، لیکن بس من موجی انسان تھی دل چاہا تو کرلیا ورنہ، کسی کام کو ہاتھ نہیں لگاتی تھی۔ ایک روٹی بناتے وقت بھی جان جاتی تھی۔ اس نے چند لمحے سوچنے میں گزارے کہ وہ چائے کے ساتھ کیا کھا سکتی ہے پھر ذہن میں ایک خیال لپکا تھا۔ اٹھ کر کھڑکی کے پاس آئی اور نیچے جھانکنے لگی۔ اِدھر اُدھر دیکھا محلے کا کوئی بچہ، بڑا گزرتا دکھائی نا دیا تھا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد جب وہ کھڑکی کے سامنے سے ہٹنے کا سوچ رہی تھی، پڑوسیوں کا بارہ سالہ حمزہ باہر نکلا تھا۔

"حمزہ۔ حمزہ۔" اس نے بڑے دلار سے پکارا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر سوالیہ انداز میں اوپر دیکھا۔

"تم لوگوں کے گھر آج کیا پکا تھا؟"

"پتا نہیں۔" اس نے کندھے اچکا کر کہا تھا۔ نمینا نے گھور کر اسے دیکھا۔

"کیوں... کھانا نہیں کھایا تھا تم نے آج دوپہر کو۔"

"دوپہر کو کھایا تھا... اب تو شام ہو رہی ہے... مجھے تو بھول بھال بھی گیا" حمزہ نے معصومیت سے جواب دیا تھا۔ وہ کافی عجلت میں لگتا تھا لیکن نیناباجی سے ڈرتا بھی تھا۔ اس لیے مجبوراً" رکا ہوا تھا۔

"اتنی جلدی کیسے بھول گیا موٹو... تین روٹیاں جو تم روز کھاتے ہو اتنی جلدی بھولنے والی چیز نہیں ہوتیں... جلدی بتاؤ کیا پکایا تھا۔" اس نے غرا کر کہا تھا۔

"میں نہیں بتاؤں گا آپ تو ہمیشہ ڈانٹتی ہی رہتی ہیں۔" اس کا انداز اور تین روٹیوں کا تذکرہ سن کر اس نے صاف انکار کیا تھا۔

"کیا کہا... ذرا دوبارہ کہنا... نہیں بتاؤ گے؟ ٹھہر جاؤ ذرا ابھی جاتی ہوں تمہارے گھر اور تمہاری امی کو بتاتی ہوں کہ تم دوپہر کو چھت پر چڑھے پتنگیں اڑا رہے تھے بلکہ نہیں... آج رات کو آؤں گی جب تمہارے ابا بھی گھر ہوں گے۔ چل بیٹا حمزہ... تجھے تو آج کٹ (پٹائی) پڑوا کر ہی رہوں گی" اس نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے اسے ڈرایا تھا۔

"ہائے نیناباجی آپ کتنی جھوٹی ہیں... میں تو کئی دن سے چھت پر گیا ہی نہیں اور پتنگ کی تو اس سال شکل بھی نہیں دیکھی میں نے" وہ ذرا سا چڑ کر بولا تھا۔

"یہ بات تمہارے ابا کو تو نہیں پتا نا... تم دیکھتے جاؤ میں کرتی کیا ہوں تمہارے ساتھ ایسی کہانی بنا کر سناؤں گی تا کہ فورا" یقین کر لیں گے" وہ اسی انداز میں بولی تھی۔ حمزہ کچھ زیادہ گھبرا گیا۔ نیناباجی سے ایسی امید کی جا سکتی تھی۔ وہ اگر کہہ رہی تھی کہ وہ ابا سے پٹائی کروائے گی تو وہ کروا سکتی تھی۔

"نیناباجی... ایسے مت کہیں نا... میں نے کیا کیا ہے۔ مجھ سے کیوں ناراض ہو رہی ہیں آپ" حمزہ نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

"یہ ہوئی نا بات... چلو جلدی سے بتاؤ... کیا پکایا تھا آج تمہاری اماں نے۔" وہ اپنے تئیں اونٹ کو پہاڑ کے نیچے لے آئی تھی۔

"آلو گوبھی" حمزہ نے منہ لٹکا کر کہا تھا۔ نینا کے منہ کا زاویہ بھی بگڑ گیا۔ سارا اشتیاق چلچلاتی دھوپ میں رکھی برف کی مانند پگھلا تھا۔

"ہائے ہائے... میرے نصیب... غریب لوگ کبھی تو بریانی یا پلاؤ بھی بنا لیا کرو... سارا دن مسالاٹی وی دیکھتی ہیں تمہاری اماں... اور اتنا خوار ہونے کے بعد پکاتی ہیں وہی آلو گوبھی" اس نے تاسف سے بھرپور لہجہ میں کہا تھا۔ حمزہ برا مان گیا۔

"میں جاؤں کیا؟" وہ عاجز آ کر بولا تھا پھر اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ گیا تھا۔

"خبردار... واپس آؤ یہ سلیم کی دکان پر جاؤ اور اسے بولو باجی نینا کہہ رہی ہیں ایک جوس اور چپس کا بڑا والا پیکٹ دیں۔ وہ لے کر فورا" میرے گھر دے کر جاؤ... یاد رکھو نہیں دے کر گئے نا تو..." اس نے خرانٹ جادوگرنیوں کی طرح آنکھیں گھماتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔ حمزہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا پھر چاہتے ہوئے بھی بڑبڑاتا ہوا سلیم کی دکان پر چل دیا۔ نینا کھڑکی سے ہٹ گئی لیکن پانچ منٹ بعد ہی دوبارہ نیچے جھانکنے لگی تھی۔ حمزہ بھی اسی وقت آ گیا تھا۔

"نیناباجی... سلیم بھائی کہہ رہے ہیں... یہ دکان آپ کے سسر کی نہیں ہے۔" حمزہ نے بہت مزے لے کر بتایا تھا۔ نینا کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

"کیا... سلیم کے بچے کی اتنی جرات واپس جاؤ اور اسے کہو ایک منٹ کے اندر سب کچھ دے ورنہ اس کی خیر نہیں۔" وہ چلا کر بولی تھی پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔

"اچھا رکو... تم جاؤ اس سلیم کی گچی (گردن) تو میں مروڑتی ہوں آکر" اس نے کھا جانے والے انداز میں کہا پھر بیڈ پر پڑا دوپٹا گردن میں ڈالا اور تن فن کرتی کمرے سے نکلی تھی۔ لیکن فوراً" ہی بریک لگانے پڑے۔ ابا لاؤنج میں دیوان پر نیم دراز ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ اسے بالکل خبر نہیں ہوئی تھی وہ کب آئے تھے۔ دروازہ کھولنے کے لیے چونکہ سیڑھیاں اتر کر جانا پڑتا تھا اس لیے ان کے اور نمنا کے پاس دروازے کی چابی ہمیشہ ہی ہوتی تھی کیونکہ امی اور زری تو کبھی گھر سے نکلتے تھے۔ ان دونوں کو دکان اور یونیورسٹی جانا ہوتا تھا۔ اب امی تو موجود نہیں تھیں جن کے سامنے وہ ابا کو نظر انداز کر کے نجانے اپنی کون سی محرومیوں کے بدلے لیتی تھی' اس لیے اس نے ست سے انداز میں ابا کو سلام کیا تھا۔ انہوں نے جواب دیا تو وہ کچھ کہے بنا دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی سیڑھیوں کی جانب

بڑھنے لگی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو اس وقت؟" انہوں نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ وہ مڑی پھر سوچتے ہوئے بولی۔

"وہ میں ذرا... سلیم کی دکان سے چپس لینے اور جوس۔" آواز خود بخود پست ہو گئی۔ وہ کوئی بچی تو تھی نہیں جو یہ بات ٹھوس لہجے میں کہی جاتی۔ وہ پہلے بھی آرام سے اندر باہر آتی جاتی تھی' امی کو چھوٹے موٹے کام ہوتے تھے تو کر آیا کرتی تھی لیکن ابا کی موجودگی میں ان کی کوشش ہوتی تھی کہ وہی جائیں۔

"اچھا... رکو اس وقت کہاں جاؤ گی... میں لا دیتا ہوں۔" انہوں نے اسے واپس بلا لیا تھا۔ وہ بھی خاموشی سے کچھ کہے بنا پلٹ آئی۔ امی ہوتیں تو صاف جواب دے کر چلی جاتی لیکن ابا سے براہ راست جھگڑے کی ہمت نہیں تھی اس میں۔ اسی لیے ابا کو خاموشی سے سیڑھیاں اترتے دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"بی بی جان! آج مجھے کوئی نصیحت مت کیجئے گا... آپ کو نہیں پتا یہ عورت مجھے کتنا شرمندہ کرواتی ہے... میں اس کی دل جوئی کی خاطر جو بھی کروں یہ اپنے رویے سے میرا دل توڑ دیتی ہے... آپ بھی مجھے ہی ٹوکتی ہیں... اپنی لاڈلی بہو کو نہیں سمجھاتیں۔"

کاشف نے بی بی جان کی جواب طلبی پر اکتا کر کہا تھا۔ بی بی جان چند لمحے خاموش رہیں۔ ان کا ہر حساب کتاب غلط ہوا جا رہا تھا۔ محبت کرنے والی سلیقہ شعار بیوی بھی ان کے بیٹے کو اس کی آزادانہ روش ترک کرنے پر مجبور نہیں کر پا رہی تھی اور ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ اپنی غلطی کو غلطی سمجھتا ہی نہیں تھا۔ اسے بیوی کے ٹوکنے سے الجھن ہوتی تھی۔ وہ یہ سمجھنے کو تیار نہیں تھا کہ اس کی بیوی کو اس کی ان رنگین مزاج عادتوں سے کتنی چڑ ہوتی ہوگی۔

وہ دونوں کو باری باری سمجھا کر تھک چکی تھی لیکن دونوں ہی سمجھنے کو تیار نہیں تھے۔ صوفیہ سے انہیں کم شکایت تھی کیونکہ وہ دیکھتی تھیں صوفیہ بہت کچھ برداشت کر رہی تھی جو شاید ان کے خاندان کی کوئی لڑکی ہوتی تو نا سہ پاتی۔ انہوں نے یہی بات جب بیٹے کو سمجھانے کی کوشش کی تھی تو وہ اکتا کر بولا تھا۔

"میں کسی کو کوئی نصیحت نہیں کروں گی لیکن کاشف ایک بات یاد رکھنا... مکان آرام سے بن جاتے ہیں مگر گھر نہیں بنتے۔ تم لوگ چند دنوں بعد دو سے تین ہو جاؤ گے مکان گھر بن جائے گا لیکن یہی صورت حال رہی تو گھر کیسے بنے گا میرے بچے تم لوگوں کا رشتہ خالی مکان رہ جائے گا اور خالی مکان میں بدروحیں رہا کرتی ہیں۔ بیویاں نہیں... اپنی بیوی کو زندہ لاش مت بننے دو اس عورت کی قدر کرو... اسے محبت ہے تم سے تمہاری ماں کے بعد اگر واقعی کسی عورت کو تم سے محبت ہے نا تو وہ صوفیہ ہی ہے... باقی تو کھمبوں پر چسپاں فلموں کے اشتہار ہیں جنہیں شریف آدمی اس ڈر سے گردن اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا کہ کسی نے دیکھ لیا تو سبکی ہوگی..." بی بی جان نے اتنے واضح لفظوں میں بھی بیٹے کو نصیحت نہیں کی تھی۔ کاشف سر جھکائے بیٹھا رہا تھا۔

"اب تم دروازے کی اوٹ میں چھپ کر کھڑے ہو جاؤ۔۔۔ اور اپنے کانوں سے سن لو کہ میں اسے نصیحت کرتی ہوں یا نہیں" بی بی جان نے اپنے بیٹے کو اشارہ کیا تھا۔

اس کے بعد صوفیہ کی باری تھی لیکن بی بی جان کچھ پوچھتی یا کہتیں صوفیہ نے رونا شروع کر دیا تھا۔

"بی بی جان! میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں لیکن یہ سب میرے اختیار سے باہر ہے مجھے اس عورت کو دیکھتے ہی کچھ ہونا شروع ہو جاتا ہے میں نے جان بوجھ کر مس بی ہیو نہیں کیا اتنی بد تمیز بھی نہیں ہوں میں میری ماں نے میری تربیت اتنی بھی لاپروائی سے نہیں کی لیکن میں بے بس ہوں۔"

صوفیہ نے شرمندہ ہوتے ہوئے کہا تھا۔ بی بی جان کو اس پر ترس آیا۔

اس حالت میں جب شوہر کی ذمہ داری تھی کہ وہ اس کے ذہنی سکون کا خیال رکھتا۔ اس کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔۔۔ وہ آپس میں لڑ جھگڑ کر وقت گزار رہے تھے۔

"میں سب کچھ برداشت کر لوں گی بی بی جان۔۔۔ آپ کاشف سے کہیے وہ حبیبہ کو چھوڑ دیں۔۔۔ اس سے ملنا ترک کر دیں۔۔۔ ورنہ وہ کاشف کو مجھ سے چھین کر لے جائے گی۔۔۔ میں مر جاؤں گی بی بی جان میں کاشف کے بغیر نہیں رہ سکتی بی بی جان"

وہ ان کی آغوش میں منہ چھپائے بلک رہی تھی۔ بی بی جان کا دل چاہا اپنے بیٹے کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ رسید کریں۔ اسے "ہیرے" کی پہچان ہی نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا وقت ہے؟" شہرین نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"ایک بج رہا ہے بیٹی۔۔۔ سمیع میاں دوبار فون کر کے پوچھ چکے ہیں۔۔۔ میں نے سوچا میں خود دیکھ کر آؤں کہ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" اماں رضیہ نے وضاحت کی تھی۔ وہ خود سے جگانا تو نہیں چاہتی تھیں لیکن اپنے دل کا کیا کرتیں۔ ایک بج چکا تھا اور شہرین اب تک سو رہی تھی۔ وہ عموماً گیارہ بجے تک اٹھ جاتی تھی لیکن آج تو حد ہی ہو گئی تھی۔

"جی اماں طبیعت ٹھیک ہے۔ بس سر میں کچھ درد ہے۔ اس لیے بستر سے نہیں نکلی۔"

اس نے کسلمندی سے انگڑائی لیتے ہوئے جواب دیا۔ اس کا سر بہت بھاری ہو رہا تھا۔ اماں رضیہ نے کھڑکی کے پردے ہٹا کر روشنی کو کھلا راستہ دیا تھا۔ شہرین نے روشنی کی وجہ سے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ اماں اس کے بستر پر آ بیٹھیں۔ اس کی دمکتی رنگت کو کمرے میں آنے والی روشنی مزید دمکا رہی تھی۔ بھرے بھرے گلابی ہونٹ اور نیند کی وجہ سے گلابی دکھنے والی آنکھیں۔ بھورے بال اور تیکھی ناک۔۔۔ اماں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا پھر دل ہی دل میں اس کے حسن کو جی بھر کر سراہا تھا۔ اللہ نے حسن تو واقعی بیش بہا دیا تھا اس لڑکی کو۔۔۔ سمیع کو اگر اس اس کے علاوہ کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا تو اس میں اس کا قصور بھی نہیں تھا۔

"بیٹی اتنا سر کیوں درد کرتا رہتا ہے۔ کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔ ڈاکٹر سے ملو رپورٹ (ٹیسٹ) کرواؤ پتا تو چلے کہ کیا جڑ ہے اس سر درد کے مرض کی۔۔۔ یہ کوئی اچھی علامت تو نہیں ہے" وہ محبت سے بولی تھیں شہرین ان کے انداز پر مسکرائی۔

"بہت بار گئی ہوں ڈاکٹر کے پاس اماں۔۔۔"

"کیا کہتے ہیں ڈاکٹر۔۔۔" انہوں نے اس کے بستر کو درست کرتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کچھ بھی نہیں کہتے۔۔۔ ڈپریشن بتاتے ہیں۔۔۔ انگزائٹی" اس نے پپوٹے سہلائے تھے اور اٹھ بیٹھی تھی۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں۔)

سعدیہ عزیز آفریدی

قرض دار

آپا کے پاس کوئی ہنر نہیں تھا صرف جھوٹی سچی کہانیاں بنانے کے۔ ایک کردار دوسرے کردار سے جب چاہتا بات کرتا' جب چاہتا منہ توڑے ایک کونے میں پڑا رہتا۔ ان کے ٹیبل پر کاغذات ہمیشہ پھڑ پھڑاتے رہتے' وہ جب صفائی کرنے ان کے کمرے میں داخل ہوتی ۔ اسے لگتا ان کا ایک ایک کردار اچک اچک کر اس کے کام کرتے ہاتھوں کو دیکھا کرتا اور اسے کبھی کبھی لگا کرتا شاید اگر وہ ان کے کمرے کی صفائی میں کوئی آنا کانی کرتی تو یہ کردار اس کی شکایت آپا سے تب ضرور کرتے ہوں گے' جب وہ اپنے تکیے پر سر رکھتی ہوں گی۔

اچھل اچھل کے دن بھر ان کے انتظار کی داستان سناتے ہوں گے۔ شمو۔ اس گھر کا واحد زندہ کردار تھی۔ آپا نے گھر میں ایک فرد کی طرح لا' ڈالا تھا۔ اس کے ماں باپ نے آپا کے ہاتھوں اسے بیچ دیا تھا۔ مہینہ کے مہینہ' بس اس کی تنخواہ آکر لے جاتے۔ اسے کبھی کبھی دل کے کسی کونے میں درد محسوس ہوتا' لیکن آپا کی توجہ' اس درد کو کم سے کم کرتی چلی جاتی۔ وہ جب آئی تھی تو صرف آٹھ سال کی تھی اور اب 21 سال کی ہو چکی تھی۔ آپا ایک اسکول میں پرنسپل تھیں۔ ان کے کمرے میں کتابیں ہی کتابیں تھیں' جن کی آنکھیں ہر وقت آپا کے اپنی طرف بڑھتے ہاتھوں کو پڑھتی رہتی کہ کب وہ انہیں اٹھائیں کب۔ اور کب۔ آپا کا معمول تھا رات کو سونے سے پہلے کوئی نہ کوئی کتاب ضرور پڑھتیں اور شمو کا دل چاہتا کبھی تو آپا کا دل بھی چاہتا ہو گا کوئی تو انہیں بھی پڑھے' ان کے دل کے اندر بے تحاشا لفظ اٹکے تھے' بہت سے جذبے تھے' جنہیں انہوں نے کبھی زبان نہیں دی تھی وہ ایک خاموش کہانی کا سب سے بولتا کردار تھیں جن کے اندر کے لفظ پتا نہیں اسے بن کہے ہی معلوم ہو جاتے۔ انہیں کب کس وقت کیا چاہیے' کب ان کی آنکھ میں آنے والا آنسو کسی گرد سے آیا یا کب دکھ کی گرد کو انہوں نے کمرے میں موجود کھڑکی سے آنے والی گرد کے نام لگا دیا۔ اسے سب پتا ہوتا لیکن آپا خود سے کبھی کچھ نہیں کہتیں۔ اس دن بھی شاید وہ کچھ نہ کہتیں' لیکن ان کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ انہوں نے اپنے کمرے میں رکھی ہوئی گھنٹی بجا ہی دی۔ اور وہ جو گہری نیند میں تھی ایک دم سے بھاگ کر ان کے کمرے میں جا گھسی۔ آپا کی حالت اتنی خراب تھی' جیسے ان کے سارے لفظ نیلے ہو کر ان کے ہونٹوں پر پیڑی کی طرح جمنے لگے تھے۔ اس کے تو ہاتھ پاؤں ہی پھول گئے' لیکن آپا نے اس کی گھبراہٹ دیکھ کر جیسے اپنی تکلیف کو چھپا لیا۔ ساتھ والے فلیٹ کے رشید صاحب کو بلانے کا کہا۔ شمو کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ وہ آپا کو چھوڑ کر کہیں جائے' لیکن ان کے سانس کے بگڑے زیرو بم سے گھبرا کر اس نے اپنے فلیٹ سے نکل کر باہر رشید صاحب کا دروازہ کھٹکھٹا دیا۔ پھر رشید صاحب اور وہ مل کر انہیں اسپتال لے کر پہنچے۔ رشید صاحب ڈاکٹر سے گفتگو کر رہے تھے اور آپا اسے دیکھے جا رہی تھیں۔

"میرا خیال تھا تمہیں اپنے گھر کا کر کے جاؤں لیکن زندگی نے مہلت کم دی۔" شمو کی آنکھوں سے جیسے

آنسو خود بخود لڑھکتے لڑاتے باہر نکل آئے۔

"نہیں آپا آپ کو کچھ نہیں ہوگا۔"

آپا کے ہونٹوں پر ایک بیمار بچے جیسی مسکراہٹ تھی انہوں نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"مسٹر صفدر کی فلم لکھنے کے لیے جو ایڈوانس لیا تھا اس میں سے کچھ رقم کم ہے انمول آجائے تو اسے کہنا قبر میں دفن کرنے سے پہلے میرا یہ قرض ضرور چکا دے۔"

شمو انہیں دیکھتی رہی تھی پھر بے قراری سے ان کے چہرے پر آجانے والا پسینہ صاف کرتی ہے۔

"آپ کو اتنا کہا! ٹیسٹ کروالیں۔ آپ نے بھی نہیں مانی آپا! پھر یہ اتنے سارے پیسے کہاں خرچ؟"

آپا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ' پیدا ہونے کے درد سے گزرتی ہوئی ان کے ہونٹوں پر آگئی۔

"وہ ایک رائٹر صاحب۔ ان کی بیٹی کی شادی میں رقم کم پڑ رہی تھی۔ اس لیے مجھے یاد نہیں رہا۔" سانس بھر کے فاصلے کو سالوں میں ناپنا اچھی علامت نہیں ہے۔

شمو رونے لگی تھی اور آدھے گھنٹے کی مسافت کو بلند سانسوں سے ناپتے ہوئے آپا نے زندگی کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ شمو روئے جارہی تھی اور بس روئے جارہی تھی۔ اسے لگتا تھا ان کے کمرے کے اندر موجود ایک ایک چیز بھی ان کی طرح بس روئے جارہی ہوگی۔ آپا کو غسل دے کر ان کی ڈیڈ باڈی کو ان کے بھائی انمول جو کے انگلینڈ میں رہتا تھا کے انتظار میں برف میں رکھ دیا تھا۔

شمو' اسپتال کے باہر بنی فٹ پاتھ پر بیٹھی' انمول کا انتظار کررہی تھی۔ اسے لگتا تھا اس کے اندر سے آپا ہر چیز چھین کر لے گئی ہیں۔ وہ بالکل خالی ہے۔ بالکل خالی!۔

یہ تیسرا دن تھا جب ایک شخص بڑی سی گاڑی سے نکلا تھا۔ شمو نے انمول کو پہلی بار دیکھا تھا۔ اونچا لمبا قد چہرے سے رعب دار۔ شمو کو لگا پہاڑ کی طرح بلند انمول' آپا کی موت کے وقت کی ایک ایک تکلیف کو اپنے آنسوؤں سے دھودے گا' لیکن اس شخص نے ڈیڈ باڈی وصول کی اور قبرستان جاکر دفنادی۔ انمول

اور اس کی میم صاحب بیوی کی آنکھ میں ایک آنسو بھی نہیں آیا تھا۔ انمول کے چہرے پر ایسا اطمینان تھا۔ جیسے کوئی شخص ڈریم مانسٹر سے ڈر کر اٹھا ہو اور ایک دم کسی نے کہا ہو مونسٹر ختم ہو گیا۔ پاکستان آنا اسے اتنا ہی نفرت انگیز لگتا تھا لیکن اسے آپا کی وجہ سے ہر سال پاکستان آنا ہی پڑتا تھا اور یہ محبت کی وجہ سے نہیں تھا۔

یہ بات بھی شمو کو اس وقت پتا چلی جب وکیل صاحب نے آپا کی وصیت پڑھی۔ آپا کے ابا کا فلیٹ ان کے نام ہو گیا لیکن قرض کی خبر انمول پر بم کی طرح گری تھی۔

"اتنی بڑی رقم۔ وہ بھی کسی غیر کی شادی پر۔!"

میم صاحب نے شمو کے شربت کا گلاس ہاتھ سے پرے کیا تھا اور انمول کو گھورا تھا۔

"کتنا کہا تھا آپا! سجاول کے داخلے کے لیے دو لاکھ کم پڑ رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا اور اب یہاں پورے پانچ لاکھ اڑا دیے وہ بھی بے مقصد ایک غریب کی شادی میں۔"

انمول بیوی سے متفق تھا۔

"تو یہ لکھنے لکھانے والے لوگ آدھے پاگل ہوتے ہیں۔ ساری زندگی خیالی یوٹوپیا میں رہتے ہیں اور مرتے مرتے دوسروں پر اپنی نیکی کے پہاڑ گرا دیتے ہیں' چاہے وہ اس کے نیچے دب کر مر جائیں یا گھٹی گھٹی سانسیں لے کر اپنے مرنے کی الٹی گنتی گنیں۔"

میم صاحب یوں کھڑی ہو گئی جیسے اس نے وکیل کو محفل برخاست کرنے کا حکم دے دیا ہو۔ اور انمول کو گھورتے ہوئے۔

"فلیٹ کے بکنے سے جو رقم ملے اس میں سے میں ایک پیسہ فالتو نہیں اڑانے دوں گی۔"

انمول پسینے پسینے ہو گیا تھا لیکن اسے بھی لگتا تھا اپنے باپ کی جنت سے نکلنے اور پھر حادثاتی طور پر اس میں واپس لوٹ آنے پر یہ اس کا حق بنتا تھا کہ وہ آپا کی نیکی کے کسی خسارے کا حصہ نہ بنتا۔ شمو جائے نماز بچھا کر بس روئے جاتی تھی کہ کوئی اچانک آ جائے اور آپا کے اس قرض کو چکا دے تاکہ وہ جب اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑی ہوں تو سرخرو ہو کر کھڑی ہوں ان کا سر جھکے نہ ان کے کندھے جھکیں۔ اس نیکی کے بارے میں شمو کے ماں باپ دونوں اس پر دعوا دائر کرنے بھی آئے لیکن وہ گئی نہیں۔

"بہت سے ضروری کام ہیں ابھی نہیں آ سکتی۔"

ماں نے آنکھیں نکالیں۔ دنیاداری کے قصے سنائے آپا کے اٹھتے ہی اب اس کا یہاں رہنا ہزار ہزار کہانیوں کو جنم دے گا۔

"لوٹ کر تمہارے پاس ہی آنا ہے اماں مگر ابھی ضد مت کرو۔"

اس نے کمر موڑلی اور پھر یہ آپا کے جانے کے دس دن بعد کی بات تھی جب اشفاق میاں دھواں دھواں چہرے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تھے۔ انمول اور بیگم صاحبہ کہیں آؤٹنگ پر گئے ہوئے تھے۔ وہ جوس لے کر ان کے سامنے آئی تھی اور ایک کونے میں کارپٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ دکھ' جیسے نئے سرے سے سوانگ رچا کر اس کے چہرے کے ایک ایک مسام سے ٹپکنے لگا تھا۔ دکھ مرتا نہیں' یہ پرانا بھی نہیں ہوتا' بس منہ بند کر کے کسی نالائق بچے کی طرح دل کے ایک کونے میں جا بیٹھتا ہے۔ پھر کسی کا دکھ اپنے دکھ جیسا مشترک لگتا ہے تو آنکھ میں آنسو بن کر میلے میں گم بچے کی طرح رونے لگتا ہے۔ کبھی سسک سسک کر' کبھی دھاڑیں مار مار کر۔ شمو کی آنکھ میں وہ سسک سسک کر رونے بیٹھ گیا تھا۔ شمو نے اشفاق میاں کو دیکھا' ان کی آنکھ میں دکھ دھاڑیں مار مار کر رونے بیٹھ گیا تھا۔

"مینا مر گئیں۔ کیسے مر گئیں۔ اس دن میری بات ہوئی کہیں سے بھی نہیں لگتا تھا انہیں کوئی تکلیف ہے کوئی درد ہے۔"

شمو بس انہیں دیکھے جا رہی تھی اس سے بولا نہیں جا رہا تھا کہ وہ آپا کا قرض معاف کرنے کی بات کر پاتی۔ اس نے کئی مرتبہ اشفاق میاں کو دیکھا۔ اشفاق میاں جو مراقبہ میں تھے چونک کر جیسے خود سے بولے۔

"اتنا کہا میں نے دوسری شادی کوئی معیوب بات نہیں لیکن وہ عورت جنتی تھی۔ اس نے نایاب کے

حق میں کبھی اپنا حق نہیں جتایا۔"

شمو پر جیسے ایک نیا راز کھل رہا تھا۔

آپا کی خاموش محبت اس کے سامنے بیٹھی تھی لیکن اس محبت کی آنکھیں گیلی تھیں۔ شمو نے سانس بحال کی تھی۔

"آپا نے آپ کے دیے دو لاکھ کسی شادی میں۔"

اشفاق میاں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا تھا۔

"وہ جتنا مجھ پر حق رکھتی تھی۔ یہ دو لاکھ مٹی بھی نہیں۔ وہ سونا عورت تھی "اس کی خاموش محبت کے لیے میں ساری دولت بھی لٹا دیتا تو کم تھا۔ کبھی کچھ نہیں مانگا اس نے۔"

اشفاق میاں اب صوفے سے کھڑے ہو گئے تھے۔

شمو ان کی نظروں کے حصار میں تھی۔

"اگر اجازت دو تو میں آخری بار اس کا کمرہ دیکھ لوں؟" شمو انہیں آپا کے کمرے میں لے گئی وہ ایک ایک چیز کو دیکھ رہے تھے ان کی ٹیبل پر، پیپر ویٹ کے نیچے دبے کاغذ، کھڑکی سے آنے والی ہوا سے ابھی بھی پھڑپھڑا رہے تھے، جیسے کوئی جان کنی میں مبتلا مریض آخری بار اپنی زندگی کی ساری سانس کشید کرنے کی کوشش کرے۔ اشفاق میاں نے کاغذ کو یوں چھوا جیسے ان کے رخسار کو چھوا ہو پھر ان کے قلم کو اٹھا لیا تھا۔

"کاش اس قلم سے اس نے میری زندگی کے فیصلے پر ہاں لکھا ہوتا۔" ایک دم دروازہ دھڑ سے کھلا تھا۔

انمول حیرت سے دونوں کو دیکھ رہا تھا شمو گھبرا گئی تھی۔

"یہ اشفاق میاں جن کا قرض آپا پر واجب الادا ہے۔" انمول کے چہرے کی ساری شادابی اس تعارف نے ایک ہی سانس میں چوس لی تھی۔ انمول کے ساتھ ایک آدمی کھڑا تھا جس کے ساتھ دو ورکر بھی تھے۔

"آپ سامان دیکھ لیجیے ابھی مہمان ہیں کل کسی وقت آ کر یہ سامان کلیکٹ کر لینا۔" اشفاق میاں کی آنکھوں میں جان کنی پھیلی تھی۔

"یہ سامان۔ آپ سیل کر رہے ہیں؟" ان کے ایک جملے میں اتنا فاصلہ تھا جتنا برزخ اور آخرت کے درمیان ہو۔ انمول لاپرواہی سے انہیں دیکھنے لگا تھا۔

"مجھے انگلینڈ واپس جانا ہے فلیٹ سیل کر چکا ہوں اس لیے سامان کو کہیں نہ کہیں کھپانا تو ہے۔" اشفاق میاں کی آنکھوں میں محبت جیسے ایک دم فقیر بن کر آ بیٹھی تھی۔

"آپ اگر مجھ پر احسان کریں تو مینا کا یہ سارا سامان میں رکھ لوں؟" انمول نے اشفاق میاں کو ایسے دیکھا جیسے کوئی عقل مند کسی بے وقوف شخص کو دیکھتا ہے۔ اس نے کندھے اچکائے تھے۔

"مجھے تو سامان ضائع کرنا ہے، ختم کرنا ہے، آپ لے جانا چاہتے ہیں تو آپ لے جائیں۔" اشفاق میاں کے چہرے پر ایسی خوشی پھیل گئی تھی، جیسے کسی نے دونوں جہاں ہاتھ اٹھا کر انہیں دان کر دیئے ہوں۔ وہ جلدی جلدی فون کر رہے تھے پھر اپنا کام کر چکے تو انہوں نے انمول کو دیکھا تھا۔ "مینا کا سارا قرض میں معاف کرتا ہوں کیونکہ ان قیمتی چیزوں کو پا کر میں اس کا اتنا مقروض ہو چکا ہوں کہ میری دی گئی رقم ذرہ بھی نہیں رہی ہے۔" شمو نے اشفاق میاں کو دیکھا تھا۔ چند چیزیں اتنی قیمتی تھیں ان کے لیے کیونکہ یہ ان کی مینا کی یاد دلاتی تھیں اور انمول، اس کے لیے انہوں نے ساری زندگی بانٹ دی تھی کیا وہ ان کا قرض چکا سکتا تھا۔ وہ باہر گیٹ پر کھڑی تھی "اشفاق میاں بڑے سے ٹرک میں سامان رکھوا رہے تھے جب شمو انمول کے پاس آئی تھی۔

"اشفاق میاں تو قرض چکا گئے۔ صاحب آپ کو پتا چلا آپ کتنے قرض دار ہو۔" انمول نے اسے یوں گھورا جیسے اس کی بات دیوانے کے بڑ کے سوا کچھ نہیں تھی۔ شمو نے اشفاق میاں کو دیکھا تھا اور آنسو بھری آنکھوں سے پشت کر لی تھی۔ محبت اشفاق میاں کے دل کے ساتھ رخصت ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ ہی آنسو تھے جو ایک بہن یا بیٹی کو رخصت کرتے ہوئے آتے ہیں۔

☆ ☆

ناولٹ

یاسمین نشاط

وہ جیسے ہی تہمینہ کی گھر سے لوٹی برآمدے میں فقیہہ الدین کو بر آجمان دیکھ کر اس کا منہ کڑوا ہو گیا۔

"فروا!" وہ زور سے چلائی۔

"جی!" کچن کی کھڑکی سے اس کا سر برآمد ہوا۔

"میرے کمرے میں آؤ فوراً"۔ کہتے ساتھ ہی وہ سیڑھیاں چڑھ گئی۔ برآمدے سے پرے امی جان اپنے بیڈ روم کے دروازے میں کھڑی اسے دیکھتی رہیں۔ وہ جانتی تھیں فقیہہ الدین کی آمد اسے دنوں ڈسٹرب رکھے گی۔ لیکن ان کی بھی مجبوری تھی۔ وہ ہولے ہولے چلتی فروا کے پاس آئیں۔ وہ چائے کی پیالی ٹرے میں رکھے باقی لوازمات پلیٹوں میں نکال رہی تھی۔

"بہن کے پاس چلی جا۔ اسے کہنا خفا مت ہو، میری بیماری مجبوری بن گئی ہے۔ ابھی تو میں زندہ ہوں۔ مر گئی تو جیسا بھی ہے، تمہارا باپ ہے۔ سر پر ہاتھ تو رکھے گا۔" وہ فروا سے زیادہ شاید خود کو تسلی دے رہی تھیں۔

فروا نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

"آپ چائے پئیں گی؟" ٹرے اٹھاتے ہوئے اس نے پوچھا تو امی جان نے منع کر دیا۔ وہ برآمدے میں آ گئی۔

"تم چائے بناتی ہو یا پائے گلاتی ہو؟" وہ رشنا پانچ منٹ میں ایسی چائے بناتی ہے کہ گھنٹوں منہ میں سواد رہتا ہے اور ادھر چائے پکا پکا کر کالا پانی سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ مہینوں بعد آیا ہوں اور یہ سوکھی سڑی چائے منہ پر ماری جا رہی ہے۔ کرموں جلی! تمہیں اگر میں اتنا ہی ناپسند ہوں تو بلواتی کیوں ہو؟" وہ ہمیشہ کی طرح نان اسٹاپ شروع ہوئے تھے۔ فروا نے جلدی سے ٹرے تپائی پر رکھی اور بھاگ کر اوپر آ گئی۔ ندا منڈیر کے پاس کھڑی اڑتی پتنگوں کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا بات ہے ندا؟" وہ اس کے قریب آکر بولی تو ندا کی محویت ٹوٹی لیکن اس نے رخ نہیں موڑا۔

"ابا کے آنے سے خفا ہو؟" وہ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"ابا مت کہو اس شخص کو، مجھے اس رشتے کی توہین محسوس ہوتی ہے۔" وہ کڑواہٹ سے بولی۔ فروا نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑا اور چارپائی پر بٹھا دیا۔ اور خود بھی ساتھ بیٹھ گئی۔ ندا یونہی ڈولتی پتنگوں کو دیکھتی رہی۔ اسے اپنا آپ بھی کسی پتنگ کی طرح لگتا تھا۔ اس کی سلامتی بھی پتنگ کی طرح تھی۔ جب ڈور کٹی۔ وہ نیچے آ گرتی۔ اسے لگتا امی جان ان کا آسمان ہیں اور وہ ہی ان کی ڈور بھی ان دونوں کا وجود امی جان کے دم خم سے قائم تھا۔

"فروا امی جان ٹھیک تو ہو جائیں گی ناں؟" اس نے بڑی آس اور امید سے چھوٹی بہن سے پوچھا تھا۔

"اللہ کرے گا۔ وہ جانتا ہے نا، ہم امی جان کے بغیر کچھ بھی نہیں تم فکر مت کرو۔ دعا کرو۔" فروا چھوٹی تھی لیکن سمجھ دار بھی اور اکثر وہ ہی بڑی بہن کو سمجھایا بھی کرتی اور بہلایا بھی کرتی۔ ندا کی پریشانی کم نہ ہوئی تھی۔

"یہ جو شخص نیچے آیا بیٹھا ہے نا۔ یہ امی جان کی

بیماری کم نہیں کرنے گا بلکہ اپنی تکلیف دہ حرکتوں سے اور بڑھائے گا۔ اور اس کی موجودگی میں تو وہ ٹھیک نہیں ہونے والی۔ تم امی جان سے کہو۔ اسے واپس بھیج دیں۔ ہمیں کسی کی ضرورت نہیں۔" ندا کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ وہ اس شخص کو برداشت کرنے کا حوصلہ رکھتی ہی نہ تھی۔ وہ اس کا باپ تھا۔ صرف برتھ سرٹیفکیٹ کے خانے میں۔ ورنہ وہ تینوں تو کب کا اس شخص کو اپنی زندگی سے نکال چکی تھیں۔ فروا نے اسے بہلایا۔

"کہہ دیں گی۔ امی جان جانتی ہیں کہ تم ان کی وجہ سے ڈسٹرب ہوتی ہو۔"

"کیا تم نہیں ہوتیں؟" اس نے فروا کی بات کاٹ کر پوچھا تھا۔

"یہ سارا گھر ڈسٹرب ہوتا ہے ندا۔ لیکن ہمیں امی جان کی بات کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ وہ بھی اپنی جگہ درست ہیں۔ نام کا ہی سہی رشتہ تو ہے نا۔ اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ تم زیادہ ٹینشن مت لو۔ وہ خود ہی ایک دو دن میں واپس چلے جائیں گے۔ انہیں

بھی رشنا بیگم کے بنا کہاں چین ہے۔ میں تو حیران ہوں کہ آخر اس عورت نے کیا گھول کر پلا دیا ہے 'جو یہ ان کو چھوڑ ہی نہیں رہے۔" فروا کی آنکھوں کی اداسیاں اس کے لہجے میں گھل گئیں تو وہ خاموش ہو گئی۔

"اس عورت کو قصور وار ٹھہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ خود کیا اتنے کمزور تھے کہ اپنے رشتوں کو بھلا کر اس عورت کے گھٹنے سے لگ کر جا بیٹھے۔ انہیں شرم تک نہیں آئی۔ رشتوں کو پامال کرتے ہوئے۔" ندا کے لہجے میں نفرتیں ہی نفرتیں تھیں۔

"میں تو یہ سوچتی ہوں امی جان کو واپس آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ وہیں رہتیں۔ اس شخص کے پلّے تو نہ بندھنا پڑتا۔" فروا کی آنکھوں میں پھر ملال اترا تھا۔

"چلو نیچے چلیں۔ کچھ کھانے کا کریں ورنہ پھر اس شخص کا پارہ چڑھا تو سارا محلہ سنے گا۔" ندا نے کہا تو دونوں اٹھ کر نیچے آگئیں۔ فقیہہ الدین برآمدے سے ٹی وی لاؤنج میں منتقل ہو چکے تھے اور اپنا فیورٹ چینل لگائے محو تھے۔ امی جان مغرب کی نماز کی تیاری کر رہی تھیں۔ فروا بھی وضو کرنے چلی گئی۔ جبکہ ندا کچن میں آ گئی۔

"ندا نماز پڑھ لینا!" امی نے اسے کچن میں گھستے دیکھ کر آواز لگائی تھی جسے وہ ان سنی کر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

زندگی اتنی بھی خوب صورت ہو سکتی ہے اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ وہ دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اور لاڈلی بھی۔ اماں ' ابا ' بھائی سب ہی تو اس کی خواہشیں پوری کرنے میں لگے رہتے۔ وہ تھی بھی تو کسی کانچ کی گڑیا جیسی۔ جو دیکھتا بے ساختہ پیار کرنے کو مچل جاتا۔ آج تک اس کی ہر خواہش پوری ہوئی تھی۔ جس چیز پر اس نے نظر ڈالی۔ زبان ہلانے سے پہلے اس کی دسترس میں آجاتی۔ لیکن اس قدر محبت اور توجہ نے بھی اس کا دماغ خراب نہیں کیا تھا۔ وہ جہاں جاتی اپنے اطوار ' اپنی گفتگو سے سب کا دل موہ لیتی۔ بڑی ہوئی وہ ایک آئیڈیل پیکر میں ڈھل گئی۔ ہر کوئی اسے

اپنی بہو ' بھابھی بنانے کا خواہاں تھا۔ ابا نے رائے پوچھی۔ وہ چپ کر گئی۔

"اگر تو کسی کو پسند کرتی ہے تو بھی بتا دے۔ ہم تیری مرضی کے خلاف نہیں جائیں گے۔" اماں نے اسے ٹٹولا تھا۔

"نہیں اماں ایسی کوئی بات نہیں لیکن ....." وہ کچھ بولتے بولتے چپ کر گئی۔ تصور میں کوئی تھا تو سہی لیکن کس حد تک یہ وہ نہ جان پائی تھی۔

"لیکن کیا' بیٹا جو دل میں ہے کھل کر کہو۔ تمہارے ابا نے مجھے اسی لیے تمہارے پاس بھیجا ہے کہ اگر تمہاری اپنی کوئی پسند ہے تو بتا دو۔"

"اماں پسند نہیں۔ لیکن میں۔ میرا مطلب ہے۔ وہ جو نادرہ پھوپھو کے بیٹے ہیں نا شہریار.... وہ بس اچھے لگتے ہیں۔" اس نے جھجکتے ہوئے بتایا تھا۔ نادرہ پھوپھو درحقیقت ابا میاں کی پھوپھو تھیں 'لیکن وہ سب بھی انہیں پھوپھو ہی کہا کرتے تھے۔

"شہریار! لیکن ان کی طرف سے ایسا کوئی اشارہ نہیں۔ شاید اس لیے کہ وہ رشتے میں تمہارے چچا لگتے ہیں۔" اماں سوچ میں پڑ گئی تھیں۔

"سگے تو نہیں۔" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"میں تمہارے ابا سے کہتی ہوں۔ وہ پھوپھو سے بات کر دیکھیں۔" اماں اٹھ گئیں لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ نادرہ پھوپھو خود سوالی بن کر چلی آئیں کہ 'شہریار خود زرش کو پسند کرتے تھے اور بہت پہلے ماں کو اپنی پسند سے آگاہ بھی کر چکے تھے اور نادرہ بیگم 'زرش کی تعلیم مکمل ہونے کے انتظار میں تھیں۔

اماں نے ابا کو زرش کی پسند کے بارے میں بتا دیا تھا۔ یوں نہایت خوش اسلوبی سے یہ رشتہ طے پا گیا۔ اور شہریار چونکہ تین سال کے لیے کمپنی کی طرف سے انگلینڈ جا رہے تھے اس لیے آنا" فانا" ان دونوں کا نکاح ہوا 'اور یوں شہریار نے تین ماہ بعد زرش کو بھی اپنے پاس بلا لیا۔

زندگی ایک دم ہی بے حد حسین ہو گئی تھی۔ شہریار

بہت زیادہ کیئرنگ اور لونگ تھے۔ زرش کا اس طرح خیال رکھتے جیسے وہ کوئی کانچ کی گڑیا ہو۔ ان کی زندگی میں کسی فکر یا پریشانی کا گزر نہیں تھا۔ زرش ہر نماز کے بعد اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی کہ اس نے ایک بہترین انسان کی ہمراہی اسے بخشی تھی اور جس دن ننھی حوریہ نے ان کی زندگی میں قدم رکھا وہ دونوں سرشار ہو گئے۔ حوریہ بھی ماں کا پرتو تھی۔ گوری چٹی' شہریار کی بھرپور توجہ کا مرکز بن گئی تھی وہ۔

☼ ☼ ☼

"یہ کھانا پکا ہے؟" فقیہہ الدین نے ٹرے اٹھا کر پھینکی جو سامنے دیوار سے ٹکراتے ہوئے زمین بوس ہو گئی سالن' چپاتیاں' سلاد ادھر ادھر بکھر گئے' شیشے کا گلاس چکنا چور ہو گیا۔ فروا نے کچن کی کھڑکی سے سب دیکھا پھر خاموشی سے آکر سمیٹنے لگی۔ اندر بیٹھی امی جان کی آنکھیں لبریز ہو گئیں۔ کتنے سال بیت گئے تھے لیکن اس شخص کے رویے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ جانے کیسی نفرت تھی اس کے من کے اندر جو کسی طور نکلتی ہی نہیں تھی۔ ابا کا فرمان شروع ہو گیا۔

"تم دونوں بھی اپنی ماں کی طرح نکمیاں ہو۔ سارا دن ٹیلی ویژن پر انڈین ڈرامے دیکھ لیے اور بس اور وہ دوسری ہے جسے سارا دن آوارگیوں سے ہی فرصت نہیں۔ میں نے کہا کرموں جلی! کچھ خبر بھی ہے کہ تمہاری نوجوان بیٹی یہ فیشنی کپڑے اور میک اپ سے لد کر جاتی کہاں ہے؟" پر کیوں! تم کیوں خبر رکھنے لگیں تمہیں تو خود سارا دن سوائے اپنے دکھڑے رونے کے فرصت نہیں۔ تم کیا کرو گی بیٹیوں کی تربیت؟ دو فرنگیوں کے حوالے کر آئیں' دو یہاں چھوڑ دیں اپنی آوارگیوں کا بازار سجانے کے لیے۔ میں باز آیا یہاں رہنے سے۔ جا رہا ہوں میں اور اب تم مر بھی جاؤ تو مجھے مت پکارنا۔ یہ قدر ہوتی ہے تمہارے یہاں میری۔ مہینوں بعد آؤ تو بھی کسی کا منہ سیدھا نہیں ہوتا کوئی کھانے تک کو نہیں پوچھتا۔" بولتے بولتے ہی فقیہہ الدین نے اپنا سامان سمیٹا تھا اور چوکھٹ کے ساتھ سہمی کھڑی ندا اور فرش پر سے برتن سمیٹتی سمیٹتی رک جانے والی فروا' دونوں پر قہر آلود نظریں ڈالتے وہ دھاڑ سے دروازہ کھولتے نکلتے چلے گئے تھے۔

امی جان کی دبی سسکیاں لبوں کو توڑ کر آزاد ہوئی تھیں۔ ندا لبریز آنکھوں کو دونوں ہتھیلیوں سے رگڑنے لگی تھی اور فروا سوچ رہی تھی کاش نفرت ناپنے کا کوئی پیمانہ ہوتا تو' وہ فقیہہ الدین کو بتاتی کہ وہ اس سے کئی گنا نفرت کرتی ہے۔

فقیہہ الدین کے جانے کے بعد شام تک گھر میں افسردگی چھائی رہی۔ کسی نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ امی جان بھی چادر اوڑھے لیٹی رہی تھیں۔ فروا اپنی کتابیں کھول کر بیٹھ گئی تھی اور ندا کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو رہا تھا' سو ایسے میں وہ ہمیشہ کھلے آسمان کے تلے آجایا کرتی۔ شام پھیل رہی تھی۔ دور افق میں ڈوبتے سورج نے ماحول کی اداسی اور خاموشی سوا کر دی تھی۔ آج پرندے بھی سر شام ہی گھروں کو لوٹ گئے تھے کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ بلا مقصد منڈیر سے نیچے گلی میں جھانکنے لگی۔ گلی میں کرکٹ کھیلنے والے بچے اب اپنے کھیل کا اختتام کیے اپنے گھروں کی طرف جا رہے تھے ہر بات' ہر کام کا اختتام ہوتا ہے پھر ان کی تکلیفوں' دکھوں کا اختتام کیوں نہیں ہو رہا؟" اس نے بے اختیار سوچا تھا۔ کیسی بے مقصد زندگی تھی ان لوگوں کی۔ غموں اور دکھوں سے بھرپور۔ اور جو بھی وہ ماں بیٹیاں ان غموں کو بھلا کر ہنسنا چاہتیں تو فقیہہ الدین کو جانے کیسے خبر ہو جاتی۔ وہ ان کی ہنسی کو ملیامیٹ کرنے چلے آتے۔

☼ ☼ ☼

حوریہ کے بعد زارا اس دنیا میں آئی اور پھر معید۔ ان کی فیملی مکمل ہو گئی۔ معید کی دفعہ تو وہ بہت کمزور تھی اور پھر کچھ پیچیدگیاں ایسی تھیں کہ سی سیکشن کرنا پڑا۔ وہ ہسپتال سے گھر آئی تو شہریار نے کانوں کو ہاتھ لگا لیے۔

"بس بھئی مجھے اور بچے نہیں چاہئیں۔ تمہاری حالت دیکھ کر تو میں ڈر ہی گیا تھا۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو بھی یہ بچے میں کیسے سنبھال پاتا۔" شہریار کے لہجے میں محبت تھی۔

"بس ان بچوں کے لیے!" وہ کبیدہ خاطر ہوئی تھی۔

"ہاں تو۔ اب ہماری دنیا تو یہ بچے ہی ہیں۔" شہریار نے شرارت سے اسے دیکھا تھا۔ وہ رونے کو تیار تھی۔

یعنی میں کچھ نہیں....؟" شہریار نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی چوم لی۔

"پگلی ہم سب ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ میں، تم.... یہ بچے۔ مل کر ہی تو فیملی بنتے ہیں۔ اور یہ سب میں نے نہیں اماں جان نے کہلا بھیجا ہے۔ انہیں اپنی بہو کی زندگی عزیز ہے، وہ تم سے پیار بھی تو بہت کرتی ہیں۔" شہریار نے رسان سے کہا تو وہ مسکرا دی۔

"اس میں کوئی شک نہیں پھوپھو واقعی مجھے ماں کی طرح چاہتی ہیں اور شہریار میرے دل میں بھی ان کے لیے بہت عزت اور احترام ہے۔"

"ہاں جانتا ہوں، تبھی تو تم ساس کو زیادہ اور ماں کو کم فون کرتی ہو۔ بھابھی کا یہ شکووں بھرا فون آیا تھا کہ تم اپنی خیر خیریت کی اطلاع بھی مہینوں بعد دیتی ہو اور بھائی جان الگ خفا ہو رہے تھے۔" شہریار نے ننھے معید کو پیار کرتے ہوئے زرش کے پہلو میں لیٹی اپنی دونوں بیٹیوں کو بھی محبت پاش نظروں سے دیکھا اور ساتھ میں اپنی ساس سے ہونے والی شکووں شکایتوں سے بھرپور گفتگو کا لب لباب زرش کو سنایا۔

وہ امی اور ابا کی محبتوں سے واقف تھی وہ جانتی تھی وہ اسے بہت یاد کرتے تھے۔ لیکن وہ جان بوجھ کر انہیں مہینوں فون نہیں کرتی تھی۔ وہ جو پل بھر ان سے دور نہیں رہی تھی اب تین سالوں سے انہیں دیکھ تک نہ پائی تھی اور جس دن اس کی اماں سے یا ابا سے بات ہوتی وہ پہروں چھپ چھپ کر روتی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کے آنسو شہریار دیکھیں سو مضبوطی کا خول چڑھائے وہ شہریار کی زبانی ہی ان کی خیریت معلوم کر کے دل کو تسلی دے لیا کرتی۔

حوریہ اب دو سال کی ہو گئی تھی اور تتلا کر باتیں کرنے لگی تھی جبکہ زارا اور معید تو نوماہ کا فرق ہونے کے باوجود جڑواں ہی لگتے تھے۔ معید تو خیر ویسے ہی ویک تھا۔ زارا کی صحت بھی کچھ خاص نہیں تھی کھانے پینے کے معاملے میں وہ دونوں ہی ایسے تنگ کرتی تھیں۔ تین ننھے بچوں کو سنبھالنا پھر گھر کا سارا کام وہ تھک جاتی اور رات کو جب بستر پر لیٹتی تو بدن پھوڑے کی مانند دکھ رہا ہوتا۔ میڈ ہفتے میں ایک بار آکر صفائی کر جاتی پھر بھی روز کا بکھراوا اس قدر ہوتا کہ وہ ہلکان ہو جاتی۔ ایسے میں شہریار کی محبت اسے پھر سے تازہ دم کر دیتی اور وہ اگلے دن کے لیے تیار ہو جاتی ،لیکن دل ہی دل میں وہ واپس پاکستان جانے کے دن گن رہی تھی لیکن شہریار کی کمپنی نے مزید دو سال بڑھا دیے۔

"شہریار نہیں!" وہ بے بسی سے یہ خبر سن کر چلائی تھی۔

شہریار نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ اسے شاید اس ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

"کیا ہوا تمہیں خوشی نہیں ہوئی؟"

"میں تو شہریار واپس جانے کے دن گن رہی ہوں دو مہینے دس دن.... اوہ نو.... مزید دو سال.... میں کیسے مینیج کر رہی ہوں آپ کو نہیں پتا۔ سارا دن اکیلی ان تین بچوں کو سنبھالتی ہوں ایک کو بھوک، ایک کو پیاس ،ایک کو واش روم.... اور ابھی بیٹھتی بھی نہیں کہ کام وہیں سے پھر اسٹارٹ ہو جاتا ہے۔ سچ پاکستان میں بڑی سہولتیں ہیں۔ ملازمائیں مل جاتی ہیں۔ پھر نانی، دادی ہوتی ہیں بچوں کا خیال رکھنے کے لیے۔ ایک ماں کو اتنا ہلکان نہیں ہونا پڑتا اور شہریار یہ تو جڑواں بچوں والا حال ہے۔ حوریہ بڑی ہے لیکن تنگ کرنے میں ان دونوں سے آگے، سارا دن مجھے فکر رہتی ہے، کہیں کچھ اٹھا کے منہ میں نہ ڈال لے۔ سیڑھیوں سے نہ گر جائے ،کسی سوئچ بورڈ کو ہاتھ نہ لگا دے۔ کچن میں نہ چلی جائے۔ سچ میں، میں بہت اپ سیٹ ہو رہی ہوں۔"

شہریار اس کی پریشانیوں کی لمبی لسٹ سن کر ہنسنے لگا۔ زرش نے غصے سے دیکھا تو وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔

"یہ تو واقعی پریشان کن حالات و واقعات ہیں۔ تم ایسا کرو پاکستان چلی جاؤ۔ کچھ عرصہ کے لیے نانیاں دادیاں تمہیں بچے پالنا اور سنبھالنا خوب سکھا دیں گی۔" شہریار کی بات سن کر اس کا چہرہ کھل اٹھا لیکن اگلے ہی پل وہ بجھ سی گئی۔ "میں چلی گئی تو آپ کیا کریں گے۔ اکیلے اکیلے رہیں گے؟"

"ارے بھئی میں تو شکر کروں گا۔ کچھ دن آزادی کی سانس لوں گا۔ مزے سے زندگی گزاروں گا۔" وہ پھر ہنسنے لگا۔

"شہریار...!" اب کہ وہ بھی ہنس دی تھی اور شہریار اگلے ہی دن اسے واپس بھجوانے کی تیاریوں میں لگ گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"زندگی... جیسے سزا نہیں ہوتی' ویسے کاٹ رہے ہیں ہم" ندا نے نبیہہ سے اپنے دل کا حال کہا تھا' نبیہہ نے اسے ہمدردی سے دیکھا۔ وہ اس کی بے حد مخلص دوست تھی ہر اچھے برے وقت میں کام آنے والی اور وہ حقیقتاً" اس سے پیار بھی کرتی تھی اور اسے پیار کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ وہ اس کے راج دلارے بھائی کی پسند بھی تھی اور یہ بات بکر بھائی نے کچھ روز قبل اسے خود سنائی تھی' جسے سن کر وہ اچھل پڑی تھی۔

"کیا واقعی... مگر کس حد تک آپ اس سے فلرٹ وغیرہ تو کرنا نہیں چاہ رہے۔ تو نہیں اور سہی' اور سہی' اور سہی؟" اس نے مشکوک نظروں سے بھائی کو دیکھا تھا۔ بکر نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"جوان بہن کا بھائی ہوں۔ کسی کی عزت اچھالنے کا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں۔ میں اسے بچپن سے پسند کرتا ہوں۔ تمہیں یاد ہے نا جب آٹھویں کلاس میں تم دونوں کو میتھس پڑھایا تھا۔ تب سے اور اب تو یہ پسندیدگی محبت میں ڈھل گئی ہے۔ میں تمہیں اب بھی یہ بات نہیں بتاتا۔ لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ انکل ندا کے لیے رشتہ پسند کر رہے ہیں۔"

"کیا...؟" وہ اس کی بات کاٹ کر چلائی تھی۔

"انکل یعنی ندا کے والد صاحب... آپ کو کیسے پتا چلا؟"

"جس لڑکے کو انکل نے ندا کے لیے پسند کیا ہے اس نے بتایا... مجھے یہ بات کہنی تو نہیں چاہیے۔ تم لوگ کہیں غلط مطلب نہ نکال لو۔ لیکن یہ سچ ہے' ان دونوں بہنوں کے لیے جو لڑکے انکل نے پسند کیے ہیں' وہ دونوں انتہائی آوارہ ہیں اور بڑا تو ڈرگز لینے کا بھی عادی ہے اور اس کی یہ عادت آخری اسٹیج تک پہنچ چکی ہے۔ وہ کبھی بھی موت کا شکار ہو سکتا ہے۔" ابوبکر انتہائی فکرمندی سے بتا رہے تھے۔

"انکل اپنی بیٹوں کی خیر خواہی کا تو خیر سوچ بھی نہیں سکتے۔" نبیہہ فکرمندی سے بولی تھی۔

"لیکن یہ رشتہ تو میں بھی نہیں ہونے دوں گی۔ ساری زندگی عذاب میں کاٹنے کے بعد بھی سکون کا ایک پل نہ ملے تو کیا فائدہ ایسی زندگی کا۔" اس نے فوری طور پر تو ندا کو کچھ نہ بتایا' ہاں اماں سے بات کر لی اور انہیں بھائی کی پسند سے آگاہ بھی کر دیا۔ اماں خوش ہوئیں لیکن پھر کچھ سوچ کر بولیں۔

"نبیہہ تیرے ابا نہیں مانیں گے تو تو جانتی ہے وہ اپنے اصولوں کے کتنے پکے ہیں۔ اور فروا کے والد کو تو ویسے بھی پسند نہیں کرتے۔ وہ ہی کیا' سارا محلہ ان کی کرتوتوں سے واقف ہے۔ اور ان سے میل جول رکھنا بھی کوئی پسند نہیں کرتا۔" اماں کی تمام باتیں سچی بھی تھیں اور حوصلہ شکن بھی۔

"آپ بات تو کریں۔ اور پھر اس میں ندا یا اس کی امی اور بہن تو قصوروار نہیں' وہ تو خود ان کی وجہ سے پریشان ہیں اور ان کو گھر میں نہیں گھسنے دیتیں۔ آپ ابا کے خیالات بھائی کی پسند بتا کر جاننے کی کوشش کریں کیا پتا وہ بھائی کے لیے مان جائیں۔ اماں ندا بہت اچھی لڑکی ہے... آپ لوگوں کی عزت کرے گی۔" امید نبیہہ نے بھی نہیں چھوڑی تھی۔ لیکن اس نے ابھی

ندا کو بھی کوئی امید نہیں دلائی تھی۔
"ابا نے خیر سے میرے اور فروا کے لیے بہترین لڑکے ڈھونڈ لیے ہیں۔" ندا نے خبر سنائی تھی۔ جبکہ نبیہہ اس کا منہ تکنے لگی تھی۔ وہ کیا کہے کہ وہ یہ بات جانتی ہے۔ اگر ندا کو پتا چل جاتا تو وہ خفا ہو جاتی کہ اس نے یہ بات چھپائی کیوں؟
"تائی جان کے دونوں لڑکے "گنی پیٹے۔ اب رشنا بیگم نے نیا کھیل رچایا ہے۔ مرکیوں نہیں جاتی یہ عورت اور اگر یہ نہیں مرتی تو پھر ہم ماں بیٹیوں کو ہی موت آجائے۔ یہ روز روز کا عذاب۔" ندا کچھ زیادہ ہی دلبرداشتہ ہو رہی تھی۔
"ایسا کیوں سوچتی ہو!" نبیہہ نے اسے اپنے ساتھ لگایا۔
"میں سچ میں بہت زیادہ تنگ آچکی ہوں۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے۔ سب کچھ رشنا بیگم کو اپنے نام کروا کر بھی سکون کیوں نہیں آرہا۔ ہم باپ کے ہوتے ہوئے یتیموں کی سی زندگی گزار رہے ہیں میری ماں.... ہنسنا بھول گئی ہے۔ ایسے ہوتے ہیں.... باپ ایسے ہوتے ہیں جیون ساتھی.... مجھے تو اس رشتے سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ اذیت ذلت بے بسی۔ رات جب وہ ماں کی پٹائی کر رہا تھا۔ تو میرا دل چاہ رہا تھا میں اس شخص کو قتل کردوں جو ایک بیمار اور کمزور بیوی پر ہاتھ اٹھا رہا ہے اور تم دیکھ لینا ایسا ہو جائے گا کسی دن۔ بیس سالوں سے ہم برداشت کر رہے ہیں یہ سب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نبیہہ اس کے دکھ کو سمجھ سکتی تھی۔ لیکن وہ بے بس تھی کاش وہ اس کے لیے کچھ کرسکتی۔ اس نے ابا جان سے خود بات کرنے کا ارادہ کرلیا۔ کوشش کرنے میں کیا حرج تھا۔

☆ ☆ ☆

اس نے ڈھیروں شاپنگ کرلی تھی سب کے لیے بے شمار تحائف خریدے تھے۔ وہ حقیقتاً" بہت خوش تھی اور شہریار اس کو یوں خوش دیکھ کر چھیڑنے لگتے۔

"تم مستقل اماں کے پاس ہی رہ لو اتنی خوش ہو مجھ سے الگ رہنے پر۔ میں اپنا پیریڈ مکمل کر کے لوٹ آؤں گا۔"
"ہاں میں بھی کچھ ایسا ہی سوچ رہی ہوں۔" وہ بھی شرارت بھری سنجیدگی سے بولی۔ "اب آپ کے پاس تو ویسے ہی ٹائم نہیں ہمارے لیے وہاں کم از کم اماں جان تو ہیں۔ یہ تین تین بچے سنبھالنے میں میری مدد تو کریں گی۔"
"اور جو ادھر میرا ارادہ کچھ اور بن گیا تو...." انہوں نے شرارت سے آنکھیں مٹکائی تھیں۔
"مجھ سے اچھی بیوی آپ کو مل ہی نہیں سکتی۔" زرش کے لہجے میں اعتماد محبت یقین سب کچھ تھا۔ شہریار کچھ بولے نہیں بس مسکرا دیے تھے۔ اس کا یہ یقین بے جا نہیں تھا۔
دو دن بعد ان کی فلائیٹ تھی اور اس رات شہریار انہیں ڈنر کروانے لے آئے تھے۔ اس رات موسم بھی بے حد اچھا تھا۔
"پھر جانے اکٹھے بیٹھ کر کب کھانا نصیب ہو؟" شہریار نے آرڈر کرتے ہوئے اس کے خوب صورت سراپے پر بھرپور نظر ڈالی تھی۔
"کیوں؟" زرش کا دل یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔
"بس مجھے لگ رہا ہے اب کی بار تم اماں کو اکیلی چھوڑ کر نہیں آؤ گی اور مجھے یہاں اکیلے ہی تین برس کاٹنا ہوں گے۔" شہریار سنجیدگی سے بولے تو وہ ہنس پڑی۔
"صرف آپ ہی نہیں۔ شہریار میں بھی آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔" اس نے پہلی بار کھل کر اعتراف کیا تھا۔
"واقعی!" شہریار کا چہرہ اس اعتراف سے جگمگا اٹھا تھا۔
"ہوں!" ایک شرمگیں مسکراہٹ نے اس کے خوب صورت لبوں کا احاطہ کرلیا تھا۔ اور شہریار نے اندر تک اس کا یہ روپ سمویا تھا۔

☆ ☆ ☆

"سن لیں آپ میں ایسی آوارہ سے ہرگز ہرگز شادی نہیں کروں گی" وہ چلائی تھی اور فقیہہ الدین نے اس کو بالوں سے پکڑ کر کھینچا تھا۔

"نامراد' بدچلن باپ کے آگے زبان چلاتی ہے۔ یہ تمیز سکھائی ہے تجھے تیری ماں نے' تیرے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہو گا۔ لیکن میں ابھی زندہ ہوں۔ میں دیکھتا ہوں تو' آج کے بعد گھر سے کیسے قدم نکالے گی۔ ذبح نہ کر دیا تجھے اور تیری ماں کو تو نام بدل دینا میرا۔" اسے زور دار جھٹکے دیتے ہوئے زور سے دھکیلا تھا۔

نتیجتاً" وہ کھلی کھڑکی کے کونے سے جا ٹکرائی۔ درد کی شدید لہر اٹھی تھی کمر میں' لیکن یہ درد اس درد سے کہیں کم تھا جو' فقیہہ الدین کی صورت ان پر مسلط تھا۔ اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کیا اور پھر جانے کہاں سے اتنی ہمت اس کے اندر آئی کہ' وہ فقیہہ الدین کے روبرو آ کھڑی ہوئی۔ فقیہہ الدین نے دوبارہ مارنے کے لیے ہاتھ بلند کیا ہی تھا کہ ندا نے فضا میں ہی اسے روک لیا۔ وہ اس کی جرات پر دنگ رہ گئے اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے۔ ندا نے لپک کر میز پر سے چاقو اٹھا لیا۔

"ندا!" فروا خوف زدہ ہو کر اس کی طرف بڑھی امی جان نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا "وہیں رک جاؤ فروا!" وہ چلائی۔ "ورنہ میں اپنے ساتھ ساتھ سب کو ختم کر ڈالوں گی۔" فقیہہ الدین کے تو چہرے کا رنگ ہی اڑ گیا تھا۔ ندا سے اس بہادری کی توقع نہ تھی انہیں۔

"یہ... یہ غلط ہے۔ ندا۔" فروا رونے لگی۔

"ہاں غلط ہے یہ سب۔ یہ سب ہی غلط ہے۔ اس شخص کا یہاں ہونا تمہارا اور میرا اس شخص سے رشتہ' ماں کا اس بدکردار شخص سے رشتہ جوڑنا۔ سب ہی غلط تھا۔ اگر یہ رشتہ صحیح ہوتا تو یہ شخص ہمیں سزا کیوں دیتا۔ ماں نے تو صبر کے گھونٹ پی رکھے ہیں' لیکن میں نے نہیں۔ اب مزید اس شخص کا ظلم نہیں سہوں گی میں اور دیکھ ماں..." وہ امی جان کی طرف پلٹی تھی۔ وہ دہلیز تھامے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ندا کیا کرنے چلی تھی...؟

"آپ کو... ابھی اسی وقت اس شخص سے طلاق لینا ہو گی' ختم کرنا ہو گا اس رشتے کو جس نے سوائے دکھ اور اذیت کے آپ کو کچھ نہیں دیا۔" امی نے دہل کر اسے دیکھا۔ یہ وہ کیا کر رہی تھی؟ کیا کہہ رہی تھی؟ اس عمر میں وہ اپنے سر پر خود ہی خاک ڈال لیتیں کیا؟"

"امی پلیز جان چھڑا لیں اس شخص سے۔" وہ ملتجی ہوئی تھی۔ تبھی فقیہہ الدین نے آگے بڑھ کر اس پر قابو پا لیا اور چاقو اس کے ہاتھ سے چھین لیا۔

"تو مارے گی مجھے؟" وہ غرائے تھے' فروا اور امی جان تھر تھر کانپنا شروع ہو گئیں۔

"میں ماروں گا تجھے۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔" انہوں نے چاقو اس کی گردن پر رکھ دیا۔ ایک لمحے کو جان جانے کے خوف نے اسے لرزایا' لیکن اگلے ہی پل وہ بے خوفی سے فقیہہ الدین کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑی تھی۔

"کریں نا... احسان ہو گا آپ کا مجھ پر۔" وہ زہر خند ہوئی تھی۔ "ٹکڑے ٹکڑے ہو کے جینا کسے کہتے ہیں' یہ اب تجھے پتا چلے گا اور تیری ماں کو بھی۔" وہ دانت پیستے' اسے پرے دھکیل کر باہر نکل گئے۔ امی جان کے لبوں سے سکون کی سانس خارج ہوئی۔ انہوں نے بھاگ کر ندا کو اپنے ساتھ لگا لیا۔

"یہ کیا کرنے چلی تھی تو پگلی۔ مرد جیسا بھی ہو الزام عورت کو ہی سہنا پڑتا ہے۔ خدانخواستہ اگر کچھ ہو جاتا تو... میں تو دونوں صورتوں میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی۔" وہ رونے لگیں فروا بھی ان کے ساتھ آ کر چمٹ گئی۔ اس کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ لیکن ندا کسی بت کی طرح کھڑی رہی۔ اسے رونا نہیں آ رہا تھا لاکھ چاہنے کے باوجود بھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ مجھے یاد تو کریں گے نا؟" کل سے کوئی دسویں بار وہ پوچھ رہی تھی۔ شہریار نے دونوں کندھوں سے پکڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا اور پھر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔

بھول جانے کا بھی تصور میں کیسے کر لوں
میری ہر سانس وابستہ ہے تیری یاد کے ساتھ
"تو جان! تمہیں اس دن ہی بھولوں گا' جب سانس لینا بھولوں گا۔ اس کے علاوہ تو نہیں۔ تم بس خیال رکھنا۔ اپنا بھی اور میرے بچوں کا بھی۔" پتا نہیں کیوں اس کا دل بے چین بھی تھا اور اداس بھی' وہ رہ رہ کر شہریار کا چہرہ تک رہی تھی۔ "شاید شادی کے بعد پہلی بار جدا ہو رہے ہیں اس لیے۔" اس نے خود کو بہلایا تھا۔ لیکن دل تھا کہ مچل رہا تھا۔ ہمک رہا تھا حتیٰ کہ جہاز میں بیٹھتے ہوئے بھی اس کا دل واپس لوٹ جانے کو چاہ رہا تھا۔ لیکن وہ اس پر بھی عمل نہ کر سکی۔ اگر شہریار اس کے دل کے حالات جان جاتے تو کیسا مذاق اڑاتے۔ اس کے ذہن میں ایک بار پھر شہریار کا عکس ابھرا تھا۔

"اماں جان۔" وہ پھوپھو کے گلے لگ کر سسک اٹھی۔

"ارے میری جان!" انہوں نے اسے چوم لیا۔ اسے ایئرپورٹ لینے پھوپھو کے بھتیجے آئے تھے جو کہ شروع سے ہی پھوپھو کے پاس رہے تھے۔ لیکن پچھلے کچھ سالوں سے ان میں اور ان کے بھائی کے درمیان رنجش چلی آ رہی تھی۔ اس لیے وہ واپس اپنے گھر چلے گئے تھے۔ پھوپھو کے تعارف کروانے پر بھی اس شخص نے نظر نہیں اٹھائی تھی۔ وہ دل ہی دل میں ان کی شرافت اور نیک طبیعت کی قائل ہو گئی تھی۔

وہ ساری رات انہوں نے جاگتے' باتیں کرتے گزاری۔ پھوپھو نے بھرپور ساتھ دیا بار بار بچوں کو لپٹاتی' پیار کرتیں' پھر شہریار کو یاد کرنے لگتیں۔ اگلے دن وہ پھوپھو کے ہمراہ ہی امی ابا کو ملنے گئی۔ دونوں بھائی اور بھاوج بھی اسے مل کر خوش ہوئے۔

امی تو اسے گلے لگا کر رو ہی پڑیں اور وہ بھی کتنا ضبط کرتی آ رہی تھی۔ سال کے سینے سے لگ کر ساری تشنگیاں مٹانے کا موقع ملا تھا اور اس سے بھرپور فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اس کا تین دن ادھر رکنے کا پروگرام تھا۔ پھوپھو بھی اس کے ہمراہ ہی تھیں۔ تین دن کیسے گزر گئے اسے پتا ہی نہ چلا' سب بچوں میں اس قدر مگن تھے اور وہ ان سب میں کہ وہ دن شہریار کو فون ہی نہ کر سکی۔ اور عجیب اتفاق تھا کہ خود شہریار نے بھی رابطہ نہ کیا تھا۔

"ناراض ہو گئے ہوں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے سوچا۔

"چلو معید کو سلا لوں' پھر فون کرتی ہوں سکون سے۔" اس نے معید کو تھپکتے ہوئے پلان کیا اور اسے سلاتے سلاتے اسے خود بھی نیند سی آ گئی اور تبھی اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے بہت عجیب سا خواب دیکھا تھا۔ لوگ' خون' سفید کپڑے... شور' رونا پیٹنا۔ وہ ایک جھٹکے سے بے دار ہوئی تھی۔ اس کی پیشانی عرق آلود تھی اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کیا اور خواب کی کیفیت سے باہر نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

"شہریار!" اس نے بے آواز پکارا تھا۔ اور پھر اس کی ساری پکاریں جیسے بے اثر ہو گئی تھیں۔

✲ ✲ ✲

"تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟" ابو جان نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"جی ابو!" اس نے پھر سے حوصلہ مجتمع کیا تھا۔

"کیا اس لیے کہ وہ تمہاری دوست ہے؟" وہ اسے کھوجتی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

"نہیں اس لیے کہ وہ اچھی لڑکی ہے اور محض اپنے باپ کی وجہ سے اس کی زندگی خراب ہو رہی ہے۔"
نبیہہ نے ارادہ کر لیا تھا بھائی اور دوست کا مقدمہ لڑنے کا۔

"تمہاری امی جان کچھ اور کہہ رہی ہیں۔ بکر کی خواہش ہے یا اس کی بھی؟" وہ پوچھ رہے تھے اور وہ بھی جیسے آج مقدمہ جیتنے کا عہد کیے بیٹھی تھی۔

"نہیں ابو جان۔ وہ تو لاعلم ہے۔ یہ بکر بھائی کی خواہش ہے اور انہوں نے ہی مجھے کہا ہے اور ابو جان... وہ واقعی بہت مظلوم لڑکی ہے۔ وہ اس کی امی اور بہن سالوں سے اس ظالم شخص کا ظلم برداشت کرنے

پر مجبور ہیں۔ اگر اس کے باپ نے اس کی شادی اس آوارہ لڑکے سے کردی تو اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی ابو جان۔ پلیز ابو جان اسے میری جگہ رکھ کر سوچیں۔"
وہ ملتجی لہجے میں بولی۔ ابو جان چند ثانیے خاموشی سے اسے دیکھتے رہے پھر گویا ہوئے۔
دیکھو بیٹی! یہ کوئی جذباتی مسئلہ نہیں ہے اسے عقل سے سلجھانے کی ضرورت ہے' چلو مان لیا ہم نے تمہاری دوست کا رشتہ بکر کے لیے لے لیا' پھر کیا ہوگا؟ کیا اس شخص کی خصلت بدل جائے گی؟ نہیں بلکہ وہ اس بات کی سزا پھر ان ماں بیٹوں کو دے گا۔ وہ آوارہ لڑکا تمہاری سہیلی کی شادی شدہ زندگی میں آگ لگائے گا اور اس کا باپ' وہ چھوٹی بیاہ دے گا اس لڑکے کے ساتھ۔ اور اس کی ماں اور مصیبتوں کے پہاڑ تلے دب جائے گی۔
بیٹا ہم ان کی کچھ مدد نہیں کر سکتے۔ ان کے اپنے رشتہ دار کچھ نہیں کر پائے تو ہم کیا بگاڑ لیں گے کسی کا؟ میرا تو ایک ہی بیٹا ہے میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔ اللہ کرے تمہاری سہیلی کو کوئی اچھا اور گھر مل جائے۔ لیکن بیٹا وہ ہم نہیں ہوں گے۔ اب تم جا سکتی ہو۔" انہوں نے دو ٹوک بات کر کے گویا اپنے فیصلے پر مہر لگا دی۔
"ابو جان آپ غور تو کریں؟" اس نے مایوسی کے عالم میں باپ کو دیکھا لیکن ان کے چہرے پر اس کی بات پر غور کرنے کے کوئی مثبت اثرات نہیں تھے۔ وہ دل برداشتہ سی باہر نکل آئی اور سیدھی ندا کی طرف چلی آئی۔ وہ لائٹس آف کیے بیڈ پر اوندھی دراز تھی۔
"کیسی ہو ندا؟" اس نے لائٹس آن کیں تو وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ نبیہہ سر تاپا لرز گئی۔ اس کی آنکھوں میں صحرا کی ویرانی تھی۔
"ندا!" وہ اس کے قریب آ گئی۔ "یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تم اتنی کمزور تو نہیں ہو۔" وہ اس کا سر سہلانے لگی۔
"نہیں۔ میں بہت کمزور ہوں۔ بہت زیادہ۔ میں اپنی ماں کو دکھ میں تڑپتا نہیں دیکھ سکتی۔ میں اپنی بہن کو سسکتے نہیں دیکھ سکتی۔ اور میں خود کو بھی اس آگ میں جلنے سے نہیں بچا سکتی۔ جو فقیہہ الدین سلگانے جا رہا ہے۔ جس کا ایندھن پہلے میری ماں بنی رہی اور اب ہم دونوں کی باری ہے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ اوپر والا یا ہم تینوں کو موت دے دے یا فقیہہ الدین کو۔ خودکشی حرام نہ ہوتی تو ہم تینوں کب کی زہر کھا کر مر گئی ہوتیں۔ لیکن یہی سوچ روک لیتی ہے یہ زندگی تو خراب ہو گئی۔ اس زندگی میں ہی شاید کچھ اچھا ہو جائے۔ تمہیں پتا ہے اب دن رات میں کیا سوچ رہی ہوں؟" وہ اٹھ بیٹھی اس کے چہرے پر عجیب تھا۔ بہت عجیب۔ نبیہہ ڈر سی گئی۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے وہ بول پڑی۔
"پتا نہیں کیا الم غلم سوچتی رہتی ہو۔ میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ.... اگر فارغ ہو تو شام کو ذرا بازار چلیں.... مجھے کچھ ضروری چیزیں خریدنا ہیں۔"
اس نے شاید اس کی بات سنی نہیں تھی۔ اپنی ہی کہے گئی۔
"میرے دماغ میں ہر وقت یہ بات گھوم رہی ہے کہ میں فقیہہ الدین کو قتل کر دوں۔"
"یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟" نبیہہ کا دل دھک سے رہ گیا۔
"تمہارا باپ ہے ندا۔ جیسا بھی ہے.... تم میرا خیال ہے فارغ رہ کر تمہارے دماغ میں ایسی فضول سوچیں بھر گئی ہیں۔ تم فوراً سے پہلے کالج جوائن کرو۔ اپنی تعلیم مکمل کرو۔" نبیہہ نے اس کے ہاتھ ہاتھوں میں لے کر اسے سمجھانا چاہا تھا۔ لیکن وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں تھی۔
"تم نے بے شمار دفعہ سنا ہوگا' باپ نے بدکردار بیٹی کو موت کے گھاٹ اتار دیا' بھائیوں نے بہن کو بدچلنی کے شبہ میں گولی مار دی۔ تم نے کبھی سنا کسی بیوی نے' بیٹی نے' ماں نے بدکرداری پر اپنا شوہر' باپ یا بیٹا قتل کیا ہو؟ عورت کی تو بدچلنی ثابت بھی نہیں ہوتی ہے اسے مار دیا جاتا ہے۔ جو مرد بدکرداری کا چلتا پھرتا اشتہار ہوتے ہیں' ان پر کسی کی نظر کیوں نہیں پڑتی؟ یہ کیوں اپنی بیوی بیٹی ان کے ہاتھوں قتل نہیں ہوتے؟ قانون'

اصول دونوں کے لیے یکساں ہونے چاہئیں۔ ہے نا؟"

وہ بول رہی تھی اور اس کے لہجے میں بلا کا سکوت تھا۔

"دیکھو ندا! غصے میں آکر کچھ غلط مت کر ڈالنا۔ اپنے آپ کو کسی بھی مصیبت میں مت ڈال لینا۔"

نبیہہ کو اس کے ارادے کچھ اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ وہ گھبرا کر اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

غصے اور دکھ کی کیفیت سمجھنے میں لوگ ہمیشہ غلطی کر جاتے ہیں۔" وہ ہنس دی اور نبیہہ کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ نکال کر بولی۔

"تم شاید یہ سمجھ رہی ہو کہ میں فقیہہ الدین کو قتل کر ڈالوں گی۔ نہیں اس طرح تو وہ نجات پا جائے گا۔ تم جانتی نہیں ہو کہ کیا ہر شخص کو اپنے اعمال کی کچھ سزا تو دنیا میں ہی بھوگ کر جانی ہوتی ہے۔ اللہ سوہنا اپنے فرائض بھی معاف کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ لیکن اگر کسی انسان کے حقوق آپ پر واجب الادا ہوں۔ آپ کسی سے زیادتی کے مرتکب ہوئے ہوں اور آپ نے کسی کا دل ہی دکھایا ہو' تو اس وقت تک اللہ سوہنے سے معافی نہیں ملے گی جب تک متعلقہ بندہ خود معاف نہ کر دے۔ اور میں کبھی بھی اس شخص کو معاف نہیں کروں گی۔ کبھی بھی ... جسے دنیا میری ولدیت کے خانے میں دیکھتی ہے۔" اس کی آنکھیں بھر آئی تھیں جسے وہ نبیہہ سے چھپانے کی کوشش کرنے لگی تھی۔ اور نبیہہ تو خود اس کے لیے دکھی ہو رہی تھی کہ وہ اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شہریار کی جان ایکسیڈنٹ میں کیا گئی زرش کی تو دنیا ہی اندھیر ہو گئی تھی۔ اس کے پاکستان آنے کے اگلے دن بعد وہ آفس جانے کے لیے نکلا تھا اور ایک لہراتے بل کھاتے کنٹینر کی زد میں آگیا تھا۔ کیسے؟ یہ شاید وہ خود بھی نہیں سمجھ پایا تھا۔ اس کی گاڑی بری طرح کچلی گئی تھی اور وہ خود بھی ریزہ ریزہ ہو کر بکھر گیا تھا۔ چیتھڑوں کی صورت اس کی ڈیڈ باڈی پاکستان آئی تھی اور جیسے کہرام مچ گیا تھا۔

وہ تو فون سن کر ہی بے ہوش ہو گئی تھی۔ اور جب ہوش میں آئی تو وہ خالی ہاتھ ننگے سر یوں بیٹھی تھی جیسے اس کی عمر بھر کی کمائی کوئی لوٹ کر لے گیا ہو اور وہ کبھی اپنے خالی کاسے کو تک رہی تھی اور کبھی اپنے سر سے سرکی چادر کو۔ تین ننھے وجود رو رو کر اپنے وجود کا احساس نہ دلاتے تو وہ بھی شاید کب کی مر گئی ہوتی۔ لیکن جو اسے زندگی اسے شہریار کے بنا جینے کو ملی تھی۔ وہ بھی موت ہی کی کوئی شکل تھی۔ گزارے ساڑھے تین سال جیسے تین پل تھے گویا۔ ہاتھوں سے ریت کی مانند پھسلے تھے۔ اور وہ بے آب و گیاہ صحرا میں ننگے پاؤں کھڑی تھی۔ رو رو کر آنکھوں کے سوتے خشک ہو گئے تھے لیکن دل تھا کہ کسی ریگستان کی طرح سر میں ریت ڈالے جانے کہاں کہاں گھومنے لگا تھا۔ کسی نے صحیح کہا تھا۔ ماضی کی یادوں سے چھٹکارا ممکن نہیں ہوتا۔

شہریار... شہریار... اس کا رواں رواں پکار اٹھتا اور وہ اپنے اردگرد سے بے خبر ہونے لگتی۔ پھوپھو تو خود جوان بیٹے کی موت کے بعد زندہ لاش بن کر رہ گئی تھیں۔ لیکن پھر بھی وہ زرش کا پورا خیال رکھے ہوئے تھیں۔ اسے سنبھال رہی تھیں۔ بچوں کو دیکھ رہی تھیں۔ امی جان پندرہویں تک اس کے پاس رہی تھیں ... پھر چلی گئی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس نے بھی سنبھلنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن پھر بھی جب شہریار کی ہوک من میں اٹھتی۔ وہ پہروں روتی رہتی۔ انہی دنوں معید بیمار رہنے لگا۔ وہ تو عدت میں تھی۔ پھوپھو ہی اپنے بھتیجے کے ہمراہ اسے ڈاکٹروں کے پاس لیے پھرتیں۔ لیکن معید کو جانے کیا تھا ٹھیک ہونے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ زرش سب کچھ بھول بھال اس کی فکر میں لگ گئی۔ بڑے بھیا کو فون کر کے بلا لیا۔ وہ معید کو چند ڈاکٹرز کے پاس لے کر گئے۔ ٹیسٹ ہوئے۔ رپورٹس آئیں تو کچھ بھی حوصلہ افزا نہیں تھا۔ بڑے بھیا ٹکر ٹکر رپورٹس دیکھ رہے تھے ان کی نظر میں بیوہ بہن کی دم توڑتی امنگیں گھوم رہی تھیں۔ وہ کیسے یہ خبر بہن کو دیتے کہ شہریار کے بعد اب معید

بھی اسے چھوڑ کر جانے والا ہے۔

"نہیں یہ مجھ سے نہیں ہوگا!" انہوں نے روتے ہوئے امی جان کو فون پر بتایا تھا اور ان کا دل خون کے آنسو رونے لگا تھا۔ ان کی بیٹی کو کس کی نظر لگ گئی تھی جو خوشیاں ایک ایک کر کے اس سے رخصت ہو رہی تھیں۔

پھر انہی دنوں انگلینڈ سے کچھ ڈاکومنٹس آئے۔ سوئے اتفاق وہ پھوپھو کے بھتیجے نے وصول کیے تھے۔ مسز شہریار کے نام کا یہ پلندا انہوں نے پھوپھو کے حوالے کیا تھا اور ساتھ ہی ایک عرض بھی۔ وہ زرش سے نکاح کرنا چاہتے تھے۔

پھوپھو حیرت سے انہیں دیکھتی رہ گئیں۔ انہوں نے یہ جرات کی بھی تو کیسے؟ ٹھیک تھا وہ انہیں ہی بیٹا ہی سمجھتی تھیں۔ لیکن زرش ان کی بہو تھی اور پھر اس شہریار کو یہ دنیا چھوڑے دن ہی کتنے ہوئے تھے۔

"تمہیں ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا فقیہہ الدین۔" پھوپھو نے سرزنش بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"کیوں پھوپھو! اس میں برائی کیا ہے۔ میں نے کسی غلط خواہش کا اظہار تو نہیں کیا۔ نکاح تو سنت ہے اور پھر بیوہ عورت سے نکاح کرنا تو بہت بڑے اجر کی بات ہے۔" انہوں نے بڑے رسان سے کہا تھا۔ پھوپھو بہت کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن اس وقت وہ بحث کے موڈ میں نہیں تھیں اس لیے خاموشی سے اٹھ گئیں۔ اور اس خاموشی کو نیم رضامندی سمجھتے ہوئے فقیہہ الدین نے ان کا پیچھا پکڑ لیا تھا۔

زرش کو ابھی تک معید کی بیماری کا پتا نہیں چلا تھا۔ کسی کی ہمت ہی نہیں پڑی تھی کہ اسے اس جانگسل حقیقت کے بارے میں بتاتا۔ لیکن وہ ماں تھی معید کی دن بدن بگڑتی حالت اسے تشویش میں مبتلا کیے ہوئے تھی۔ بڑے بھیا ہر ممکن ڈاکٹروں سے رابطہ کر رہے تھے۔

"ہم اسے باہر لے جاتے ہیں۔" انہوں نے آخری امید کے طور پر پوچھا تھا۔

"کوشش ہی ہے۔ کرنا چاہتے ہیں تو کرلیں۔ ورنہ ٹیومر پورے دماغ میں پھیل چکا ہے۔ بچہ بہت چھوٹا ہے۔ آپریشن کا رسک تو کوئی بھی نہیں لے سکتا۔ بہرحال آپ کوشش کرلیں۔" ڈاکٹر نے ایک فیصد بھی امید نہیں دلائی تھی۔ اور پھر انہیں زرش کو بتانا پڑا۔

"کیا؟" وہ کئی لمحے پتھرائی آنکھوں سے کبھی بھائی اور کبھی بیڈ پر سوئے معید کو دیکھتی رہی۔ تو کیا شہریار کے بعد معید بھی۔

"نہیں۔" اس نے زور سے سر جھٹکا اور لپک کر معید کو بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ معید کو کہیں نہیں جانے دے گی۔ نہیں۔ وہ ایک پل کے لیے بھی معید سے جدا نہیں ہوگی۔ وہ شہریار سے کچھ دنوں کے لیے الگ ہوئی تو تقدیر نے اسے ہمیشہ کے لیے جدا کر دیا۔ اور اب معید۔ "نہیں اللہ میاں جی۔ آپ ایسا نہیں کریں۔ مجھ سے معید کو مت چھینیں۔ ابھی تو میں نے اس کی آواز بھی نہیں سنی۔ یہ مجھے ماما کہہ کر پکارے گا تو مجھے کیا محسوس ہوگا۔

پلیز اللہ میاں جی۔ نہیں کریں ناں ایسا پلیز۔" وہ کسی چھوٹی بچی کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔

☆ ☆ ☆

اور وہ شام بھی اس کی زندگی کی باقی سیاہ شاموں ایسی ہی تھی۔ لیکن اس شام میں اس کی تقدیر کی سیاہی بھی گھل گئی تھی۔ فقیہہ الدین نے صحیح کہا تھا وہ ٹکڑوں میں جیے گی۔ اور اس کے ٹکڑوں میں جینے کی ابتدا ہو گئی تھی۔ فقیہہ الدین رشنا بیگم اور امیر علی کے ساتھ آئے تھے۔ ساتھ میں دونوں بھائی بھی تھے۔

"یہ لے' یہ پہن لے!" رشنا بیگم نے ایک شاپر اس کے آگے رکھا تھا۔ وہ جو ابھی ابھی چھت پر آ کر بیٹھی تھی۔ رشنا بیگم اور پھر چارپائی پر رکھے شاپر کو ٹکر ٹکر تکنے لگی۔ جیسے اسے کچھ سمجھ نہ آیا ہو۔

"چل اٹھ' نیچے چل!" رشنا بیگم نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا تو وہ جیسے چونکی۔ پھر پیچھے کھڑے فقیہہ الدین اور امیر علی پر نظر پڑی تو اس کے لبوں سے ہنسی پھوٹ پڑی۔

رشنا بیگم نے یوں اسے دیکھا جیسے وہ باؤلی ہو گئی ہو۔
اس نے شاپر اٹھایا اور چلتے ہوئے فقیہہ الدین کے پاس آکر رک گئی۔
"چلتی کیوں نہیں نیچے قاضی صاحب آئے بیٹھے ہیں!" فقیہہ الدین غرائے تھے۔
"چل رہی ہوں!" وہ پھر ہنسی تھی اور یونہی ہنستے ہنستے اس کی نظر برساتی میں چھپ کر کھڑی فروا پر پڑی تھی۔ وہ شاید اسے ہی دیکھنے آئی تھی۔
"ہاں تو امیر علی صاحب!" وہ امیر علی کے سامنے آکھڑی ہوئی اور سر سے پیر تک اس کا جائزہ لیا۔ پھر چبا چبا کر بولی۔
"امیر علی ولد علیم الدین، صحیح کہا ناں میں نے؟" اس نے تائید چاہی تھی اور جانے کیوں امیر علی نے فوراً" گردن ہلائی تھی۔
"تو تم مجھ سے یعنی ندا فقیہہ الدین سے نکاح کرنے آئے ہو۔ جانتے ہو میرے باپ یعنی تمہارے چچا اور تمہاری ماں یعنی میری تائی جان کا گزشتہ بیس برسوں سے کیا رشتہ ہے؟"
امیر علی تو گڑبڑایا ہی ساتھ ہی رشنا بیگم بھی بدبدا کر آگے بڑھی تھی اور اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی فقیہہ الدین نے آگے بڑھ کر زور دار تھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا تھا۔ تکلیف کی شدت سے ندا کی آنکھ میں آنسو آگئے۔ لیکن وہ پی گئی۔
"سچ برداشت نہیں ہوتا ناں فقیہہ الدین صاحب!" وہ اپنے باپ کی طرف مڑی۔
"یہ سچ گزشتہ بیس برسوں سے میری ماں اور ہم سہتے چلے آرہے ہیں۔ لوگ انگلیاں اٹھا اٹھا کر ہم پر آوازے کستے ہیں فقیہہ الدین صاحب۔ آپ اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر اپنی بھابھی کے گھر کیوں رہ رہے ہیں؟ وہ بھی اس صورت میں کہ آپ کے بھائی کو مرے عرصہ گزر گیا۔ اور یہ عورت... ہم نے تو سنا تھا بڑی بھابھی ماں کے جیسے ہوتی ہے۔ اور اس عورت نے تو سارے رشتوں کی ہی مٹی پلید کروالی۔ اور..."
"بس کر لڑکی!" رشنا بیگم دھاڑی تھی "اس کی زبان کو لگام دو فقیہہ الدین ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔"
رشنا کے تو تلوؤں سے لگی سر پر جا کر بجھی۔ اس نے پہلے رشنا بیگم سے اور پھر فقیہہ الدین سے مخاطب ہو کر کہا۔
"وہ تو اب بھی نہیں ہے۔ کس بھول میں ہو تم... اور یہ تم نے کیسے سمجھ لیا۔ میں تمہارے اس نشئی بیٹے سے شادی کروں گی۔ یہ وقت آنے سے پہلے میں خود کو اور اس ساری جائداد کو آگ لگا دوں گی اور فقیہہ الدین صاحب... آپ بھی کسی بھول میں مت رہیے گا۔ وہ ماں تھی، جو جانے کس خوف کے تحت آپ کے سب جائز و ناجائز کو سہتی آرہی ہے۔ میں ان کی طرح نہیں۔" اس کا لہجہ بغاوت سے بھرپور تھا۔
"میں دیکھتا ہوں تم اس نکاح سے کس طرح انکار کرتی ہو۔" فقیہہ الدین نے لپک کر اسے بالوں سے پکڑا تھا اور گھسیٹ کر نیچے لے جانے لگا۔ خلاف توقع اس نے کوئی مزاحمت نہیں کی تھی۔ اسی طرح گھسٹتی نیچے آئی تھی۔ فروا ان سے پہلے ہی بھاگ کر نیچے آگئی تھی اور اب ماں کو سب سنا رہی تھی۔
"پانچ منٹ میں کپڑے بدل کر آؤ۔ ورنہ کھڑے کھڑے تم ماں بیٹیوں کو گولی سے اڑا دوں گا۔" فقیہہ الدین نے اسے اندر کی طرف دھکا دیتے ہوئے کہا تھا۔
ندا نے اندر گھس کر کنڈی چڑھا لی اور پچھلے دروازے سے امی جان کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کے دماغ نے فوراً" پلان ترتیب دے لیا تھا' فروا اور امی جان سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔ اس نے فروا کو بیرونی دروازہ بند کرنے کا اشارہ کیا۔ اور پھر الماری کھول کر کاغذات اور زیورات نکالنے لگی۔
"دس منٹ... دس منٹ میں ہم یہاں سے نکل رہے ہیں فروا۔ تم امی جان کی دوائیں بیگ میں ڈال لو۔" اس نے جلدی جلدی بیگ میں چند کپڑے اور ضروری اشیاء ٹھونسیں۔ وہ چند لمحے قبل دماغ میں آنے والے خیال کو عملی جامہ پہنا رہی تھی۔
"مگر کہاں جائیں گے یہ گھر چھوڑ کے؟" امی جان نے کمزور سا احتجاج کیا تھا۔

"کہیں بھی' لیکن فی الحال یہاں سے نکلنا ہے۔"
اس نے بیگ بند کیا باہر سے دروازہ پیٹا جانے لگا تھا۔ اور فقیہہ الدین کے منہ سے حسب عادت گالیوں کا فوارہ ابل رہا تھا۔

"جلدی نکل حرام زادی۔" وہ ایک بار پھر غرائے تھے اور ندا نے ان دونوں کو پچھلے دروازے سے باہر نکال کر جلدی سے دروازے میں تالا ڈال دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

اور اس کا بلکنا کسی کام نہیں آیا۔ ایک رات معید چپ چپاتے اسے چھوڑ گیا اسے خبر بھی نہیں ہوئی۔ وہ تو اس کا پل پل خیال رکھتی تھی۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر دیکھتی تھی کہ اس کی سانس چل بھی رہی ہے یا نہیں۔ لیکن اس رات پتا نہیں کیا ہوا تھا۔ وہ اتنی گہری نیند سوئی تھی کہ اسے خبر ہی نہ ہو سکی کہ موت کے ہاتھوں نے اس سے معید کو چھین لیا۔ وہ روئی' تڑپی' کرلائی' شہریار کی موت کا غم پھر سے ہرا ہو گیا۔ پھوپھو جان اسے تسلی دیتے دیتے خود رو پڑتیں۔ پھر اللہ سے توبہ کرنے لگتیں۔ معافی مانگتیں پھر اسے سنبھلنے کا کہتیں اور اسے لگتا جیسے وہ کبھی سنبھل ہی نہ پائے گی۔ اسے معید کی پیدائش یاد آنے لگتی۔

ڈاکٹروں نے کمپلیٹ چیک اپ کے بعد اسے تندرست بچہ قرار دیا تھا ہاں تھوڑا کمزور تھا لیکن.... اور شہریار کتنا خوش تھا معید کی پیدائش پر.... شہریار' معید' یادوں کا سلسلہ بڑھتا چلا جاتا.... اور وہ روئے چلی جاتی۔ لیکن وہ کہتے ہیں نا' وقت بہت بڑا مرہم ہے اور پھر رب کریم نے انسان میں نسیان کا مادہ بھی رکھا ہے۔ ورنہ تو انسان کبھی بھول ہی نہ پاتا اور غم اور دکھ سے پاگل ہو جاتا۔ جس دن اس کی عدت پوری ہوئی' اسی دن معید کا چالیسواں ہوا۔ سب ہی تو آئے تھے۔ ابا' امی' بڑے بھیا' چھوٹے بھائی اور وہ ایک ایک کے گلے لگ کر بچھڑے ہوؤں کو یاد کر کے روتی رہی۔ اور پھر امی جان اسے اپنے ہمراہ لے آئیں۔ اب اس کی ساری توجہ کا مرکز حوریہ اور زارا ہی تھیں' وہ انہیں ایک پل بھی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتی۔ اس کے دل میں عجیب سا خوف سرایت کر گیا تھا۔ کھو دینے کا خوف۔ اس نے شہریار کے بغیر زندگی بتانے کا کبھی تصور بھی نہ کیا تھا' کبھی اس پہلو پر سوچا بھی نہ تھا۔ لیکن ہمیشہ وہ کب ہوا ہے' جو ہم سوچتے ہیں۔ زندگی کی شاہراہ پر اخیر تک کا ساتھ دینے کے وعدے کرنے والا اسے سفر کے آغاز میں ہی تنہا چھوڑ گیا تھا اور اسے یہ سفر اب اکیلے ہی طے کرنا تھا۔

وقت کا کام گزرنا ہوتا ہے۔ گزر جاتا ہے۔ وہ حادثے جو کبھی بہت شدت سے محسوس ہوتے ہیں' دکھ دیتے ہیں' آہستہ آہستہ مندمل ہونے لگتے ہیں۔ بھولتے نہیں' ایک کسک بن کر ساری عمر ساتھ رہتے ہیں۔ وہ بھی آہستہ آہستہ اس دکھ کو بھولنے لگی تھی۔ پھر بچیاں بڑی ہو گئی تھیں۔ اسکول جانے لگی تھیں۔ ان کی پڑھائی' ہوم ورک' ان سب میں کھو کر بہت کچھ بھولنے لگا تھا۔ بڑی بھیا کی شادی ہو گئی تھی۔ چھوٹا پڑھائی کے لیے ابراڈ چلا گیا تھا۔ زندگی ایک ڈگر پر چل نکلی تھی۔ پندرہ دن بعد وہ بچیوں کو لے کر پھوپھو کے پاس دو دن رہ آتی۔ چھٹیاں تو وہ گزارتی ہی پھوپھو کے پاس تھی۔ انہوں نے بتیرا کہا تھا' وہ ان کے پاس رہے۔ لیکن وہاں رہ کر اسے تنہائی کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔

پھر جیسے ٹھہری ہوئی زندگی میں ارتعاش پیدا ہونے لگا۔ نبیلہ کو' وہ اور اس کی بچیاں کھٹکنے لگی تھیں بات بے بات روک ٹوک' ذرا ذرا سی بات پر ڈانٹ ڈپٹ۔ اسے کہاں برداشت تھا۔ حوریہ اور زارا کو تو وہ دیکھ کر جیتی تھی۔ اس نے بھابی کو منع کیا تو وہ پھٹ پڑیں۔ وہ سنائیں کہ اس کا دل بند ہوتے ہوتے بچا۔

"لوگ نفرت کیسے کر لیتے ہیں؟" اس نے دونوں بچیوں کو خود میں سمیٹتے ہوئے سوچا تھا۔ وہ ساری رات پھر اس نے شہریار کو یاد کرتے گزاری تھی۔ اس سب کی ذمہ دار وہ خود تو نہیں تھی' پھر کیوں اسے مورد الزام ٹھہرایا جاتا تھا۔ نبیلہ بھابی پہلے تو ڈھکے چھپے روک ٹوک کیا کرتی تھیں اب شیر ہو گئیں۔ وہ سب کے

سامنے ایک منٹ میں اسے سنا دیتیں۔ ابا اور امی بھی ان کی حکمران طبیعت کے آگے بے بس تھے۔ وہ اسے ہی صبر کی تلقین کرتے اور وہ ان کے کہے پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتی۔ لیکن نبیلہ کو پھر بھی صبر نہ آتا۔

اور اس دن جب پھوپھو بے قرار ہو کر ملنے چلی آئی تھیں۔ نبیلہ نے ان کو جالیا۔

"آنٹی، آپ کو کوئی فنانشلی پرابلم ہے؟" اس نے چھوٹتے ہی سوال داغا تھا۔ سب نے چونکنے ہو کر اسے دیکھا تھا کہ وہ کچھ بھی کہہ سکتی تھی پھوپھو بھی حیران تو ہوئیں لیکن قابو پا گئیں۔

"نہیں تو بیٹا اللہ کا شکر ہے... اللہ رکھے تمہارے پھوپھا مرحوم نے بہت کچھ چھوڑا تھا۔ پھر ماشاء اللہ شہریار نے بھی بہت کمایا۔ وہ تو سمجھو اللہ کی مرضی نہیں تھی۔ ورنہ جانے ترقی کی اور کتنی منازل طے کرتا۔" وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ لیکن نبیلہ تو جانے آج کیا پر تولے بیٹھی تھی۔

"میں نے سنا ہے، شہریار گزشتہ پندرہ سال سے انگلینڈ میں تھے نیشنلٹی تو ہو گی' اور یقیناً" اس کے بیوی بچے بھی برٹش نیشنلٹیز حاصل کر چکے ہوں گے۔ تو پھر یہ وہاں کیوں نہیں جاتے؟" پھوپھو شاید اس کی بات کو سمجھنا نہیں چاہ رہی تھیں۔ بات بدل گئیں۔ لیکن اگلی روز انہوں نے زرش کو ساتھ چلنے کا حکم سنا دیا۔

"زرش بچوں کے اسکول سرٹیفکیٹ لے لو۔ ہم اپنے گھر چل رہے ہیں۔" انہوں نے اپنے پر خاصا زور دیا اور زرش نے فوراً" تیاری کرلی۔ حالات کا بدلتا رخ وہ بھی دیکھ چکی تھی اور اس سے پہلے کہ نبیلہ سیدھا سیدھا نکل جانے کا کہتی، مصلحت اسی میں تھی کہ وہ عزت سے چلی جائے۔ سو وہ بچیوں کو ساتھ لے کر پھوپھو کے پاس چلی آئی۔ یہ اس کا اپنا گھر تھا روپے پیسے کی کمی نہ تھی اور پھر شہریار کی بدولت انہیں نہ صرف نیشنلٹی ملی تھی بلکہ دونوں بیٹیوں کی شادی تک خرچہ بھی اسے باقاعدگی سے ملتا تھا۔ لائف پالیسی کے پیسے بھی اسے مل گئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ جب چاہے بچوں کے ساتھ وہاں جا کر رہائش اختیار کر سکتی تھی۔ شہریار نے اپنے مختصر سے ساتھ میں انہیں ہر طرح سے سیکیورٹی دینے کی کوشش کی تھی۔

یہاں گھر کا ماحول بھی اچھا تھا۔ اپنائیت کا احساس تھا اور حوریہ اور زارا بھی یہاں ہر طرح کی آزادی محسوس کرتی تھیں۔ پھوپھو کے اکیلے پن کی وجہ سے فقیہہ الدین دوبارہ یہاں مستقل سکونت اختیار کر چکے تھے۔ گو انہوں نے وہ بات دہرائی نہیں تھی لیکن پھوپھو کے ذہن سے وہ بات محو نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے وہ ان کی حرکات و سکنات' پر کڑی نظر رکھتی تھیں لیکن فقیہہ الدین کی کسی بھی بات سے انہیں شبہ نہیں ہوا تھا کہ 'وہ زرش میں کوئی دلچسپی لے رہے ہیں۔

دونوں بچیاں اب فورتھ اور ففتھ اسٹینڈرڈ میں آ گئی تھیں۔ گزرتے وقت نے جہاں زرش کو گہری سنجیدگی میں مبتلا کیا تھا' وہیں اس سنجیدگی نے اس کی شخصیت کو مزید دلکش بنا ڈالا تھا۔ وہ اتنی چھوٹی سی عمر میں بڑی باوقار لگنے لگی تھی۔ ابا کی وفات کے بعد امی کی ذات بٹ گئی تھی۔ وہ کبھی بڑے بھیا کے پاس ہوتیں تو' کبھی چھوٹے کے ساتھ کیونکہ دونوں کی بیویوں نے ساتھ رہنے سے انکار کر دیا تھا اور دونوں بھائیوں نے باہمی فیصلہ سے الگ الگ گھر ڈھونڈ لیے تھے۔ وہ پھوپھو کے ساتھ تھی' مطمئن تھی۔

☼ ☼ ☼

"لیکن ہم جائیں گے کہاں؟" فروا نے سوال کیا تھا۔

"فی الحال نیبہہ کے گھر اس کے بعد سوچیں گے۔" وہ خود نہیں جانتی تھی آگے ان کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ یا پھر اسے کیا کرنا تھا۔

"وہاں سے فقیہہ الدین فوراً" ڈھونڈ نکالے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے ہماری دوڑ بس اسی گھر تک ہے۔" امی جان نے خدشہ ظاہر کیا تھا۔

وہ کچھ نہیں بولی۔ خاموشی سے نیبہہ کے گھر کے کھلے دروازے میں داخل ہو گئی۔ ان دونوں نے بھی

پیروی کی تھی ان کو یوں اندر آتے دیکھ کر نبیہہ کی امی سمجھ گئی تھیں کہ خیریت نہیں ہے۔ کیونکہ فروا اور ندا تو آتی جاتی تھیں لیکن ان کی امی کبھی گھر سے باہر نہیں نکلی تھیں۔ انہوں نے جلدی سے دروازہ بند کیا اور انہیں لے کر سب سے پچھلے کمرے میں آگئیں۔

"بہن سب خیریت تو ہے نا؟" ان کے بیٹھتے ہی نبیہہ کی امی نے پوچھا تھا۔ وہ کچھ نہیں بولیں۔ بلکہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ آگے ہو کر انہیں تسلی دینے لگیں تبھی نبیہہ بھی آگئی۔ انہیں یوں دیکھ کر وہ بھی پریشان ہوگئی۔

"ہمیں آج کی رات پناہ چاہیے نبیہہ' کل صبح ہوتے ہی میں ان کو لے کر چلی جاؤں گی۔ کیا تم میری کچھ مدد کر سکتی ہو؟" ندا نے کہا تو نبیہہ نے بے ساختہ امی کی طرف دیکھا انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا نبیہہ کو تسلی ہوئی ورنہ وہ دل ہی دل میں خوفزدہ ہو رہی تھی کہ پتا نہیں امی جان کیا کہیں۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں!" امی کی رضامندی پاتے ہی وہ ایک دم سے ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ پھر وہ ان کے لیے چائے اور لوازمات لے گئی۔

"اتنا تکلف... یہ..." ندا نے کہا تو نبیہہ مسکرا دی۔

"یہ تمہارے لیے نہیں بلکہ آنٹی کے لیے ہے' وہ تو پہلی بار ہمارے گھر آئی ہیں نا۔" اس نے بسکٹ کی پلیٹ ندا کی امی کے آگے کی۔ تبھی کال بیل زور سے بج اٹھی۔ نبیہہ دیکھنے کے لیے اٹھنے لگی تو ندا نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"دیکھو! اگر باہر فقیہہ الدین صاحب ہوں تو ہمارا مت بتانا۔ میں تمہیں سب کچھ تسلی سے بتاتی ہوں۔" اس کا لہجہ ملتجیانہ تھا نبیہہ سر ہلاتے باہر نکل گئی۔ کوئی دس منٹ بعد اس کی واپسی ہوئی اور تب تک ان کی سانس خشک ہوتی رہی۔

"کون تھا؟" ان سے پہلے ہی نبیہہ کی امی نے پوچھ لیا

"انکل ہی تھے۔" اس نے لہجہ نارمل کرتے ہوئے بتایا۔

"میں نے بلو (ملازم) سے کہلوا دیا کہ سب لوگ شادی پر گئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے یقین کر لیا؟" ندا نے بے یقینی سے پوچھا۔

"نہیں!" نبیہہ نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔

"بہت بول کر گئے ہیں میں تو دروازے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی' خیر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ابھی ابا جی آئیں گے تو کچھ نہ کچھ اس مسئلے کا حل نکالیں گے تم لو نا یہ اور آنٹی آپ بھی ویسے ہی بیٹھی رہیں یہ سموسہ لیں نا...." اس نے زبردستی سموسے پہلے ندا کی امی اور پھر فروا کی پلیٹ میں رکھ دیا۔ لیکن وہ انہیں کھا نہ سکیں' دل تو پریشانیوں میں الجھا تھا۔ اتنے میں کال بیل دوبارہ بج اٹھی۔ ندا اور نبیہہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا "ڈرو مت' ابا جی ہوں گے۔" نبیہہ نے انہیں تسلی دی اور اٹھ کر باہر چلی گئی۔ اب کی بار ابا جی تھے لیکن ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ فقیہہ الدین انہیں راستے میں مل چکا ہے۔ نبیہہ کی ہمت نہ پڑی کہ کچھ پوچھے کیا پتا ان کا رد عمل کیا ہو اور اندر وہ تینوں بیٹھی تھیں۔ وہ ہولے سے سلام کر کے مڑی تھی کہ ابا جی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھک میں لے گئے۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔

"کیا مسئلہ ہے۔ کدھر ہے وہ لڑکی اور اس کی ماں اور بہن' فقیہہ الدین نے اغوا کا پرچہ کٹوا دیا ہے۔ ابھی آتے ہوئے گلی میں ملا ہے اور اس نے بہت بکواس کی ہے۔ میرا دماغ کھولا دیا ہے اس بدتمیز شخص نے۔" ابا جی بہت غصہ میں تھے۔ وہ جھوٹ نہ بول سکی۔

"وہ ادھر ہی ہیں۔ لیکن ابا جی انہیں پناہ چاہیے۔ صرف ایک رات کے لیے۔ کل صبح وہ یہاں سے چلی جائیں گی وہ شخص بہت غصہ میں ہے۔ مار ڈالے گا انہیں۔ پلیز ابا جی انسانیت کے ناتے۔" نبیہہ نے ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ سچ میں اپنی دوست کی مدد کرنا چاہتی تھی۔ ابا جی نے ٹہلتے ٹہلتے رک کر اپنی بیٹی کو دیکھا اور پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئے۔

"ابو بکر کو بلاؤ... فوراً"۔

"جی۔" وہ فوراً" باہر نکل آئی تھی۔

☆ ☆ ☆

"شاید آپ کو یاد ہو پھوپھو! بہت پہلے میں نے ایک درخواست کی تھی میں زرش سے نکاح کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن تب آپ نے غور نہیں کیا تھا شاید ابا جی سے بدمزگی کی وجہ سے لیکن میں ایک بار پھر آپ کے سامنے دامن پھیلا رہا ہوں۔ میں زرش کو سہارا دینا چاہتا ہوں۔ ان بچیوں کو باپ کی شفقت دینا چاہتا ہوں۔ پھوپھو زندگی کی شاہراہ پر زرش زیادہ دیر تک اکیلی نہیں چل سکے گی۔ ابھی تو آپ ہیں۔ اللہ آپ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے لیکن خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو کہاں جائیں گی یہ۔ دنیا جینے نہیں دے گی انہیں، آپ کچھ تو خیال کریں۔"

فقیہہ الدین ایک بار پھر دست سوال دراز کیے بیٹھے تھے۔ پھوپھو بڑی گہری نظروں سے ان کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کیا وہ جائیداد کے لیے ان کی بہو کو اپنانا چاہ رہے تھے؟ زرش ان کی بہو تھی، ان کی پوتیوں کی ماں تھی۔ پھر وہ ان کے سگے بھتیجے کی اولاد تھی۔ وہ بیوہ تھی لیکن خوب صورت اور صاحب جائیداد بھی تھی۔ کوئی بھی اس سے شادی کرنے کو تیار ہو جاتا۔

اور فقیہہ الدین بھی انہیں اسی لالچ میں مبتلا نظر آئے تھے۔ انہوں نے زرش کے گھر والوں کو بلا لیا اور ساری صورت حال ان کے سامنے رکھ دی۔ اور امی اس وقت شاکڈ رہ گئیں، جب بڑے بھیا بھابھی نے اس رشتے کی بھرپور حمایت کر دی۔ اور انہوں نے بڑے وثوق سے امی جان کو بھی سمجھا دیا۔ "پھوپھو کتنی دیر جئیں گی۔ اور امی اس کے بعد آپ نے سوچا ہے کہ زرش اور اس کی بچیاں کس طرح رہیں گی۔ زرش کم عمر ہے۔ اور اس پر خوبصورت اور صاحب جائداد بھی۔ بہت کٹھن ہو جائے گا اس کے لیے اکیلے رہنا۔

ابھی جذباتیت میں سب کچھ عجیب لگتا ہے۔ لیکن حقیقت بہت تلخ ہے کہ فقیہہ الدین جو اب عزت سے زرش کو اپنانے کے لیے تیار ہے جب موقع ملے گا اور اس کی خواہش نہیں پوری ہو گی تو وہ کیا نہیں کرے گا اور ویسے بھی ان حالات میں زرش سے جو بھی شادی کرے گا۔ وہ اس کی جائیداد کے لیے ہی کرے گا۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کسی کو کم لالچ ہو کسی کو زیادہ۔ تو پھر ہم فقیہہ الدین پر ہی اعتبار کر دیکھیں اپنا ہے کچھ تو شرم لحاظ کرے گا ہی اور بچیوں کا کیا ہے۔ جب وہ اپنی قانونی عمر کو پہنچیں گی تو واپس لوٹ جائیں گی۔ اور فقیہہ الدین اور زرش کو مزید کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ جذباتیت کو ایک طرف رکھ کر عقل سے کام لیں۔ یہی بہتر ہے ہمارے لیے بھی اور زرش اور اس کی بچیوں کے لیے بھی۔"

"امی کو مطمئن نہیں ہوئی تھیں لیکن پھر بھی کہا کچھ نہیں، جب زرش سے پوچھا گیا تو وہ تو آپے سے ہی باہر ہو گئی۔

"میں اپنا کما رہی ہوں۔ کسی پر بوجھ نہیں ہوں۔ پھر بھی سب لوگ اس طرح کی باتیں کر رہے ہیں۔ امی آپ تو جانتی ہیں میں شہریار کی جگہ اور کسی کو نہیں دے سکتی اور میری معصوم بچیاں.... کیا ان کے ذہنوں پر برا اثر نہیں پڑے گا۔ پلیز آئندہ کوئی مجھ سے اس ٹاپک پر بات نہ کرے۔" اس نے بات ختم کر دی۔ لیکن بات ختم ہوئی نہیں تھی۔ وہ لوگ تو واپس لوٹ گئے۔ لیکن اب پھوپھو کے سر پر یہ ہوا سوار ہو گیا تھا کہ انہیں کچھ ہو گیا تو زرش اتنے بڑے گھر میں اکیلی کیسی رہ پائے گی۔ کون اس کی دیکھ بھال کرے گا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے زرش کا برین واش کرنے لگیں۔ اور نتیجتاً زرش نے ہامی بھر ہی دی۔

ایک شام کو بڑی سادگی سے فقیہہ الدین اور زرش کا نکاح ہو گیا سب ہی آئے تھے۔ فقیہہ الدین اپنی ماں، بڑے بھائی اور بھابھی کے ساتھ آئے تھے۔ بری شاندار تھی۔ زیور بھی کافی بھاری تھا اور جوڑا بھی لیکن زرش نے کچھ بھی پہننے سے انکار کر دیا اور عام سے کپڑوں میں ہی نکاح کی رسم میں شامل ہوئی تھی۔ نکاح کے بعد پھوپھو نے بڑا اچھا ڈنر دیا تھا۔ فقیہہ الدین کی والدہ نے زرش کو ساتھ لے جانے کی فرمائش کی تھی۔ رسم دنیا تھی۔ لیکن زرش نے منع کر دیا۔ وہ یہ

ساری باتیں پھوپھو سے پہلے ہی کلیئر کر چکی تھی۔ وہ کبھی فقیہہ الدین کے گھر رہنے نہیں جائے گی اور نہ ہی کبھی فقیہہ الدین اسے مجبور کریں گے اور وہ اسی گھر میں سکونت پذیر رہے گی۔ فقیہہ الدین نے بڑی خوش اسلوبی سے معاملات کو سنبھالا اور گھر والوں کو واپس بھیج دیا۔ ان کا سامان انیکسی سے زرش کے کمرے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ مہمان کو مالکانہ حقوق حاصل ہو گئے تھے اور یہ خوشی ان کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ یہ گھر اور اس کی ملکیت فقیہہ الدین کا خواب تھی جواب پورا ہونے کی قریب تھا۔

فقیہہ الدین کے چہرے کا پہلا نقاب اترنے میں زیادہ دن نہیں لگے تھے۔ انہوں نے چند ہفتوں بعد ہی پھوپھو سے مطالبہ کر دیا تھا کہ یہ گھر ان کے نام کر دیا جائے۔

"فقیہہ الدین۔" انہوں نے حیرانگی سے اسے دیکھا تھا۔ انہیں اتنی جلدی توقع نہیں تھی کہ وہ اپنی اصلیت پر اتر آئے گا "آپ تو خفا ہو گئیں پھوپھو جان۔" وہ مکارانہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے ساتھ بیٹھی زرش کو بے چینی سے ہاتھ مسلتے دیکھ کر اندر ہی اندر لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"پھوپھو جان آپ نے اپنی بہو کا مستقبل تو محفوظ کر دیا۔ لیکن میں؟ میرے سر پر تو چھت بھی نہیں۔ کل کلاں کو آپ کو کچھ ہو گیا تو آپ کی بہو اور پوتیاں تو مجھے دھکے دے کر نکال باہر کریں گی۔ اور میں ہو جاؤں گا دھوبی کا کتا۔ تو پلیز پھوپھو میری عمر بھر کی محبت اور خدمت کا یہ صلہ تو نہ دیں مجھے۔ کچھ تو لاج رکھیں۔ میں نے ہمیشہ آپ کی خدمت کی ہے۔ کچھ تو صلہ دیں ناں مجھے۔" فقیہہ الدین اس وقت لالچ کے شیرے میں لتھڑا رس گلا لگ رہے تھے۔

"میرے جیتے جی تو نہیں ہو سکتا فقیہہ الدین!" پھوپھو نے قہر آلود نگاہوں سے اس شخص کو دیکھا تھا۔ جو انہیں ڈسنے کے درپے ہو چکا تھا۔

"یعنی آپ چاہتی ہیں کہ میں آپ کو مار ڈالوں؟" اس نے بے حد سفاکی سے کہا تھا۔ زرش کا رواں رواں کانپ اٹھا۔

"یا اللہ اتنے گھناؤنے لوگ بھی ہیں اس دنیا میں۔"

"یا پھر آپ کی پوتیوں میں سے کسی ایک کو... نہ، نہ، نہ مجھے ایمبیسی سے ڈرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کو تو بس اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ ماں نے دوسری شادی کے لیے رکاوٹ ختم کر ڈالی۔"

"تم اتنے کمینے اور گھٹیا ہو گے فقیہہ الدین میں نے سوچا تو تھا فقیہہ الدین لیکن میں نے یہ بھی سوچا تھا تمہاری رگوں میں ایک شریف باپ کا خون ہے۔ لیکن یہ بھول گئی کہ باپ کے ساتھ تمہاری ماں کا بھی تو خون شامل ہے۔ چھی میں اس وقت کو کوس رہی ہوں جب میں نے اپنی پھول سی بچی کو تمہارے حوالے کرنے کا سوچا۔ کاش میں اسے مجبور نہ کرتی۔ لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ تم ابھی اسی وقت اس گھر سے نکل جاؤ اور فوراً" سے پیشتر میری بچی کو طلاق دے دو۔ تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔ اٹھو زرش۔" وہ زرش کو لے کر اٹھ گئی تھیں لیکن فقیہہ الدین نے اپنی کمینگی کا دوسرا ثبوت بھی دے ڈالا۔ اس نے دونوں بچیوں کو یرغمال بنا لیا۔

"یہ گھر میرے نام ہو گا۔ ابھی اور اسی وقت بڑی بی۔ اور اس کے بعد زرش کے نام کی گئی جائداد کا ففٹی پرسنٹ بھی۔ ورنہ یہ دونوں معصوم کلیاں بن کھلے ہی مرجھا جائیں گی۔

"ایسا تو آپ یقیناً" نہیں چاہیں گی۔ دیکھیں نا... آپ تو پہلے ہی دکھوں کی بہت بڑی فصل کاٹ رہی ہیں۔ مزید کچھ بھی سہنے کا حوصلہ نہیں ہو گا آپ میں۔ اس لیے آج کے بعد... اس گھر میں وہی ہو گا جو میں چاہوں گا۔ کاغذات پر سائن کرتی ہیں یا...!" اس نے تیز دھار چاقو ہوا میں لہرایا۔ زرش تو یہ دیکھتے ہی حواس کھو بیٹھی تھیں کہ دونوں بچیاں فقیہہ الدین نے چھری کی نوک پہ رکھی ہیں اور ان کے پاس اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ سوائے سائن کرتے ہی بنی۔

"آپ بہت اچھی ہیں پھوپھو اور سمجھ دار بھی۔ چلو بیٹا مما کو پانی پلاؤ۔" اس نے بچیوں کو دھکیلا۔ وہ چیخ

چلاتی بے سدھ پڑی ماں سی لپٹ گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

سب کچھ اتنا اچانک ہوا تھا کہ ندا کو سمجھ ہی نہ آیا۔

"یہ بہت ضروری ہے!" نبیہہ نے اس کے ہاتھ دبائے تھے۔

"لیکن میں... ان سے۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

"کاغذی کاروائی ہے۔ دیکھو... بھائی بہت دنوں سے تمہاری بڑی بہنوں سے رابطہ کرنے کی کوشش میں تھے اور خدا کا شکر ہے کہ رابطہ ہو گیا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ فی الفور نہ تو وہ یہاں آسکتی ہیں اور نہ ہی تم وہاں جا سکتی ہو۔ آنٹی نیشنلٹی ہولڈر ہیں 'مسئلہ تم دونوں کا ہے جتنے دن تمہاری بہنوں کو یہاں آنے میں لگیں گے اتنے دن تم کہاں رہو گی خصوصاً" اس صورت میں جبکہ انکل نے اغوا کا کیس کر دیا ہے۔ تو یہ تمہاری سیکورٹی کے لیے ہے اور ہماری بھی 'اس لیے پلیز مطمئن ہو جاؤ۔ تمہارے ساتھ کچھ غلط نہیں ہونے جا رہا۔" نبیہہ نے دوستی کا حق پوری طرح نبھایا تھا۔ دونوں بہنوں کا نکاح اسی شام ابا جی نے اپنے بیٹے اور بھتیجے سے کر دیا تھا' کن شرائط پر ان سے کوئی بھی واقف نہ تھا۔ لیکن فی الحال ان دونوں بہنوں کو سیکورٹی مل گئی تھی۔ امی جان کے لیے ابوبکر نے ایمبیسی سے رابطہ کر لیا تھا اور یوں ان کو بھی پروٹیکشن مل گئی تھی۔ ابا جی نے انہیں اپنے اندرون شہر والے گھر میں منتقل کروا دیا تھا راتوں رات اور یوں صبح جب فقیہہ الدین پولیس لے کر ان کے گھر پہنچا تو پولیس کو کچھ بھی نہ ملا تھا۔ لیکن وہ مطمئن نہیں تھے۔ انہیں یقین تھا کہ ان تینوں کو اس گھر کے علاوہ اور کہیں پناہ نہیں مل سکتی تھی اور وہ اندر ہی کہیں چھپی ہوئی ہیں۔ لیکن سر توڑ کوشش کے باوجود انہیں کوئی سراغ نہ مل سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

زندگی پوری سفاکی سے اس پر عیاں ہوئی تھی۔ رشتے اس قدر گھناؤنے اور سفاک بھی ہو سکتے ہیں یہ اس نے کبھی نہ سوچا تھا۔ شہریار' معید اور اب پھوپھو کو کھونے کے بعد اسے حقیقتاً" لگ رہا تھا وہ کھلے آسمان کے نیچے تپتا سورج اوڑھے کھڑی ہے اور کہیں کوئی ابر کرم بھی نہیں۔ اس کی تو شکل ہی بدل کر رکھ دی تھی فقیہہ الدین نے 'مکان اپنے نام کرواتے ہی وہ انہیں ایک کرائے کے گھر میں منتقل کر گیا تھا اور پھوپھو اس صدمے سے ایسی گریں کہ پھر اٹھ ہی نہ سکیں۔ شدید فالج کا اٹیک ہوا 'اور چند دن ہاسپٹلائزڈ ہونے کے بعد اگلے جہاں سدھار گئیں۔ وہ فقیہہ الدین کے ظلم سہنے کو تنہا رہ گئی۔ اب تو اسے اور طرح کا خوف آنے لگا تھا۔ بچیاں جیسے جیسے بڑی ہو رہی تھیں اس کی راتوں کی نیند اڑتی جا رہی تھی۔

پھر اس نے بڑے بھیا سے رابطہ کیا اور انہیں ساری صورت حال بتا دی۔ وہ خوف جو اسے ہولائے دے رہا تھا۔ بھیا تو حق دق رہ گئے۔ اس قدر ذلالت کی توقع تو شاید کسی کو بھی نہیں تھی فقیہہ الدین سے 'انہی دنوں اسے پتا چلا کہ وہ پھر امید سے ہے۔ وہ کسی صورت مزید بچے پیدا کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ جو حالات تھے ان میں تو وہ تینوں ہی بڑی مشکل سے جی پا رہی تھیں۔ اگرچہ حوریہ اور زارا کا سارا خرچ باہر سے آتا تھا۔ لیکن پھر بھی زندگی جس موڑ پر کھڑی تھی۔ مزید بچے پیدا کرنے کا تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ لیکن اس کی ہمت نہیں پڑی کہ وہ اس بچے کے ساتھ کچھ بھی ناروا کرے۔ وہ تو پہلے ہی آزمائشوں کی زد میں تھی مزید اللہ تعالیٰ کو ناراض نہیں کر سکتی تھی۔ سو اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا۔ فقیہہ الدین کو جان کر کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ جیسے ان سب سے اس کا کچھ لینا دینا نہ ہو۔ وہ تو کبھی کبھار اپنی بھوک مٹانے آتا تھا اور اس کا اس گھر سے یا کسی بھی فرد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ندا کے بعد فروا کی آمد نے اسے بالکل ہی نڈھال کر دیا۔ اس نے سوچا تھا شاید ایک بیٹا ہو جائے تو اس کی زندگی شاید کچھ سہل ہو جائے۔ لیکن۔

زندگی کچھ اور مشکل ہو گئی تھی۔ گھر کے گزارے کے لیے اس نے سلائی کرنا شروع کر دی۔ کچھ حوریہ اور زارا کے آجاتے تھے یوں زندگی کی گاڑی رواں دواں ہو تو گئی تھی۔ لیکن یوں کہ جیسے ناؤ میں سو چھید ہوں اور ناؤ گھسیٹنا بھی بہت ضروری ہو۔ یوں غموں کے سمندر میں زرش نے کشتی کو بچاتے بچاتے اک عمر بتا دی تھی۔ حوریہ اور زارا انگلینڈ جا چکی تھیں۔ ان کا فون آجاتا۔ اسے حوصلہ ہو جاتا۔ ندا اور فروا تھیں۔ جن کو ان کے باپ نے کبھی تسلیم نہ کیا تھا' پیار کیا کرنا۔ وہ تو شاید بس اس کی باقی ماندہ جائداد جو اس نے ندا اور فروا کے نام کر دی تھی۔ حاصل کرنے کے چکر میں تھا۔ انہی دنوں بڑے بھیا کا فون آیا تھا وہ اپنے دونوں بیٹوں کے لیے حوریہ اور زارا کا ہاتھ مانگ رہے تھے۔ اسے اور کیا چاہیے تھا۔ اس نے فوراً" ہاں کر دی تھی۔ اشعر انجینئرنگ پڑھ رہا تھا اور سلمان ڈاکٹر بن گیا تھا۔ بھیا بھی پچھلے کئی سالوں سے قطر میں مقیم تھے۔ بھابھی بھی اب کافی حد تک بدل گئی تھیں۔

ہفتے میں ایک آدھ بار فون کر لیا کرتیں۔ چھوٹا البتہ مکمل طور پر سسرالیوں کا ہو گیا تھا۔ شادی ہوئی تھی تو پلٹ کر نہ دیکھا تھا۔ بیوی کے ساتھ' سال بعد ہی اس کے باپ کے گھر شفٹ ہو گیا تھا۔ اماں ابا اس کے غم میں گھل گئے تھے۔

کبھی کبھی وہ سوچتی تھی زندگی کن لوگوں کے لیے خوشی کا باعث ہوا کرتی ہے۔ اس کی تو اپنی شادی شدہ زندگی' سوائے شہریار کے ساتھ کے ایک کانٹوں بھرا بستر ہی لگا کرتی۔ فقیہہ الدین تو جانے کس گناہ کی پاداش میں اس پر مسلط ہوا تھا۔ وہ تو رو رو کر معافیاں مانگ چکی تھی۔ اللہ سے اپنی کردہ ناکردہ گناہوں کی' لیکن سزا تو ختم ہونے میں ہی نہ آرہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کتنے دن ہو گئے تھے ان دونوں کو اس گھر میں۔ نبیہہ کے ابا جی نے ضرورت کی ہر شے انہیں اس گھر میں مہیا کر دی تھی۔ وہ ان کا خیال سگوں سے بڑھ کر رکھ رہے تھے۔ فروا کو تو معاذ رخصت کرا کے لے گیا تھا۔

وہ اس رشتے پر خوش تھا۔ تن تنہا تھا۔ گھر والی کی ضرورت تھی۔ سو اس نے فروا کو جی جان سے قبول کر لیا تھا۔ فروا بھی خوش تھی۔ ندا کیا چاہتی تھی یہ کسی نے نہ پوچھا تھا اور سچ تو یہ تھا کہ اس نے خود بھی کبھی نہ سوچا تھا۔ پریشانی اور فکر میں وہ تقریباً" بھول ہی چکی تھی کہ اس کی زندگی کسی اور کے نام لکھ دی گئی ہے۔ اگر کبھی ذہن میں خیال آیا بھی تو حالات کا فیصلہ سمجھ کر کبھی سنجیدگی سے نہ لیا تھا۔ نبیہہ نے انہیں پروٹیکشن دی تھی۔ کسی بھی طریقے سے اور وہ اپنی عظیم دوست سے اور کسی بھی طرح کا فیور نہیں چاہتی تھی۔ وہ تو یہ بھی نہیں جانتی تھی کہ اگر امی جان انگلینڈ چلی گئیں تو وہ کیا کرے گی۔ کہاں رہے گی اور کس کے سہارے۔"

ابوبکر نے اگرچہ حالات کے پیش نظر باپ کی حکم عدولی نہ کی تھی۔ لیکن ظاہر سی بات تھی وہ ساری عمر نبیہہ کی دوستی نبھانے کے لیے ندا کا طوق اپنے گلے میں کیوں ڈال لیتا۔ یہ بھی احسان تھا کہ وہ اسے تحفظ دینے کے خاطر مان گیا تھا۔ وہ اس کے بارے کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے سختی سے اپنے دل کا دروازہ بند کر لیا تھا لیکن اس رات جب فروا معاذ کے ساتھ ملنے کے لیے آئی تو اس کی آنکھوں کی چمک اس قدر زیادہ تھی کہ اس کا پورا وجود لودیتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی ہنسی اتنی خوب صورت ہو گئی تھی کہ ندا اسے دیکھتی رہ گئی۔

"خوب صورت ہو گئی ہوں نا؟" وہ ایک بار پھر ہنسی۔ اتنا اعتماد تھا اس کی بات میں کہ وہ اثبات میں سر ہلا گئی۔

"محبت ... میری بہن محبت!" فروا نے اسے کندھوں سے تھام کر کہا۔ "تمہیں بھی ہو جائے گی محبت .... جب ابوبکر بھائی تمہیں رخصت کرا کے لے جائیں گے۔ اور پھر تمہارے دل سے ہر خوف اڑ جائے گا تمہیں احساس ہو گا کہ زندگی کتنی خوب صورت ہو جاتی ہے جب کسی کی محبت اس میں رنگ بھرتی ہے۔ معاذ بہت اچھے ہیں۔ مرد کا یہ روپ بھی

ہوتا ہے۔ میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔ بچپن سے بس ابا جی کو ہی دیکھا اور یہی خیال ذہن میں رچ بس گیا تھا کہ سارے مرد ابا جی ہی جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن معاذ کو پا کر ایسا لگا کہ نہیں ایسا نہیں ہے۔ اور... کیا ہوا؟"

بولتے بولتے اسے ندا کی بے پناہ خاموشی کا احساس ہوا تھا۔ ندا نے نفی میں سر ہلا کر بے حد آہستگی سے اس کے ہاتھ ہٹائے اور اندر آ گئی۔ اسے ایک دم سے اپنا آپ خالی خالی لگنے لگا تھا۔ واقعی! محبت اس طرح بے رنگ زندگی میں رنگ بھرتی ہے کہ سب کچھ ہی بدل جاتا ہے۔ اور وہ بھی ایک فرد کی محبت؟ اس نے مرد کا بہت بھیانک روپ دیکھا تھا۔ ایک باپ کی حیثیت سے ایک شوہر کی حیثیت سے ایک دیور کی حیثیت سے اسے یاد تھا جب فقیہہ الدین کے بڑے بھائی کی ڈیتھ ہوئی تو وہ انہیں چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ مہینوں ان کی خبر نہ لی تھی۔ فروا ان دنوں بہت چھوٹی تھی۔ چھوٹی تو وہ بھی تھی کہ لیکن حالات نے اسے بہت بڑا کر دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے ایک ایک زخم کو اپنے دل پر محسوس کرتی تھی۔ فقیہہ الدین جب بھی گھر آتا اس کی ماں اپنے آپ کو ایک نئے زخم کے لیے پیش کر دیتی۔ اور وہ صرف زخم ہی نہیں دیتا بلکہ اس پر خوب نمک بھی چھڑکتا تھا۔

اس نے اپنی ماں کو ساری ساری رات روتے دیکھا تھا۔ کسی انہونی کے خوف نے ان کا سارا سکون چھین لیا تھا۔ جب تک حوریہ اور زارا یہاں سے چلی نہ گئی تھیں۔ وہ بے سکون ہی رہی تھیں اور اسے وہ دن بھی یاد تھا۔ جب وہ اپنی بھاوج اور بچوں کو لے کر انہی کے گھر، جو اس نے بہت پہلے ان سے خالی کروا لیا تھا، میں شفٹ ہو گیا تھا۔ اور اس کے شب و روز وہیں گزرنے لگے تھے۔ وہ کم عمر تھی۔ اسے ان سرگوشیوں کی سمجھ نہیں آتی تھی۔ جو محلے والیاں آ آ کر امی سے کرتیں، لیکن گزرتے وقت نے اسے یہ سمجھ بھی دے دی تھی اور اس روز اس کی نفرت میں اضافے کے ساتھ ساتھ اس کے دل میں کراہیت بھی جاگی تھی۔ اس کا بس چلتا تو ولدیت کے خانے سے ان کا نام تک کھرچ ڈالتی۔

اس نے بہت دفعہ سوچا تھا کہ اس ظالم شخص سے ماں علیحدہ کیوں نہیں ہو جاتیں اماں۔ اپنی سوچ کو اس نے زبان دی تھی اور اس نے بالآخر ماں سے کہہ ڈالا تھا۔ "ہم اب کون سا ساتھ ہیں، علیحدہ ہی ہیں۔" انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری تھی۔

"یہ ظلم کیوں سہہ رہی ہیں آپ؟ چھوڑ دیں اس شخص کو کیوں اب تک آپ یہ رشتہ نبھا رہی ہیں؟"

"میرا نصیب یہی ہے۔ کہاں بھاگ کر جاؤں۔ تم مت سوچا کرو۔ زندگی پتا نہیں کتنی باقی رہ گئی ہے۔ ایک بار بیوگی کی چادر اوڑھ چکی ہوں، دوبارہ مطلقہ کا داغ کیوں لگواؤں۔ اس کو چھوڑ کر بھی کونسا زندگی پھولوں سے بھر جائے گی۔ یہ زندگی اسی طرح رہنی ہے۔ تو پھر چلنے دو۔ کون دو دھاری تلوار پر چلے۔ دنیا کسی طرح جینے نہیں دیتی۔ میری بچیاں ہیں۔ بہت کچھ کرنے سے پہلے مجھے ان کے بارے میں سوچنا پڑتا ہے۔ میں تو بس اللہ سوہنے سے یہ دعا کرتی ہوں کہ وہ تمہارے نصیب خوشیوں سے بھر دے۔ میرے دکھوں کی ذرا سی بھی آنچ تم بچیوں تک نہ پہنچے۔" انہوں نے ایک بار سب کچھ اپنے اندر ہی اتار لیا تھا۔

"اور ابوبکر..." سوچ کا دھارا اس شخص کی طرف مڑا۔ جسے ایک حادثے نے اس کی زندگی کا ساتھی بنا ڈالا تھا۔ وہ کیسا ہو گا؟ کیا فقیہہ الدین جیسا یا پھر معاذ جیسا؟ اور کیا پتا وہ اس تعلق کو رکھنا بھی چاہے یا نہیں۔ اسے تو یاد نہیں پڑتا تھا کہ کبھی اس نے ندا کو ایسی نظر سے دیکھا ہو۔ اس کے دل میں کیا تھا۔ وہ کب جانتی تھی اور نبیہہ سے پوچھنے کی ہمت نہ تھی اس میں نبیہہ کے ابا جی کسی ملازم کے ہاتھ ہی ضرورت کی اشیاء بھجواتے تھے۔ خود نہ تو نبیہہ اور نہ ہی کوئی اور ان کے گھر سے کبھی آیا تھا۔ نبیہہ کا فون البتہ ضرور آتا تھا۔ اور نہ آنے کی وجہ بھی وہ یہی بتاتی تھی کہ فقیہہ الدین کہیں ان کا پیچھا کرتا ہوا ادھر نہ پہنچ جائے۔

اس دن صبح ہی صبح کوئی آن دھمکا۔ بیل اتنے زور سے بجی تھی کہ امی جو فجر کے بعد لیٹی تھیں، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ ندا کا دل بھی زور سے دھڑکا۔ کہیں وہ جان تو

نہیں گئے کہ وہ ماں بیٹی یہاں چھپی بیٹھی ہیں۔ [illegible] دوبارہ بجی تھی۔

"میں دیکھتی ہوں۔" اسے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر امی جان جلدی سے چارپائی سے اتری تھیں۔ ندا کی آنکھوں میں استفہام تھا۔ لیکن وہ نظر انداز کرتی دروازے کی طرف بڑھ گئیں اور پھر پہلی بار زندگی میں بے خوف ہو کر بنا پوچھے انہوں نے دروازہ کھول دیا تھا۔ کیا ہو گا.... زیادہ سے زیادہ ایک گولی' تو چلو یونہی سہی۔

"السلام علیکم آنٹی۔" اجنبی آواز پر انہوں نے نگاہیں اٹھائیں۔ ندا لپک کر آئی تھی اور پہلی بار اسے اپنے قدم من من بھر کے محسوس ہوئے تھے۔ وہ وہیں ساکت رہ گئی تھی۔

"وہ سوری.... شاید آپ کو میرا آنا برا لگا۔" ابوبکر نے ان ماں بیٹی کو ساکت دیکھا تو خفت سے بولے تھے۔

"نن.... نہیں بیٹا۔ آپ آئیں۔" امی جان جیسے ہوش میں آتے ہوئے بولیں۔ انہوں نے راستہ دے کر سائیڈ پر کھڑی ندا کو اشارہ کیا تھا۔ لیکن وہ تو ایک ٹک ابوبکر کو گھورے جا رہی تھی۔ فروا کی باتیں ذہن میں گونجنے لگی تھیں۔ "محبت.... محبت۔" پھر جیسے کسی نے زور سے دل میں کچھ چبھو دیا۔ وہ اس پر ذرا بھی دھیان دیے بنا پاس سے گزر کر امی کے ساتھ جا کر برآمدے میں بیٹھ گئے تھے۔ اور اب آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہے تھے۔ امی جان کی آنکھوں سے تو اتر سے آنسو بہنے لگے تھے۔

"کیا۔ کیا کہہ رہے تھے وہ؟" وہ بھاگ کر پاس آئی۔ لیکن تب تک ابوبکر اٹھ کر کھڑے ہوئے تھے۔ ہاتھ میں پکڑے کاغذات انہوں نے امی جان کے ہاتھ میں تھما دیے تھے پھر خدا حافظ کہہ کر پہلے کی طرح بنا اس کو دیکھے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔

اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ تو کیا ابوبکر نے یہ نام نہاد رشتہ ختم کر دیا تھا؟ ایک بے نام سی خلش نے اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔ اس کی ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کر ماں سے اس کے رونے کا سبب دریافت کرلے۔ چپ چاپ کمرے میں آکر لیٹ گئی۔ اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا گو کہ اس نے کبھی ابوبکر کے حوالے سے خود کو سوچنے نہیں دیا تھا اور وہ کسی ایسے ہی انجام کے لیے تیار تھی' لیکن پتا نہیں کیوں دل کھنچا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار پانی بھر آیا۔ اور وہ تکیے میں منہ دیے رونے لگی۔ امی جان نے اسے روتے دیکھا تو چپ چاپ پلٹ گئیں اور اس رات اس نے اپنی ڈائری کا آخری ورق لکھا تھا۔ اور تہیہ کیا تھا کہ آج کے بعد نہ تو وہ روئے گی اور نہ ہی کبھی ڈائری لکھے گی۔ ابا کے سارے ظلم و ستم وہ اسی ڈائری میں تحریر کرتی آرہی تھی۔ ورنہ تو شاید اس کا دماغ کبھی کا پھٹ گیا ہوتا۔

"کیا کہہ رہی ہیں امی آپ؟" اگلی صبح اس کی آنکھ فروا کی آواز سے کھلی تھی۔

"ہاں۔ کل ابوبکر آئے تھے۔" امی کی دھیمی سی آواز آئی۔ وہ اٹھ بیٹھی فروا اتنی صبح کیسے آئی تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانکا۔ معاذ بھی ہمراہ تھا تو کیا امی نے انہیں خود بلایا تھا۔ یہ سب بتانے کے لیے' اس کو عجیب خفت سی ہونے لگی۔ ٹھکرائے جانے کا احساس ہی جان لیوا ہوتا ہے۔ کیا تھا ابوبکر جو آپ بھی معاذ کی طرح اس رشتے کو نباہ لیتے۔ اس کے دل میں پھر دکھ کروٹ لینے لگا تھا اور تبھی اسے بہت پہلے نبیہ کی کہی بات یاد آگئی اس نے بتایا تھا کہ سنی بھائی کسی لڑکی کو بہت زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لیکن ابا جی ان کی وہاں شادی کرنے کے لیے رضامند نہیں ہیں۔

"ٹھیک ہے!" اس نے اپنے آپ کو تسلی دی۔

"ندا.... ندا۔" فروا آواز دیتی اندر آرہی تھی۔ اس نے جلدی سے خود کو سنبھالا اور پلٹ کر بستر کی چادر ٹھیک کرنے لگی۔ کیوں لگتا ہے ایسا کبھی کبھی کہ آپ کے دل کی حالت چہرے سے عیاں ہو رہی ہے؟ اور یہ خوف دامن گیر کہ کوئی جان نہ لے' خواہ وہ آپ کا کتنا ہی اپنا کیوں نہ ہو۔ وہ بھی فروا کے سامنے بے نقاب نہیں ہونا چاہتی تھی۔

"تم چل رہی ہو؟" اس نے اندر آتے ہوئے پوچھا

تھا۔

"کہاں... اتنی صبح... خیر ہے؟" وہ بشاشت سے بولی تھی۔

"جنازے کے لیے... امی کہتی ہیں کہ ہمیں کم از کم آخری بار ان کا دیدار کرلینا چاہیے۔ جیسے بھی تھے۔ باپ تھے کم از کم دنیا کی نظروں میں۔"

"کیا...؟" وہ جیسے گہری نیند سے بے دار ہوئی تھی۔

"تمہیں نہیں پتا۔ کل اباجی کو انہی کے بھتیجے نے قتل کردیا۔ غصے میں آکر' ان کا انجام شاید یہی تھا۔" اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ کوئی اچھی یاد کوئی پدرانہ شفقت کا لمحہ۔ جو اسے رونے پر مجبور کردے۔ لیکن کہیں ایسا کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ آخری بار دیکھنے کو تیار ہو گئی۔ کیسے ہوتے ہیں فرعونوں کے چہرے' جب وہ اپنی ہی فرعونیت تلے دب جاتے ہیں۔ منوں مٹی ان کا غرور ریزہ ریزہ کردیتی ہے اور وہ بھی ایک مٹھی خاک رہ جاتے ہیں۔ ہوا کے ذرا سے جھونکے سے اڑ جانے والے۔ بے بس لاچار...؟

اور فقیہ الدین کی کفن میں لپٹی لاش انسان کی اصل حقیقت بتا رہی تھی۔ اس کا چہرہ عجیب بھیانک دکھ رہا تھا۔

رشنا تائی بین کرتی سینہ پیٹ رہی تھیں۔ وہ تو ہر طرف سے خالی ہاتھ رہ گئی تھیں۔ بیٹا بھی جیل چلا گیا تھا اور لوگوں کی چہ مگوئیاں۔ وہاں بیٹھنا دشوار تھا۔ اس لیے وہ جلد ہی وہاں سے اٹھ آئیں۔ شاید وہ جو زمین پر خدا بن بیٹھتے ہیں ان کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ امی کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اور وہ دونوں بھی خاموش ہی تھیں۔

"نبیہہ کے گھر سے ہوتے چلیں۔" فروا نے کہا تھا۔

"ہاں چلو بھائی صاحب کا شکریہ بھی ادا کردوں۔ موقع ہی نہ ملا بہت ساتھ دیا انہوں نے ہمارا' بہت احسانات ہیں ان کے ہم پر۔" امی نے کہا تو وہ سٹپٹا گئی۔ ابوبکر نے نکاح ختم کردیا ہے اور امی اسے ان کے گھر لے جانے پر تیار۔

"امی جان میں کیسے؟" اس نے منع کیا۔

"تمہاری دوست کا بھی تو گھر ہے۔ اور تمہیں بھی اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔ بہت نبھائی ہے اس نے دوستی۔" فروا نے کہا لیکن اس کا دل تیار نہیں تھا۔

"امی آپ مجھے گھر کی چابی دیں۔ میں کچھ دیر ادھر بیٹھ جاؤں گی۔" اس نے فیصلہ کیا۔ امی نے بحث نہیں کی اور چابی اسے پکڑا دی۔ وہ دونوں نبیہہ کے گھر کی طرف بڑھ گئیں۔ اس نے دروازہ کھولا تو ایک بار پھر ماضی کی تلخ یادیں اس کو ستانے لگیں۔ اسے یاد آگیا۔ کیسے ایک بار وہ تین ماہ تک اس کا کرایہ نہ دے سکی تھیں۔ مالک مکان نے جینا حرام کردیا تھا اور تبھی امی نے اپنے باقی ماندہ زیورات بیچ کر اس مکان کو خرید لیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی انہوں نے مالک مکان سے درخواست بھی کی تھی کہ وہ اس بات کا پتا فقیہ الدین کو نہ چلنے دے۔ اور اس نے زبان بندی کا وعدہ کرلیا تھا۔ فقیہ الدین تو ویسے بھی چار چار ماہ ان کی خبر نہ لیا کرتا تھا' نہ ہی اسے اس بات کی پروا تھی کہ آخر وہ اپنی زندگی کیسے گزار رہے ہیں۔ اس نے ایک ایک چیز جھاڑی۔ مٹی صاف کی اور صحن میں رکھی چارپائی پر لیٹ گئی۔ آزادی کا احساس کتنا روح پرور ہوتا ہے تم نہیں فقیہ الدین کے ظلم و ستم سے نجات مل گئی تھی۔ اب وہ آزادی سے اپنی زندگی گزار سکتی تھیں... عزت کی زندگی۔ انہوں نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہ کی تھی کہ اپنے ہی بھتیجے نے ان کا قتل کیوں کرڈالا؟ ایک رسم دنیا نبھانی تھی سو نبھا ڈالی اور ابوبکر... خیال کا دھارا پھر اس شخص کی طرف مڑ گیا۔

"ہے بدتمیز لڑکی یہ کیا طریقہ ہے۔ یہاں کیوں آگئیں؟" نبیہہ فوں فوں کرتی اندر داخل ہوئی تھی۔

"آجاؤ۔" وہ اٹھ بیٹھی بس دل چاہ رہا تھا اس گھر سے۔ بہت ساری یادیں وابستہ ہیں نا۔ میں نے کہا دیکھتی چلوں۔ تم سناؤ کیسی ہو؟ میں نے تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا تمہاری وجہ سے آج ہم زندہ ہیں... اوکے شٹ اپ! زندگی عزت' موت' ذلت سب کچھ اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔" نبیہہ نے اس کی بات کاٹی تھی لیکن اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "وہ میں ابوبکر

صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ اگر اس وقت وہ مجھ سے نکاح نہ کرتے تو شاید آج میں اس قاتل کی بیوی ہوتی..... بہر حال تم میری طرف سے ان کا شکریہ ادا کر دینا اور تمہارا احسان بھی میں زندگی بھر نہ بھولوں گی۔" وہ سر جھکائے بولے جا رہی تھی۔

"تمہیں ہو کیا گیا ہے پاگل؟" نبیہہ نے اس کا سر اوپر اٹھایا۔

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ نچلے ہونٹ کا داہنا کونا دانتوں میں دبائے وہ جانے کس کرب کو لبوں تک آنے سے روک رہی تھی۔ شاید باپ کی موت کا دکھ۔ کچھ بھی تھا' آخر کو باپ ہی تھا۔

"سنو! بتاؤ مجھے۔ انکل کی وفات پر رو رہی ہو یا کوئی اور دکھ..... جلدی بولو..... جلدی اس سے پہلے کہ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جائے اور میں بھیا کو بلاؤں پھر وہ خود ہی تمہاری اشک شوئی کریں گے۔" اس نے مسکراتے ہوئے دھمکی دی تھی۔

ندا نے عجیب سی نظروں سے اپنی دوست کو دیکھا پھر سر جھکا کر بولی۔

"وہ میری اشک شوئی کیوں کریں گے۔ اور کس ناتے سے؟

"کس ناتے سے؟ شاید تم بھول رہی ہو۔ تمہارے سب حقوق وہ اپنے نام لکھوا چکے ہیں۔" اس نے آنکھیں دکھائیں۔

"زبردستی اور مجبوری کے رشتے دیرپا نہیں ہوتے۔ میں ان کی احسان مند ہوں کہ انہوں نے مجھے تمہاری دوست ہونے کے ناتے شیلٹر فراہم کیا اور اب شاید اس کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ وہ وجہ ہی ختم ہو گئی۔ اور اسی لیے انہوں نے کل رات ابا کے ختم ہوتے ہی طلاق کے کاغذات بھی دے دیے۔ بہر حال اگر اس رات یہ مجھ سے نکاح نہ کرتے تو شاید میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑ رہی ہوتی۔ گھر سے بھاگنے کے جرم میں۔" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ جسے اس نے منہ دوسری طرف کر کے چھپایا' ساری عمر بھاگتے ہی گزر گئی تھی۔ کبھی کسی سے فرار تو' کبھی کسی سے' حد ہو گئی تھی کہیں کوئی ٹھکانہ' کوئی سرائے ہو تو سہی۔ بندہ کچھ دیر رک کر ستا لے۔ نبیہہ نے حیرانی سے اس کی باتیں سنی تھیں اور چپ چاپ لوٹ گئی تھی۔ ایسا کس طرح ہو سکتا تھا۔ وہ اپنے بھائی کی بے چینیوں سے واقف تھی گواہ تھی۔ وہ کیسے اس سر پھری لڑکی کے عشق میں مبتلا تھا۔ اور جب ابا جی نے بلا کر اسے اچانک ندا سے نکاح کرنے کا کہا تھا تو اس کی جو کیفیت تھی وہ بیان نہیں کی جا سکتی تھی۔ ندا اس کی ہو گئی تھی اس احساس نے اسے کئی راتیں جگائے رکھا تھا۔ وہ ساری ساری رات اس کے بارے سوچتا تھا اور صبح اٹھ کر نبیہہ سے ایک ہی سوال کرتا تھا۔

"حالات ٹھیک ہوتے ہی کہیں وہ طلاق نہ مانگ لے۔ میں جانتا ہوں وہ مجھے پسند نہیں کرتی۔" خدشات اس کے لبوں پر آتے تو نبیہہ ہنس پڑتی۔

"آپ مت دیجیے گا طلاق۔ وہ سر پھری ہے تو آپ بھی ضد پر اڑ جائیں۔"

"نہیں زبردستی میں مزا نہیں۔ میں محبت کے جواب میں ڈبل محبت لینے کا خواہش مند ہوں۔ یہ صبر' جبر اوں..... ہوں..... مجھ سے نہیں ہو گا۔" وہ منہ بناتا۔

وہ ایک دم سے بڑی اماں بن کر سمجھانے بیٹھ جاتی۔

"اتنی پاگل نہیں ہے وہ بھی' بلاوجہ کے خدشوں سے دل خراب مت کریں۔ میں منالوں گی اسے حالات ٹھیک ہو جائیں پھر آپ مجھے لے چلنا اس کے پاس۔ وہ دل کی بہت نرم ہے' ضرور نکاح کے بعد اس نے آپ کے بارے میں سوچا ہو گا۔ اللہ تعالیٰ نے نکاح کے بولوں میں بڑی تاثیر رکھی ہے بھیا۔" اور اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر امید جاگ جاتی۔ خدا گواہ تھا۔ اس نے وقتی لمحوں میں صرف اس کو سہارا دینے کے لیے نکاح نہیں کیا تھا۔ وہ تو اپنی دعاؤں کے بار آور ہونے پر خوش تھا۔ جیسے بھی ہو رہا تھا وہ اس کی منکوحہ بن گئی تھی۔ ورنہ جس طرح ابا جی نے منع کیا تھا وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا حالات کبھی سازگار ہوں گے۔ شکر ہے انسان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں۔ لیکن ندا نے جو کچھ کہا تھا وہ بھی غلط نہیں ہو سکتا تھا۔

یہ سب کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں تیرتے پانی نے اس کے دل کے سب حالات بیان کر ڈالے تھے۔ اسے خوشی ہوئی تھی اس کے بھائی کی محبت رائیگاں نہیں تھی۔ وہ سرپھری لڑکی بھی اس آگ میں جلنے لگی تھی۔ جس میں کئی سالوں سے اس کا بھائی اکیلا ہی سلگ رہا تھا۔ وہ بھائی کو یہ خوش خبری دینا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے وہ کنفرم کرنا چاہتی تھی کہ جو کاغذات ابوبکر نے آنٹی کو دیے تھے کیا واقعی وہ طلاق کے کاغذات تھے؟

☆ ☆ ☆

"امی آپ نے سوچا ہے آپ کے جانے کے بعد میں کیا کروں گی؟ کہاں جاؤں گی؟" وہ رو رو کر بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

"بیٹا مجبوری ہے۔ مجھے ایک بار جانا پڑے گا۔ حوریہ اور زارا کی شادی کرنا ہے۔ بھیا بلا رہے ہیں۔ گزرتے سالوں میں تو فقیہ الدین کے خوف نے مجھے ان کے پاس جانے ہی نہیں دیا۔ بڑی مشکل سے دوبارہ ویزہ لگوایا ہے بھیا نے۔ کچھ دن رہ کر آجاؤں گی۔ ان کا بھی تو حق ہے مجھ پر اور تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ اتنی کمزور تم پہلے تو کبھی نہ تھیں؟ میں فروا سے کہوں گی۔ تمہیں اپنے ساتھ لے جائے یا پھر تمہارے پاس آجائے کچھ دنوں کے لیے۔" وہ اپنی پیکنگ کر رہی تھیں اور ساتھ ساتھ اسے سمجھا بھی رہی تھیں۔

"مجھے ایسا کیوں لگ رہا ہے امی کہ آپ وہاں جا کر واپس نہیں آئیں گی وہیں رہ جائیں گی....!" اس کا خدشہ بالآخر لبوں پر آ ہی گیا تھا۔

"سب وہم ہے تمہارا اور پھر مجھے واپس آکر تمہاری بھی تو شادی کرنا ہے۔ ابوبکر تو....!" انہوں نے کچھ کہتے کہتے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ہاں ابوبکر نے تو چادر اوڑھا کر کھینچ بھی لی۔" اس نے آہ بھر کر سوچا تھا۔

"سنو.... ندا ابوبکر سے تمہاری کوئی انگیجمنٹ تو نہیں ہو گئی تھی....؟" انہوں نے اچانک ہی غیر متوقع سا سوال پوچھا۔ وہ گڑبڑا گئی۔

"نن.... نہیں کیوں بھلا؟" وہ صاف مکر گئی اور دل نے ہر بار کی طرح اس دفعہ بھی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

"چلو اچھا ہے۔" انہوں نے سوٹ کیس بند کیا اور باہر نکل گئیں۔ اور وہ پھر بے اختیار ابوبکر کے بارے میں سوچنے لگی تھی۔ شام میں نبیہہ آگئی۔ ہنستی مسکراتی شاپنگ بیگز سے لدی پھندی۔

"ہائے تھک گئی۔ ایک کپ گرما گرم چائے تو پلا دو۔ بہت تھکن ہو رہی ہے۔ سچ میں بہت مشکل ہے بازاروں میں پھرنا۔" اسے کہہ کر وہ سب کچھ باہر نکالنے لگی۔ وہ جلدی سے کچن میں آگئی۔ کپڑوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ شادی کے ہیں۔ چائے کا پانی اوپر رکھ کر اس نے پلیٹ میں نمکو اور بسکٹ نکالے۔ تبھی وہ اس کے پیچھے ہی آگئی۔

"میں نے تمہارا شکریہ ابوبکر بھائی تک پہنچا دیا تھا۔" وہ آتے ہی پھر بولنے لگی۔ ندا نے انجان بننے کی کوشش کی۔

"بہت ہنسے۔ کہنے لگے شکریہ تو مجھے ادا کرنا ہے کیونکہ اس دن اباجی کی بات مان کر انہوں نے جس فرمانبرداری کا ثبوت دیا۔ اس کے عوض اباجی ان کی شادی ان کی من پسند لڑکی سے کرنے پر راضی ہو گئے ہیں۔ بہت خوش ہیں وہ۔ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ کہیں اس رشتہ کو ختم کرنے سے ندا کو کوئی مسئلہ تو نہیں ہو گا۔ میں نے کہہ دیا۔ ہرگز نہیں بلکہ وہ تو بہت خوش ہو گی۔ وہ کونسا آپ کے عشق میں مر رہی ہے۔ ضرورتاً "ایک رشتہ جوڑا گیا تھا۔ اور بس۔ چلو آؤ نا میں تمہیں شاپنگ دکھاؤں بھائی نے خود کی ہے۔ بہت خوش قسمت ہے وہ لڑکی۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ دوسری سمت منہ کیے وہ پاگل سی لڑکی دھواں دھار رونے میں مشغول تھی۔

"توبہ ہے ندا۔ اب آ بھی چکو۔" نبیہہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو وہ پھٹ پڑی۔

"کیسی دوست ہو تم، تمہیں احساس تک نہیں کہ تمہارے بھائی نے میرے ساتھ کیسی زیادتی کی ہے۔ پہلے ایک تعلق باندھا' پھر توڑ دیا۔ میرے کوئی جذبات نہیں۔ بنا پوچھے نکاح کر دیا۔ بنا پوچھے توڑ دیا۔ اتنے بے حس ہیں تمہارے بھائی صاحب کہ اپنے عشق کے سامنے انہیں ساری دنیا ہیچ لگ رہی ہے۔ انہوں نے ایک لمحہ کے لیے بھی نہیں سوچا... کہ یہ نام نہاد رشتہ کسی کے دل کو تہ و بالا کر سکتا ہے۔ اپنی محبت کو پانے کی خوشی میں وہ میرا دل ہی بھول گئے۔ کیوں...؟ قصور ان کا نہیں میرا ہے۔ بالکل میرا' مجھے ان کے بارے میں سوچنا ہی نہیں چاہیے تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ رشتہ انہوں نے مجبوری میں باندھا... اور وہ کسی اور سے محبت کرتے ہیں۔ مجھے نہیں دیکھنا کچھ بھی۔ تم بھی بے حس اور ظالم ہو اپنے اس بے رحم بھائی کی طرح۔ جاؤ تم پلیز جاؤ تم۔" وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسک اٹھی۔

دل یوں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا تھا کہ سمیٹنا مشکل لگ رہا تھا۔

سب نے اسے مل کر کھلونا ہی بنا ڈالا تھا۔ اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

"اچھا باقی نہیں۔ یہ مایوں کا جوڑا ہی پسند کر لو۔" نبیہہ بھی آج تنگ کرنے کا تہیہ ہی کیے بیٹھی تھی اس نے جوڑا اس کے آگے لا رکھا۔

اس کا تو دماغ ہی گھوم گیا۔ کیا ہو گیا تھا نبیہہ کو؟ کیوں اتنا ذلیل کر رہی تھی اسے اس نے جوڑا اٹھا کر گھما کر دروازے کی طرف پھینکنا چاہا تھا لیکن اس کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ نبیہہ کی جگہ ابو بکر کو دیکھ کر اس کے تو اوسان خطا ہو گئے۔ کہیں وہ ساری باتیں انہوں نے سن تو نہیں لیں۔ ابھی تو یہاں نبیہہ کھڑی تھی۔ پھر یہ کہاں سے آ گئے۔ وہ رونا دھونا' دکھ تکلیف' بھول بھال بھاگنے کے چکر میں تھی۔ جب اچانک ابو بکر نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھام لیا۔ اسے لگا وہ ابھی گر جائے گی۔

"چھوڑیں مجھے... اور شرم نہیں آتی آپ کو کس ناتے سے آپ میرا ہاتھ پکڑ رہے ہیں۔ جائیں اس کے پاس جس کے عشق میں مرے جا رہے ہیں۔ چھوڑیں مجھے۔" وہ غصے سے بولی۔ ابو بکر نے بازو پر گرفت مضبوط کر لی۔ اور اپنی گہری بھوری آنکھیں اس کے سرخ چہرے پر جما دیں۔ اور ندا کو زیر کرنے کے لیے وہ لمحہ ہی کافی تھا۔ وہ مزید غصہ نہیں دکھا سکی۔ دوسرا ہاتھ منہ پر رکھے رونے لگی۔

"یا اللہ پھر رونا دھونا۔ ارے تم اس طرح بالکل اچھی نہیں لگتی ہو۔ تمہارے اس پہلے والے روپ پر تو فدا ہیں ہم۔" ابو بکر نے تھوڑا سا آگے ہو کر سرگوشی کی تھی۔ وہ سٹپٹا گئی۔ لیکن فوراً" ہی خود پر قابو پا لیا۔

"بے وقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔ میرا ہاتھ چھوڑیں۔ جب رشتہ ختم کر چلے ہیں تو پھر..." اس نے پورا زور لگایا۔ ابو بکر نے خود ہی گرفت ڈھیلی کر

دی۔ نرم و نازک کلائی پر انگلیاں ثبت ہی ہو گئی تھیں۔

"کس نے کہا میں نے رشتہ ختم کر دیا ہے؟" وہ سنجیدہ ہوا تھا۔

"اس دن امی کو جو کاغذات دے کر گئے ہیں۔ وہ کیا پراپرٹی کے تھے؟" وہ جل کر بولی تھی۔ ابوبکر چونکا وہ تو یہ سارا رونا دھونا اس کا تھا۔

"اف اللہ!" اس نے ماتھا پیٹ لیا۔

"تم واقعی عقل سے پیدل ہو ایک بار کھول کر تو دیکھ لیتیں۔ وہ آنٹی کے ویزہ اور ٹکٹ تھی۔"

"لیکن ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ تمہاری غلط فہمی نے تمہارے دل کا حال تو کھول دیا۔ ورنہ جتنی سر پھری تم ہو۔ ضد میں آکر ساری عمر اپنے دل کی بات نہ بتاتیں' اور میں تمام عمر اسی آگ میں جل کر خاک ہو جاتا میں نے تو سنا تھا کہ عورت کے اندر ایک آلہ لگا ہوتا ہے۔ جو مرد کی ہر نظر کی پرکھ کرتا ہے اور اس کو بتاتا رہتا ہے۔ تمہاری حسیات کیا انکل فقیہ الدین کے جبر نے سلا دی تھیں کہ تمہیں کبھی محسوس نہ ہوا۔ کہ یہ چھ فٹا' سالم مرد تمہارے عشق میں کس بری طرح مبتلا ہے؟"

"کیا؟" اب کی بار وہ چونکی۔

"ہاں بے وقوف لڑکی۔ وہ تم ہی تھیں۔ میں نے بہت پہلے نبیہہ کو بتا دیا تھا کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا نبیہہ نے کبھی تم سے نہیں کہا۔ یہ تو ابا جی کو تمہارے والد صاحب کی حرکتوں پر اعتراض تھا اس لیے انہوں نے سختی سے منع کر دیا تھا۔ لیکن جب تم لوگوں نے ہمارے گھر آکر پناہ چاہی تو یہ ابا جی ہی تھے جنہوں نے مجھے بلا کر تمہارے بارے میں پوچھا تھا اور میرے اقرار پر انہوں نے نکاح کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ اور مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ کسی بھی مشکل وقت میں' میں تمہیں تنہا نہیں چھوڑوں گا اور اسی رات جب تمہارے والد صاحب نے پولیس سے ساز باز کر کے ہمارے گھر پر ریڈ کی تھی تمہارے اغوا کرنے کا پرچہ کٹوایا تھا' تو ابا جی نے تمہیں میری منکوحہ ثابت کیا تھا اور کہا تھا کہ ہم دونوں ہنی مون پر ہیں۔ اور تمہیں شاید علم نہیں پورا ڈیڑھ ہفتہ میں' اپنے دوست کے گھر رہا تھا۔ یہ اور بات کہ ہمارے نکاح اگلے دن ہی فروا اور معاذ ہنی مون پر چلے گئے تھے۔ اور ادھر ہم ہیں۔ ہنی مون تو دور کی بات کوئی چینی کی بات تک نہیں کر رہا۔ چینی یعنی میٹھا۔ اوپر سے نمک کے پہاڑ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے مجھ غریب کے' زخموں پر نمک چھڑکا جا رہا ہے۔ حد ہے۔ بھئی تم نے بھی کس پتھر سے سر پھوڑا ہے یار ابوبکر۔" بات مکمل کر کے انہوں نے خود پر ترس کھاتے ہوئے دزدیدہ نگاہوں سے جوتے کا کونہ فرش پر مارتی ندا کو دیکھا تھا اس کے تو گویا سب الفاظ ہی ختم ہو گئے تھی۔ وہ یکایک ہی اپنی نظر میں معتبر ہو گئی تھی۔ آج تک کی ساری زندگی گویا فضول اور بے فائدہ تھی۔ فقیہ الدین کے غم میں گھل گھل کر اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مرد ایسا بھی ہوتا ہے۔ وہ محبت بھی کرتا ہے اور عزت بھی دیتا ہے۔

فقیہ الدین کا چیپٹر کلوز ہو گیا تھا اور ان کے زخم میں مندمل۔ اور اس کے سامنے ایک اور مرد آکر کھڑا ہو گیا تھا محبت کا دعوی کرتا۔

عزت دینے کا ارادہ لیے ہوئے اور اس کا دل کہتا تھا۔ اعتبار کر لو۔ اور اس نے سارے اندیشے۔ سارے وہم دل سے بھلا کر اعتبار کرنے کی ٹھان لی تھی۔ ہمیشہ وہم نہیں کرتے۔ خدا سے جیسی امید رکھو ویسا ہی ملتا ہے۔

"تو پھر اس جمعے کو بارات لے کر آجاؤں؟" ابوبکر کی آواز اسے خیالوں کی دنیا سے باہر لے آئی۔ وہ پر شوق نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔ اس کے دل پہ چھایا غبار چھٹ گیا۔

"بارات کے لیے جمعہ کا انتظار کیوں کرنا.... منکوحہ ہوں کہیں تو ابھی امی رخصتی کر دیں۔" وہ شرارت سے کہتی باہر بھاگی تھی۔ اور ابوبکر کے زوردار قہقہے نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔

☆ ☆

سیما بنت عاصم
ٹوٹے گا
ANWER

فہد ابھی ابھی آفس سے لوٹا تھا۔ جوتوں کے تسمے بھی نہ کھولے تھے کہ امی کا سر کھانے بیٹھ گیا۔

"صبح چائے کے ساتھ پراٹھا۔۔۔ دوپہر مولی یا آلو کا پراٹھا۔۔۔ رات دودھ میں بھیگا ہوا پراٹھا۔۔۔ پراٹھے کھا کھا کر میرا دماغ بھی پراٹھا۔۔۔ میرا مطلب ہے ماؤف ہو چکا ہے۔"

وہ بری طرح جھلایا ہوا تھا۔ ٹفن کا ڈبا تخت پر امی کے قریب پٹخا۔ سوئی میں دھاگا پروتے ہوئے انہوں نے سخت ناگوار نظروں سے فہد کو ٹوکا تھا۔

"چپ کر جا۔ تجھ سے کہہ دیا نا! تجھے ہفتے میں چار بار ان ہی پراٹھوں پر گزارا کرنا ہوگا۔"

لائٹ گم تھی۔ امی کو گرمی زیادہ لگتی۔ اس پر فہد کی بحث و تمحیص۔

"امی! پراٹھوں کا ہی پہاڑہ پڑھنا ہے تو پراٹھے قیمہ یا چکن کے بھی تو بنتے ہیں نا اور وہ رضوانہ بھابھی تو کبابوں کا کچا آمیزہ بھی بھر کر پراٹھے بنا لیتی ہیں، کم از کم آفس میں تو میری عزت کا خیال کر لیا کریں۔"

اور مکان کی بالائی منزل پر رہائش پذیر، دوسرے لفظوں میں ان کے سر پر سوار ان کی بڑی بہو رضوانہ کے تو نام سے بھی ان کے پر جلتے تھے، اب بھی بدک اٹھیں۔

"ارے جا۔۔۔ نام نہ لیا کر میرے سامنے اس ہتھنی، بارہ من کی دھوبن کا۔۔۔ موٹی۔۔۔ منحوس۔۔۔ ڈائن! اور کان کھول کر سن لے۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں کہ صبح شام کچن میں سر کھپاتی رہوں۔۔۔ مجھے گھر کے دھندے کم ہیں کیا؟ اور جب تک تیری شادی نہیں ہو جاتی تجھے ان ہی پراٹھوں پر گزارا کرنا ہوگا۔"

یہ سب ہی ٹھیک تھا۔ دھان پان سی امی گھر بھر کے دھندے نمٹانے میں ہلکان رہتیں۔ اولادیں سب بیاہی گئیں۔ بہو کا چولہا چوکی الگ تھا۔ نہ بھی ہوتا تو پروا کون پالتا تھا۔ گھر کی اوپری منزل پر رہائش پذیر بیٹا بہو اپنی دنیا میں مگن رہتے تھے۔

"تو کس حکیم نے نسخے میں لکھا تھا کہ پندرہ ہزار کی میری تنخواہ میں سے آدھی کمیٹیوں میں کھپا دو؟"

"ارے باؤلا ہوا ہے کیا! کمیٹیاں نہیں بھگتاؤں گی تو یہ ہاتھی جیسا پیر۔۔۔ تیری شادی پر لاکھوں کا خرچا تیرے باوا قبر سے اٹھ کر کریں گے؟ تیرے سہرے کے پھول کھلنے کا وقت اچانک آگیا تو کہاں سے لاؤں گی۔"

اور یہی موضوع فہد کی دکھتی رگ تھا اس کا منہ گوڈوں تک لٹکتا نظر آنے لگا۔

"امی! خدا کے واسطے سہرے کا نام بھی نہ لیا کریں۔"

"ہائیں! یہ کیا بات کی۔ سہرا دیکھنے کا تو ماں کو ارمان ہوتا ہے۔ ارے وہ دن دیکھنے کے لیے تو میں زندہ ہوں۔ جب تیرے سر پر سہرا سجے گا۔" وہ آنکھیں موند کر چشم تصور سے وہ دن دیکھنے لگیں۔ جب چاند جیسی دلہن ان کے آنگن میں اترے گی۔

"میرا مطلب تھا امی، میرے سر پر سہرا بندھ بھی جائے تو ٹکے گا کیسے؟ یہ چٹیل میدان دیکھ رہی ہیں آپ!" اس نے سر پر ٹکی وگ اتار کر اپنے ہاتھ میں لی تو اس کی شفاف چندیا ڈھلتے دن کی روشنی میں دو آتشہ ہو کر لش لش کرنے لگی۔

"ہئے۔۔۔ ہئے۔۔۔ کم بخت۔۔۔ کیوں اپنا بھانڈا پھوڑنے پر تلا ہے دیواروں کے کان ہی نہیں، آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔ ارے منحوس! جلدی سے اسے اپنے سر پر رکھ لے۔" بس یہیں آکر تو وہ مات کھاتی تھیں۔ اب بھی ان کا سہانا خواب اک چھناکے سے ٹوٹا تھا۔ انہوں نے سراسیمہ و محتاط نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر جھٹ کہا تھا۔

"تو کون بھلا اس چندیا کے ساتھ مجھے قبول کرے گا۔۔۔؟"

"خبردار جو اپنی کالی زبان سے کوئی بدفال نکالی ہو تو۔۔۔ ارے لولے، لنگڑوں، اندھے، کانوں کی شادیاں ہو جاتی ہیں تو۔۔۔ تو تو پھر۔۔۔" انہوں نے "گنجا" کہتے کہتے زبان دانتوں تلے داب لی، مگر فہد سمجھ کر آزردہ ہو گیا۔

"امی میری شادی ہو گی کیسے۔۔۔؟ ہر جگہ تو آپ میری اس چندیا کا بھید کھول دیتی ہیں۔"

"ارے تو کیا چاندی کے ورق لگا کر تجھے پیش کردوں؟" وہ بھلا کہاں اپنی خطا تسلیم کرنے والوں میں سے تھیں۔ "دیکھ میرے چاند' شادی کے معاملے میں جھوٹ' دھوکا' فریب سے کام لینے کی میں تو قائل نہیں ہوں۔ہاں!"

"بس تو پھر سمجھ لیں کہ میرے سر پر بھی سہرا نہیں بندھے گا۔"

"ارے میرے چاند! تیرے سر پر سہرا سجے گا اور ضرور بندھے گا۔ بس اللہ کے حکم کی دیر ہے اس کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ اللہ جلد وہ دن لائے' پھر میں اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ کر اللہ اللہ کروں گی اور تیری جان بھی ان پراٹھوں سے چھوٹ جائے گی۔"

"تو آپ بھی سن لیں' اگر ان پراٹھوں کا کلمہ یوں ہی صبح شام جاری رہا تو اب میں بھوکا ہی رہ جایا کروں گا۔"

بات گھوم پھر کر پھر پراٹھے پر آرکی تو امی کو خیال آیا کہ کتنے دن سے انہوں نے کچھ ڈھنگ کا نہیں پکایا ہے۔ ایک پل کو انہیں فہد پر ترس آگیا' یہ اس کی سادگی و شرافت نہیں تو اور کیا کہلاتی کہ وہ ساری تنخواہ بغیر لفافہ کھولے لاکر ماں کے ہاتھ پر دھر دیتا' لنچ کے نام پر جو باندھ کر ساتھ کردیتیں' آنکھیں بند کرکے لیے چل پڑتا۔ مہینہ بھر پراٹھوں کا پہاڑہ رٹنے کے بعد اب نعرہ احتجاج بلند کیا تھا۔ وہ شدومد سے پنکھا جھلنے میں لگی تھیں جب وہ کپڑے بدل کر آیا تو منظر ذرا نہ بدلا تھا۔

"اب اس ٹفن کا کیا کروں؟"

"گلی میں لے جاکر پھینک دے۔" وہ جھلا کر بولیں پھر خیال آیا' فہد سے کچھ بعید بھی نہیں کہ وہ ایسا کر گزرے سو دہل کر بولیں۔

"کچن میں لے جاکر رکھ دے۔ اور لے' بازار سے کباب پراٹھا رول لے آ۔" وہ ازار بند سے بندھی تھیلی کھولنے لگیں۔

"اف پھر پراٹھا! امی! کباب چپاتی کے ساتھ بھی تو ملتا ہے نا!" فہد کی باچھیں کھل پڑی تھیں۔

"ارے ہاں نا! جا وہی لے آ۔ جان چھوڑ میری۔"

اس نے خوشی خوشی سو کا نوٹ اچکا تھا اور اگلی ہی چھلانگ میں گھر سے باہر۔ اس کے جاتے ہی امی سر پکڑ کر بیٹھ گئیں۔

☼ ☼ ☼

فہد کی شادی نہ ہوئی' حلق میں اٹکی ہڈی ہوگئی۔ نہ اگلتے بنتی تھی نہ نگلتے۔ انہوں نے بہوؤں کے لیے بڑے خواب دیکھے تھے' مگر جب ان کے بڑے بیٹے عظیم نے اپنی کولیگ رضوانہ سے شادی کی ضد پکڑی تو مانو ہار ہی گئی تھیں۔ عظیم ان کا سعادت مند بیٹا تھا۔ انکار کی کوئی صورت بھی نہ تھی۔ انہیں جبراً" رضوانہ کو بیاہ کرلانا ہی پڑا۔ یہ اور بات کہ رضوانہ اپنے نام کی ایک تھی۔ اس کی رہنمائی پٹیوں کے سبب بیٹا تو ہاتھ سے نکلا ہی نکلا۔ بہو کے سکھ کا خواب بھی چھناکے سے ٹوٹ گیا تھا۔ اور پھر بہت جلد عظیم کے منہ میں رضوانہ کی زبان بولنے لگی تھی۔ شادی سے اگلے ہفتے چولہا چوکی الگ ہوگیا تو انہوں نے بھی ہزار دفعات اس پر لگادیں۔

"میرے باپ کا گھر ہے' میں کرایہ کیوں دوں؟" اس نے آنکھیں پھیرنے میں توتے کو مات کردیا' مگر امی بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔ رضوانہ نے عظیم کو مٹھی میں کرکے سب سے پہلے تنخواہ پر قبضہ کیا تھا اور گھر گرہستی کے ہزار خرچے ہوتے ہیں۔ گٹر کی صفائی' ماہانہ بل' کیبل کا کرایہ' ہر چیز میں ساجھا تھا۔ عظیم نے سب منظور کرلیا' مگر پھر ان کے ہر معاملہ سے ہاتھ اٹھا لیا۔ گھر کی اوپری منزل پر اپنی دنیا الگ بسالی۔ وہ دونوں اب بھی نوکری کرتے تھے۔ اولاد تھی نہیں۔ دنوں انہیں بیٹے کا منہ نصیب نہ ہوتا امی کا مزاج کرارا تھا۔ کسی سے کم ہی بنتی تھی۔ ان کی بڑی بیٹی اسما آپا کا کہنا تھا جس ساس نے آج کے دور کی دو بہوئیں بھگت لیں' اس کا سارا دم خم ٹوٹ جاتا ہے۔ وہی حال امی کا تھا۔ انہیں معیار کے نام سے بھی نفرت ہوچلی تھی۔ رضوانہ کے معاملہ میں تو خیر بس نہ چلا۔

اپنے دوسرے بیٹے فرخ کی دلہن سامعہ تو بڑے ہی

ارمانوں چاؤ سے چھانٹ کے لائی تھیں۔ اور کیا مجال جو دو گھڑی کا سکھ پایا ہو۔ سامعہ نہلے پہ دہلا ثابت ہوئی تھی۔ امی صفائی ستھرائی، طور طریقہ، سلیقہ نفاست رکھنے والی اور سامعہ ست الوجود لاڈو ناز کی پلی۔ ہر کام میں چوپٹ ان کا مزاج اور سامعہ کے لیل و نہار جب ٹکراؤ ہوا تو غضب کی ٹھنی۔ نتیجتاً" فرخ صاحب نے بیوی کو بغل میں داب بھاگ لینے میں ہی عافیت جانی۔ سو بہو کے سکھ کا خواب اک بار پھر ادھورا رہ گیا۔

اب ساری امیدیں فہد سے ہی وابستہ تھیں جس کے سر پر سہرا سجنے کے آثار دور دور تک نہ دکھائی پڑتے تھے تو یوں کہ اس چٹیل میدان چندیا کے سبب وہ دنیا کے لیے ناقابل قبول تھا۔ اب اس کا کیا کیا جائے کہ ٹائیفائڈ کے سبب عرصہ پہلے وہ شدید بیماری سے اٹھ تو گیا، مگر بعد ازاں اس کے بال جھڑنا شروع ہوئے تھے اور رفتہ رفتہ فہد کا سر چٹیل میدان بن گیا اسی گنجے پن کے سبب وہ عمر سے کئی سال بڑا لگنے لگا تھا۔ اس محرومی سے جو نقصان ہوا سو ہوا، سب سے بڑا خسارہ یہ رہا کہ رشتہ کے معاملے میں اس کا "گنجاپن" حائل ہوا اور اس کی شادی اک گمبھیر مسئلہ بنتی چلی گئی۔ اب یہ تو وہ ہی جانتی تھیں کہ اگر لوئی گننے بیٹھ جاتا تو فہد کی خوبیاں ایک سانس میں گنی نہ جاسکتی تھیں۔ ان جیسے لوگوں کے طفیل ماننا پڑتا کہ دنیا نیکی و شرافت پر ہی قائم ہے، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ لوگ ظاہر بین ہوتے ہی ہیں شخصیت کی خوبیاں، باطنی خامیوں پر حاوی ہوتی ہیں۔ اندھیر تھی اندھیر۔

وقت دھیرے دھیرے سرکتا کافی آگے بڑھ گیا تھا۔

اک اک کر کے فہد کے سارے یار دوست ٹھکانے لگ چکے تھے۔ اب تو انہوں نے شادیوں میں شرکت بھی چھوڑ دی تھی۔ کوئی فہد کی شادی کی بابت پوچھتا تو ان کے کلیجے پر گھونسا سا پڑتا۔ لوگ ہمدردی کی آڑ میں زخم چھیڑتے ہیں۔ ان کا بس نہ تھا ورنہ منٹوں میں کر گزرتیں، مگر وہی مثال صادق آئی تھی کہ اگلتے بنتی نہ نگلتے۔ معاملات کھٹائی میں پڑتے تو اسی گنجے پن کے سبب... کئی رشتے پھر گئے تھے۔ کئی لوگ فہد کو رد کر کے جاچکے تھے اب تو انہیں کوئی لنڈوری مطلقہ، بیوہ بھی منظور تھی، فہد کی عمر ہی اتنی نکل چکی تھی، مگر فہد کے سر پر سہرا سجنے کی کوئی سبیل نظر آتی تب نا! مصیبت تو یہی تھی کہ فہد کے سر پر سہرا بندھ بھی جائے تو ٹکے گا کیسے؟ بات صرف یہیں تک رہتی تب بھی منظور تھا، لیکن عجیب اتفاق تھا... بلکہ المیہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ فہد کے سیکڑوں رشتے آئے اور گئے، مگر معاملہ ہمیشہ یکساں ہی رہتا۔ دنیا اچھے لوگوں سے خالی نہیں ہے، کوئی فہد کو چندیا سمیت سند قبولیت بخش ہی دیتا اور ان کا گھرانا قابل قبول ٹھہرتا تب بھی۔

بات چلتی... آگے بڑھتی... اور سوئے نصیب پکی ہونے سے پہلے پٹڑی بدل جاتی۔ جب فہد اور امی کو رشتہ پکا ہوجانے کا یقین ہونے لگتا تو پتا چلتا لڑکی کا کوئی اور بڑھیا رشتہ آگیا یا کوئی ٹوٹا کنکشن بحال ہوگیا۔ اور لیجئے جناب، چٹ منگنی، پٹ بیاہ۔ فہد میاں تاپتے رہ جاتے۔ یہ ایک بار نہیں کئی بار ہوا تھا اور اتنی بار ہوا تھا کہ اب امی تو کیا سب ہی امید چھوڑ چلے تھے۔ کتنی بار بات بنتے بنتے بگڑی... آڑی ٹیڑھی، حتیٰ کہ ناقابل قبول سالوں کی اٹکی لڑکیاں اسی طرح ٹھکانے لگ چکی تھیں اور وہ بھی آنا" فانا" کہ امی کو یقین ہوگیا کہ فہد کے رشتہ پر ضرور کسی دشمن نے "کارگزاری" فرمائی ہے۔ اسی یقین کے طفیل، انہوں نے بتیرے ٹونے ٹوٹکے۔ جادو کا توڑ۔ بندش کا علاج کروایا، مگر سب لاحاصل۔ وہی رفتار بے ڈھنگی۔ ایک کے بعد ایک کر کے ایک ہی صورت حال سے نمٹنے کے بعد یہ وہم اتنا پکا ہوا گیا تھا کہ اب بہن بھائی و دیگر چھیڑتے کہ کسی شادی دفتر کے لیے فہد کی خدمات بطور "ٹونکا" پیش کردی جائیں۔ کسی کا تو بھلا ہو۔

فہد کی تین شادی شدہ بہنیں، دو بھابیاں اور چھٹی وہ خود، فہد کے لیے لڑکی ڈھونڈ نکالنے کی مہم میں ناکام ہوگئیں تو معاملہ اس کے نصیب پر چھوڑ کر ہاتھ جھاڑ اپنے اپنے گھروں کو بیٹھ گئی تھیں۔ اب تو تنگ آکر وہ خود فہد سے کہتیں۔

"ارے فہد، تو ہی کوئی لڑکی پھنسالے... عظیم نے

بھی تو آخر اپنے آفس کی لڑکی سے شادی کی ہے۔"

مگر مصیبت تو یہی تھی کہ وہ ایسا تھا ہی نہیں۔ اس کے آفس میں کئی لڑکیاں کام کرتی تھیں کیا مجال جو کبھی آنکھ اٹھا کر کسی کو دیکھا ہو۔ شاید وہ خود سے آگاہ تھا اب تک کے دلخراش واقعات نے ثابت کردیا تھا کہ دنیا کے لیے اس کی شخصیت ناقابل قبول ہے۔ اللہ بخشے' فہد کے ابا اسے شاہ دولہ کا چوہا کہتے تھے۔ سوکھا ماند قوق چہرہ' گہری بادامی آنکھیں' کھڑا ہوتا تو ایک نظر میں پورا نہ پڑتا' بیٹھتا تو کمر دہری کمان کی طرح ہوجاتی اور آج کل کی آئیڈیل پرست لڑکیوں کے مزاج الامان الحفیظ۔

شریف النفس' محنت کش۔ بھولا بھالا بلکہ قدرے بے وقوف۔ اب ایسے لڑکیوں کی کہاں قدر و قیمت تھی۔

مگروہ جو اوپر بیٹھا ہے' وہ تو سب ہی کا رب ہے نا!

سو فہد کا رشتہ بھی پکا ہو ہی گیا تھا۔ فہد کا رشتہ رضوانہ کے توسط سے طے ہوا تھا۔۔۔ اور یہ پہلی بار تھا کہ امی کا رضوانہ سے اتفاق ٹھہرا۔ لڑکی مناسب و معقول تھی۔ فہد نے تصویر دیکھی تھی اور اک نظر میں اقرار کرلیا۔ انکار کا سوال ہی نہ تھا۔ پھر امی کی پسند بھی تو ناپسندیدہ ہونے کا تو سوال ہی نہ تھا' مگر کوئی انہیں بھی تو منظور کرتا نا! لگتا تھا کہ یہ رشتہ بالا ہی بالا طے کیا گیا تھا' لڑکی نے فہد کو نہ دیکھا تھا۔ اچھا بھلا فہد کا مائنڈ بن گیا تھا۔ امی عید کے چاند تاریخ رکھنے کی سوچ رہی تھیں حسب توفیق تیاری شروع کردی تھی' فہد نے آفس میں لان کے لیے درخواست بھی دے دی تھی کہ جانے کہاں سے خود لڑکی نے فہد کی تصویر دیکھ لی۔۔۔ اور چندیا کا معاملہ تو خیر پوشیدہ رکھا ہی نہ گیا تھا۔ لہٰذا اصاف کورا جواب حاضر تھا۔

اب یہ انکار کس جانب سے ہوا یہ معاملہ ہنوز راز تھا' مگر یہ تجربہ فہد اور امی کو یہ باور کرانے کے لیے کافی تھا کہ فہد کی زیرو شخصیت کی بنیاد پر اس کی شادی کچھ ایسا سہل مرحلہ نہیں ہے اب اس کا کیا کیا جائے کہ دنیا اوصاف کے بجائے اسٹیٹس اور گنوں کی جگہ ظاہریت کو اہمیت و اولیت دیتی ہے۔ سو فہد میاں ہنوز لنڈورے کے لنڈورے تھے!

☆ ☆ ☆

اس دن فہد کی چھٹی تھی۔ وہ امی کے ساتھ مل کر گھر کی جھاڑ پونچھ میں لگا تھا۔ چھتوں دیواروں کے جالے اتار کر کھڑکی کے دروازوں کی دھلائی کے ساتھ آنگن میں پڑی چند کرسیاں بھی چمکادی تھیں۔ گملوں کے پتوں کی چھٹائی۔ رات اسما کا فون آیا تھا وہ فہد کے رشتے کے لیے کل کسی کو لے کر آرہی تھیں امی نے فہد کو بتایا تو وہ کرنٹ کھا کر اچھلا۔

"اسما آپا! پرلے درجے کی بے ایمان ہیں یہ اسما آپا۔۔۔ یاد نہیں۔۔۔ پچھلی بار میری تنخواہ کے معاملے میں کس مبالغے سے کام لیا تھا اور وہ عظیم اس نے بھری محفل میں بھانڈا پھوڑدیا۔"

اور عظیم کے تو نام سے بھی امی بھاؤ کھاتی تھیں۔ اس بار بھی بدک اٹھیں۔

"خبردار۔۔۔ جو عظیم کا نام بھی لیا میرے سامنے۔ جورو کا غلام۔۔۔ اور اس کی بیوی۔۔۔ ڈائن۔۔۔ چمار کی اولاد۔۔۔ وہ بھلا کیوں چاہیں گے کہ میں بھی چار گھڑی بہو کا سکھ پاؤں۔۔۔ تیرے سر پر سہرا سجے۔۔۔"

اور سہرے کا ذکر فہد کو اپنی محرومی کی یاد دلاتا تھا۔ وہ افسردہ ہوگیا۔

"امی! شادی سہرے سے مشروط تو نہیں۔۔۔ بغیر سہرے کے بھی تو شادی ہو ہی جاتی ہے۔۔۔ آپ بار بار سہرے کا ذکر نہ کیا کریں نا!"

"ارے۔۔۔ چل۔۔۔ چل۔۔۔ تو کوئی رنڈوا ہے جو سہرا نہیں بندھے گا؟ اور کیوں نہ کروں سہرے کا ذکر' تیرے بال عمر سے نہیں' بیماری سے جھڑے ہیں۔"

"مجھے پتا ہوتا تو میں اس منحوس ٹائیفائیڈ کی بجائے کسی اور بیماری کا شکار ہوجاتا۔" امی کی بات پر وہ جھلا گیا تھا۔ اپنی جھونک میں بک گیا۔

"ارے فہد۔۔۔ گھاس تو نہیں چر گئے ہو۔۔۔ اے میاں بیماری میں بھی کوئی اپنی مرضی یا خوشی سے مبتلا ہوتا ہے۔"

"امی! میں تنگ آچکا ہوں' بردکھوے کے نام پر بھانت بھانت کے لوگوں کا سامنا کر کر کے.... مجھے نہیں اچھا لگتا آئے روز کا یہ تماشا!"

"تو کچھ بھی کہہ لے' کر لے.... اب تو اسما نے شادی دفتر سے رابطہ کر لیا ہے۔ وہاں فارم بھی جمع کروا دیا ہے' تیری تصویر کے ساتھ۔"

"ہائیں! شادی دفتر؟ اور اس کے چارجز؟" وہ سٹپٹا اٹھا۔ یہ اک اور ہوئی۔ یعنی یک نہ شد دو شد۔

"وہ میں دے چکی ہوں۔ دو ہزار روپے۔" ان کا اطمینان قابل دید تھا۔

"وہ تو رجسٹریشن کے ہوں گے۔ شادی کی فیس جتنی آپ ان کے حلق میں ٹھونسیں گی' اتنی تو...."

"تو تجھے اس سے کیا لینا دینا۔ تو اپنے کام سے کام رکھ۔" امی کی ساری امیدیں اب شادی دفتر سے ہی وابستہ تھیں۔ انہوں نے تو پرانے صندوق کی تہہ سے باس مارتا جوڑا بھی نکال کے الماری میں رکھ لیا تھا جو انہوں نے فہد کی بارات والے دن ساڑھی پر باندھنا تھا۔

"امی! آپ سے کس نے کہہ دیا' شادی دفتر کے چکر میں پڑنے کو....؟" اسے امی کا یہ اقدام ایک آنکھ نہ بھایا تھا۔ نہ جانے انہیں' اس کی خون پسینے کی کمائی ٹھکانے لگانے کا اتنا شوق کیوں تھا.... مگر مرتا کیا نہ کرتا۔ امی نے بتایا اسما رشتے کے لیے کسی محترم شفیق الرحمٰن کے ساتھ آرہی ہے۔

"ارے تو پھر تجھ سے شادی کرے گا کون؟" امی سچ مچ تنگ آچکی تھیں۔

"امی! ایسا تو نہ کہیں۔" فہد کے دل کو دھکا سا لگا۔ بات تو سچ تھی' مگر بات تھی رسوائی کی.... اس کا منہ گوڈوں تک لٹک گیا تو انہیں بھی احساس ہوا کہ وہ کچھ غلط کہہ گئی ہیں' مگر یہ بھی تھا.... کہ فہد کی شادی کا مرحلہ کسی عظیم چوٹی کو سر کرنے سے بڑھ کر ثابت ہوا تھا۔ اگر کوئی ان سے دنیا کا مشکل ترین کام پوچھتا تو وہ بلا مبالغہ کہتیں۔ فہد کی شادی۔

"ارے تو بھلا کیسے ہوگی تیری شادی؟ امی! میری شادی نہ ہوئی تو قیامت تو نہ آجائے گی؟"

"ہئے.... ہئے.... تیرے منہ میں خاک۔" وہ دہل اٹھیں "بھلا کیا خامی ہے میرے چاند جیسے بیٹے میں...."

"چاند جیسی چندیا کی...." وہ جل اٹھا۔ پھر گھر سے نکل گیا۔ کچھ دیر تازہ فضا میں سانس لیے تو دماغ روشن ہوا۔

"یہ اک نئی پخ ہوئی.... شادی دفتر کے توسط سے رشتہ! مگر شادی دفتر کے معاملات میں جتنے فراڈ سننے میں آئے تھے۔ اس سے تو.... توبہ ہی بھلی.... اب یہ شفیق الرحمٰن کیا بلا ہیں....؟ مان نہ مان.... میں تیرا مہمان.... اس مسئلے کا یہی حل تھا کہ کسی نہ کسی طرح انہیں چلتا کیا جائے.... مگر امی.... اس کی چندیا نہ بجا دیں گی؟ ہاں.... وہ تو پردہ کرتی ہیں' مگر کان تو ادھر ہی پڑے ہوں گے۔ کچھ ایسا کام کیا جائے کہ اسے ناپسند کر جائیں' فائنلی انہیں اپنی چندیا دکھا دوں گا.... وہ بھاگتے نظر آئیں گے۔" یک لخت اک ترکیب سوجھی تو فہد مسکرا دیا۔

اس بار اسما آپا کی تاکید تھی کہ چندیا کا راز فاش نہیں کرنا ہے۔ جو ہوگا' دیکھا جائے گا.... ان کے خیال میں یہی اور فہد کی شادی راہ میں حائل تھا اور اگر وہ اس خیال میں خوش تھیں تو امی ان کی خوشی میں خوش تھیں۔

☼ ☼ ☼

شفیق الرحمٰن کا نزول اسما آپا کے ہمراہ ہوا۔ دونوں ماں بیٹی سر جوڑے جانے کیا معاملات طے کرتی رہیں۔ پھر شفیق الرحمٰن کی مدارات کے لیے کچن میں جا گھسیں۔ سفید پاجامے پر سیاہ اچکن' موٹے عدسوں کی زمانہ آدم کی عینک لگائے وہ خاصی باریک بینی سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ بجلی عین وقت پہ چکما دے گئی تھی۔ بیرونی کمرہ گرم رہتا تھا۔

"میاں! گرمی کافی ہے' بجلی کب آئے گی؟"

"بجلی کا بس یہی حل ہے۔ ہمت فین۔" اس نے قریبی ریک سے ہاتھ کا پنکھا اٹھا کر انہیں تھمایا۔

"ہمت فین۔۔۔۔؟"

"جی ہاں۔ یعنی جب تک ہمت ہے، جھلتے رہیں۔"

"تو پھر سمجھ لیجئے کہ ہم میں ہمت نہیں۔ آیئے کچھ دیر باہر کی کھلی ہوا میں چلتے ہیں۔ عصر کی اذان قریب ہے۔ مسجد تک کا راستہ بات چیت کے بعد دکھا دیجئے گا۔" فہد مسکرا دیا۔ کیا سنہری موقع نصیب ہوا تھا۔ آنکھ بچا کے ادھر ادھر دیکھا میدان صاف تھا۔

"بالکل۔۔۔ بالکل۔۔۔ آیئے چلیے۔۔۔ "اندر کی ہوا" کھانے سے بہتر ہے کہ باہر کی ہوا کھائی جائے۔"

شفیق الرحمٰن نے عینک درست کر کے خاصی بے یقین نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ ایسے نکمے سے جواب کی امید نہ تھی۔ گھر سے باہر کی فضا روشن، مگر حبس زدہ تھی۔ سر تاپا اک نظر اسے دیکھ کر باقاعدہ انٹرویو کا آغاز ہوا۔

"میاں صاحبزادے! اپنی عمر اور تنخواہ وغیرہ بتایئے!"

"کیوں۔۔۔ آپ نے ساری زندگی گھاس کھودی ہے کیا؟" اس نے منہ ٹیڑھا کر کے خاصی ناگواری سے کہا تھا۔

"ہائیں! کیا مطلب؟" ان کی آنکھیں سکڑیں پھر پھیلتی چلی گئیں۔ لڑکا بظاہر نیک، معقول و شریف نظر آتا تھا۔ اس بدتمیزی کی امید نہ تھی۔

"مطلب یہ کہ یہ ماتھے کی سلوٹ دیکھ رہے ہیں آپ۔۔۔ یہ چالیس سال سے پہلے پڑتی ہے کیا؟ اور تنخواہ کا نہ پوچھے، سمجھے بس گزارا ہو ہی جاتا ہے۔"

"میاں! گزارا تو اس دور میں بھنگی کا بھی ہو ہی جاتا ہے۔ جس کی لاکھ انکم ہے وہ بھی روتا ہی نظر آتا ہے۔۔۔۔ مہنگائی ہی اتنی ہے۔" وہ بکرے کی طرح اس کی کھال اتار رہے تھے۔

"تو پھر میری تنخواہ بھی آپ امی سے ہی پوچھے۔ میں تو بس ہاتھ لگانے کا خطاکار ہوں۔ بند لفافہ امی کو تھما دیتا ہوں۔"

"تو پھر آپ کا اپنا خرچا پانی کیسے چلتا ہے؟"

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ بھئی لوٹ مار کر کے کسی کا پرس اڑا لیا۔ کسی سے موبائل چھین لیا۔"

"ہائیں!" انہیں جیسے بچھو نے ڈنک مارا۔ بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیا پھر اس کے غیر سنجیدہ تاثرات پر کچھ اطمینان محسوس کر کے وہیں سے انٹرویو کا سلسلہ جوڑا۔

"کس کمپنی میں ملازم ہیں۔ خیر سے۔۔۔ اور کس عہدے پر کام کرتے ہیں۔"

"خیر۔ ایسا تو نہ کہیں کہ امی نے آپ کو یہ نہ بتایا ہو یا آپ نے پوچھا نہ ہو۔"

"تو پھر سمجھ لو کہ ہم تمہارے منہ سے سننا چاہتے ہیں۔"

"واہ! یہ بھی کوئی لوری ہے، جو آپ نے صرف میرے منہ سے سننی ہے؟" اس نے سخت برا ماننے کا تاثر دیا۔ "یا پھر اظہار محبت۔۔۔ جس کے لیے فلموں کی ہیروئن دوپٹا مروڑا آنکھیں پٹ پٹا کے ادائیں دکھاتی ہے؟"

"یعنی آپ فلموں کے رسیا ہیں؟"

"جی ہر روز تھوڑی۔۔۔ ہر فلم کا آخری شو بس یونہی کبھی شغل میلہ کر کے لوٹتے ہوئے۔" اس نے دیدے نچائے تھے۔

"شغل میلہ۔۔۔ کیا مطلب؟" وہ سٹ پٹائے۔

"نکا لگاؤ مسلمانو!" اس نے لہجہ خمار آلود بنا کر ان کی ناک سے ناک ملائی، مگر نکا نہ لگ سکا تب اس نے رازدارانہ انداز اپنایا۔ ادھر ادھر دیکھ کر منہ میں ہوا بھری اور انگلی سے بوتل کی ڈاٹ کھولنے کی آواز نکالی اور منہ سے انگوٹھا لگا کر غٹا غٹ چڑھانے کا اشارہ دیا کہ وہ جواباً "لاحول" پڑھتے ہی رہ گئے۔

"ویسے عمر شریف شوز آپ کو کیسے لگتے ہیں۔ بڈھا گھر پر ہے؟" وہ آواز گمبھیر بنا کر ان سے اتنا نزدیک ہوا کہ ان کی ناک اس کی ناک سے ٹکرانے لگی۔ نتیجتاً شفیق الرحمٰن کی موٹے عدسوں والی بابا آدم کے زمانے کی عینک زمین بوس ہوتے ہوتے بچی۔

"یا خدا ہم نے اپنی زندگی میں کبھی ٹی وی نہیں دیکھا۔"

"اجی جانے دیجیے۔ جوانی تو آخر آپ پر بھی آئی ہوگی نا! شغل میلہ۔ شراب و شباب۔"

"ہائیں! ایسے کام ہم نے تو کبھی نہ کیے۔۔۔"

"تو اب کر لیجیے۔ میرا مطلب ہے' مرد اور گھوڑا بھی کبھی بوڑھا ہوتا ہے؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ یہ کس طرح کی باتیں آپ ہم سے کر رہے ہیں؟" وہ کھنکار کر سنبھلے پھر چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھ کر لاحول پڑھی۔ گمان تو یہی تھا کہ اس کی بدکلامی کی بوچھاڑ سے موصوف پہلے ہی وار پر پسپا ہو کر بھاگتے نظر آئیں گے' مگر شاباش تھی ان کی ہمت کو کہ حوصلے ہنوز جوان تھے۔

"میاں صاف صاف بتاؤ کہ شادی کے لیے تمہاری شرائط کیا ہیں؟"

"وہی۔۔۔ جن سے آپ کی دختر فارغ ہیں۔" وہ اپنی جھونک میں کہہ گیا۔

"ہائیں! ہماری دختر سے تمہارا کیا لینا دینا۔" ان کی غیرت جوش کھا گئی تو نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔ "وہ تین بچوں کی اماں ہے۔"

"ہائیں! مطلقہ بیوہ سے اب تین بچوں کی اماں۔۔۔!" اس کی نظروں تلے ستارے ناچ ناچ گئے۔ "حد ہوتی ہے ناانصافی کی بھی۔۔۔ یعنی کے امی نے اسے اتنا گرا پڑا اور ناقابل قبول سمجھ لیا ہے؟ ہائے اماں جی کہتے پھنسایا۔" وہ خود سے ہم کلام تھا۔ شفیق الرحمن کو ایک نظر میں رد کر دیا تھا' جب والد محترم ایسا کڑک دار مزاج رکھتے ہیں تو بیٹی چار ہاتھ آگے ہی ہوگی۔ ادھر انہوں نے بھی پر تولے۔

"میاں! ہمیں مسجد کا راستہ بتا دو ہمیں عصر کے بعد جانا ہے۔"

"مسجد کا راستہ!" اس نے ڈھٹائی سے باچھیں پھیلائیں۔ "کسی راہ چلتے سے ہی پوچھنا پڑے گا۔۔۔ دراصل اس طرف کبھی جانا نہیں ہوا' آپ کی فرزندی میں آ کر ممکن ہے۔"

"جی نہیں! میرا انکار بھی سن لیجیے۔" اس بار گرمی ان کے دماغ کو چڑھ گئی تھی۔

"مبارک ہو۔" وہ زبردستی بغل گیر ہوا۔ "مجھے آپ سے یہی امید تھی۔"

"تمہایت بدنصیب ہوگی وہ لڑکی جس کے ساتھ آپ کی شادی۔۔۔"

"اجی شادی کی ضرورت بھی کیا ہے۔" اس نے لفنگوں کی طرح آنکھ دبائی تھی۔ "جب اپنا کام ویسے ہی چل جاتا ہے۔"

یہ تابوت میں آخری کیل تھی۔ وہ اچکن سنبھالے بھاگتے نظر آئے۔ اسما آپا نے جانے کہاں سے دیکھ لیا۔ وہ ان کے پیچھے تھیں' مگر وہ کہاں ہاتھ آنے والے تھے۔ گھر جا کر ہی دم لیا ہوگا۔

"خس کم جہاں پاک" فہد نے ہاتھ جھاڑے اور اپنی راہ لی۔

اگلی ہی صبح اسما آپا کا ملامت بھرا فون آیا تھا اور جانے امی سے کیا کچھ جڑا کہ وہ اپنا سر پیٹتی رہ گئیں۔ دن بھر ان کا لہو جوش مارتا رہا تھا۔ فہد کے گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی ٹانگ گھسیٹی۔

"ارے فہد! تیرے منہ میں کیڑے پڑیں۔ کتنی منت خوشامد سے اسما' شفیق الرحمن کو گھر لائی تھی تو نے ایسا کیا سر پھونکا کہ وہ سر پہ پیر رکھ کے بھاگے؟"

"تو اور کیا انہیں سر کا تاج بنا لیتا اب میں اتنا بھی گرا پڑا نہیں کہ تین بچوں کی اماں کا رشتہ منظور کر لوں۔ اس سے تو میں لنڈورا ہی بھلا۔" وہ سخت آزردہ تھا۔

"ہائیں! گھاس تو نہیں چر گیا۔ یہ کیا اول فول بک رہا ہے؟" غصہ سے وہ تیز تیز پنکھا جھلنے لگیں۔

"امی ان کی بیٹی تین بچوں کی اماں ہے۔" وہ جھلایا۔

"ارے تیرا ناس جائے۔ ان کی بیٹی سے بھلا تیرا کیا واسطہ۔۔۔؟"

"واسطہ نہ ہی پڑے تو اچھا ہے۔ اب میں اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں کہ تین بچوں کی اماں' ان کی بیٹی سے نکاح پڑھا لوں۔" اس کا رنج کم ہو کے نہ دیتا تھا۔

"فہد! تجھے اللہ سمجھے۔ تجھ سے کس نے کہا کہ وہ

اپنی بیٹی کا رشتہ دینے آئے تھے؟ وہ شادی دفتر کے مالک تھے۔ شفیق الرحمن صاحب۔"

امی کی بات فہد کے سر پر پہاڑ کی طرح گری۔ ان کا سر پر پیر رکھ کر بھاگنا یاد آیا تو سر پیٹ کر رہ گیا۔

"ارے تو کیا ان کی شکل پر شادی دفتر کا بورڈ لٹکا تھا کہ میں دیکھتے ہی سمجھ جاتا؟"

"تیرا بیڑہ غرق جائے۔ ان سے اول فول بکنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ اسما کی کتنی ہیٹی ہوئی ہے۔ کچھ پتا بھی ہے؟"

"تو اسما آپا سے بھی کہہ دیجیے کہ انتقاماً" وہ میرے گنجے پن کا راز اگل دیں۔"

"ارے فہد' اسما تمہاری بہن ہے کوئی دشمن تو نہیں جو یہ ذلت بھرا راز گاتی پھرے گی۔" انہوں نے فہد کی عقل پر ماتم کیا' مگر اب چڑیاں کھیت چگ چکی تھیں۔

وہ تین بیاہی بیٹیوں کی ماں تھیں۔ بہوؤں سے تو خیر امید ہی چھوڑ چکی تھیں۔ اب انہیں فہد کے معاملہ میں بھی بیٹیوں ہی سے امیدیں تھیں۔ یہ اور بات کہ بیٹیاں اپنے نام کی ایک تھیں۔ تینوں بھی پلٹ کر نہ دیکھتیں کہ ماں ہے کس حال میں۔ انہیں اپنے گھر اور بچوں کے دھندے ہی چین نہ لینے دیتے تھے۔ بس فون پر رابطے چلتے۔

"امی میری پیاری امی' آپ میری شادی کے قصے کو بھول کیوں نہیں جاتیں؟" فہد نے دل پر پتھر رکھ کر کہا تھا اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا کہ اب در در کی خاک چھان کر ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کی شادی کو مقدر پر رکھ کر صبر شکر کا کلمہ پڑھ کر ہاتھ جھاڑ لیے جائیں' مگر ایک تو وہ ماں تھیں دوسرے اس کی شادی کے بعد آنے والی بہو سے کچھ سکھ کی امید و تمنا انہیں بھی تھی۔ دھان پان سی امی کام میں بڑی پھرتیلی تھیں۔ ہر کام طریقے قرینے سے وقت پر کیا کرتیں' مگر اب مات کھا جاتی تھیں۔

"تیرے منہ میں خاک۔ تیرے سر پر سہرا دیکھنے کی آس میں تو میں زندہ ہوں۔"

لائٹ آگئی تھی' مگر پنکھا جھلنا امی کی عادت تھی۔

بے خیالی میں وہ پنکھے تلے بیٹھ کے بھی "دہمت فین" جھلتی رہتیں۔ فہد نے ان کے ہاتھ سے پنکھا لے کر رکھا تو وہ بکتی جھکتی کچن کی جانب چل دیں اور فہد سوچنے بیٹھ گیا۔ وہ آئیڈیل تراشتے تو وہ کیسی ہوتی۔ نازک اندام' پری چہرہ' پھر سر جھٹکا۔ امی کہتیں جو ظاہریت کی بنیاد پر رشتے جوڑتے ہیں چوٹ کھاتے ہیں۔ معیار کے نام پر ایک کے بعد ایک لڑکیاں رد کرنے والے ہی بعدازاں بہوؤں کے دکھ اٹھاتے ہیں۔ ان کی بہوئیں بری بھلی جیسی بھی تھیں' انہوں نے ایک نظر میں اپنالی تھیں۔ یہ اور بات کہ بعدازاں خوب ہی ٹھنی' مگر بس بات خلش تک ہی رہی۔ دیواریں اٹھیں نہ اپنے پرائے بنے۔ امی زبان کی کراری' مگر دل کی بری نہ تھیں۔ وہ اب بھی کہتیں کہ وہ فہد کے لیے جہاں جائیں گی ہاں بھر کے ہی آئیں گی۔ انہوں نے بہو ڈھونڈنے کے لیے پہلا قدم اٹھایا تو یہی تہیہ کیا تھا' جس پر آج تک قائم تھیں۔ فہد کے معاملہ میں اگر بات کھٹک گئی تھی تو وہ اسے خود کے لیے رب کی آزمائش ہی تصور کیا کرتیں۔ جانے کتنی منتیں مرادیں مان رکھی تھیں۔ ہزار جگہ آس لے کر گئیں' مگر نیت وہی رہی۔

لڑکی کیسی بھی ہو انہوں نے ناپسندیدگی کا ٹھپہ کسی نہیں لگایا تھا' مگر کوئی فہد کو بھی تو قبول کرتا! اور یہیں آکر بات کھٹائی میں پڑی تھی!

اس بار اسما آپا کا فون آیا۔ انہوں نے شادی دفتر والے بزرگوار سے معذرت کی تھی اور الف سے یے تک ساری کہانی ان کے سامنے رکھ دی۔ اب رشتہ کروانے کا تو سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔ یہ طور "ٹوٹکا" فہد کی خدمات ضرور طلب کرلی تھیں۔ فہد سن کر ہنس دیا۔ کسی کا تو بھلا ہو۔ پھر وسلنگ کرتا گھر سے نکل گیا۔

ہم سے نہ سہی اوروں سے سہی تمہیں دل کا لگانا آتو گیا
دنیا میں کسی کے ہو تو گئے' تمہیں پیار نبھانا آتو گیا

☼ ☼ ☼

انجم آرا نے آفس جانے سے کچھ دیر پہلے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر ناقدانہ انداز میں اپنا جائزہ لیا تھا۔ جیسے خود کا کوئی نیا روپ ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے دو چار ماہ کے عرصہ میں سرتاپا خود کو بدل لیا تھا۔ کسی مہنگی کریم کے فارمولے نے رنگت لش لش چمکادی تھی۔ کچھ کوشش سے وزن کم کرلیا تھا۔ عینک سے جان چھڑا کے کلر فل لینس کا استعمال شروع کیا تو ان کی شخصیت میں سچ مچ نکھار آگیا تھا۔ یہ کچھ ہی دنوں پہلے کی بات تھی۔ گدرائے ہوئے جسم پر اونچا سا جوڑا بنائے' سڑے فیشن کے پرانے باس مارتے جوڑے' گھسے جوتے پہن کے وہ آفس سدھارتیں تو لوگ منہ چھپا چھپا کے ہنستے۔ فیشن کوئی بھی ہو ان کی جمپر کا سائز کبھی نہیں بدلا۔ خیر' وہ ایسی بری بھی نہ تھیں۔ ہاں' مگر خود سے بے پروا ضرور تھیں۔ اللہ بخشے' اماں جی جب تک حیات رہیں ان کے لیے چھپر چھاؤں بنی رہیں۔۔۔ ان کا آسرا غنیمت تھا' مگر مرتے دم تک اماں جی کے حلق کی ہڈی بنی رہیں!

اماں کہتیں اور درست کہتیں' ماں باپ کا سایہ اٹھ جائے تو میکہ پرایا ہوجاتا ہے' بہن بھائی بیاہ کر اپنے نہیں رہتے۔ وہ کس کنارے لگے گی۔ بات دل شکن سہی' مگر سچ تھی۔ وہ شریف النفس نیک' قبول صورت اعلا عہدے پر فائز تھیں' مگر مزاج۔ الامان!

اپنا معیار ہی اتنا بڑھا رکھا تھا۔ جس سے وہ اک انچ ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔ بندہ باحیثیت' اعلا تعلیم یافتہ' اونچے عہدے پر فائز۔۔۔ حسب نسب میں یکتا ہو' اب مڈل کلاس میں ایسا بر کہاں! عام رشتوں میں کوئی نہ کوئی نکتہ چن کر اچھے بھلے رشتوں میں ناک مار دیتیں۔ مزاج کی کراری تھیں پھر اپرا گھرانہ تھا' بھتیجے' بھتیجیاں' بہن' بھائی' بھاوجیں' مگر ادھار کسی کا نہ رکھتیں ان کے مزاج کسی سے نہ ملتے۔ منہ پر کھری کھری سنا جاتیں اور بہوئیں بھلا کہاں کسی کی سنتی ہیں۔ سو غضب کی ٹھنتی۔ شاید اماں کو بھی ان کے مزاج سے کوئی اچھی امید نہ تھی' مگر وہ جب تک زندہ رہیں۔ ان کے لیے ڈھال بنی رہیں۔

اولاد بری ہو یا بھلی' والدین سمیٹ ہی لیتے ہیں' مگر

وہ نہ رہیں تو انہیں کون سمیٹے گا۔۔۔ یہی دھڑکا انہیں پل پل ستاتا۔ آنے بہانے انجم آرا کو سمجھانے بیٹھ جاتیں کہ اسی لیے والدین برے بھلوں کو بھگتنے کی ترغیب دے کر بیاہی بیٹیوں کو لوٹاتے ہیں اور انجم آرا کہتیں یہ وہ وقت تھا جب عورت غیر تعلیم یافتہ تھی' اپنے حقوق سے آگاہ تھی نہ چار پیسے کمانے کے قابل۔ آج کی عورت مضبوط ہے۔ اپنا اچھا برا بھگت سکتی ہے۔ ان کی بات دل کو لگتی تھی۔ یہ سچ تھا کہ اگر انجم آرا کی کمائی کی سپورٹ نہ ہوتی تو ان کی ایسی دھاک نہ ہوتی۔ بھوئیں بیٹے مل کر انہیں بیچ کھاتے۔ دنیا انہیں سمجھتی ہی نہ تھی۔ ہر کوئی کہتا' وہ نہ رہیں تو یہ بوجھ کون سرکائے گا۔ تب وہ کہتیں۔ انجم چار پیسے کمانے قابل ہے' کسی پر بوجھ تو نہیں ہے۔ کوئی رشتہ اس کے مزاج کو لگ گیا تو سو بسم اللہ ورنہ گاڑی تو چل ہی رہی تھی۔

پھر بے چاری اماں بی ان کی شادی کا ارمان لے کر ہی دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ اور انہیں سچ مچ لگنے لگا کہ وہ تنہا ہو گئی ہیں۔ بلکہ مزید بوجھ بن گئی ہیں۔ گھر بھر میں کوئی بات کرتا نہ ان سے واسطہ رکھتا۔ اب تو مدت ہوتی تھی ان کے گھر آنگن میں کوئی پتھر آئے۔

کیونکہ انہوں نے اپنی شرائط میں کافی نرمی کر دی تھی۔ کم حیثیت سہی' تعلیم یافتہ قابل قبول مڈل کلاس ہو بھولے بھٹکے کوئی عقل کا اندھا عہدے کے لالچ میں' تنخواہ پر رال ٹپکا کر انہیں سند قبولیت بخشنے پر آمادہ ہو بھی جاتا تو انہیں ایسے لوگوں سے خار تھی۔ جو کماؤ عورتیں ڈھونڈتے' نکمے' بے غیرت' اور ایسے ہی میں کسی بھلے وقتوں میں ان کی کولیگ فریدہ نے کہا تھا۔

"آج کل کے لڑکے ماڈلک پسند کرتے ہیں۔ تم نے خود کو غور سے دیکھا ہے۔ کبھی برسوں پرانی بھٹکی ہوئی روح لگتی ہو۔"

بات ان کے دل میں کھب گئی تھی۔ پھر خود کو آئینے میں بغور دیکھا۔ پل بھر کو لگا۔ اب تک خسارے خود اپنے ہاتھوں خریدے تھے۔ دنیا بناوٹ کی عادی ہے۔ ظاہریت پر مرتی ہے۔ خصوصاً" لڑکیوں کو خود سے بے پروا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ نکتہ اچھی طرح ان کی سمجھ میں آ گیا تھا۔ پھر مانو سرتاپا خود کو بدل لیا۔ وقت دبے پاؤں سرک گیا اور پتا ہی نہ چلا۔

اب بات معیار سے اتر کر جو ہے' جیسا ہے کی بنیاد پر آن رکی تھی۔ مگر اس کا کیا کیا جائے کہ آزمائش بھی نیک لوگوں کے لیے ہی درج ہوتی ہیں۔ اماں بی کے بعد وہ سچ مچ خود کو تنہا محسوس کرنے لگی تھیں۔ رہ رہ کے خیال آتا' وہ کتنی اکیلی ہیں۔ اور کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں وہ لوگ جنہیں کوئی چاہتا۔ سراہتا اور خیال رکھتا ہے۔ اب تو وہ شادیوں میں شرکت سے بھی کانوں کو ہاتھ لگانے لگی تھیں۔ بلاوجہ لوگ زخموں پر نمک چھڑکتے ہیں۔ بھلا ان کے بس کی بات تھی؟ گو بات وہیں آ کر رکتی وہ اگر معیار پر سمجھوتا کر بھی جائیں تو اب انہیں ان کون منظور کرے گا؟

"نہیں" آگر فریدہ نے کہا تھا۔ پانی پلوں کے نیچے سے گزر جائے تو واپس نہیں آتا۔ بات ان کے دل کو "ٹھاہ" کر کے لگی۔ یہ سچ تھا۔ کچھ گزر گئی۔ کچھ گزر جائے گی۔ مگر بہت اداس' بہت بے قرار گزرے گی۔ کون کسی کا ہوتا ہے۔ مرد کا سہارا مضبوط ہوتا ہے۔

عورت اس کے بغیر ادھوری ہے اور یہ بات اب ان کی سمجھ میں آتی تھی۔ جب سچ مچ پانی پلوں کے نیچے سے گزرنے کو تھا۔ انسان تنہا چلتا ہے تو جلدی تھک جاتا ہے۔ وہ بھی تھک گئی تھیں۔ بلکہ ٹوٹ گئی تھیں اور ان کی شکست کسی سے بھی مخفی نہ تھی۔ بھرا پرا گھر تھا۔ مگر سب ہی نے انہیں۔ ان کے حال پر چھوڑ کر ہاتھ جھاڑ لیے تھے۔ زیادہ تیر مارا تو شادی دفتر میں نام لکھوا دیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ کوئی رشتہ انجم آرا کے مزاج کو لگ گیا سو بسم اللہ۔ ورنہ گاڑی تو چل ہی رہی تھی۔

اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اسی ہفتہ شادی دفتر سے بلوایا تھا۔ بڑی بھابھی اڑی اڑی گئی تھیں۔ رشتہ مناسب و معقول تھا۔ بہ طور خاص انجم آرا کے لیے شادی دفتر کے مالک شفیق الرحمٰن کو بھا گیا تھا۔ بھابھی لوٹیں تو اسی اتوار مہمانوں کی آمد کا مژدہ ہمراہ تھا۔

فہد کی آمد شفیق الرحمٰن صاحب کے ہمراہ ہوئی تھی۔ اور بھابھی نے سیدھے سبھاؤ انجم آرا کے سامنے بٹھا دیا تھا۔ انہوں نے اک نظر دیکھا۔ لڑکی مناسب و معقول تھی۔ انہیں اعلا بڑھیا درکار بھی نہ تھی۔ امی کا فرمان تھا۔ خوب تر لڑکیوں کے مزاج اونچے ہوتے ہیں۔ جن کی شادیاں مشکل سے ہوں۔ وہ گزارا کرنے کے ہنر سے آشنا ہوتی ہیں۔ مگر یہ محض دکھاوا تھا۔ ٹوٹکے کے تحت بند ٹوٹ جاتے اور اب اسے برا یا ہو ہی جانا تھا۔ اب تک کے تجربات نے تو یہی ثابت کیا تھا۔

پر کشش۔ سوبر۔ مگر انہیں اپنے چٹیل سر کے ساتھ شادی دفتر والوں سے کمنٹ منٹ بھی یاد تھی۔ وہ اک آہ بھر کر اداس الو کی طرح سر ڈال کر بیٹھ گئے۔

یوں نہ تھا میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے۔

✡ ✡ ✡

اس دن فہد آفس سے گھر لوٹا تو امی سر خوشی سے بڑا صندوق اٹھائے بیٹھی تھیں۔

"یہ زیورات کی صندوقچی میرے جہیز کی ہے۔"

شیشم کی منقش صندوقچی اب بھی نئی نکور معلوم دے رہی تھی۔

"اور یہ سچے کام کا دوپٹا۔" اب جگر جگر کرتا دوپٹا ان کے ہاتھ میں تھا۔ نکاح کے وقت اپنی بہو کے سر پر ڈالوں گی۔" فہد اکتا کر صحن کے تخت پر بیٹھ کر جوتوں کے تسمے کھولنے لگا۔

"اور سن میری پاؤ بھر کی چاندی کی پازیب تیری دادی نے منہ دکھائی میں دی تھی۔ ذرا پالش کے لیے دے آنا۔" ان کی خوشی چھپائے نہ چھپ رہی تھی۔

"امی! یہ سب کھڑاگ آخر کس لیے۔؟"

"اے فہد، تجھے اللہ سمجھے' تیرا رشتہ پکا ہو گیا ہے تو شادی کی تیاری کیا تیرے باوا قبر سے اٹھ کر کریں گے۔"

"میرا رشتہ پکا ہو گیا؟" اس نے بے یقینی سے کہا۔

"اور مجھے خبر بھی نہیں؟"

کب۔ کہاں۔ مجھ سے؟"

"ارے بھول گیا۔ پچھلے اتوار تو شفیق الرحمٰن کے ساتھ سج بن کے بر دکھوے کو گیا میں گئی تھی۔؟ آج انجم آرا کے گھر والے مٹھائی دے کے بات پکی کر گئے ہیں؟"

فہد پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ بے ساختہ نگاہوں۔ میں انجم آرا کا سراپا گھوم گیا۔

"مگر امی وہ شادی دفتر سے معاہدہ۔ ٹوٹکا۔؟"

مارے خوشی کے زبان ہی گنگ ہو گئی تھی۔

"ارے تو کیا یہ طے ہوا تھا کہ اگر سچ مچ کوئی تجھے اپنانے پر تیار ہو جائے۔ تو انکار کر دیا جائے؟"

"ہائیں!" ان کے دماغ کی ساری بتیاں جل اٹھیں۔ اس بارے میں تو انہوں نے سوچا بھی نہ تھا۔

"اب منہ کھولے' آنکھیں پھاڑے کیا بیٹھا ہے' یہ سونے کے بٹن' تیرے ابا کی شیروانی۔۔۔۔"

مگر وہ سن ہی کہاں رہا تھا۔ اک نعرہ مستانہ لگا کر امی کو اٹھایا اور گول گول چکر دینے لگا۔

امی ہائیں ہائیں ہی کرتی رہ گئیں۔

✡ ✡

مکمل ناول

قرۃ العین خرم ہاشمی

بند شیشوں کے پرے دیکھ
دریچوں کے ادھر
سبز پیڑوں پہ
گھنی شاخوں پہ، پھولوں پہ
وہاں کیسے چپ چاپ برستا ہے مسلسل پانی....!
کتنی آوازیں ہیں
یہ لوگ ہیں
باتیں ہیں مگر!
ذہن کے پیچھے
کسی اور سطح پہ
کہیں جیسے چپ چاپ
برستا ہے تصور تیرا....!!!

شیشے کے پار برستی بارش اور بارش کی رم جھم سے بجتے فطرت کے راگ کو سنتی، محسوس کرتی وہ کسی اور ہی جہاں میں پہنچی ہوئی تھی! اس خوب صورت سے پہاڑی علاقے میں فطرت کے جلوے اور رنگینی جگہ جگہ نظر آتی تھی۔ دنیا کے شور شرابے اور ہنگاموں سے جب بھی اس کا دل اکتا جاتا وہ چند دن، اس علاقے میں موجود اپنے ریسٹ ہاؤس میں چلی آتی تھی۔ یہاں آکر اسے ایسے لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنے ظاہری وجود کو چھوڑ کر، اپنے "اصل" میں لوٹ آتی ہے۔ اس کا وہ ظاہری وجود، جو دنیا کے لیے تھا۔

شیشے کے پار بھیگتے درختوں کو دیکھتی، شال کو اپنے گرد ٹھیک سے لپیٹتی۔

وہ پلٹ کر بیڈ تک آئی سائیڈ ٹیبل پہ پڑے اپنے موبائل کو اٹھایا۔ ہمدان کی پانچ مس کالز تھیں۔ اس نے کچھ سوچتے ہوئے جلدی سے میسیج ٹائپ کیا اور اسے میسیج سینڈ کر کے موبائل آف کیا اور لاپروائی سے سائیڈ ٹیبل کی دراز میں پھینک کر، کمرے سے باہر نکل گئی۔ اپنی خیریت کی اطلاع اس نے پہنچادی تھی، باقی کی معلومات وہ ریسٹ ہاؤس کے ملازموں سے بھی لے سکتا تھا۔ اپنی اس تنہائی میں وہ کسی کی مداخلت پسند نہیں کرتی تھی یہ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اور ٹیرس پہ تنہا کھڑی، بارش کی بوندوں کو گنتی وہ لڑکی خود بھی اسی خاموشی اور تنہا منظر کا پس منظر لگ رہی تھی!

"السلام علیکم بابا جان!" رحیمہ بی بی کے ساتھ مل کر میز پہ ناشتے کے لوازمات رکھتی انوشے نے ہشاش بشاش لہجے میں بابا جان کو سلام کیا۔ بابا جان نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرا۔ پنک ہائی نیک والے سوئیٹر پہ اسکن کلر کی شال لیے بالوں کو کیچر میں مقید کیے جس کی وجہ سے چہرے کے اطراف میں کچھ لٹیں بکھری ہوئی تھیں۔ جسے وہ کان کے پیچھے کرلیتی اور مگن سے انداز میں بابا جان کو ناشتے کے لوازمات پیش کر رہی تھی۔

"رحیمہ بی بی آپ گرم چائے لے آئیں۔" انوشے نے رحیمہ بی بی سے کہا جو سرہلاتی ہوئی واپس کچن میں چلی گئیں رحیمہ بی بی ان کی خاندانی ملازمہ تھیں۔ جسے انوشے اپنے بچپن سے اس گھر میں دیکھتی آرہی تھی۔

"تم نے اس بار کافی دن نہیں لگا دیے ایبٹ آباد میں۔" بابا جان نے ناشتا کرتے ہوئے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا تھا۔ مگر وہ بے چینی سے اس کے جواب کے منتظر تھے۔ پچھلے کافی دنوں سے انوشے بہت الجھی الجھی اور گم صم سی لگتی تھی۔ انوشے کی چوبیس سالہ زندگی کے شب و روز ان کے سامنے تھے، جو ایک

کھلی کتاب کی طرح کے تھے، مگر نجانے کیوں اب کھوئی کھوئی سی وہ انوشے انہیں ایک پہیلی کی طرح سے لگنے لگی تھی! جو ان کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ سلائس پہ مکھن لگاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے اس کے ہاتھ رکے تھے مگر سر جھٹک کر خود کو مگن ظاہر کرتے ہوئے، اس نے سرسری سے لہجے میں جواب دیا۔

"جی بابا جان! بس ویسے ہی دل چاہ رہا تھا کچھ دن دنیا کے ہنگاموں سے دور، اکیلے میں وقت گزارنے کا یونیورسٹی سے بھی فارغ تھی اس لیے میں نے سوچا کہ کچھ دن تنہا اپنے ساتھ بھی گزارے جائیں۔"

کراچی

انوشے نے روانی میں کہا تو بابا جان نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر بات کرنی والی پر اعتماد اور ذہین انوشے 'اب ادھر ادھر دیکھتی' نظریں چراتی رہتی تھی۔ جیسے اس کی شفاف ٹھہرے پانی جیسی 'سبز رنگ کی آنکھیں وہ راز افشا نہ کردیں جن پہ گھری پلکوں کا حسین پہرہ تھا۔ انوشے کی آنکھوں کی رنگت بابا جان کی آنکھوں جیسی تھی۔

"ہوں! تو تمہارا مطلب یہ ہے کہ جو وقت تم یہاں میرے ساتھ گزارتی ہو' اس میں تم "اپنے" ساتھ نہیں ہوتیں؟ کیا یہ سب دکھاوے کی زندگی ہے انوشے ؟ کیا تم خوش نہیں ہو میرے ساتھ؟"

بابا جان نے دل میں اتنے دنوں سے مچلتا سوال' زبان کے حوالے کر ہی دیا۔

"نہیں بابا جان!" انوشے نے تڑپ کر ان کے سبز اور نیلی رگوں والے سفید اور مضبوط مردانہ ہاتھ پہ اپنا نازک سا ہاتھ رکھا۔

"آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے؟ جتنی محبت اور پیار سے آپ نے میری پرورش کی ہے میں اگر چاہوں بھی تو آپ کا حق نہیں ادا کر سکتی۔" انوشے نے نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ کہا تو بابا جان اسے خاموشی سے دیکھ کر رہ گئے۔ ہر دم ہنسنے' مسکرانے والی انوشے کی آنکھیں اب بات بے بات نم ہو جاتی تھیں۔ جیسے دل کا پیالہ آنسوؤں کے نمکین پانی سے بھرا ہوا تھا جو ہلکی سی بھی ٹھیس لگنے پہ چھلک پڑتا تھا اور آنکھیں.....! جو اندر کے حال کا آئینہ ہوتی ہیں یہ آنکھیں راز کب رکھتیں ہیں بھلا! کبھی اداسی کی صورت' کبھی نمی کا جہاں لیے' کبھی جاگتی راتوں کا ہلکا گلابی پن' سب راز کھول دیتی ہیں! اور ہم تیزی سے پلکیں جھپکاتے یا ادھر ادھر دیکھتے' نظریں چھپاتے یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ایک دیوار کے پیچھے چھپ گئے ہیں۔

"اچھا خیر چھوڑو ان سب باتوں کو۔ بڑی آپا کا فون آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھیں کہ انوشے بہت اصرار کرنے پر بھی صرف دو دن ان کی طرف ٹھہری تھی! تمہاری بہت فکر کر رہی تھیں کہ بہت کمزور اور چپ چپ سی ہو گئی ہو۔"

بابا جان نے ایبٹ آباد میں مقیم اپنی بڑی بہن کنیز فاطمہ کے فون کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

"جی بابا جان! بڑی پھوپھو سچ میں' بہت پیار کرتی ہیں مجھ سے۔ دو دنوں میں ہی انہوں نے اتنا کچھ اپنے ہاتھوں سے خاص میرے لیے بنا بنا کر کھلایا کہ میری تو بس ہو گئی تھی۔"

انوشے نے تصور کی آنکھ سے بڑی پھوپھو کے گھر میں گزارے خوشگوار دنوں کو دیکھتے ہوئے ہنس کر بتایا تو بابا جان بھی مسکرا دیے۔

"ہاں وہ شروع سے ہی ایسی ہی ہیں۔ سب کا بہت خیال رکھنے والی اور فکر کرنے والی۔" بابا جان نے مسکراتے ہوئے' بہت محبت سے اپنی بہن کا ذکر کیا۔

"اب گل پھوپھو شکوہ کر رہی تھیں کہ میرے پاس لاہور بھی رہنے آؤ۔ مگر میں نے کہہ دیا کہ میں اپنے بابا جان کو اکیلا چھوڑ کر نہیں آسکتی۔ ہاں اگر بابا جان خود کسی دن مجھے اپنے ساتھ لاہور لے چلیں تو پھر اور بات ہو گی۔"

انوشے نے شرارت سے کہتے' بال بابا جان کے کورٹ میں ڈال دی تھی۔ بابا جان اس کی بات سمجھ کر مسکرا کر اثبات میں سر ہلانے لگے۔

"اسلام آباد سے لاہور کون سا دور ہے' آج کل آفس میں کام زیادہ ہے۔ میں فری ہو جاؤں تو لاہور کا ایک چکر لگا لیں گے۔"

بابا جان نے ذہن میں آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتے ہوئے کہا۔ تو انوشے ان کا دھیان بٹ جانے پہ شکر ادا کرتی۔ گرم گرم چائے کے سپ لینے لگی۔

مگر آخر کب تک؟ درد جب حد سے سوا ہو جائے گا تو چہرے کے خدوخال سے ہوتا لہجے میں بھی سما جائے گا۔ اور لہجوں کے درد' چھپائے نہیں چھپتے!

شہر کے مضافات سے دور بڑی سی' پرانے زمانے کی بنی حویلی' جس میں گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ' جدید تقاضوں کو مدنظر رکھتے تزئین و آرائش میں کافی

تبدیلی کی گئی تھی۔ آج کے دن بہت خوب صورتی سے سجی ہوئی تھی۔ آخر کیوں نہ ہوتی۔ اس حویلی کے اکلوتے بیٹے اور وارث کی آج شادی کی تقریب تھی۔ حویلی کے اندر باہر بہت شور اور گہما گہمی تھی۔ سجی سنوری بچیاں اپنے زمین کو چھوتے دوپٹوں کو سنبھالنے میں ہلکان ہوتیں' لہنگا پہنے' چوڑیوں سے ہاتھ بھرے' اندر سے باہر بھاگ رہی تھیں۔ لڑکیوں کی ٹولیاں الگ رنگ میں' جگہ جگہ براجمان تھیں۔ ہنسی' قہقہے لگاتیں' ہار و سنگھار کیے' ہر جوان دل کو دھڑکاتے' کہیں مہندی کے تھال سجا رہی ہوتیں کہیں پھولوں کے تھال لیے کھڑی ہوتیں۔

مردانہ اور زنانہ حصے الگ الگ تھے۔ اس لیے لڑکیاں بہت آرام سے' زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے ادھر سے ادھر جا رہی تھیں۔ حویلی میں بہت رونق تھی۔ کیوں کہ بے جی کے ننھیال اور ددھیال سے لوگ شادی میں شرکت کرنے آئے ہوئے تھے۔ سسرال میں سے زیادہ تر رشتہ دار آس پاس ہی رہتے تھے۔ ویسے بھی بے جی کی سسرال میں لمبے چوڑے رشتے نہیں تھے۔ ان کے شوہر عبدالرحیم اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھے۔ ساس سسر بہت شفیق اور مہربان تھے۔ جب تک زندہ رہے بے جی کے لاڈ اٹھاتے رہے۔

بے جی کو اللہ نے تین بچوں سے نوازا تھا۔ دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ عبدالرحیم کی وفات تین سال پہلے قضائے الٰہی سے ہو گئی تھی۔ تب تک وہ بڑی دونوں بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ جہانگیر کے سر سہرا دیکھنے کی تمنا لیے وہ ابدی نیند سو چکے تھے۔ آج جہانگیر بھی اپنی زندگی کے نئے سفر کا آغاز کر رہا تھا۔ جہاں بے جی کا دل خوشی سے معمور تھا وہاں آنکھوں میں نمی بھی تھی۔ دونوں بہنیں بھی ہر کام میں پیش پیش تھیں۔ کیوں نہ ہوتیں آج ان کا راج دلارا بھائی' دلہا بنا تھا۔ پریوں جیسی آن بان والی ماہ رخ کو بیاہنے کے لیے!

غرض مختلف رسموں سے ہوتیں' بالآخر دلہن کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ سیڑھیاں چڑھتے' بڑا سا گھونگھٹ نکالے' بھاری زیورات اور لہنگے میں ملبوس' ماہ رخ نے سرخ پتیوں پہ رکھے روشن دیے دیکھے۔ تو ہلکی سی مسکراہٹ نے اس کے خوب صورت لبوں کا احاطہ کیا۔ سیڑھیوں سے لے کر' اس کے کمرے تک کا راستہ بہت خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ اسے اپنے دل میں بھی ایسے ہی رنگ کے سرخ پتیوں کی بارش ہوتی نظر آ رہی تھی اور امنگوں اور امیدوں کے جلتے ننھے ننھے بے شمار دیے جن کی لو اس کے گالوں کو دہکا رہی تھی۔

خسرو رین سہاگ کی' سو جاگی پی کے سنگ
تن مورا من پریتم کا' دونوں ایک ہی رنگ!

خوب صورتی اور نفاست سے آراستہ کمرے میں' پھولوں سے سجی سیج پہ بیٹھی' اپنے مہندی سے رچے نم ہاتھوں کی لرزش کو چھپاتی' دھڑکتے دل سے وہ اپنے' ہم سفر کی منتظر تھی! ہم سفر بھی وہ۔ جس کی ایک جھلک نے ہی اسے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ جہانگیر کی خاندانی شرافت' نام اور اس کی قابلیت کے علاوہ' اس کی سحر زدہ کر دینے والی شخصیت نے بھی ماہ رخ کو اس رشتے پہ اثبات کی مہر لگانے پہ مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ ماہ رخ کا حسن بھی لفظوں کا محتاج نہیں تھا۔ مگر اس کے حسن میں اضافہ اس کی خود سے بے نیازی اور سادگی سے ہوتا تھا۔

دروازہ کھولنے کی ہلکی سی آواز نے کائنات کی ہر چیز کو ساکت کر دیا تھا۔ بس وہ تھی اور اس کے دل کا بڑھتا ہوا شور تھا۔

تیری ہر چاپ سے جلتے خیالوں میں چراغ
جب بھی تو آئے جگاتا ہوا جادو آئے!

ماہ رخ کا سارا جسم سماعت بن گیا تھا۔ اس کی چاپ سے جلتے چراغوں کی روشنی خود میں دور تک اترتے محسوس کر رہی تھی۔ جب جہانگیر نے بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے ایک دم ہی اس کا گھونگھٹ الٹ دیا تھا۔ ماہ رخ نے بے اختیار آنکھیں بند کر لی تھیں۔ مگر اس کے پلکوں کی لرزش' اس کے دل کا حال بیان کر رہی تھی۔ جہانگیر نے ٹھٹک کر اس کے دو آتشہ حسن کو دیکھا

تھا۔ بے۔جی کا انتخاب لاجواب تھا۔ مگر وہ خود بھی کسی سے کم نہیں تھا اسی لیے اسے ہم سفر بھی ایسا ہی ملنا چاہیے تھا۔ یہ جہانگیر کی خود پسند سوچ تھی۔ جس نے لفظوں کا روپ دھار لیا تھا۔

"ماہ رخ تم خالصتاً" بے۔جی کی پسند ہو۔ مگر میرے دل تک آنے کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے۔ میری زندگی کے کچھ اصول ہیں۔ جن پہ میں نے کبھی سمجھوتا نہیں کیا ہے اور میں تم سے بھی یہ ہی امید رکھتا ہوں کہ ان سے ٹکرانے کے بجائے، سمجھ داری سے اپنی زندگی میں شامل کرلو گی اور سب سے اہم بات ....!" جہانگیر نے بیڈ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے اپنی مرضی چلانے اور بحث کرنے والی عورتیں سخت ناپسند ہیں۔ امید ہے کہ تمہیں میری بات سمجھ آگئی ہوگی۔ رات کافی ہو چکی ہے تم چینج کر لو۔" جہانگیر نے اپنی شیروانی کے بٹن کھولتے ہوئے کچھ یاد آنے پہ پیچھے مڑکر گم صم سی بیٹھی ماہ رخ کو دیکھا۔

"اور ہاں یاد آیا۔ تمہارا منہ دکھائی کا گفٹ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں پڑا ہوا ہے امید ہے تمہیں پسند آئے گا۔ ویسے بے جی کی پسند کو تم ریجیکٹ کر ہی نہیں سکتیں۔"

ماہ رخ نے نم ہوتی آنکھوں کے ساتھ واش روم کے بند ہوتے دروازے کو دیکھا تھا۔ کیسی زور کی ہوا چلی تھی کہ سارے چراغ ہی بجھا گئی تھی۔ سہاگ رات ' ارمانوں سے سجی ' محبت کے چند بولوں کا رس' سماعت سننے کو بے چین تھی۔ ماہ رخ نے بیڈ سے نیچے پاؤں رکھے تو زیور کی جھنکار سے مدھر سر بکھر گیا۔ اس کا یہ حسن ' اس کا دلہناپے کا روپ ' ہار سنگھار کچھ بھی تو ایسا نہیں تھا ' جسے سراہا گیا ہو۔ جس کے لیے اتنے جتن کیے تھے اگر وہ ہی دل نوازی کی ایک نظر ہی نہ ڈالے تو کیا فائدہ اس ہار سنگھار کا! اس روپ کا....!

بے دلی سے ایک ایک زیور کو اتارتی ' ماہ رخ نم آنکھوں سے ' اپنے دل کو تسلی کے بول کہتی ' اندر ہی اندر خود سے الجھ رہی تھی۔

"ایک ایسا ہم سفر جس کی ہر بات میں سے شروع ہو کر میں پہ ہی ختم ہوتی ہے۔ جو نازک جذبوں کی پذیرائی کرنے سے قطعی نا آشنا ہے اس کے ساتھ چلنا کتنا مشکل ہوگا۔"

ماہ رخ نے گہری سانس لے کر خود کو ان سوچوں سے آزاد کرنا چاہا اور لہنگا سنبھالتی ڈریسنگ روم کی طرف بڑھ گئی۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے نازک جذبات و احساسات کے شیشے پہ ابھی ایسی سرد رویوں کی بہت سی کنکریاں پڑنی تھیں۔ جہانگیر علی شاہ پتھر کا ایسا بت تھا جو صرف زخم دینا جانتا تھا مرہم لگانا نہیں۔

آج صبح سے ہی بہت اچھی دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ بابا جان کے آفس جانے کے بعد 'انوشے' دھوپ کا مزا لینے لان میں چلی آئی۔ اور بہت غور سے گھوم پھر کے لان کا جائزہ لینے لگی۔

"مالی بابا ٹھیک سے لان کا خیال نہیں رکھ رہے ہیں۔ آج بات کروں گی ان سے۔ کتنے ہی پودوں کو کانٹ چھانٹ کی ضرورت ہے اور یہ گھاس اس طرف سے بڑی ہوئی ہے اور....."

انوشے خود کلامی کرتے ہوئے پودوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ خود کو کسی سوچ یا خیال سے بچانے کے لیے' یہ کوشش کر رہی ہے۔ کچھ دیر میں سہی بالآخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہی اور پوری طرح سے اپنے کام میں مگن ہو کر اردگرد کی ہوش بھلا بیٹھی تھی۔

فطرت ایسے ہی خود میں گم کر کے کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی 'مگر ہمیں بے معنی کی سوچوں اور الجھنوں سے آزاد کر کے 'نئی امید اور امنگ دیتی ہے۔ جیسے کہ انوشے خود کو اس وقت ترو تازہ اور آزاد محسوس کر رہی تھی اور اس سکون کی تلاش میں ہی وہ ' اتنے دن اس پہاڑی علاقے کے ریسٹ ہاؤس میں گزار کر آئی تھی۔

"انوشے بی بی! آپ کا فون ہے۔" گھریلو ملازم اکبر نے کارڈلیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ تو گوڈی کرتی انوشے نے چونک کر اس کے ہاتھ میں پکڑے فون کو دیکھا اور پھر مٹی سے بھرے اپنے

ہاتھوں پہ نظر ڈالی۔ ہاتھ جھاڑتی اس نے کارڈلیس پکڑ لیا۔

"کہاں غائب ہو بے وفا لڑکی!" انوشے کے ہیلو کہنے پہ دوسری طرف سے بے ساختہ شکوہ کیا گیا۔ انوشے کے لبوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں تو یہاں ہی ہوتی ہوں مگر سنا ہے آپ ہمارے شہر میں آکر بھی ہم سے نہیں ملے ہیں؟" انوشے نے جواباً شکوہ کیا تو ہمدان بے ساختہ ہنس پڑا۔

"بالکل تمہاری طرح سے جیسے تم ایبٹ آباد آکر ہمارے پاس رکنے کے بجائے اس ویرانے میں آباد ریسٹ ہاؤس میں ڈیرا ڈال لیتی ہو اور سارا دن بھٹکتی آتما کی طرح اونچے نیچے راستوں پہ چہل قدمی کرتی مقامی لوگوں کو ڈراتی رہتی ہو۔"

"کافی تیز سورس آف انفارمیشن ہیں جناب کے!" انوشے نے ہمدان کی بات پہ ہنستے ہوئے کہا اور لان چیئر پہ بیٹھ گئی۔

"بس جو دل کے قریب ہوں ان کے ہر پل کی خبر رکھنی بھی پڑتی ہے۔" ہمدان نے ٹریک سے اترتے ہوئے کہا۔ اسی پوائنٹ پہ آکر انوشے خود میں سمٹ جاتی تھی۔ ابھی بھی ہمدان کو ٹریک سے اترتے دیکھ کر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگی۔ جسے سمجھ کر ہمدان گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"اچھا! میں نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ مابدولت آج رات کا کھانا آپ کے گھر تناول فرمائیں گے۔ ہماری پسند کی تمام ڈشز تیار ہونی چاہیے۔ حکم عدولی پہ کنیز کو دیوار میں چنوایا بھی جا سکتا ہے۔" ہمدان نے تحکمانہ لہجے میں شرارت سے کہا۔

"جی جی جو حکم جناب عالی! بس اتنا بتا دیں کہ یہ کنیز کون ہے جس تک آپ کا حکم بمعہ فرمائشی لسٹ کے پہنچانا ہے۔"

انوشے نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔ جواباً ہمدان نے کچھ کہا تو انوشے کی مدھر ہنسی فضا میں بکھر گئی۔ فون بند کر کے کارڈلیس پہ ٹھوڑی رکھ کر کچھ سوچتے ہوئے اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک تھی۔ ہلکی سی گنگناہٹ لیے وہ اٹھ کر اندر کی طرف چل پڑی۔ رحیمہ بی بی کے ساتھ مل کر اسے شام کے ڈنر کی اچھی سی تیاری بھی کرنی تھی۔ آج کی شام کو وہ بہت اچھی طرح سے اور یادگار بنانا چاہتی تھی۔ جیسے آج سے دو سال پہلے کی ہوا کرتی تھیں۔ بے فکری اور خوشی کے رنگوں سے مزین!

☼ ☼ ☼

"جہانگیر! ادھر آؤ بیٹا!" بے جی نے گھر سے باہر جاتے جہانگیر کو آواز دیتے ہوئے کہا۔ شام کا وقت تھا۔ بے جی بڑے سے صحن میں تخت پہ بیٹھی ہوئی تھیں۔ سردیوں کے شروع ہوتے ہی یہ بڑا سا صحن آباد ہو جاتا تھا۔ جہاں سورج کی نرم گرم شعاعوں سے لطف اندوز ہوتے ہوئے گھر کے بہت سے کام بھی نپٹائے جاتے تھے۔ ابھی بھی بے جی عصر کی نماز پڑھ کر فارغ ہوئی تھیں۔ جب انہوں نے جہانگیر کو تیار ہو کر پورچ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

جہانگیر نے پاس آکر بے جی کو سلام کیا تو انہوں نے اس کے جھکے سر پہ پیار دے کر اشارے سے اپنے پاس بیٹھنے کا کہا۔ "حکم کریں بے جی!" جہانگیر نے مودب ہو کر پوچھا۔

"جہانگیر بیٹا! تمہاری شادی کو دو مہینے ہونے والے ہیں ماہ رخ بیٹی بہت اچھی اور دھیمی مزاج کی بچی ہے۔ مگر بیٹا میں نے بہت بار نوٹ کیا ہے کہ تمہارا رویہ اس کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سخت ہے۔ شادی کے بعد سے اب تک تم اسے کہیں بھی گھمانے پھرانے نہیں لے کر گئے اور تو اور تم نے اس کے خاندان کی طرف سے دی جانے والی دعوتوں پہ بھی جانے سے منع کر دیا۔ سوائے چند ایک کے!" بے جی نے سنجیدگی سے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

جہانگیر خاموشی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔ ماں کے چہرے پہ پھیلی ناراضی صاف نظر آ رہی تھی۔ اسی وقت خوب صورت سے میرون شال اوڑھے، جس پہ کڑھائی ہوئی تھی، سج سج کے قدم اٹھاتی ماہ رخ بھی

چائے کی ٹرے اٹھائے چلی آئی' ماہ رخ پہ کاموں کی ذمہ داری نہیں تھی مگر اکثر صبح کا ناشتا اور شام کی چائے' وہ خود بے جی کو بنا کر دیتی تھی۔ جس پہ بے جی بہت خوش ہوتی تھیں اور اسے ڈھیروں دعاؤں سے نوازتی تھیں۔ ماہ رخ نے پاس آکر سلام کیا اور پاس پڑی میز پہ ٹرے رکھ کر چائے بنانے لگی۔

"آپ چائے لیں گے؟" ماہ رخ نے ذرا کی پلکیں اٹھا کر اپنے مجازی خدا سے سوال کیا۔ جس کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔

"اچھا تو یہ محترمہ اس معمولی خدمت کے عوض آپ کے کان بھرتی ہیں میرے خلاف!" جہانگیر علی شاہ نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں سوال کیا تو ماہ رخ چائے میں چینی ڈالنا بھول کر حیرانی سے اس کا منہ دیکھنے لگی۔

"جہانگیر' یہ تم کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟ وہ تمہاری بیوی ہے۔ آج کل تو لوگ نوکروں سے بھی ایسے بات نہیں کرتے ہیں کیا میری تربیت یہ تھی! تم نے مجھے اندھا یا بے وقوف سمجھ کر رکھا ہوا ہے۔ جو میں تمہارے رویے کو دیکھ یا محسوس نہیں کر سکتی ہوں۔" بے جی نے جلال میں آتے ہوئے کہا تو جہانگیر غصے کو ضبط کرتا' ہونٹ چباتا' ایک دم سے وہاں سے اٹھ کر لمبے لمبے ڈگ لیتا' چلا گیا۔ پیچھے ماہ رخ آنکھوں میں آنسو لیے' حیرت کی تصویر بنے اسے جاتا ہوا دیکھتی رہی۔ جبکہ بے جی تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ انہیں نہیں پتا چلا کہ کب ماہ رخ خاموشی سے اٹھی اور اندر چلی گئی تھی۔ اس رات جہانگیر علی شاہ بہت دیر سے گھر آیا تھا۔ اور لان میں موجود' سیاہ چادر' جس پہ جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے شیشے ٹانکے ہوئے تھے' لپے وجود کو اپنے انتظار میں جاگتا دیکھ کر ایک لمحے کو ان کے قدم رکے ضرور تھے۔ مگر ٹھہرے نہیں تھے۔

اور ان کی چوڑی پشت پہ نظریں جمائے' اندر جاتا دیکھ کر' اس نے گہری سانس لی تھی۔ اور تھک ہار کر سنگی بینچ پہ بیٹھ گئی تھی۔ یہ دو مہینے' دو صدیوں کے برابر تھے اس کے لیے۔ وہ ہر لمحہ' ہر پل' پتھر کے بت کو خوش کرنے' راضی کرنے میں لگی رہتی تھی مگر پھر بھی پتھر کا وہ مجسمہ پگھلتا نہیں تھا۔ ماہ رخ نے سیاہ رات کے دامن پہ پھیلے ستاروں کی طرف دیکھا۔

ہم؟

دوران خلاؤں میں
رقص کرتے رہتے ہیں
ان گنت ستارے ہیں!
اپنے اپنے محور میں
پھر بھی دست قدرت نے
چند اک ستاروں میں
اک کشش سی رکھ دی ہے
جب قریب آتے ہیں
ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں
ہم وہی ستارے ہیں؟

اپنے ٹوٹے پھوٹے وجود کو سمیٹتے' ماہ رخ آہستگی سے اٹھی اور اندر کی طرف چل پڑی۔ جو بھی تھا حقوق و فرائض کا رشتہ تو دونوں کو ہی نبھانا ہی تھا۔ ہاں اس میں دل کا زیاں اور بکھرنا کس نے دیکھنا تھا اور دل بھی نازک سے جذبات و احساسات رکھنے والی موم کی گڑیا کا....! جو رویوں کی تپش میں لمحہ بہ لمحہ پگھل رہی تھی!

✡ ✡ ✡

"کیسی ہو؟" میسجز ٹون بجی تو اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا۔ اسی دشمن جان کا پیغام آیا تھا۔ دل میں درد سا پھیلنے لگا تھا۔

"پتا نہیں! سوچنا چھوڑ دیا ہے!" جواب حسب روایت ہی بھیجا تھا اس نے۔

"بہت یاد آتی ہو! کیا کروں میں؟" بہت بے چارگی سے کہتے' آخر میں معصومیت سے سوال کیا گیا تھا۔

"تمہیں بار بار کہا ہے میرے راستے میں مت آؤ! مجھے جینے دو میری زندگی۔"

بے بسی سے وہ چیخ پڑی تھی۔

"تم راستہ نہیں! منزل ہو میری اور میری جان!"

کچھ منزلوں پر
قدم نہیں....
دل پہنچتے ہیں....!"

بڑے جذبے سے میسجز کیا گیا تھا۔ اس کے گال دہک اٹھے تھے۔ خوب صورت لبوں کو کچلتے اس نے بے بسی سے صرف اتنا لکھا تھا۔

"تم....!" اور میسجز سینڈ کر کے' موبائل آف کر کے رکھ دیا۔ تکیے میں منہ چھپائے' وہ اس کے لفظوں کے سحر اور وجود کے جادو سے بچنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے ہوتے ایک دم سے رو پڑی تھی۔

اور اس کے ادھورے میسجز سے وہ جان چکا تھا کہ وہ بے بسی کی انتہا پہ تھی۔ اس کے لبوں پہ خوب صورت مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔! "جتنا بھی دور بھاگ لو۔ واپس میرے پاس ہی آنا ہے تمہیں!"

اس کے تصور سے مخاطب ہوتے دھیرے سے خود کلامی کی تھی اس نے۔

☼ ☼ ☼

"میں نے تو مما سے پہلے ہی کہہ دیا تھا جیسے ہی امتحان ختم ہوں گے میں ایک دن بھی ضائع کیے بغیر ماموں جان کے پاس رہنے چلی جاؤں گی اور ان کی خوب خدمت کروں گی تاکہ وہ بھی ایک سگھڑ اور سلیقہ شعار بیٹی کا سکھ لے سکیں۔ انوشے سے تو ایسی توقع رکھنا ہی فضول ہے۔"

علشبہ کی نان اسٹاپ چلتی زبان' انوشے کو چائے کی ٹرالی لاتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تھمی ضرور تھی مگر رکی نہیں تھی۔ مونگ پھلی سے انصاف کرتے وہ نیچے قالین پہ رکھے کشن پہ بیٹھی ہوئی تھی۔ پاس ہی صوفے پہ بابا جان ٹی وی کا والیوم بند کیے' بہت دلچسپی اور اشتیاق سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"ویسے یہ سگھڑ اور سلیقہ مند بیٹی کا سکھ گل پھوپھو کو بھی ملنا چاہیے تھا نا! تمہیں چاہیے تھا کہ ان چھٹیوں میں تم گل پھوپھو کو مکمل آرام کرواتیں۔ مگر تمہیں سیر سپاٹے کرنے سے ہی فرصت نہیں ہے۔!"

انوشے نے گرم گرم گاجر کا حلوہ بابا جان اور علشبہ کو پیش کرتے ہوئے' علشبہ سے کہا تو وہ کھسیانی ہنسی ہنس پڑی۔

"تم مما کی فکر مت کرو۔ گھر میں نوکر بھی موجود ہیں اور سب سے بڑی بات' مما کی دو دو بہوئیں ہیں مما روایتی ساس بن کر ان سے خوب خدمت لیتی ہیں۔ مگر یہاں ماموں جان کو میری خدمت کی ضرورت تھی' ہے نا ماموں جان؟"

علشبہ نے فراٹے بھرتے ہوئے بابا جان کو مخاطب کیا۔ جو اثبات میں سرہلا کر رہ گئے۔ مگر ان کے چہرے پہ پھیلی ہلکی سی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ انہیں علشبہ کا بولنا اچھا لگ رہا ہے۔

"شرم کرو لڑکی! اپنی ماں کو ہی ظالم ساس مشہور کر رہی ہو۔ کیا میں جانتی نہیں کہ گل پھوپھو کتنی اچھی اور سوفٹ نیچر کی ہیں۔"

"اچھا بچوں تم دونوں بیٹھو! مجھے کچھ کام کرنا ہے آفس کا۔ میں اسٹڈی روم میں ہوں۔ کچھ دیر میں ہمدان آئے گا۔ اسے وہاں ہی بھیج دینا۔"

بابا جان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ انوشے نے اثبات میں سرہلا دیا جبکہ علشبہ سنبھل کر بیٹھ گئی اور کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ہمدان اکثر آتے ہیں ناماموں جان سے ملنے!"

"ہوں! ہمدان شروع سے ہی بابا جان سے کافی اٹیچڈ رہا ہے۔ اب تو خیر سے اسلام آباد میں ہی جاب کرتا ہے۔ تقریباً" روز ہی ملاقات ہو جاتی ہے' ہمدان کی بابا جان سے۔"

انوشے نے اپنے سے دو سال چھوٹی' ایم۔ اے پارٹ ون کی طالبہ اور نٹ کھٹ سی کزن علشبہ کو تفصیل سے جواب دیتے ہوئے کہا۔

گل پھوپھو کے چار بچے تھے۔ تین بیٹے اور ایک بیٹی۔ علشبہ سے چھوٹا احمد سیکنڈ ایئر کا اسٹوڈنٹ تھا۔ بڑے دو بھائی زوار اور احتشام شادی شدہ تھے۔ زوار بھائی کی بیوی آمنہ' بڑی پھوپھو کی بیٹی تھیں۔ زوار بھائی اور آمنہ کے دو بچے' ایک بیٹا اور ایک بیٹی تھی۔

احتشام کی بیوی عائلہ 'خالصتاً" ان کی اپنی پسند تھیں۔ دونوں کی ایک بہت پیاری بیٹی تھی۔ علشبہ گھر بھر کی لاڈلی تھی۔ اکلوتی بیٹی 'بہن اور پھوپھو بن کر اس کے مزے ہی مزے تھے۔

"میں نے سنا تھا کہ ماموں جان نے بہت زور دیا تھا ہمدان پہ کہ ان کے ساتھ 'اسی گھر میں آکر رہے جبکہ ہمدان نے یہاں آکر رہنے سے منع کر دیا تھا۔" علشبہ نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں! بابا جان نے کافی زور دیا تھا۔ مگر وہ نہیں مانے ویسے آفس کی طرف سے انہیں اپارٹمنٹ ملا ہوا ہے۔" انوشے نے لاپروائی سے جواب دیا تو علشبہ کسی سوچ میں گم سر ہلا کر رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

ماہ رخ کے والد کا اس وقت انتقال ہوا جب ماہ رخ دس سال کی تھی۔ ماہ رخ سے بڑے دو بھائی تھے۔ احسن بھائی اور جنید۔ ماہ رخ کی والدہ ام کلثوم لاہور کے ایک کالج میں لیکچرار تھیں۔ بہت وضع دار اور باہمت خاتون جنہوں نے شوہر کے مرنے کے بعد بہت ہمت اور حوصلے سے وقت گزارا تھا۔ اپنے بچوں کی کڑی نگرانی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تعلیم و تربیت پہ بھی خاص توجہ دی تھی۔ بچے تینوں ہی ماں کے فرمانبردار اور فطرتاً" نیک تھے۔ ماں کی انتھک محنت اور کوششوں کی دل سے قدر کرنے والے۔

ام کلثوم کا ایک ہی بھائی تھا۔ جو کافی عرصے سے اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا میں رہائش پذیر تھا۔ دونوں بہن بھائی دور ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مکمل رابطے میں رہتے تھے اور تبریز ماموں کی کوششوں سے ہی بی ایس سی کرنے کے بعد احسن بھائی کینیڈا چلے گئے۔ اور وہاں مزید تعلیم حاصل کرنے ساتھ ساتھ جاب بھی کرنے لگے اور گھر بھی پیسے بھیجنے لگے۔

جنید ایف ایس سی میں اور ماہ رخ میٹرک میں تھی۔ احسن کے باہر جانے سے گھر کے حالات پہلے سے بہت بہتر ہونے لگے تھے۔ تبریز ماموں کا ارادہ تھا کہ کچھ عرصے بعد جنید کو بھی اپنے پاس بلالیں گے۔ اس کے لیے وہ مسلسل کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

جنید پڑھنے میں بہت اچھا اور لائق تھا۔ اس نے ایف ایس سی اعزازی نمبروں سے پاس کی اور اسکالر شپ پہ پڑھنے کے لیے آسٹریلیا چلا گیا۔ جنید کی عمر کم تھی مگر اس کے بہتر اور محفوظ مستقبل کے لیے ام کلثوم کو دل پہ پتھر رکھنا پڑا اور اپنے دونوں بیٹوں کو خود سے دور بھیجنا پڑا۔

لاہور میں ام کلثوم کا چھوٹا سہی مگر اپنا ذاتی گھر تھا۔ جو لاہور کے اچھے علاقے میں تھا۔ دونوں بیٹوں کے جانے کے بعد 'گھر میں کوئی مرد نہیں رہا تھا۔ مگر یہ بھی شکر تھا کہ آس پاس رہنے والے لوگ بہت اچھے اور شریف تھے۔ اور کافی وقت سے ایک دوسرے سے واقف تھے۔ اس لیے دونوں ماں بیٹی کا وقت سہولت سے کٹنے لگا۔ کچھ ام کلثوم بہت سمجھ دار اور سیلف میڈ خاتون تھیں اور انہی خطوط پہ انہوں نے اپنے بچوں کی بھی تربیت کی تھی۔

ماہ رخ کو ڈرنے' خوفزدہ ہونے یا کسی پہ انحصار کرنے کے بجائے 'بہادری اور سمجھ داری سے حالات کا مقابلہ کرنا اور دنیا میں جینا سکھایا تھا۔ ام کلثوم خود گاڑی ڈرائیو کرتی تھیں اور آہستہ آہستہ انہوں نے ماہ رخ کو بھی ڈرائیونگ سکھا دی تھی۔

وقت بہت تیزی سے گزر رہا تھا۔ احسن بھائی نے تعلیم مکمل کر کے تبریز ماموں کے ساتھ 'ان کے بزنس میں ہاتھ بٹانے لگا تھا۔ اس کا ارادہ بھی اپنا ذاتی بزنس شروع کرنے کا تھا مگر فی الحال وہ ماموں کی زیر پرستی کاروبار کے داؤ پیچ سیکھ رہا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ اس قابل ہو گیا کہ اپنا ذاتی کاروبار شروع کر سکتا تھا۔ اور پھر ماموں سے شراکت کر کے اس نے اپنے کاروبار کی بنیاد رکھی۔ اور دن بہ دن ترقی کا زینہ چڑھنے لگا۔

دوسری طرف جنید 'اپنی تعلیم مکمل کر کے آسٹریلیا میں ہی ایک کمپنی میں جاب کرنے لگا۔ اس کی جاب بہت اچھی اور ترقی کے کافی چانسز تھے۔

ماہ رخ ان دنوں ایم اے انگلش لٹریچر میں کر رہی

تھی جب احسن بھائی کی شادی تبریز ماموں کی بڑی بیٹی زارا سے ہوئی۔

زارا اور فرحین دو ہی بہنیں تھیں۔ شادی روایتی دھوم دھام سے پاکستان میں ہی ہوئی۔ یہ ان کے گھر کی پہلی خوشی تھی۔ جسے بھرپور طریقے سے منایا گیا۔ سارا خاندان کافی عرصے بعد اکٹھے ہوا تھا۔ جنید بھی پاکستان آیا ہوا تھا۔ احسن کی شادی میں ام کلثوم نے اپنی قریبی اور دل عزیز سہیلی رقیہ عرف بے جی کو بھی بلایا تھا۔ دونوں دوستیں کافی عرصے بعد ملی تھیں۔

بے جی ایبٹ آباد میں مقیم تھیں۔ جبکہ ام کلثوم لاہور میں کافی سال پہلے رقیہ (بے جی) کے والدین کچھ عرصہ لاہور مقیم رہے تھے۔ جہاں ان کے پڑوس میں ام کلثوم اپنے والدین اور اکلوتے بھائی کے ساتھ رہتی تھیں اور یہاں سے ہی دونوں میں نہ مٹنے والی محبت اور دوستی کا آغاز ہوا تھا۔ جو ساری زندگی قائم رہا۔ حتیٰ کہ شادی اور بچوں کے بعد بھی۔ ہاں گھریلو مصروفیات کی وجہ سے ملنا ملانا بہت کم ہوتا تھا۔

احسن کی شادی پہ جہاں رقیہ (بے جی) ماہ رخ کی خوب صورتی اور سادگی کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھیں۔ پر اعتماد، پڑھی لکھی، سلیقے سے اٹھنے بیٹھنے والی، نرم لہجے میں بات کرتی ماہ رخ انہیں اپنے اکلوتے اور وجیہہ بیٹے کے لیے پسند آگئی تھیں اور انہوں نے فوراً" ہی اس کا ذکر، ام کلثوم سے بھی کر دیا تھا۔ جو ایک لمحے کے لیے حیران اور پھر خاموش ہو گئی تھیں۔

جہانگیر بلاشبہ دیکھنے میں ہر لحاظ سے بہترین تھا۔ مگر اس کے مزاج اور عادتوں کے بارے میں وہ ٹھیک سے نہیں جانتی تھیں۔ اسی لیے انہوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا تھا۔

احسن کی شادی کے ہنگامے سرد پڑے تو کچھ دن بے جی اپنی دونوں بیٹیوں اور مٹھائی کے ٹوکرے لیے، ماہ رخ کا ہاتھ باقاعدہ مانگنے چلی آئیں۔ ماہ رخ، سب کو ہی بہت پسند آئی تھی۔ اور بالآخر سب سے صلح مشورے اور جہانگیر سے ملنے کے بعد اس رشتے کے لیے ہاں کر دی گئی۔ اور یوں کچھ عرصے بعد ماہ رخ رخصت ہو کر جہانگیر کی بڑی سے حویلی میں چلی گئی۔

پیچھے ام کلثوم اکیلی رہ گئی تھیں۔ مگر یہ بھی شکر تھا کہ جنید ماں کا اکیلا پن دیکھ کر، واپس پاکستان آگیا تھا۔ اور ایک اچھی کمپنی میں جاب کرنے لگا تھا۔ اور وہاں ہی اس کی ملاقات مریم سے ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پسند کیا اور گھر والوں نے رضامندی کی مہر لگا دی تو شادی کے ہنگامے جاگ اٹھے۔

☆ ☆ ☆

"کہاں ہو اتنے دن ہو گئے ہیں تمہاری جلی کٹی باتیں سنے ہوئے! تمہاری یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں؟"

کافی دنوں بعد آن لائن ہوئی تھی آج وہ بھی میلز چیک کرنے کے لیے۔ جب ایک کے بعد ایک میسجز آنے لگے۔ پہلے تو وہ نظرانداز کرتی رہی مگر اگلا بندہ بھی مستقل مزاج تھا۔ تنگ آکر اس نے میسجز کا جواب دیا اور سینڈ کر دیا۔

"آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟ کیوں تنگ کر رہے ہو کوئی کام نہیں ہے تمہیں!"

"ہائے! شکر ہے جواب آیا تو، چاہے تمہاری طرح کا خوب صورت نہ سہی! مگر چلے گا!" سامنے والے نے ڈھٹائی کا بھرپور مظاہرہ کیا تھا۔

"اچھا سنو.....!" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد پھر میسجز آیا۔

"تمہاری آواز سنے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ مہربانی کر کے اپنی خوب صورت اور مترنم آواز کا رس میری سماعتوں کو بخش کر مجھے زندہ ہونے کا یقین دلا دو۔"

کلام کر کے میرے لفظ کو سہولت ہو
تیرا سکوت میری گفتگو محال کرے!

کچھ دیر وہ خاموش نظروں کے ساتھ اسکرین کو دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم سے سائن آؤٹ ہو گئی۔ آنکھوں میں پھیلتی نمی نے ہر منظر کو دھندلا دیا تھا۔

دوسری طرف وہ بھی اسی خاموشی اور چپ کے ساتھ ساکت نظروں سے اس کے نام کو دیکھے جا رہا

تھا۔ اس کے نام سے ہی تسکین کا ایک جہاں آباد ہو جاتا تھا۔ بعض لوگ زندگی میں ایسے بھی ہوتے ہیں ناں، جو اپنے ہونے کے احساس سے ہی زندگی میں رنگ بھر دیتے ہیں۔ اسے خوشنما بنا دیتے ہیں اور اگر زندگی جیسے یہ لوگ ہی زندگی میں شامل ہو جائیں تو!

لمحہ لمحہ سے خوشیاں کشید کرنا اور ہر لمحے میں صدیاں جی لینا اسی کو کہتے ہیں! اور اسے بھی اپنی زندگی ہی چاہیے تھی۔ محبت کے لمس سے بنی 'جاوداں زندگی!

☆ ☆ ☆

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ۔۔۔!" علشبہ نے کین کے بنے جھولے پہ 'آگے پیچھے جھولتے ہوئے' اپنے سامنے بیٹھے ہمدان کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے 'پاس ہی چیئر پہ بیٹھی انوشے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ آج اتوار کا دن تھا۔ ہمدان صبح سویرے ہی آ دھمکا تھا۔ اس کے آتے ہی گھر میں عجیب طرح کا شور پیدا ہو گیا تھا۔ رحیمہ بی بی کو مختلف ہدایات دیتے اور ساتھ ہی ساتھ انوشے سے لمبے چوڑے ناشتے کی فرمائش کر کے 'مسلسل علشبہ کی کلاس لے رہا تھا۔ کیونکہ علشبہ جلدی بے دار ہونے کی وجہ سے مسلسل جمائیاں لے رہی تھی۔

انوشے نے رحیمہ بی بی کے ساتھ مل کر ناشتا تیار کیا۔ جس سے بھرپور انصاف کیا گیا۔ اب نرم گرم دھوپ کا مزا لینے کے لیے 'تینوں ٹیرس پہ موجود تھے۔ مالٹوں سے بھری ٹوکری پہلے ہی اوپر پہنچ چکی تھی۔ علشبہ کی گود میں بھی مالٹے تھے۔ جبکہ انوشے کا دھیان کھانے سے زیادہ مالٹے چھیلنے میں تھا۔ کیونکہ ہمدان شہزادہ بن کر صرف حکم چلا رہا تھا۔ انوشے نے مالٹے چھیل کر نفاست سے پلیٹ میں رکھ کر 'ہمدان کو پیش کیے۔ جسے مزے سے کھاتے ہوئے وہ مسلسل انوشے پہ اعتراض بھی کر رہا تھا۔

"یہ مالٹے چھیلے ہیں تم نے؟ بندہ تھوڑی نفاست سے چھیلتا ہے۔ مگر چلو خیر ہے کزن ہو ایسے ہی کھا لیتا ہوں۔۔ دل کیا تو ڑتا۔۔۔"

ہمدان نے شان بے نیازی سے کہا تو انوشے گھور کر رہ گئی۔ اس سے پہلے کہ انوشے اس کے ہاتھ سے پلیٹ جھپٹتی۔ علشبہ نے ایک دم سے ہی اپنی بات شروع کر دی۔

"کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ۔۔۔" علشبہ نے مالٹا چھیلتے ہوئے کہا۔

"تم کبھی کبھی سوچنے کا کام بھی کیوں کرتی ہو؟ جب اوپر والے کے کرم سے 'اتنے سالوں سے بغیر دماغ کے تمہارا کام چل ہی رہا ہے نا!"

ہمدان نے مزے سے کہا۔ مگر علشبہ ان سنی کرتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں سوچتی ہوں کہ آخر "لوگوں" کو اتنی اچھی جاب ملی ہے۔ سیلری پیکج بھی زبردست ہے مگر لوگوں نے آج تک ہمیں ٹریٹ نہیں دی ہے۔ کیوں انوشے! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا!" علشبہ نے ہمدان کو فوکس کرتے ہوئے کہا۔ تو ہمدان برا سا منہ بنا کر رہ گیا۔

"جب بھی سوچنا کسی کا برا ہی سوچنا اس سے تو بہتر تھا کہ تم سوچتی ہی ناں۔ میں غریب بندہ 'مشکل سے یہ جاب ملی ہے اور تم نے پہلے ہی نظر میں رکھنا شروع کر دیا ہے۔"

ہمدان نے بے چارگی کا تاثر دیتے ہوئے علشبہ کو ٹالا تھا۔

"نظر میں تو کب سے رکھا ہوا ہے 'لوگوں کو ہی خبر نہیں ہے۔!" علشبہ نے سر جھکاتے ہوئے زیر لب کہا تو پاس بیٹھی انوشے نے چونک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنا چاہا۔ مگر جھکے سر کی وجہ سے اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکی۔ جبکہ ہمدان نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔

"ہمدان علشبہ ٹھیک کہہ رہی ہے تمہیں اتنی اچھی جاب ملی ہے۔ ہمیں ٹریٹ دو اور اگر تم نہیں مانتے تو۔۔۔!" انوشے نے کرسی پر سے اٹھتے ہوئے اندر کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

"اگر نہیں مانا تو۔۔۔" ہمدان نے انوشے کی پشت پہ بکھرے خوب صورت لچھے دار' کمر تک آتے بالوں کو دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"تو میں بابا جان سے شکایت لگا دوں گی۔ کیونکہ علشبہ ٹھیک ہے ناں!" انوشے نے پیچھے مڑ کر شرارت سے علشبہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ تو علشبہ خوشی سے کھل اٹھی۔

"یہ ہوئی ناں بات! یہ آئیڈیا مجھے کیوں نہیں آیا۔" علشبہ نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔

"اس لیے کہ ایسے نادر آئیڈیا زصرف دماغ والوں کو ہی آسکتے ہیں۔ ویسے تمہیں بابا جان کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ تمہارا کہہ دینا ہی بہت ہے۔"

ہمدان نے انوشے کی سبز آنکھوں میں اترے شرارت کے رنگوں کو دیکھتے گہری مسکراہٹ سے کہا تھا' تو انوشے کندھے اچکاتی سیڑھیاں اتر گئی۔ دوپہر کے کھانے کا مینیو سوچتے ہوئے وہ کچن میں آگئی۔ جبکہ انوشے کے جاتے ہی ہمدان بھی ہلکی سی گنگناہٹ لیے بابا جان کی اسٹڈی میں چلا گیا۔ جبکہ پیچھے گم صم سی بیٹھی علشبہ ساکت نظروں سے اس کے چھوڑے نقش پا دیکھ رہی تھی۔

"انوشے کا کہنا ہی بہت ہے اور میری منت کرنا بھی۔۔۔" علشبہ نے عجیب سی یاسیت میں گھرتے ہوئے سوچا تھا۔ موسم سرما کی نرم سی دھوپ' یک دم ہی جسم کو چبھنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ماہ رخ! اللہ نے ہمیں بہت بڑی خوشی سے نوازا ہے۔ بس بچے تم نے اپنا بہت خیال رکھنا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم بہت کمزور ہو۔ زیادہ چلنے پھرنے سے منع کیا ہے۔ ایک خادمہ مستقل تمہارے لیے رکھ دی ہے۔ جو بس تمہاری دیکھ بھال کیا کرے گی۔ خبردار سیڑھیاں زیادہ نہیں اترنی چڑھنی ہے۔ بلکہ ایسا کرو تم نیچے والے پورشن میں شفٹ ہو جاؤ۔ مجھے بھی آسانی

رہے گی۔ جہانگیر تو ویسے ہی اکثر گھر پہ نہیں ہوتا ہے۔" بے جی نے خوشی سے مسلسل بولتے ہوئے کہا۔

شادی کے چھ مہینے بعد ماہ رخ کو ماں بننے کی نوید ملی تھی۔ خوشی اور بے یقینی سے اس کے پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے۔ جہانگیر بھی خوش تھا مگر بے جی کی مختلف ہدایتوں پہ چڑ کر رہ گیا۔ عادت نہیں تھی۔ نا کسی کو خود سے اہم اور آگے دیکھنے کی۔

"بے جی! آپ بلاوجہ ہی اتنا پریشان ہو رہی ہیں۔ ڈاکٹر نے اتنا بھی نہیں ڈرایا ہے۔ چلنا پھرنا تو اچھا ہوتا ہے صحت کے لیے۔ فضول کے نخرے اٹھا کر اس کا دماغ مت خراب کر دیجئے گا۔ پہلے ہی محترمہ کے شکوے ختم نہیں ہوتے ہیں مجھ سے۔"

جہانگیر نے صوفے پہ بیٹھتے ہوئے تیز نظروں سے ماہ رخ کو گھورتے ہوئے کہا۔ جس کا ہنستا مسکراتا چہرہ ایک دم سے ہی بجھ کر رہ گیا تھا۔

"خیر یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ میں جانوں یا میری بہو! میں کل ہی ماہ رخ کا سامان اپنے ساتھ والے کمرے میں رکھواتی ہوں۔ کم از کم میری نظروں کے سامنے تو رہے گی نا۔ تم تو ہفتہ ہفتہ بھر گھر نہیں ہوتے ہو۔ کام کی وجہ سے۔ یہ بے چاری اکیلی گھبرا جائے گی اس حالت میں۔" بے جی نے جہانگیر کی بات کے اثر کو زائل کرتے ہوئے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تھا۔

"کوئی نہیں گھبراتی یہ بے چاری! گھر میں اتنے نوکر ہیں' دیکھ لیں گے ان محترمہ کو بھی۔۔۔ یہ بس اسی کمرے میں ہی رہے گی۔ بس میں نے کہہ دیا۔" جہانگیر نے بات ختم کرتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔ تو ماہ رخ لب کاٹتے ہوئے سر جھکا گئی۔ جبکہ ماہ رخ کے پاس بیڈ پہ بیٹھی بے جی نے پرسوچ نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ پہ اپنا مہان لمس رکھتی' تسلی دیتی' اٹھ کر کمرے سے باہر چلیں گئی تھیں۔

"بس رضیہ۔۔۔ (خادمہ) کے ہاتھ دودھ کا گلاس

بھجواتی ہوں۔ بیٹے بغیر مت سونا۔" بے جی نے جاتے جاتے ہدایت کی تو ماہ رخ اثبات میں سرہلا کر رہ گئی۔

"تم کیا چہرے پہ ہروقت نحوست طاری کیے رہتی ہو کیا دکھانا چاہتی ہو دنیا کو؟ بہت ظلم ہوتے ہیں تم پہ کس چیز کی کمی ہے تمہیں یہاں۔۔۔ مگر تم۔۔۔" بے جی کے کمرے سے باہر نکلتے ہی جہانگیر نے غصے سے کہا۔ تو ماہ رخ ضبط کرنے کی کوشش میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔

"کیا مصیبت ہے۔ خوشی کے موقع پہ بھی رونا۔" جہانگیر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور سگریٹ اور لائٹر اٹھا کر کمرے کے ساتھ بنے ٹیرس پہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی ماہ رخ نے چہرے پہ بہتے آنسوؤں کو صاف کیا۔ اسی وقت رضیہ دروازہ ہلکا سا بجا کر دودھ کا گلاس لیے آگئی۔ "سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دو۔ کچھ دیر بعد پی لوں گی۔" ماہ رخ نے سستی سے کہا۔

"بے جی نے کہا ہے کہ آپ دودھ کا گلاس جب خالی کرلیں۔ تب ہی نیچے آؤں۔" رضیہ نے ٹرے پکڑے سعادت مندی سے کہا۔ تو ماہ رخ گہرا سانس لے کر رہ گئی اور اٹھ کر بیٹھ کر گلاس لبوں کو لگالیا۔ اسی وقت جہانگیر واپس کمرے میں آیا اور رضیہ کو دیکھ کر بولا۔

"میں اسٹڈی میں ہوں۔ ایک کپ چائے بھجوادو۔" جہانگیر نے میز پر سے اپنی فائل اٹھائی اور سائیڈ کا دروازہ کھول کر اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ جو کمرے کے ساتھ ہی منسلک تھا۔

"کچھ اور چاہیے ماہ رخ بی بی!" رضیہ نے مؤدب لہجے میں پوچھا تو ماہ رخ نے واپس لیٹتے ہوئے نفی میں سرہلا دیا تھا۔ رضیہ سرہلاتی واپس چلی گئی۔ ماہ رخ کی آنکھوں سے آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے تھے۔

"بیٹا اپنے رویے اور لفظوں کی سختی سے زخمی کردیتا ہے اور بے جی اپنی نرمی اور محبت سے اس پہ اپنے مہان لمس کا مرہم رکھ دیتی ہیں۔ دونوں ماں، بیٹا ایک دوسرے کا الٹ ہیں۔ الگ الگ انتہاؤں پہ کھڑے ہوئے اور میں۔۔۔ میں خود کہاں ہوں؟ ان چھ مہینوں میں میرا اصل وجود تو کہیں کھو کر ہی رہ گیا ہے۔ میری پسند، نہ پسند، خوشی، غم، ہنسی، رونا، اگر کچھ ہے تو بس جہانگیر کی "میں" اور ان کی ضد! وہ پتھر دل، احساس، نرمی، چاہت کے ہر رنگ سے نہ آشنا ہے۔ بس تراشا ہوا سنگ مرمر کا حسین بت ہے۔"

ماہ رخ نے تھک کر آنکھیں موندلی تھیں۔

✡ ✡ ✡

پورے یورپ میں سردی کی شدید لہر نے نظام زندگی کو مفلوج کرکے رکھ دیا تھا۔ عمر ابھی ابھی گھر کے اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے لانگ کوٹ پہ ننھے ننھے برف کے ذرات چپکے ہوئے تھے۔ باہر شدید برف باری ہو رہی تھی۔

"ہیلو بگ برو۔" شہرام نے موبائل پہ گیمز کھیلتے ہوئے ایک نظر اسٹینڈ پہ کوٹ لٹکاتے ہوئے اپنے بڑے بھائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ شہرام، عمر سے سات سال چھوٹا تھا اور کالج میں زیر تعلیم تھا۔ آنکھوں پہ لگی عینک کے پیچھے سے جھانکتی ذہانت سے چمکتی آنکھیں، مقابل کو فوراً متوجہ کرلیتی تھیں۔ شہرام کے دو ہی شوق تھے۔ پڑھنا اور ویڈیو گیمز کھیلنا۔ جس پہ عمر اکثر اس کی کلاس لے لیتا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے جینئس۔۔۔" عمر نے دستانے اتارتے ہوئے اس کے پاس صوفے پہ بیٹھتے ہوئے کہا، مگر حسب عادت شہرام کے گھنے اور سلکی بال خراب کرنا نہیں بھولا تھا۔ جس پہ شہرام بہت چڑتا تھا۔

"بگ برو (بڑے بھائی) کتنی بار کہا ہے کہ میرا ہیئر اسٹائل خراب مت کیا کریں۔" شہرام نے منہ بناتے ہوئے ایک ہاتھ سے بال سیٹ کیے تو عمر بے ساختہ ہنس پڑا۔

"یار اتنی فکر تو لڑکیوں کو بھی اپنے ہیئر اسٹائل کی نہیں ہوتی ہوگی۔ جتنی تمہیں ہے۔" عمر نے شرارت سے کہا۔

"بائی داوے! آپ کو بہت خبر ہے لڑکیوں کی پسند،

نہ پسند کی؟ خیر تو ہے، کتنی لڑکیوں کو جانتے ہیں آپ۔" شہرام نے موبائل پر سے نظریں اٹھا، اپنے دراز قد اور وجیہہ بھائی کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کی ذہن آنکھوں میں شرارت کی چمک واضح تھی۔

"جانتا تو صرف ایک کو ہی ہوں، بس وہ یہ بات مانتی ہی نہیں ہے۔" عمر نے بھی اسی شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

"اچھا! میں بتاؤں گا پری آپی کو! وہ خود ہی ٹھیک کرلیں گی آپ کو۔" شہرام نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

"چلو تمہاری ہی سہی وہ کسی کی سنے گی تو نا۔" عمر نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ اسی وقت کافی کے مگ لیے دونوں کی نوک جھوک پہ مسکراتی مماجان چلی آئیں۔

"تھینک مماجان! سچ میں کافی کی شدید طلب ہو رہی تھی۔" عمر نے مگ پکڑتے ہوئے خوشدلی سے کہا۔ تو مماجان اپنا مگ پکڑ کر مسکراتے ہوئے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

"بگ برو اب آپ اپنی دلہن لے ہی آئیں جو آپ کے نخرے برداشت کرسکے۔ مماجان کو میرے لیے ہی رہنے دیں۔" شہرام نے منہ بناتے ہوئے کہا، تو مماجان بے ساختہ ہنس پڑیں۔

"چلو پھر ٹھیک ہے۔ عمر کی شادی کر ہی دیتے ہیں۔ پھر یہ جانے اور اس کی بیوی، ہم دونوں ماں، بیٹا عیش کریں گے۔" مماجان نے شرارت سے عمر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مماجان! دس از ناٹ فیئر.... آپ اگر شہرام کے ساتھ مل کر پارٹی بنائے گی تو مجھے مجبوراً "ڈیڈ کی مدد لینی پڑے گی۔ آخر کو آخری فیصلہ ان کا ہی ہوتا ہے نا۔" عمر نے اطمینان سے کہا۔ تو مماجان اسے گھور کر رہ گئیں۔

"تم سچ میں، بہت تیز ہوگئے ہو۔ اب تمہاری دلہن لانی ہی پڑے گی۔ میں بات کرتی ہوں آج ہی تمہاری ڈیڈ سے۔ پری کو رخصت کروا کے لے ہی آتے ہیں اب۔ ویسے بھی ایک سال سے زیادہ ہوچکا ہے، تم لوگوں کے نکاح کو۔"

مماجان نے خاموش بیٹھے عمر کو دیکھتے ہوئے کہا اور خالی مگ اٹھا کر کچن میں چلی گئیں، جبکہ شہرام اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔ عمر نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کرکے، تصور کی آنکھ سے 'اس حسین پری کو اپنے آنگن میں چلتا پھرتا دیکھنے لگا۔ مگر تصور کی آنکھ سے دیکھے جانے والے خواب، حقیقت میں کب اتنی آسانی سے ڈھلتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

"تم کب ایبٹ آباد کا چکر لگا رہی ہو۔ کچھ بہت ضروری باتیں کرنی تھیں تم سے۔ مگر تمہیں فرصت ہی نہیں ملتی۔" کنیز پھوپھو نے فون پہ آمنہ کو لتاڑتے ہوئے کہا۔ جو ماں کی محبت بھری ڈانٹ پہ کھلکھلا کے ہنس پڑی تھیں۔

"امی جان آپ کے دونوں نٹ کھٹ سے نواسہ، نواسی ہی ہر وقت نچائے رکھتے ہیں۔" آمنہ نے کہا۔

"یہ تو تم آج کل کی لڑکیوں نے بہانہ بنایا ہوا ہے۔ ہم بھی تھے ہمارے بھی بچے تھے۔ بھرا پڑا سسرال تھا۔ سب ہی دیکھتے اور سنبھالتے تھے۔" کنیز پھوپھو نے ناک پر سے مکھی کی طرح اس کی بات کو جھٹلاتے ہوئے کہا تھا۔

"خیر میرا فون کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اور عائشہ اکٹھے ہو تو ہمدان کی شادی کے بارے میں سوچتے ہیں۔ اب تو ماشاء اللہ سیٹ ہوگیا ہے۔ مزید تاخیر کیا کرنی۔ عمران کی شادی تو میں نے بی اے کے دوران ہی کردی تھی۔ ماشاء اللہ سے جوان ہوتے بچوں کا باپ ہے۔ بس اب مجھے اس معاملے میں مزید دیر نہیں کرنی ہے۔"

کنیز پھوپھو! جن کے چار بچے تھے۔ عمران بڑا، اس سے چھوٹی آمنہ، پھر عائشہ جو شادی شدہ اور اپنے اپنے گھروں میں خوش باش تھیں۔ ہمدان کی آمنہ سے بہت دوستی تھی۔ اسی لیے پھوپھو چاہتی تھیں کہ ہمدان

سے بات کرکے اس کی پسند معلوم کرے۔ عائشہ کی شادی' نند کے بیٹے سے ہوئی تھی اور وہ ایبٹ آباد میں ہی مقیم تھی۔

اچھا امی! میں پہلے ہمدان سے تو بات کرکے دیکھوں۔ اس کی مرضی کیا ہے۔ ددھیال میں تو کوئی اس کے جوڑ کی نہیں ہے۔ جو تھیں' وہ منگنی شدہ یا شادی شدہ ہو چکی ہیں۔ ہاں مگر ننھیال میں علشبہ بھی ہے۔ انوشے بھی ہے۔ دونوں ہی ہمیں بہت پیاری اور عزیز ہیں۔ مگر پسند ہمدان کی ہی چلے گی۔" آمنہ نے تفصیل سے کہا تو کنیز پھوپھو سوچ میں گم بولیں۔

"ہوں! علشبہ بھی بہت پیاری بچی ہے۔ مگر نا سمجھ اور امیچور سی ہے۔ میرے ہمدان کے لیے' مجھے ہمیشہ سے انوشے ہی اچھی لگی۔ جس طرح بھابھی کے بعد اس نے بھائی صاحب کو سنبھالا اور سمجھداری کا مظاہرہ کیا ہے۔ آج کل کی بچیوں میں کہاں ہوتی ہے اتنی سمجھ داری اور کیئر۔" کنیز پھوپھو نے اپنے دل کی بات کہتے ہوئے کہا۔ تو آمنہ نے بھی تائید کی۔ آمنہ بڑی بیٹی ہونے کی وجہ سے شروع سے ہی ماں کے زیادہ قریب تھی۔

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد آمنہ نے فون رکھ دیا۔ مگر اس کا ذہن مسلسل ہمدان میں الجھا ہوا تھا۔ وہ جلد از جلد بھائی سے بات کرکے اس کی مرضی معلوم کرنا چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

نو مہینے کے صبر آزما انتظار اور تکلیفوں کو اٹھا کر' جب ماہ رخ کی گود میں گلابی کمبل میں لپٹی سرخ و سفید' تیکھے نین نقش والی ننھی پری آئی تو اس کا دل اپنے رب کا شکر ادا کرنے لگا۔ جس نے ماں جیسے عظیم رتبے پہ اسے فائز کیا تھا۔

"امی دیکھیں یہ کتنی خوب صورت ہے نا۔" جنید نے بے بی کاٹ میں لیٹی بچی کے گال کو ہلکے سے چھو کر کہا۔ جنید اور ام کلثوم' ماہ رخ کے اسپتال میں ایڈمٹ ہونے کا سن کر پہلی دستیاب فلائٹ سے ایبٹ آباد پہنچ گئے تھے۔ ان کے اسپتال پہنچتے ہی بیٹی کی خوش خبری ملی تھی۔ ام کلثوم نے کئی دن پہلے سے ہی سب تیاریاں کر رکھی تھیں۔ ام کلثوم کی تو بہت خواہش تھی کہ ماہ رخ یہ عرصہ ان کے ساتھ گزارتی۔ کیونکہ پہلی دفعہ ماں بننے کا تجربہ بہت مختلف اور الگ ہوتا ہے۔

ماہ رخ بہت کمزور اور نڈھال ہو چکی تھی۔ سارا دن اکیلے اپنے کمرے میں خادمہ کے سہارے پڑی رہتی تھی۔ بے جی بار بار سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی تھیں۔ جوڑوں کے درد کی وجہ سے۔ جہانگیر ان دنوں اپنے کاروبار کو مزید وسعت دینے کے چکروں میں دن رات مصروف تھا۔ ایسے وقت میں' جب ماہ رخ کو اس کے ساتھ اور ہمدردی کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے ہی حالوں میں مست رہتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ہی کافی تھا کہ ایک عالی شان حویلی میں' پر تعیش کمرے میں' اس کی بیوی کو کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ بہتر سے بہتر خوراک' خدمت اور دیکھ بھال کے لیے ملازموں کی فوج موجود تھی۔ ماہ رخ کو اور کیا چاہیے تھا؟

مگر ماہ رخ کبھی اپنے مجازی خدا کو یہ نہیں سمجھا سکی تھی کہ شوہر کے ساتھ "کا نعم البدل' دنیا کی کسی چیز میں نہیں تھا۔ ماہ رخ کا نازک دل' اپنے شوہر کے التفات' اس کی محبت' اس کے نرم لفظوں کو ترستا تھا اور اس کی یہ خواہش ناجائز بھی نہیں تھی۔ ایک لڑکی جس نے ساری زندگی خود کو' اپنے جیون ساتھی کے لیے سنبھال کر رکھا ہوتا ہے۔ کیا شادی کے بعد اپنے جائز اور محرم رشتوں سے اس بات کی توقع رکھنا بھی غلط ہوتا ہے۔ جیون ساتھی' جس کے ساتھ کے لیے' وہ اپنے گھر' اپنے پیارے والدین' بہن' بھائیوں کو چھوڑ کر بالکل انجان جگہ پہ آئی ہے۔ کیا بدلے میں تھوڑی سی توجہ' محبت' عزت اس کا حق نہیں بنتی ہے۔

مگر یہ بات عموماً "جہانگیر جیسی سوچ رکھنے والے مرد نہیں سوچتے ہیں۔ جو صرف اپنی ذات کے گرد ہی گھومتے اور سوچتے ہیں۔ ام کلثوم نے جب ماہ رخ کو اپنے پاس آنے کا کہا تو ماہ رخ نے شدید خواہش رکھتے ہوئے بھی نرمی سے منع کر دیا تھا۔ ام کلثوم جہاندیدہ

عورت تھیں۔ وہ جہانگیر کے مزاج اور اس کے روکھے پن کو سمجھ چکی تھیں، اسی لیے خاموش ہوگئی تھیں۔ جنید کی شادی، ماہ رخ کے فارغ ہونے کے انتظار کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد ہونا قرار پائی تھی۔

بے جی نے سارے اسپتال میں مٹھائی بانٹی تھی۔ ان کی خوشی دیدنی تھی۔ ام کلثوم نے اس پہ بھی شکر ادا کیا کہ کہیں پوتے کی تمنا میں، وہ پوتی کو نہ قبول کرتیں۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔ "جہانگیر کہاں ہے؟" ام کلثوم نے بے جی سے پوچھا جو پوتی کو بہت پیار سے دیکھ رہی تھیں۔ چونک گئیں۔

"جہانگیر ایک ہفتے سے کراچی گیا ہوا ہے۔ میں نے فون کر دیا تھا۔ پہلی دستیاب فلائٹ سے پہنچ جائے گا۔ بہت خوش تھا وہ بیٹی کی پیدائش کا سن کر۔" بے جی نے محبت بھرے لہجے میں کہا تو ام کلثوم نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ جبکہ ماہ رخ نے خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔ کہیں اس کی آنکھوں میں پھیلتی نمی کوئی اور نہ دیکھ لے۔ مگر درد سے کراہتے دل کی سسکیاں، سارے وجود میں پھیل رہی تھیں۔ اتنے اہم اور نازک وقت پہ بھی وہ ماہ رخ کے ساتھ تو کیا پاس بھی نہیں تھا۔

عورت اتنا درد، اتنی تکلیف اٹھا کر اپنے بچے کو دنیا میں لاتی ہے اور اس کے بدلے مرد کی توجہ، اس کا مہربان لمس، ہمدردی کے چند بول، عورت کو مان، یقین اور تحفظ کے حصار میں لیے آسمان پہ بٹھا دیتے ہیں۔ مگر جہانگیر سے ایسے کسی بھی عمل کی توقع رکھنا، خود کو دکھ دینے کے برابر تھا۔ مگر ماہ رخ ہر بار کسی نئی امید کا سرا تھامتی اور ٹوٹنے پہ دہری اذیت سے دوچار ہوتی تھی۔

رات تک جہانگیر بھی پہنچ گیا۔ بچی کو گود میں لے کر بے ساختہ اپنے لب اس کے ماتھے پہ رکھ دیے۔ بچی کی آنکھیں جہانگیر پہ تھیں اور نین نقش ماہ رخ جیسے۔ جہانگیر کو بچی سے والہانہ پیار کرتے دیکھ کر، ماہ رخ کی آنکھوں میں آنسو اور لبوں پہ مطمئن مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ جہانگیر نے بچی کا نام "انوشے" رکھا تھا۔ ماہ رخ کو بھی یہ نام بہت پسند آیا تھا۔ یوں انوشے کے آنے سے ان کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ وہ باب جس میں جدائی کی بہت لمبی لکیر کھنچی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

انوشے تین سال کی ہو چکی تھی، اس دوران بہت دھوم دھام سے جنید کی شادی مریم سے ہو چکی تھی۔ مریم کا تعلق کافی آزاد خیال فیملی سے تھا اور اسی وجہ سے جہانگیر کو مریم اور اس کی فیملی پسند نہیں آئی تھی اور حسب عادت اور روایت جنید کی شادی پہ بھی ماہ رخ کو دو دن پہلے جانے کی اجازت ملی تھی۔ ام کلثوم کی لاکھ یاد دہانی اور بار بار کے بلاوے پر بھی ماہ رخ بھائی کی شادی پہ اس طرح شرکت نہ کر سکی۔ جیسے اسے کرنا چاہیے تھا۔

شاپنگ تو خیر مریم نے سب اپنی پسند سے کی تھی۔ مگر پھر بھی قدم قدم پہ ام کلثوم کو بیٹی کی کمی محسوس ہوتی رہی تھی اور جنید کو بہن کے لاڈ اور ہنسی مذاق کی۔ یہ بھی شکر تھا کہ حسن بھائی، اپنی بیوی اور بیٹے کے ساتھ شادی میں شرکت کرنے کے لیے دس دن پہلے ہی آ گئے تھے۔ زارا نے بڑی بہو ہونے کے ساتھ ساتھ، بیٹی ہونے کا بھی حق ادا کیا تھا۔

وہ سب جہانگیر کی فطرت اور مزاج کو بہت اچھی طرح سمجھ چکے تھے۔ اس لیے ماہ رخ کو شرمندہ کرنے، یا دکھ دینے کے بجائے، اس کا حوصلہ بڑھاتے رہتے تھے۔ جنید کی شادی بخوبی سرانجام پائی۔ مگر یہاں بھی ماہ رخ کے لیے ایک بات مسئلہ بنی رہی۔ مریم کا بھائی، جو ماہ رخ سے بھی ایک سال چھوٹا تھا۔ بہت ہنس مکھ اور شرارتی طبیعت کا تھا۔ شادی میں اس نے خوب ہلا گلا کیا۔ سمیر نے سب کو مذاق کی پشت میں لیا اور اسی وجہ سے ماہ رخ سے بھی فری ہونے کی کوشش کی۔ جو جہانگیر کی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی تھی اور جہانگیر کا مزاج مزید غضب ناک ہو گیا تھا ماہ رخ کے ساتھ۔ بظاہر بھائی کی شادی پہ ہنستی مسکراتی ماہ رخ، اندر سے ڈری سہمی سی رہتی تھی کہ کون سی بات یا چیز جہانگیر کو بری لگ جائے۔ جہانگیر اسے لے کر اپنے

ساتھ ہی آیا تھا ایک ہفتے کے لیے' بے جی شادی والے دن پہنچی تھیں۔ جن کے آنے سے ماہ رخ کو کافی ڈھارس پہنچی تھی۔ جہانگیر جیسا پتھر صرف دو لوگوں کے سامنے موم ہوتا تھا' ایک تو تھیں بے جی اور دوسری انوشے۔

ماہ رخ جانتی تھی یا اس کا رب کہ وہ کس طرح قدم پہ قدم ایک ایسے مرد کے ساتھ نبھا کر رہی تھی جو ہر معاملے' ہر چیز میں' ماہ رخ سے لاپروا ہونے کے ساتھ ساتھ' اس کی تذلیل کرنا' سخت لفظوں کے تیروں سے زخمی کرنا' اپنا فرض سمجھتا تھا۔ہاں جسمانی مار پیٹ سے کبھی کام نہیں لیا تھا اس نے' مگر جسمانی مار پیٹ سے زیادہ' تکلیف دہ' رویوں کی مار ہوتی ہے اور مزے کی بات ہے کہ اس کے نشان' آپ کسی کو دکھا بھی نہیں سکتے۔

دنیا وہ دیکھتی ہے جو نظر آتا ہے۔ ماہ رخ کی زندگی کا بہترین رخ۔ خوب صورت' وجیہہ شوہر روپے پیسے کی ریل پیل' نوکروں کی فوج' اچھے سے اچھا پہننا اوڑھنا' سونے کے زیورات سے سجی ایک خوب صورت مورت۔

مگر ماہ رخ کا دل جانتا تھا کہ وہ اندر سے کتنی ٹوٹی اور بکھری ہوئی ہے۔ جہانگیر کا اخلاق اور رویہ' ماہ رخ کے گھر والوں کے ساتھ بہت روکھا اور تلخ تھا۔ وہ کبھی بھی ماہ رخ کے ساتھ اپنے سسرال آنا یا رہنا پسند نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی سے گھلنے ملنے کی کوشش کرتا تھا۔ اگر کبھی آیا بھی تھا تو چند گھنٹوں میں ہی ماہ رخ' جہانگیر کے اعتراضات اور نکتہ چینی سے گھبرا جاتی تھی۔ اس لیے ماہ رخ میکے کا رخ بہت کم کم کرتی تھی۔

ایک بار بے جی نے ماہ رخ کو بتایا تھا کہ جہانگیر بچپن سے ہی بہت ضدی اور خود سر تھا۔ اس میں انتہا پسندی ہمیشہ سے رہی تھی۔ وہ بہت چھوٹی چھوٹی بات پر اپنے بہت اچھے اور گہرے دوستوں کو چھوڑ دیتا تھا۔ ان سے تعلق ختم کر دیتا تھا۔ معاف کرنے کا مادہ اس میں نہیں تھا۔ وہ جلد باز تھا۔ اکھڑ اور خود سر تھا۔ اپنی انا کا پرچم ہمیشہ بلند رکھتا تھا۔ جب تک باپ کا سایہ سر پہ رہا جہانگیر پھر بھی سن لیتا تھا۔ مگر جب خود مختاری اور مکمل آزادی مل گئی تو اس کے مزاج کی سختی اور غصیلا پن کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ دو بہنیں بڑی ہونے کے باوجود جہانگیر کے غصے سے خائف رہتی تھیں۔ مگر جہانگیر نے ہمیشہ اپنی بڑی بہنوں کا احترام کیا تھا۔

صرف بے جی ہی وہ واحد فرد تھیں جو جہانگیر کو لگام ڈال لیتی تھیں۔ اسی لیے ماہ رخ بہت کچھ خاموشی اور صبر سے برداشت کر لیتی تھی اور پھر انوشے کے آنے سے اس کا ذہن کافی حد تک بٹ گیا تھا۔ انوشے بہت شرارتی اور ذہین بچی تھی۔ ہر وقت ماں کو اپنے ساتھ مصروف رکھتی تھی۔ انوشے کے زیادہ تر کام ماہ رخ خود کرتی تھی۔ اس لیے اس کے دن اور رات جہانگیر کی بے اعتنائی پہ جلنے یا کڑھنے کے بجائے انوشے کی معصوم کھلکھلاہٹوں سے سجنے لگے تھے۔

زندگی کچھ سہل لگنے لگی تھی جب اس ہنستی مسکراتی زندگی میں موت کا سناٹا گونجنے لگا۔ بے جی بہت خاموشی سے اجل پہ لبیک کہتی عدم کو سدھار گئیں۔ بے جی کی اچانک موت نے جہانگیر کو بہت دھچکا پہنچایا تھا۔ جہانگیر کے ساتھ باقی سب کے لیے بھی یہ بہت بڑا صدمہ ثابت ہوا تھا۔ بے جی کا کمزور اور ناتواں وجود ایک مہربان سایہ دار درخت کی مانند تھا۔ ان کے گزر جانے کے بعد ماہ رخ نے جانا تھا کہ رویوں کی تپتی دھوپ میں زندگی کا سفر کتنا مشکل اور دشوار ثابت ہوتا ہے۔

جہانگیر کا مزاج آگ اگلتے سورج کی مانند ہو گیا تھا اور ماہ رخ موم کی بنی نازک سی لڑکی! ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرنے لگی۔

☆ ☆ ☆

"تم نے آگے کیا کرنے کا سوچا ہے۔ تمہیں ماسٹر کیے ہوئے ایک سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ ویسے تو تمہیں اب پیا گھر سدھار دینا چاہیے' مگر جب تک ایسا کچھ نہیں ہوتا تم کوئی جاب ہی کرو۔ انگلش لٹریچر میں ماسٹر کرنے کا فائدہ۔"

دونوں اس وقت رات کے کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ کچن میں موجود میز پہ ڈھیر ساری سبزیاں پھیلائے، چائنیز بنانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ زیادہ کام تو انوشے ہی کر رہی تھی۔ علشبہ کی زبان زیادہ تیز چل رہی تھی، ہاتھوں کی نسبت۔

کٹنگ بورڈ پہ نفاست سے گاجر کو کاٹتی، انوشے نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "فی الحال میرا کسی چیز کا بھی موڈ نہیں ہے۔ میں ایسے ہی ٹھیک ہوں۔"

علشبہ نے غور سے اپنے سامنے بیٹھی انوشے کو دیکھا تھا۔ بلیک رنگ کے کپڑوں میں قمیص کے دونوں بازووں، کہنی تک چڑھائے ہوئے تھے۔ جوڑے میں لپیٹے بالوں کی لٹیں چہرے کے اطراف بکھری ہوئی تھیں۔ وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی۔ مگر اس کی سبز رنگ کی آنکھوں میں ہلکی سی لالی اور اداسی کی لہر بہت واضح محسوس ہوتی تھی۔ اس کے لہجے اور باتوں میں ایک واضح اکتاہٹ تھی۔ علشبہ کو آئے پندرہ دن ہو چکے تھے اور وہ مسلسل انوشے کو کسی سوچ میں گم دیکھتی تھی۔ اکثر رات کو دیر تک جاگتا، عجیب مضطرب سی رہتی تھی۔ "انوشے تم بہت بدل گئی ہو اور ایسا پچھلے تقریباً" ایک ڈیڑھ سال سے ہوا ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ ممانی جان کی موت کا صدمہ، تمہیں بالکل بدل گیا ہے۔ بہت خاموش اور الجھی الجھی سی رہنے لگی ہو تم۔"

علشبہ نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ جو یک دم ہی گم صم سی ہو گئی تھی۔ پھر علشبہ نے دیکھا، اس کی آنکھوں کے کٹورے لبالب بھر گئے تھے۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو علشبہ مما کی موت کو آج بھی قبول کرنا بہت مشکل لگتا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے ان کے ساتھ ہی میری خوشی اور سکون چلا گیا ہے۔"

(میرے دل پہ بہت بوجھ ہے کسی راز کا.... بس کیسے اور کس سے کہوں! اور یہ بوجھ ہے کہ میری سانسیں لینا محال ہو گیا ہے۔)

انوشے نے رندھے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے، باقی کے جملے دل میں سوچے تھے۔ علشبہ نے اٹھ کر انوشے کے گال پہ بہتے آنسو صاف کیے تھے اور اسے خود سے لگا کر تسلی دینے لگی تھی۔ انوشے اتنے دن بعد، کسی اپنے کو پاس پا کر اس کے ہاتھ پہ سر رکھ کر بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ کتنے دنوں سے روکا ہوا تھا، آنسوؤں کے اس سیلاب کو، آج کسی بہانے ہی سہی انہیں نکلنے کا موقع مل گیا تھا۔

کسی کام سے کچن کی طرف آتے بابا جان نے انوشے اور علشبہ کی باتیں سن لی تھیں۔ اپنی عزیز از جان اور لاڈلی بیٹی کو اس طرح روتے دیکھ کر ان کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ سختی سے ہونٹ بھینچتے وہ واپسی کو مڑ گئے تھے۔ اب انہیں سمجھ آ رہی تھی کہ انوشے میں آنے والے بدلاؤ کی اصل وجہ کیا تھی۔ نہ جانے وہ کیوں اس بات کو سمجھ نہیں سکے تھے۔ ماں کی موت نے اسے اکیلا کر دیا تھا۔ اب انہیں انوشے کو واپس زندگی کی طرف لانا تھا اور اس کا حل انہوں نے سوچ لیا تھا، انوشے کی جلد از جلد شادی کر دینا۔ وہ مضبوط قدم اٹھاتے، اپنے کمرے کی طرف چل پڑے تھے۔ بہت جلد ہی وہ انوشے کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے تھے۔

مگر! فیصلہ انسان نہیں "او پر والا" کرتا ہے اور کیا خوب کرتا ہے کہ ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں اپنی عقل اور فہم کی بساط پہ مان کر کے چلنے والے، ہم دراصل کتنے نادان اور لاعلم ہوتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

"آ جاؤ عمر! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" عمر نے ہلکا سا دروازہ ناک کیا تو اندر سے ڈیڈ کی بارعب آواز آئی۔ عمر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ مما جان، جائے نماز بچھائے نماز پڑھنے میں مشغول تھیں، جبکہ ڈیڈ اپنے سامنے رکھی فائلوں میں سر کھپا رہے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے یہ ان کا معمول تھا۔ عمر چلتا ہوا ان کے ساتھ صوفے پہ ہی بیٹھ گیا۔ دونوں باپ، بیٹا میں دوستی بھی بہت تھی اور انڈر اسٹینڈنگ بھی۔

"جی ڈیڈ آپ نے بلایا تھا۔" عمر نے کچھ لمحوں کی

خاموشی کے بعد پوچھا۔

"ہوں! کل میری تمہاری مما جان سے تفصیلی بات ہوئی تھی اور ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اب تمہاری شادی کردی جائے۔ نکاح کو ایک سال سے زیادہ ہو گیا ہے۔ میرے خیال سے رخصتی میں مزید دیر مناسب نہیں ہے' اب جبکہ تم بزنس کو بہت اچھی طرح سے سنبھال بھی رہے ہو۔"

ڈیڈ نے اپنا سنہری نظر کا فریم اتار کر سامنے میز پہ رکھا اور پیشانی کو مسلتے ہوئے آہستہ آواز میں کہنے لگے۔ وہ کسی الجھن کا شکار لگ رہے تھے۔ عمر جانتا تھا' مگر خاموش تھا فی الحال' وہ اگلی بات کا منتظر تھا۔

"مگر تم جانتے ہو کہ یہ اتنا آسان نہیں ہے اور آنے والے وقت کے خدشات میرے دل کو گھیرے رہتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پری کو کسی تکلیف یا پریشانی سے نہ گزرنا پڑے۔ بہت عزیز ہے مجھے وہ۔ میں اس کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا ہوں۔ مگر....."

ڈیڈ نے کہتے ہوئے بے ساختہ گہری سانس لی تھی۔ پری سے ان کی محبت اور اٹیچ منٹ کو سب ہی جانتے اور مانتے تھے۔

"ڈیڈ آپ ٹینشن مت لیں ڈاکٹر نے پہلے ہی آپ کو زیادہ اسٹریس لینے سے منع کیا ہوا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" عمر نے باپ کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی تھی۔ وہ ہارٹ پیشنٹ تھے ان کے لیے زیادہ ذہنی دباؤ اچھا نہیں تھا۔ اس لیے سب احتیاط کرتے تھے کہ وہ زیادہ سوچیں نہیں۔ اسی وقت مما جان بھی نماز پڑھ کر فارغ ہو گئیں اور اٹھ کر ان کے پاس آگئیں۔

"میں نے اسی لیے' پہلے ہی کہا تھا کہ جلد بازی سے کام مت لیں۔ مگر اس وقت جو کیا وہ بھی مجبوری تھی۔ اب یہ سوچنا ہے کہ آگے کیا کیا جائے۔ اس بے یقینی کی کیفیت سے تو باہر نکلے ہم لوگ۔" مما جان نے بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے کہا۔

"عمر میں چاہتا ہوں کہ تم ایک بار کھل کر پری سے بات کرلو۔ تاکہ ہمیں آگے کا لائحہ عمل طے کرنے میں آسانی ہو۔ میں یا تمہاری مما جان اگر بات کریں گے تو وہ جھجک سکتی ہے' تم سے اس کی بہت دوستی ہے۔ تمہاری بات وہ سمجھ بھی لے گی۔"

ڈیڈ کے کہنے پہ عمر نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا اور انہیں شب بخیر کہتا ہوا اپنے کمرے میں آگیا۔ اپنے بیڈ پہ لیٹتے ہوئے اس نے موبائل ہاتھ میں لیا اور اس کا نمبر ملایا۔ بیل جاتی رہی مگر اس نے نہ اٹھانے کی جیسے قسم اٹھا رکھی تھی۔ کچھ دیر عمر سوچتا رہا۔ پھر جلدی جلدی ٹائپ کرتا ہوا مسیج لکھا اور سینڈ کردیا۔

اے چشم درد آشنا
اک بوند برس
اک اشک چھلک
خاموش نظر
کوئی بات تو کر
دل دکھتا ہے!
تو میرے دل پہ ہاتھ تو رکھ
میں تیرے ہاتھ پہ دل رکھ دوں
دل درد بھرا.....!
جو اس کو چھوئے
یہ اس سے ملے
اک لفظ محبت بول ذرا
میں سارے لفظ تجھے دے دوں
دل درد سراب کو آب سے بھر
تو میرے خواب پہ آنکھ تو دھر
میں تیری آنکھ میں خواب بھر دوں
خاموش محبت
بات تو کر.....!

عمر نے موبائل کو سینے پہ رکھا اور چت لیٹ کر چھت کو گھورتا' جواب آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر اس کا انتظار' انتظار ہی رہا۔ یہ وقت کا کیسا ہیر پھیر تھا' اس کی بہترین دوست' ہر بات ایک دوسرے سے شیئر کرنے والے' جب نکاح جیسے مقدس اور مضبوط بندھن میں بندھے اور یکسر ایک دوسرے سے انجان ہو گئے۔ دونوں ہی ایک دوسرے سے صدیوں کے فاصلوں پہ

چلے گئے تھے۔ عمر کا دل یہ تو نہیں مانتا تھا کہ وہ محبت جیسے جذبے سے نا آشنا ہو گی۔ محبت میں ایک دل کا دوسرے دل سے کنکشن براہ راست ہوتا ہے۔ اسی لیے تو محبت میں الہام ہوتے ہیں کچھ ایسے ہی الہام اس کے دل کی سرزمین پہ اترتے تھے۔ جو اس کے ہونے کا یقین دلاتے تھے۔

ایک طرف وہ جواب آنے کے انتظار میں مبتلا تھا' دوسری طرف وہ موبائل کو دیکھتی بھیگی آنکھوں اور کپکپاتے ہاتھوں کے ساتھ لکھنے اور نہ لکھنے کی دوہری اذیت کا شکار تھی۔ محبت بھی ایک تھی' انتظار بھی ایک جیسا تھا اور اس کی اذیت بھی! پھر ایسی کون سی چیز تھی جو محبت کو بولنے نہیں دے رہی تھی؟ جو محبت سے بڑھ کر ثابت ہو رہی تھی۔

کیا محبت سے بڑھ کر بھی کچھ ہوتا ہے؟ ہاں کسی کا اپنے پہ مان' یقین اور بھروسہ! جس کے ٹوٹنے سے رشتے ہی نہیں' ہم بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور ایسی ہی مان بھروسے اور یقین کی دیواروں میں وہ قید اپنی محبت پہ نوحہ پڑھ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"یہ یہاں کیا کرنے آیا ہے؟" جہانگیر نے ڈرائنگ روم میں صوفے پہ براجمان سمیر کو دیکھتے ہوئے درشتی سے ماہ رخ سے پوچھا تھا۔ جو خادمہ کو کھانے کی ہدایت دینے کچن میں آئی تھی۔ انوشے سمیر کے پاس تھی۔ جہانگیر حویلی واپس آیا تو ڈرائنگ روم سے آتی سمیر اور انوشے کی آوازوں نے اسے متوجہ کر لیا تھا۔ اور سمیر کو دیکھتے اس کی تیوری چڑھ گئی تھی۔ وہ تنتناتا ہوا کچن میں آیا اور خادمہ کا لحاظ کیے بغیر ماہ رخ کا ہاتھ پکڑ کر سختی سے اس کا رخ اپنی طرف موڑا اور شعلہ بار آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے' درشتی سے پوچھنے لگا۔

"جہانگیر میرا ہاتھ چھوڑیں۔ سب دیکھ رہے ہیں۔" ماہ رخ نے تکلیف کی شدت سے لب کاٹتے ہوئے کہا تو جہانگیر غصے میں اس کا ہاتھ جھٹکتا' واپس مڑ گیا ماہ رخ نے نوکروں کے سامنے ہوئی تذلیل پہ لب کاٹتے' آنسوؤں کو پیتے' کچن سے باہر نکل آئی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ اس کا رخ اپنے کمرے کی طرف تھا۔ جہاں جہانگیر غصے میں ٹہل رہا تھا۔ ماہ رخ کو دیکھ کر وہ رک گیا اور دونوں ہاتھ سینے پہ باندھ کر' لب بھینچے' شعلہ بار نگاہوں سے گھورنے لگا۔ ماہ رخ انگلیاں موڑتے ہوئے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی۔

جہانگیر کو ماہ رخ کا میکے جانا اور ان کا یہاں آنا ویسے ہی پسند نہیں تھا اور مریم اور اس کی فیملی کو تو وہ ویسے ہی سخت ناپسند کرتا تھا اور مریم کے بھائی سمیر کی حرکات و شوخیاں' وہ شادی پہ دیکھ چکا تھا۔ اور اسی وجہ سے ماہ رخ جنید کی شادی میں بھی جہانگیر کے غصے کے زیر عتاب رہی تھی اور اسی ناپسندیدہ شخص کو اپنے گھر کے ڈرائنگ روم میں موجود دیکھنا' اس کی برداشت سے باہر تھا۔

"وہ یہاں کیا کرنے آیا ہے تم جانتی ہو کہ مجھے سخت چڑ ہے ایسے لوگوں سے جنہیں اپنی حدود و قیود کی پاسداری کرنی نہ آتی ہو۔ جو اپنی تہذیب و روایات سے انجان ہوں۔"

جہانگیر نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"امی نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں۔ انوشے کے لیے وہ ہی دینے آیا ہے۔ وہ' دراصل اپنے کسی ذاتی کام سے ایبٹ آباد ایک ہفتے کے لیے آرہا تھا تو امی نے۔"

ماہ رخ نے ہکلاتے ہوئے جلدی جلدی وضاحت دینے کی کوشش کی۔

"فوراً" سے پہلے اسے یہاں سے چلتا کرو اور خبردار میں دوبارہ اسے یہاں نہ دیکھوں۔"

جہانگیر نے غصے سے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی اور زور سے دروازہ بند کرتا اسٹڈی روم میں چلا گیا۔ پیچھے کھڑی ماہ رخ کے رکے آنسو چہرے پہ بہنے لگے تھے۔ کہنے کو وہ اس شخص کی بیوی تھی' شریک حیات! مگر اپنے گھر میں وہ کسی مہمان کو اپنی مرضی سے خوش آمدید بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔

لوگوں کی تہذیب اور روایات پہ انگلی اٹھانے والا'

خود اپنے گھر میں آئے مہمان کی عزت کرنا نہیں جانتا تھا۔ ماہ رخ نے دیکھا تھا کہ بے جی مہمانوں کو کتنی عزت و تکریم دیتی تھیں۔ ماہ رخ کی دونوں نندیں بھی ایسی ہی تھیں۔ بھلے کم کم ہی میکے آتی تھیں مگر ان کے طور و طریقے اور عادات اپنی ماں جیسی ہی تھیں۔ اس لیے ماہ رخ کی ان کے ساتھ بہت اچھی دوستی بھی تھی۔

ماہ رخ نے گالوں پہ پھیلے آنسوؤں کو صاف کیا اور خود کو سنبھالتی' ڈرائنگ روم تک آئی تو سمیر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اسے کوئی ضروری کام یاد آگیا تھا۔ وہ چلا گیا اور ماہ رخ خاموشی سے اسے جاتا دیکھتی رہ گئی۔ وہ ایک بار بھی اسے دوپہر کے کھانے پہ رکنے کا نہیں کہہ سکی تھی۔ اس حویلی کی یہ روایات تو کبھی بھی نہیں رہی تھی کہ مہمان کھانے کے وقت 'بغیر کھائے چلا جائے۔ مگر روایات کو نبھانے والے لوگ منوں مٹی تلے سو چکے تھے۔ اب صرف اپنی انا اور تنگ نظری کا پرچم بلند کیے ایک بے حس شخص رہ گیا تھا۔ جو صرف حکم چلانا جانتا تھا۔ اپنی مرضی کرنا!

☆ ☆ ☆

بابا جان نے' بڑی بہن ہونے کے ناطے' اس سلسلے پہ کنیز پھوپھو سے بات کی۔ وہ چاہتے تھے کہ انوشے کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ بتائیں۔ اور کنیز پھوپھو تو پہلے ہی سب تیاری کرکے بیٹھی ہوئی تھیں آمنہ نے ان کے کہنے پر ہمدان سے بات کی تھی اور وہ بھی انوشے کو پسند کرتا تھا۔ کچھ دنوں تک کنیز پھوپھو' ایبٹ آباد سے اسلام آباد آنے والی تھیں۔ باقاعدہ رشتے کی بات کرنے۔ مگر اس سے پہلے ہی بھائی کے فون نے انہیں اپنی بات کہنے کا موقع دے دیا اور کنیز پھوپھو نے موقع ضائع کیے بغیر' ہمدان کے لیے انوشے کا ہاتھ مانگ لیا۔

بابا جان ہمدان کے نام پہ چونک کر رہ گئے۔ یہ تو انہوں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ ہمدان ان کی آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا تھا۔ سب سے بڑی بات انہیں بہت پسند تھا۔ اور انوشے شادی کے بعد بھی ان کے پاس ہی رہتی۔ کیونکہ ہمدان کی جاب اسلام آباد میں تھی۔ بابا اسی وقت ہاں کرنا چاہ رہے تھے۔ مگر کنیز پھوپھو کی اگلی بات نے انہیں خاموش کروا دیا۔

"میں چاہتی ہوں کہ یہ شادی بچوں کی پسند اور رضا مندی سے ہو۔ انوشے کی ماں آج زندہ ہوتی تو یہ مرحلہ بہت آسان ہو جاتا۔ مگر انوشے کی پسند ناپسند کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے ہیں۔ پہلے آپ انوشے کی مرضی معلوم کرلیں۔ پھر جس دن آپ کہیں گے ہم سر کے بل چل کر رشتہ لینے آجائیں گے۔ مجھے آپ کے فون کا بہت بے صبری سے انتظار رہے گا۔"

فون بند کرنے کے کتنی دیر بعد تک بھی بابا جان گم صم سے بیٹھے رہے۔ کوئی چیز تھی جو کانٹے کی طرح چبھی تھی۔ شاید بیٹی سے شدید محبت کرنے والا باپ' اس کی زندگی کے اہم ترین مرحلے پہ' اس کی رضا جاننے یا پوچھنے کے بجائے' اپنی پسند کو ہی حرف آخر سمجھ رہا تھا۔

"مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا کہ شادی کے لیے انوشے کی پسند' ناپسند معلوم کرنی چاہیے! میں اتنا لاپروا کیسے ہو سکتا ہوں کہ اتنی اہم بات میری ذہن میں نہیں آئی۔" بابا جان نے پیشانی ملتے ہوئے صوفے سے اٹھے۔

"اور کہیں ایسی ہی مرضی اور لاپروائی میں اس کی زندگی کے ہر معاملے میں تو نہیں برتتا رہا؟"

اچانک بابا جان کے اندر سے آواز آئی تو وہ ٹھٹک کر رک گئے۔ آج یہ کیسی عجیب سی سوچیں تنگ کرنے آ رہی تھیں! وہ دوبارہ صوفے پہ بیٹھ گئے تھے۔ کسی گہری سوچ میں گم صم سے!

☆ ☆ ☆

"آخر کیا چاہتی ہو تم؟ کیوں کر رہی ہو میرے ساتھ ایسا تم! کیا تم نہیں جانتیں میرے لیے تم کیا ہو؟"

کتنے دنوں بعد' اس سنگ دل کی آواز کانوں کے بنجر پن پہ بارش کی بوندوں کی طرح پڑی تھی۔ عمر کو لگ رہا تھا کہ اس کے اندر زندگی پھر سے دوڑنے لگی ہے اور زندگی جیسے لوگوں کے لہجے اتنے ہی سرد تھے۔

"میں بتا چکی ہوں تمہیں اپنا آخری فیصلہ.... مجھے یہ رشتہ قائم نہیں رکھنا ہے۔" فون سے ابھرتی سرد آواز، کے لفظ نوکیلے پتھر جیسے تھے۔ اس کے ماتھے کی رگیں تن گئیں۔ فون پہ گرفت مضبوط ہو گئی۔

"وجہ جان سکتا ہوں میں!" عمر نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"بس مجھے تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزارنی ہے۔ میں اپنی پسند ناپسند میں آزاد ہوں۔"

دوسری طرف سے اسی مضبوطی کے ساتھ کہا گیا۔

"تم میرے بغیر بھی زندگی نہیں گزار سکتی ہو میں تمہیں تم سے زیادہ جانتا ہوں پری! تم موم سے بنی، نازک احساسات و جذبات رکھنے والی کانچ کی نازک سی گڑیا ہو کیوں خود کو پتھر بنانے کی ناکام کوشش کر رہی ہو۔

اس کوشش میں تم پتھر بنو یا نہ بنو مگر ٹوٹ ضرور جاؤں گی! اور ایسا کبھی ہوا تو یقین رکھنا تمہاری ذات کے بکھرے کانچ، میں اپنے جسم کی پور پور سے چنوں گا تاکہ تمہارے ٹوٹنے کے دکھ کو، اپنے زخمی وجود میں مدغم کر سکوں پھر تمہارا دکھ اور میرا درد برابر ہو جائیں گے۔ ایک جیسے ہو جائیں گے۔" عمر نے وارفتگی سے کہا تھا۔ کچھ دیر تک دوسری طرف خاموشی رہی۔ پھر وہی زندگی جیسی آواز گونجی۔

"تم کچھ بھی کہو میرا فیصلہ وہ ہی ہے اور ویسے بھی میں نے کہا ناکہ میری پسند اور نہ پسند کی بات ہے!"

"تمہاری پسند یا نہ پسند کی بات ہوتی تو میں ضرور مان بھی لیتا مگر اب یہ پسند، نہ پسند کی بات نہیں ہے بلکہ "محبت" کی بات ہے! ہماری "محبت" کی! اور تم چاہے کچھ بھی کہو یا کر لو میں تمہیں "محبت" سے مکرنے تو نہیں دوں گا میری ضد اور جنون سے تم اچھی طرح واقف ہو!" عمر نے مضبوط لہجے میں کہا تھا۔

"تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے! تم مجھے خود ہی چھوڑ دو نہیں تو میں پھر دوسرا راستہ اختیار کروں گی۔"

دوسری طرف سے اس نے جھنجلا کر کہا تھا۔ عمر کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس نے اسی مضبوطی سے کہا۔

"ٹھیک ہے تمہاری ہر بات کو سچ مان لوں گا۔ جو کہو گی، وہ ہی کروں گا! بس ایک بار میرے سامنے آکر، میری آنکھوں میں دیکھ کر، میرے دل پہ ہاتھ رکھ کر کہہ دینا! خدا کی قسم اگر اس کے بعد یہ دل دھڑکا تو میں مان جاؤں گا کہ "محبت" کا وجود، اس دنیا میں ہے ہی نہیں! میں آرہا ہوں تمہارے پاس، تمہارا جواب لینے یا تو تمہیں لاجواب کر کے آؤں گا یا پھر خود کو ہمیشہ کے لیے ہار کر!

"میں آرہا ہوں پری! میرا انتظار کرنا...."

میری مٹی کو چمکنا ہے تیرے نور کے ساتھ
تو میری خاک سے بچ کر نہیں جانے والا

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی عمر نے فون بند کر دیا تھا۔ مگر اس کی سرخ رنگ ہوتی آنکھوں میں ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرنے کے نشان تھے۔

☼ ☼ ☼

صبح سے ہی آسمان پہ کالے گھنے بادلوں کا بسیرا تھا۔ ہوا کی موج مستی الگ جاری تھی۔ چار سالہ انوشے بڑے سے لان میں ادھر سے ادھر بھاگ رہی تھی۔ ماہ رخ بھی خوشگوار موڈ میں سب کچھ بھلائے، انوشے کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ جب چوکیدار نے گیٹ کھول کر کسی کو اندر آنے دیا تھا۔ آنے والا سمیر تھا۔ ماہ رخ کو لان میں دیکھ کر وہ بھی اس طرف ہی آگیا اور آگے بڑھ کر بھاگتی ہوئی انوشے کو گود میں اٹھا لیا۔

"کل میں واپس لاہور جا رہا ہوں۔ سوچا جاتے ہوئے ایک بار انوشے سے مل لوں۔ بہت پیاری بچی ہے آپ کی۔"

سمیر نے پہلے کی نسبت سنجیدگی سے کہا۔ وہ کافی حد تک ماہ رخ کی مجبوریوں کو سمجھنے لگا تھا۔ دوسری بات جہانگیر نے بھی، اپنے رویے یا مزاج کو چھپانے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی تھی۔ ماہ رخ نے سر اٹھا کر سنجیدہ سے سمیر کی طرف دیکھا تھا۔

"اس دن آپ بغیر کھانا کھائے چلے گئے تھے۔ آج کم از کم چائے تو ضرور پی کر جائیے۔ آئیے پلیز!"

ماہ رخ نے آداب میزبانی نبھاتے ہوئے' اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ جہانگیر بھی گھر پہ موجود تھا۔ ماہ رخ جانتی تھی کہ جہانگیر حسب عادت برا مانے گا۔ مگر وہ اپنی نیت اور عمل میں صاف تھی۔ اس لیے آداب میزبانی نبھانے کے لیے اسے کسی عذر کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اندر داخل ہوئے تو انوشے' سمیر کی گود سے اتر کر' صوفے پہ پڑے اپنے بڑے سے ٹیڈی بیئر کی طرف بھاگی تھی۔ سمیر ادھر ہی رک گیا تھا اور مسکراتے ہوئے انوشے کو دیکھنے لگا۔

اسی وقت ماہ رخ' اس کے پاس سے گزر کر کچھ آگے ہی گئی تھی جب اسے بہت زور کا چکر آیا اور بے اختیار ہی اس نے اپنی خادمہ رضیہ کو آواز دی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ تیورا کر گرتی' سمیر نے اسے آگے بڑھ کر سہارا دیا اور اسی وقت سیڑھیاں اترتے جہانگیر نے' ماہ رخ کو چکراتے اور سمیر کو اسے تھامتے دیکھ لیا تھا۔ جب تک جہانگیر تیزی سے سیڑھیاں اترتے نیچے پہنچا سمیر' ماہ رخ کو پاس پڑے صوفے پہ بیٹھا چکا تھا۔ رضیہ بھی ماہ رخ کے پاس پہنچ چکی تھی۔ سمیر پریشان سا ایک قدم پیچھے پلٹا جب اس کے منہ پر زور سے طمانچہ پڑا۔ سمیر لڑکھڑا کر رہ گیا اور حیرت و صدمے سے اپنے سامنے کھڑے جہانگیر کو دیکھنے لگا۔ جو غصے سے پھنکارتے' نفرت بھری نگاہوں سے اسے گھور رہے تھے۔ "تمہاری جرات کیسے ہوئی میری بیوی کو ہاتھ لگانے کی۔"

جہانگیر نے پھنکارتے ہوئے کہا۔ جہانگیر کے منہ سے نکلے لفظوں کے زہر سے سمیر کا تن من نیلا ہو گیا تھا۔ جبکہ ماہ رخ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس تماشے کو دیکھ رہی تھی۔

"اپنی زبان سنبھال کر اور سوچ سمجھ کر لفظ استعمال کیا کریں۔ ضروری نہیں ہے کہ سب آپ کی طرح چھوٹے ذہن کے مالک ہوں جو اپنے اندر کی غلاظت' دوسروں میں دیکھتے پھرتے ہیں!"

سمیر نے ضبط کی کڑی منزلوں سے گزرتے ہوئے سرخ چہرے اور مٹھیوں کو بھینچتے ہوئے کہا اور ماہ رخ کے پیلے پڑتے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔

"سوری ماہ رخ آپی! مجھے اتنا اندازہ تو تھا کہ آپ کے شوہر کا مزاج بہت سخت اور روکھا ہے مگر یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ شخص ذہنی بیمار اور شکی بھی ہے!"

سمیر نے نفرت سے جہانگیر کی طرف دیکھ کر زمین پہ تھوکا تھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔ جہانگیر نے بھی پاس پڑی شیشے کی میز کو زور سے ٹھوکر ماری اور غصے سے گھر سے باہر نکل گیا تھا۔ میز دھماکے سے کانچ کے ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔ ماہ رخ' ارد گرد کی ہوش بھلائے' ہر طرف بکھرے' ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے دیکھ رہی تھی۔ اسے سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کانچ کے ٹکڑے کون سے ہیں اور اس کی ذات کے کون سے! انوشے کب سے ڈر کے رو رہی تھی۔ ایک خادمہ اسے چپ کروانے کی کوشش کرتی وہاں سے لے جانے لگی۔ مگر وہ لپک لپک کر ماں کے پاس جانا چاہ رہی تھی۔ مگر ماہ رخ وہاں ہوتی تو کچھ سنتی یا محسوس کرتی اس کا وجود شک اور تذلیل کے الاؤ میں جل رہا تھا۔ نیک اور پاکباز عورت سب کچھ برداشت کر بھی لے مگر اپنے کردار پہ اٹھی انگلی کبھی بھی نہیں برداشت کرتی ہے۔ یہاں آکر مصلحت' سمجھوتے کی ساری راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اگر ایک مرد' اپنی بیوی کو محبت نہ دے تو بھی گزارا بہت آرام سے ہو سکتا ہے۔ مگر اپنی بیوی پہ بھروسہ نہ کرے' اس کی تذلیل کرے' ایسے مرد کے ساتھ زندگی گزارنا' جیتے جی آگ میں جلنے کے مترادف ہے اور آگ بہت ظالم ہوتی ہے۔ اس میں جانا اور رہنا' عذاب ہوتا ہے اور زندگی میں جب اس کی رحمت کی امید ہمیشہ رہی ہے تو عذاب کی سزا کیوں بھگتیں!

اس لمحے ماہ رخ نے بھی ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ محبت نہ سہی مگر اپنے وجود کی تذلیل بھی اسے منظور نہیں تھی۔ موسلا دھار اور برستی رات' آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی جب جہانگیر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تھا اور سامنے بیڈ پہ بکھری ـــــ اور سرخ آنکھوں کے ساتھ بیٹھی ماہ رخ' اسے اندر آتا دیکھ کر بیڈ

سے اتر کر چھوٹے چھوٹے مگر مضبوط قدم اٹھاتی اس کے سامنے آکر کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کا دوپٹا ایک طرف سے نیچے قالین پہ لٹک رہا تھا۔ اس کا چہرہ پتھریلا مگر رنگ پیلا پڑا ہوا تھا۔ جہانگیر نے بہت غور سے اس کی طرف دیکھا تھا اور پہلی بار ہی اسے اس روپ میں دیکھا تھا۔ ایک قیامت تھی جو گزر چکی تھی اور ایک قیامت تھی جو ان دونوں کے درمیان کھڑی تھی۔ جس سے دونوں ہی بے خبر تھے۔

سوال کرنے والا بھی اور جواب دینے والا بھی...!

وہ دونوں بھی ایک دوسرے کے سامنے ایسے ہی کھڑے تھے!

☆ ☆ ☆

"کیا ہوا ہے علشبہ تم ایسے اچانک سے واپس کیوں جا رہی ہو؟ ابھی یونیورسٹی میں کلاسز بھی شروع نہیں ہوئی ہیں کل ہی تو تم نے مجھے بتایا تھا پھر آج ایسے ہی کیوں؟"

انوشے' پریشانی سے علشبہ سے پوچھ رہی تھی جو جلدی جلدی بیگ میں اپنی چیزیں رکھ رہی تھی۔ علشبہ کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔ وہ انوشے کی کسی بات کا جواب نہیں دے رہی تھی۔ انوشے کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اچانک علشبہ کو کیا سوجھی۔ کل رات تک دونوں نے باتیں کی تھیں اس وقت علشبہ نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی! صبح ناشتے کے بعد بابا جان نے اسے اپنے کمرے میں بلایا تھا اور ان کے آفس جاتے ہی' علشبہ نے واپس جانے کی ضد پکڑلی تھی۔ فون کر کے وہ اپنی سیٹ ریزرو کروا چکی تھی۔

"علشبہ بتاؤ مجھے آخر تمہیں ہوا کیا ہے؟" انوشے نے جھنجلا کر علشبہ کا بازو پکڑ کر' اس کا رخ اپنی طرف موڑا تھا۔ علشبہ کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی وہ چونک گئی۔

"تم رو رہی ہو؟" انوشے نے اس کے چہرے پہ پھیلے آنسوؤں کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کچھ نہیں بس امی بہت یاد آ رہی تھیں۔ کل رات انہیں خواب میں دیکھا تو رہا نہیں گیا۔ میں نے ماموں جان کو بھی بتا دیا تھا۔ تم پریشان نہ ہو۔ بس کچھ دیر میں میری فلائٹ ہے۔ مجھے یہاں آئے دن بھی تو کافی ہو گئے تھے نا! اس لیے..."

علشبہ نے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بیگ کی زپ بند کی۔ اور ڈریس تبدیل کرنے کے لیے ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ انوشے اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اچانک! مگر..." انوشے کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ علشبہ کا رویہ بہت عجیب سا تھا۔ انوشے' علشبہ کو سی آف کر کے واپس آئی تو بہت چپ چپ تھی۔ ایئرپورٹ پہ علشبہ بے اختیار انوشے کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔

☆ ☆ ☆

"جہانگیر! آپ جانتے ہیں میں آج تک کیوں آپ کی بے اعتنائی' کج ادائی' بے رخی کو برداشت کیا؟ کبھی سوچا کیوں ایک عورت' اپنا گھر بنانے اسے بسانے کے لیے' اپنے جان سے پیارے رشتوں کو چھوڑ کر' ایک اجنبی کے سنگ زندگی گزارنے کا عہد کرتی ہے! کبھی سوچا اگر ایک عورت اتنی قربانی دیتی ہے تو کیوں اور کس لیے؟"

ماہ رخ نے ٹوٹے بکھرے لہجے میں سامنے کھڑے جہانگیر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بارش کا شور اور بجلی کے کڑکنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

"صرف ایک گھر بسانے کی خواہش میں وہ خواہش جو آدم اور حوا کو بھی تھی۔ اسی خواہش کے تحت تو نا ممکن نظر آنے والے مرحلے بھی طے کر لیے جاتے ہیں اور اگر شادی کے بعد ایک عورت کو اس کے شوہر کی طرف سے محبت' عزت اور مان ہی نہ ملے تو؟ کیا مرد و عورت کا رشتہ صرف حقوق و فرائض کی حد تک ہی رہ جاتا ہے؟ چلیں اس بات کو بھی اگر سامنے رکھا جائے تو کیا ہمارے مذہب میں بیوی کے صرف فرائض ہی بتائے گئے ہیں۔ حقوق نہیں!

مرد اللہ اور اس کے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر جب کسی عورت کو اپنی زندگی میں شامل کرتے ہیں تو کیا اس کی تذلیل کرنے کے لیے؟"

ماہ رخ نے بپھرے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

"کیا بکواس کر رہی ہو تم! میں نے تمہیں کونسی تنگی دے رکھی ہے۔ ہر طرح کا آرام اور بہتر زندگی مہیا کی ہے۔" جہانگیر نے تپتے ہوئے کہا۔

"جسمانی سکون کی اہمیت اس وقت ختم ہو جاتی ہے جہانگیر صاحب! جب آپ ہر لحہ ہر پل سامنے والے کو ذہنی اذیت دیں۔ اسے مینٹل ٹارچر کریں۔"

ماہ رخ نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا۔ آج اس کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ ناجائز بات کے آگے جھکنا' اسے تسلیم کرنے کے برابر تھا اور ماہ رخ جیسی باکردار اور شریف عورت کے لیے' یہ ایک گالی کی طرح تھا۔

"ماہ رخ میرا دماغ خراب مت کرو اور اپنی حد میں رہو۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ مجھے بحث کرنے اور زبان درازی کرنے والی عورتوں سے سخت نفرت ہے!" جہانگیر نے انگلی اٹھا کر اسے تنبیہہ کی تھی۔

"بات بحث یا زبان درازی کی نہیں ہے بات میری عزت نفس اور نسوانیت کی ہے۔ جس پہ آج آپ نے سب کے سامنے انگلی اٹھائی ہے۔ آپ اپنی اس حرکت کے لیے میرے آگے جواب دہ ہیں اور مجھے اس کا جواب چاہیے کیوں! آپ نے مجھے' میری ہی نظروں میں گرا دیا؟ کیوں! اپنی گندی سوچ کے چھینٹے' میرے پاک دامن پہ اڑائے؟ کیوں جہانگیر؟"

ماہ رخ نے جہانگیر کا بازو پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے سوال کیا۔ یکایک جہانگیر کا ہاتھ اٹھا اور ماہ رخ لڑکھڑا کر رہ گئی۔ اپنے چہرے پہ ہاتھ رکھے وہ حیران اور پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ تمہارے ہر سوال کا جواب ہے اور بس اپنی حرکت پہ نہ کل شرمندہ تھا اور نہ آج ہوں۔ وہ تم ہی اسی قابل اور تم۔۔۔۔"

جہانگیر نے نفرت بھرے لہجے میں کہتے انگلی اٹھا کر پتھرائی ہوئی کھڑی ماہ رخ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اور تم یہ جانتی بھی تھیں کہ مجھے اس کا یہاں آنا سخت ناپسند ہے۔ پھر بھی تم نے اسے گھر کے اندر آنے کی دعوت دی اور اسے تو موقع چاہیے تھا تم ذرا سا چکرا کیا گئیں وہ فوراً" سے پہلے تمہیں سنبھالنے کے بہانے تمہارے قریب ہوا تھا اور۔۔۔۔"

"بس کریں جہانگیر! خدا کا واسطہ ہے ایک معمولی سے ہوئے حادثاتی واقعے کو اپنی مرضی کا رنگ مت دیں۔ مجھے میری ہی نظروں میں مت اتنا گرا دیں کہ میں دوبارہ آپ سے نظر نہ ملا سکوں۔"

ماہ رخ نے روتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے اور گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئی۔ وہ بہت بری طرح اور ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ جہانگیر نے ناگواری سے ماہ رخ کو بلکتے ہوئے دیکھا اور تنفر سے اونہہ کہہ کر رخ دوسری طرف موڑ لیا۔

کچھ دیر بعد ماہ رخ اٹھی اور اپنے آنسو پونچھتی ہوئی' مضبوط قدم اٹھاتی' جہانگیر کے پاس سے گزر کر کمرے کے داخلی دروازے کے پاس پہنچی اور مڑے بغیر سنجیدگی سے بولی۔

"جہانگیر! مجھے لگا تھا کہ میں آج آپ کے اندر سوئے ہوئے احساس کو اتنا تو ضرور جگا دوں گی کہ آپ اپنی آج کی حرکت پہ شرمندہ ہوں مگر یہ میری خام خیالی ہی رہی۔ مجھے آج سمجھ آئی کہ میں ایک پتھر کے ساتھ رہ رہی تھی۔ اگر بات میرے کردار اور عزت نفس پہ نہ آتی تو میں ساری عمر اسی خاموشی سے اندر ہی اندر ٹوٹتے ہوئے گزار دیتی مگر اب نہیں!"

ماہ رخ نے ہینڈل پہ ہاتھ رکھے ذرا سا مڑ کر جہانگیر کو دیکھا۔ جہانگیر بھی ماہ رخ کے آخری جملوں پہ چونک کر اسے گھورنے لگا تھا۔

"جہانگیر! جب تک آپ کو اپنی زیادتی' اپنے غلط رویئے کا احساس نہیں ہو جاتا' میرا یہاں سے چلے جانا ہی بہتر ہے۔"

ماہ رخ نے کہا اور مڑ کر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔ پیچھے غصے سے پیچ و تاب کھاتا' جہانگیر کچھ خیال آتے ہی فوراً" کمرے سے باہر نکلا۔ جہانگیر کا رخ

انوشے کے کمرے کی طرف تھا۔ اس کا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ ماہ رخ' سوئی ہوئی انوشے کو خود سے لپٹا کر پیار کر رہی تھی۔ چوم رہی تھی۔

"تم نے جہاں جانا ہے دفع ہو جاؤ مگر یہ یاد رکھنا میری بیٹی کبھی تمہارے ساتھ نہیں جائے گی۔ میں بھی تمہاری جیسی عورت کے ساتھ نہیں رہنا چاہتا۔ صبح ہوتے ہی ڈرائیور تمہیں' تمہاری ماں کے گھر چھوڑ آئے گا۔ جو چاہو یہاں سے لے کر جا سکتی ہو سوائے انوشے کے' اور یہاں سے ایک بار جاؤں کی تو واپسی کے سب راستے تمہیں بند ملے گے۔"

جہانگیر نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی تھی۔ ماہ رخ آزردگی سے مسکرا دی اور سوئی ہوئی انوشے کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"آپ سے کس نے کہا کہ میں انوشے کو اپنے ساتھ لے کر جانا چاہتی ہوں؟"

ماہ رخ نے پراسرار سی مسکراہٹ چہرے پہ سجائے' جہانگیر کے الجھن بھرے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔

"انوشے کو میں اپنی رضا اور خوشی سے آپ کے پاس چھوڑ کر جا رہی ہوں۔۔۔ کیوں؟ اس کا جواب آپ خود ڈھونڈیں گے۔ نہیں تو وقت ہے نا ہر سوال کا جواب دینے والا آپ بھی انتظار کریں۔ اس وقت کا' جب بہت سی ان کہی باتوں کے اسرار کھلیں گے۔"

ماہ رخ نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں کہا تو جہانگیر کچھ نہ سمجھتے ہوئے' دروازہ غصے سے مارتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہ رات ماہ رخ نے رو کر اور انوشے کو خود سے لگا کر گزاری تھی۔ آج اس کی ممتا بھی' اسے اپنے فیصلے سے باز نہیں رکھ پا رہی تھی۔ اس کا دل اپنے فیصلے پہ مطمئن تھا۔ مگر انوشے کو خود سے الگ کر دینے کا خیال اسے کمزور بھی بنا رہا تھا۔

مگر وہ جانتی تھی کہ یہ ابتدا ہے آج جہانگیر نے سمیر کو لے کر' اس کے کردار پہ انگلی اٹھائی تھی۔ کل کو کوئی اور بھی ہو سکتا تھا۔ جہانگیر کو اپنے رویے یا اپنے عمل پہ کوئی شرمندگی نہیں تھی۔ ایسے شخص کے ساتھ رہنا خود اپنی نظروں میں ہی گرنے کے مترادف تھا۔

اگلی صبح ماہ رخ نے خاموشی سے وہ بڑی' عالیشان حویلی چھوڑ دی تھی۔ ڈرائیور نے اسے بحفاظت لاہور پہنچا دیا تھا۔ ام کلثوم نے جب لٹی پٹی سے ماہ رخ کو گھر کی دہلیز پہ دیکھا تو دل تھام کر رہ گئی تھیں۔

✡ ✡ ✡

"یہ لیجیے بابا جان! آپ کی پسندیدہ کافی" انوشے نے کمرے کا دروازہ کھول کر آتش دان کے پاس' ایزی چیئر پہ بیٹھے کتاب پڑھتے ہوئے بابا جان کے پاس آتے ہوئے کہا۔ بابا جان جب سے ایبٹ آباد سے آئے تھے۔ بہت خوش اور مطمئن سے تھے۔ کافی کا مگ پکڑ کر انہوں نے لبوں سے لگایا۔ کافی کی مہک اور ذائقے نے ان کے مزاج کو اور خوشگوار کر دیا۔

"یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو!" بابا جان نے انوشے کو پیار سے اپنے پاس بلاتے ہوئے کہا۔ تو انوشے ان کے قدموں کے پاس کشن پہ بیٹھتے ہوئے اپنی کہنیاں ان کے گھٹنوں پہ ٹکا کر' دونوں ہاتھوں کی ہتھیلی پہ چہرہ ٹکا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ اس لمحے' وہ بہت معصوم سی لگی تھی بابا جان کو۔ یہ انوشے کی بچپن کی عادت تھی۔ بابا جان کے ساتھ اسی انداز میں بیٹھ کر کہانیاں سنتا' اپنی باتیں کرتا' بابا جان کو بولتے ہوئے دیکھتے رہنا۔ ابھی بھی وہ منتظر نظروں سے بابا جان کے چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ جن کے چہرے پہ سوچ کی پرچھائیاں واضح تھیں۔ کافی ختم کرنے تک ان کے درمیان خاموشی رہی۔ پھر بابا جان گلا کھنکار کر گویا ہوئے۔

"میں نے ایبٹ آباد جانے سے پہلے علشبہ کو ایک ذمہ داری سونپی تھی مگر تم بتا رہی تھیں کہ اس کا اچانک ہی واپس جانے کا پروگرام بن گیا اور وہ بغیر کچھ کہے یا بتائے چلی گئی۔ خیر!" بابا جان نے تمہید باندھتے ہوئے کہا تو انوشے چونک سی گئی۔

"کیسا کام بابا جان؟" انوشے نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

"انوشے' بڑی آپا نے ہمدان کے لیے تمہارا ہاتھ مانگا ہے مگر ساتھ ہی ان کی خواہش تھی کہ ایک بار تم

سے پوچھ لیا جائے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ میری بیٹی کے شب و روز میرے سامنے کھلی کتاب کی طرح ہیں۔ تم نے آج تک مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی ہے مگر پھر بھی، میں نے مناسب سمجھا کہ علشبہ دوست یا بہن بن کر تمہاری رضا معلوم کرے۔ مگر وہ بھی چلی گئی ہے۔ میں ایبٹ آباد بھی اسی سلسلے میں ہی گیا تھا۔ اگلے جمعے کو بڑی آپا آرہی ہیں باقاعدہ تمہارا رشتہ لینے سب کے ساتھ۔ میں انہیں ہاں کر آیا ہوں۔" جہانگیر نے خوشی خوشی سے بتاتے ہوئے کہا۔ تو انوشے بھیگی آنکھوں اور زرد چہرے کے ساتھ ایک دم سے پیچھے ہٹی تھی۔

"کیا ہوا انوشے! کیا تمہیں اعتراض ہے اس رشتے پر۔" بابا جان نے اسے سر جھکائے اور پیچھے ہٹتے دیکھ کر سنجیدگی سے سوال کیا تھا۔

"نہیں نہیں بابا جان! بس ویسے ہی مما کا خیال آگیا تھا۔ آپ کو جو بہتر لگے آپ کریں۔" انوشے نے تیزی سے پلکیں جھکاتے ہوئے اور کانپتی آواز میں کہا تھا۔

"جیتی رہو بیٹا! تم نے میرا مان رکھ لیا۔" بابا جان نے انوشے کے جھکے سر پہ پیار سے ہاتھ پھیرا۔ انوشے شب خیر کہتی ہوئی ان کے کمرے سے نکل آئی اور تیزی سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرکے، پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ بابا جان نے ہمیشہ اپنی مرضی کی تھی۔ اس کی شادی کا فیصلہ بھی ایسا ہی کرنا تھا انہوں نے، وہ سب جانتی تھی مگر کسی چیز کے جاننے اور اس کے بیتنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آج اس فیصلہ کن مرحلے پہ آکر اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے۔ علشبہ اس دن واپس لاہور کیوں چلی گئی تھی اب انوشے کی سمجھ میں آیا تھا۔ علشبہ، ہمدان سے محبت کرنے لگی تھی۔ اس کا اندازہ انوشے کو پہلے ہی ہو گیا تھا۔ اسی لیے اس میں اتنا حوصلہ بھی نہیں تھا کہ اپنی محبت کو کسی اور کے ہاتھ میں سونپ دیتی۔ اسی لیے اس نے فرار کو آسان سمجھا تھا۔ مگر انوشے کیسے اور کہاں فرار حاصل کرتی؟

"مما! آئی مس یو سو مچ! کاش آپ آج میرے پاس میرے ساتھ ہوتیں۔ میں تھک گئی ہوں آپ سے کیا عہد نبھاتے نبھاتے! مما آپ کی انوشے اتنی بہادر نہیں ہے۔"

انوشے نے گھٹنوں میں سر دے کر روتے ہوئے ماں کو پکارا تھا۔

☆ ☆ ☆

ماہ رخ کو آئے دس دن گزر چکے تھے۔ سمیر کی زبانی مریم پہلے ہی ساری صورت حال سے واقف ہو چکی تھی۔ مریم نے اس بات کو لے کر گھر میں کافی ہنگامہ کیا تھا۔ سمیر چار بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا اور چہیتا تھا اس کے ساتھ کیے سلوک اور الزام نے سب کو شدید غصہ اور طیش دلا دیا تھا۔ ماہ رخ کو اپنے سامنے دیکھ کر مریم نے کافی ہنگامہ کیا تھا۔ جنید کو بھی جہانگیر کے رویے نے شدید تکلیف پہنچائی تھی مگر لاڈلی اور اکلوتی بہن کی حالت دیکھ کر اس کا دل دکھ سے بھر گیا۔

جہانگیر کی فطرت سے واقف ہونے کے باوجود اس سے اس ذلالت کی توقع نہیں تھیں ان کو۔ ماہ رخ بہت نڈھال، اور غم زدہ سی رہتی تھی۔ جہانگیر کی ہٹ دھرمی اور بے رخی، انوشے سے جدائی، کبھی کبھی اسے لگتا تھا کہ اس نے سنگین غلطی کی تھی اپنا گھر چھوڑ کر۔ مگر پھر اس شام کا وہ منظر اور جہانگیر کے زہریلے الفاظ، اسے مضبوط کر دیتے تھے۔ ام کلثوم جنہوں نے ساری زندگی مضبوطی اور بہادری سے گزاری تھی۔ ماہ رخ کو دیکھ کر وہ بھی اندر سے ڈھے چکی تھیں۔ وہ جہانگیر سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ مگر انہیں سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ اس سے کس چیز کی وضاحت مانگیں؟ جہانگیر کے غلط رویے یا الزام کی یا اپنی بیٹی کی معصومیت اور پاکدامنی کی گواہی دیں؟ یا اسے یہ بتائیں کہ سمیر لاابالی ضرور ہے مگر بری نیت رکھنے والا نہیں۔ وہ ماہ رخ کو آپی کہتا تھا۔ جو جہانگیر نے سمجھا وہ اس کے ذہن کا فتور تھا۔ سمیر کی نیت کا نہیں!

اسی کشمکش میں پندرہ دن گزر گئے۔ ایک دن ڈاک کے ذریعے ماہ رخ کے نام رجسٹری آئی تھی۔ جسے پڑھتے

ہی وہ تیورا کر گر پڑی تھی۔ مریم نے اسے بے ہوش دیکھ کر جنید کو آواز دی اور اسے گاڑی میں ڈال کر قریبی ہاسپٹل لے گئے۔ جہاں اسے ایمرجنسی میں کئی گھنٹے رکھا گیا۔ ماہ رخ کا نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا اور سب سے زیادہ تکلیف دہ خبر جو اسے ہوش میں آنے کے کئی دن بعد پتا چلی تھی وہ یہ کہ وہ امید سے تھی۔ مگر اس کا مس کیرج ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر نے وجہ شدید دباؤ اور کوئی صدمہ بتائی تھی۔ جہانگیر نے ماہ رخ کو طلاق دے دی تھی۔ یہ خبر قیامت بن کر ان کے گھر پہ ٹوٹی تھی۔ احسن بھائی اور زارا کے کئی فون آئے تھے۔ احسن بھائی جلد از جلد پاکستان آنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔

ماہ رخ اسپتال میں ہی ایڈمٹ تھی جب اس سے ملنے جہانگیر کی بڑی بہن کنیز فاطمہ آئی تھیں۔ ام کلثوم کی زبانی 'ماہ رخ کے ساتھ بیتے جانے والی روداد اور مس کیرج کا سن کر وہ بہت غم زدہ اور آبدیدہ ہو گئی تھیں۔ ماہ رخ کا ہاتھ تھام کر وہ کتنی دیر ہی روتی رہیں اپنے بھائی کی طرف سے معافی مانگتی رہیں۔ جواب میں ماہ رخ خاموش رہی۔ بولی تو صرف اتنا۔

"میری انوشے کا خیال رکھیے گا۔ اگر زندگی میں اسے کبھی آپ کی ضرورت پڑی تو انکار مت کیجیے گا۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہو گا۔"

ماہ رخ نے دھیرے سے بول کر آنکھیں موندلی تھیں۔ مگر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل کر تکیے میں جذب ہونے لگے تھے۔ کنیز فاطمہ بہت دکھی دل سے وہاں سے آئی تھیں۔

جہانگیر نے اسلام آباد میں بہت خوب صورت گھر لے لیا اور مستقل وہاں رہائش اختیار کرلی۔ اور پونے پانچ سال کی ڈری سہمی سی انوشے کو اسکول میں داخل کروا دیا۔ ایبٹ آباد میں موجود بڑی سی حویلی کو ریسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا گیا اور ان دنوں جب جہانگیر حویلی میں مختلف تعمیری کام کروا رہا تھا۔ ایک دن کنیز فاطمہ اس سے ملنے چلی آئیں۔

"آیئے آپا! میں بس کچھ دیر میں اسلام آباد کے لیے نکلنے ہی والا تھا۔" جہانگیر نے انہیں دیکھ کر سامنے پڑے صوفے پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پچھلے آٹھ مہینے سے وہ جہانگیر سے بات کرنے کا موقع تلاش کر رہی تھیں۔ مگر جہانگیر نے کسی سے بھی رابطہ نہیں رکھا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ خود سے بھی بھاگ رہا تھا۔

"حیرت کی بات ہے تمہارے جیسے بے حس اور خود غرض شخص کو بھی کوئی رشتہ یاد رہ گیا ہے۔ ماہ رخ کو تو تم نے اپنی زندگی سے ایسے نکال کر پھینک دیا جیسے وہ کوئی جیتا جاگتا انسان نہیں 'بے جان مورت تھی۔ تم نے تو یہ بھی نہیں سوچا کہ انوشے کا کیا ہو گا؟ وہ معصوم سی بچی کیسے ماں کی جدائی کا صدمہ سہے گی۔"

اتنے مہینوں کا پکتا لاوا جہانگیر کو سامنے دیکھ کر پھٹ پڑا تھا۔ کنیز فاطمہ نے کبھی جہانگیر سے اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ وہ بڑی ہو کر بھی 'بھائی سے دبتی تھیں۔ مگر ماہ رخ کے ساتھ ہوئی زیادتی نے انہیں بولنے کی طاقت دے دی تھی۔

"کنیز آپا! بس کریں۔ یہ میرا ذاتی مسئلہ ہے۔ میں مزید اس عورت کے ساتھ نہیں رہ سکتا تھا۔ جس کے نزدیک میری بات 'میرے وقار کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔" جہانگیر نے ضبط کرتے ہوئے کہا تھا۔

"بس کرو جہانگیر! اپنی جھوٹی انا 'ضد' خود سری کے بت توڑ دو۔ ماہ رخ جیسی عورت کی تم نے قدر نہیں کی۔ جو تمہارے ساتھ اپنے ہر عمل 'سوچ اور رشتے سے خالص تھی۔ تم نہیں جانتے تم نے کیسا ہیرا گنوایا ہے۔ اپنی ضد 'غصے اور جلد بازی کی وجہ سے! ارے نادان! کچھ اور نہ سہی اپنی معصوم بچی کی طرف تو دیکھتے' اتنا بڑا فیصلہ کرتے وقت 'اپنے آنے والے بچے کے بارے میں تو سوچتے۔ تمہارے اس ظلم نے اس کی کوکھ بھی اجاڑ دی۔ ایک بار تو سوچتے تم کیا کر رہے ہو؟"

کنیز فاطمہ نے روتے ہوئے کہا تو جہانگیر پتھر کا بت بنا رہ گیا۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں کنیز آپا؟ اس کے ذہن میں مختلف خیالات چکرانے لگے تھے۔ اس کے ماتھے پہ پسینہ نمودار ہو گیا تھا۔ اس نے بے اختیار صوفے کی

پشت تھام کر خود کو گرنے سے بچایا تھا۔

"کیا ماہ رخ پریگننٹ تھی؟" جہانگیر نے سرسراتی ہوئی آواز میں پوچھا تو کنیز فاطمہ نے چونک کر ان کے پیلے پڑے چہرے کو دیکھا تھا۔

"ہاں! مگر اسے بھی خبر تب ہوئی جب وہ سب کچھ ہار کر تہی دامن ہو چکی تھی۔" کنیز فاطمہ نے آہستہ آہستہ کرکے 'ماہ رخ کے نروس بریک ڈاؤن سے لے کر اسپتال میں ہوئی آخری ملاقات تک کی روداد سنا دی۔ جہانگیر گم صم سا سب سنے گیا۔

"یہ کیا ہو گیا مجھ سے؟" پچھتاوے کی شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔

"میری تم سے ایک التجا ہے تمہیں بے جی کا واسطہ ہے ماہ رخ پہ اور ظلم مت کرنا۔ اسے انوشے سے دور مت کرنا۔ تم پہلے ہی بہت ظلم کما چکے ہو۔" کنیز فاطمہ نے صوفے سے اٹھتے ہوئے ایک نظر گم صم سے کھڑے جہانگیر پہ ڈالی تھی اور خاموشی سے دہلیز پار کر گئیں۔ شام کی بڑھتی تاریکی نے 'رات کے دامن کو تھام لیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا چھا چکا تھا۔ مگر صوفے پہ گم صم سے 'سود و زیاں کے حساب سے گزرتے جہانگیر کے اندر ہر چیز روشن ہو گئی تھی۔

"بے جی کا واسطہ! اور ظلم مت کمانا؟" تو کیا میں اتنا ظالم اور سنگ دل ہوں کنیز آپا نے مجھے بے جی کی قسم دی۔ کیا وہ جانتی تھیں کہ مجھ میں انسان ہونے کے ناطے 'انسانیت نہیں ہوگی؟ کیا سچ میں 'میں اپنے ظلم میں فرعون بن چکا ہوں؟"

جہانگیر نے اپنے اندر کے سوالوں سے گھبرا کر باہر کا رخ کیا۔ مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ جگہ بدل لینے سے 'سوال دم نہیں توڑ دیتے ہیں۔ بلکہ اور زیادہ شدت سے سامنے آنے لگتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

پرسکون ریسٹورنٹ کے تنہا اور الگ سے کونے میں بیٹھی انوشے بار بار رسٹ واچ کو دیکھ رہی تھی۔ بلیک رنگ کی گھیرے دار فراک پہ ہرے اور میرون رنگ کے نفیس سی کڑھائی تھی۔ کندھوں پہ میرون رنگ کی ہی شال تھی۔ سبز آنکھوں میں پھیلے ہلکے گلابی پن کے کنارے پہ کاجل کی لکیر واضح تھی۔ جیسے پرسکون سے جھیل کے گرد حصار سا بندھا ہو۔ بال حسب معمول کیچر میں جکڑے کچھ پشت پہ بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ لٹیں چہرے کے گرد ہالہ سا بنا رہی تھیں۔ ستواں ناک میں چمکتی لونگ اور تراشیدہ ہونٹوں پہ (گلابی) پنک کلر کے لپ گلوس نے اس کے روپ کو مزید نکھار دیا تھا۔

ہمدان نے ریسٹورنٹ میں داخل ہوتے ہوئے ادھر سے ادھر نظریں دوڑائی تھیں کہ وہ اسے نظر آ ہی گئی۔ وہ انوشے کو اکیلے وہاں بیٹھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اپنے ساتھ آئے دوست سے معذرت کرتا 'وہ بہت سرشار قدموں سے اس کی طرف بڑھا تھا۔ جب سے اسے پتا چلا تھا کہ ماموں جان بھی دل و جان سے اس رشتے پہ راضی ہیں۔ ہمدان کا دل نئی لے اور ترنگ پہ دھڑکنے لگا تھا۔

اور آج اتفاقاً" انوشے کو یہاں اکیلا بیٹھے دیکھ کر' اسے اپنی خوش بختی پہ یقین آگیا تھا اور انوشے سے اپنے دل کی بات کہنے کا اسے بہترین موقع ملا تھا اور اس کے دل کی بات جاننے کا بھی! ان کچھ لمحوں میں ہی اس کے خوش گماں دل نے 'کتنے ہی خواب سجا لیے تھے۔ ہمدان کے چہرے کی چمک اور آنکھوں میں 'آنے والے لمحوں کا خوشگوار تصور اس کی اندرونی خوشی کا اظہار کر رہے تھے اور آج تو انوشے کی بھی سج دھج نمایاں تھی یا ہمدان کو ہی ایسا لگ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ ہمدان اس کی میز تک پہنچتا۔ کوئی اور دراز قد اور چوڑے شانوں والا جس کی پشت ہمدان کی طرف تھی 'انوشے کے سامنے والی کرسی پہ بیٹھ چکا تھا اور بہت استحقاق کے ساتھ اپنا مضبوط مردانہ ہاتھ ' میز پہ دھرے انوشے کے نازک گلابی ہاتھوں پہ رکھ چکا تھا۔ ہمدان جہاں تھا وہاں کھڑا کا کھڑا رہ گیا اس کی نظروں کے سامنے انوشے کا روشن چہرہ تھا۔ جو اس نو وارد کو دیکھ کر مزید روشن ہو گیا تھا۔

اور چہرے تب ہی روشن ہوتے ہیں جب کسی سے

دل کا تعلق ہو اور انوشے کے چہرے پہ جھجک آمیز خاموشی اور حیا سے آئی لالی نے اسے بتا دیا تھا کہ آنے والا' انوشے کے دل سے کتنا قریب ہے۔ انوشے اپنا ہاتھ' بھلے ہی پیچھے ہٹا چکی تھی مگر اس کی گھنیری پلکوں کی لرزش' دھڑکنوں میں آئے بھونچال کو عیاں کر رہی تھیں۔

ہمدان خاموشی سے پلٹ گیا۔ مگر ہمدان کو ایسا لگ رہا تھا' جیسے وہ اپنا سب کچھ یہاں ہی ہار کر جا رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

ماہ رخ نے ایک نظر سوئی ہوئی ام کلثوم پہ ڈالی۔ ساری زندگی ہمت اور بہادری سے' وقت اور حالات کا مقابلہ کرنے والی اس کی ماں' اپنی بیٹی کے ساتھ ہوئے تقدیر کے تلخ وار سے لڑتے لڑتے بالآخر ہار ہی گئی تھی۔ اوپر سے مضبوط بنی ام کلثوم' اندر سے وہی خوفزدہ اور اولاد کی تکلیف پہ تڑپ اٹھنے والی ماں ہی تھیں۔

ام کلثوم کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ ماہ رخ گم صم سے رہ گئی تھی۔ آج اس کی وجہ سے اس کی ماں اندر ہی اندر سے گھلتی' درد سہتی' اس حال تک پہنچ گئی تھیں۔

"اور اگر امی کو کچھ ہو گیا تو!" ہسپتال کے ٹھنڈے فرش پہ دل تھام کر بیٹھتی' وہ آنے والے وقت سے خوفزدہ تھی۔ وہ بہت بے بس اور لاچار لگ رہی تھی۔ اب جو بھی کرنا تھا' ماہ رخ کو خود ہی کرنا تھا۔

بہت ہمت اور بہادری سے اس نے ان قیامت کی گھڑیوں کو گزارا تھا اور ام کلثوم کے خطرے سے باہر آتے ہی' اس کا سر اپنے رب کے آگے سربسجود ہو گیا۔ جو بے شک اپنے بندوں کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ ام کلثوم ڈسچارج ہو کر' گھر آچکی تھیں۔

کل رات کی فلائٹ سے احسن بھائی' بمعہ اپنی فیملی کے آچکے تھے۔ ماہ رخ کو گلے سے لگا کر بے اختیار رو پڑے تھے۔ ماہ رخ کی اجاڑ زندگی نے ان سب کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ مگر ماں کے سامنے خود کو ہشاش بشاش ظاہر کرنا ان کی مجبوری تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ ام کلثوم کو ذہنی دباؤ سے دور رکھیں۔ زارا اور احسن بھائی نے ماہ رخ کو بہت تسلی دینے کے ساتھ ساتھ اس کا حوصلہ بھی بڑھایا تھا۔ احسن بھائی اور ان کی فیملی کے آنے سے گھر میں ویسے ہی رونق ہو گئی تھی۔ احسن کا ایک ہی بچہ تھا اور زارا دوسری بار ماں بننے کے مرحلے سے گزر رہی تھی۔ کچھ مہینے کے بعد ہی اس کی ڈلیوری متوقع تھی۔

ماہ رخ' ماں کو سوتا ہوا دیکھ کر چپکے سے کمرے سے باہر چلی آئی۔ زارا بھی اپنے بیٹے کے ساتھ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی۔

ماہ رخ خاموشی سے باہر صحن میں نکل آئی اور چھوٹے سے لان کے ساتھ بنی لوہے کی گول سیڑھی جو اوپر چھت کی طرف جاتی تھی۔ وہ کچھ سیڑھیاں چڑھ کر' اوپر والی سیڑھیوں پہ بیٹھ گئی۔ جہاں سے گھر کی دیوار سے باہر سڑک صاف نظر آتی تھی۔ یہاں بیٹھنے کی اصل وجہ سامنے والے گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے بچے تھے۔ ماہ رخ کا دل بہت اداس تھا اور آنکھیں نم تھیں۔ انوشے کو دیکھے' اس سے ملے دس مہینے سے بھی اوپر ہو چکے تھے۔

انوشے کی پانچویں سالگرہ بھی اس دوران گزر چکی تھی۔ اور اب وہ اسکول بھی جانے لگی تھی۔ مگر اس پہلے قدم پہ' اس اہم مرحلے پہ ماہ رخ اپنی بیٹی کے ساتھ نہیں تھی۔ انوشے اور احسن بھائی کے بیٹے میں سوا سال کا فرق تھا۔ انوشے ساڑھے پانچ کی اور وہ پونے سات سال کا تھا۔

اچانک ماہ رخ نے گھر کے سامنے ایک گاڑی رکتی ہوئی دیکھی۔ گاڑی سے نکلنے والی ایک عورت اور بچی کو دیکھ کر ماہ رخ چونک گئی۔ اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ بے اختیار وہ تیزی سے اٹھی اور تیز رفتاری سے سیڑھیاں پھلانگتی گیٹ کے پاس پہنچی اور فوراً گیٹ کھول کر دوڑتی ہوئی بلیو فراک میں ملبوس بچی کو گلے لگا لیا۔

"میری انوشے' میری جان! میری آنکھیں ترس گئی تھیں تمہیں دیکھنے کے لیے۔" ماہ رخ بے اختیار'

دیوانہ وار کبھی انوشے کا چہرہ چوم رہی تھی۔ کبھی اس کے ہاتھ انوشے بھی ماں سے لپٹ کر بے اختیار رو پڑی تھی۔

"چھوٹی بی بی! یہ انوشے کا سامان ہے۔ انوشے بی بی کو اسکول سے پندرہ دن کی چھٹیاں ہیں اور صاحب نے کہا ہے کہ یہ آپ کے ساتھ گزاریں گی۔ میرے لیے جو آپ حکم کریں میں انوشے بی بی کے ساتھ رکوں یا واپس چلی جاؤں۔"

رحیمہ بی بی نے مودب لہجے میں کہا۔

"نہیں رحیمہ بی بی آپ واپس جائیں۔ انوشے کی دیکھ بھال میں کرلوں گی۔" ماہ رخ نے خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ کہا اور انوشے کا ہاتھ تھام کر اندر جاتے ہوئے کچھ یاد آنے پہ رک کر بولی۔

"اور ہاں اپنے صاحب کا شکریہ ادا کرنا۔ جو حق بھی احسان کرکے ادا کرتے ہیں۔"

ماہ رخ کے لبوں پہ بہت آزردہ سی مسکراہٹ تھی۔ رحیمہ بی بی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور مڑ کر واپس چلی گئی۔ ماہ رخ انوشے کا ہاتھ تھامے اندر آئی تو لاؤنج میں احسن بھائی اور زارا دونوں ہی موجود تھے۔ انوشے کو دیکھ کر وہ دونوں بھی حیرت زدہ رہ گئے۔ ماہ رخ نے انہیں ساری بات تفصیل سے بتادی۔

اسی وقت اندر والے کمرے سے وہ باہر نکل کر آیا تو زارا چونک گئی۔ وہ بھی نئی صورت کو بہت حیران نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

ڈیڈ! یہ کون ہے؟" اس نے باپ کی گود میں بیٹھی لڑکی کی طرف اشارہ کرکے پوچھا تھا۔

"ادھر آؤ۔" احسن نے بیٹے کو پاس بلاتے ہوئے کہا۔

"یہ ہماری پری" ہے اور اپنی مما کی انوشے!"

احسن نے پیار سے بھانجی کو چومتے ہوئے کہا۔ انوشے کو پہلے دن سے ہی ننھیال میں سب پری کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ سوا چھ سالہ عمر نے بہت غور سے اس خوب صورت سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ پریوں والی کوئی بات اسے اس لڑکی میں نظر نہیں آئی تھی، سوائے اس کے کہ وہ بھی بہت خوب صورت تھی جیسی کہ پریاں ہوتی ہیں۔ مگر ڈیڈ نے کہا تھا تو وہ پھر پری ہی تھی۔

"ڈیڈ! کیا یہ پری میری بھی ہے؟ مگر یہ تو مجھ سے بات نہیں کررہی ہے اور نہ ہی دوستی!"

عمر نے تنقیدی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے باپ سے شکوہ کیا تو سب ہنس پڑے تھے۔

"ہم آپ کی دوستی کروادیتے ہیں!" احسن نے ہنستے ہوئے کہا اور دونوں بچوں کو ہاتھ ملانے کو کہا۔ دونوں بچوں نے ہاتھ ملا کر دوستی کی تھی۔ اور پھر کھیلنے میں مگن ہوگئے تھے۔ مگر آنے والے وقت نے ثابت کیا تھا کہ دونوں کے ہاتھوں کا ملنا وقتی نہیں تھا۔ بلکہ ہمیشہ کے ساتھ کے لیے تھا۔

☆ ☆ ☆

انوشے نے ایک نظر عمر کے مضبوط مردانہ ہاتھ پہ ڈالی اور آہستگی سے اپنا ہاتھ کھینچ کر گود میں رکھ لیا۔ اس کے چہرے پہ حیا کی لالی تھی۔ پلکیں لرز رہی تھیں۔ وہ جو سوچ کر آئی تھی کہ عمر کو دو ٹوک الفاظ میں سمجھا کر' ہر رشتہ' ہر ناطہ ختم کردے گی۔ اب اس کے سامنے آتے ہی سارے الفاظ جیسے کہیں کھو سے گئے تھے۔ دل عجیب لے پہ دھڑک رہا تھا۔ یہ وہ ہی عمر تھا جس کو وہ اپنے بچپن سے جانتی اور دیکھتی آئی تھی۔ جو اس کا بہترین دوست بھی تھا اور ہمدرد کزن بھی اور آج وہ اس کے سامنے خاموش بت بنی بیٹھی ہوئی تھی۔

عمر وارفتگی سے اسے دیکھے جارہا تھا۔ پچھلے کتنے ہی مہینوں کی چھائی تھکن اور تکلیف کہیں گم ہو کر رہ گئے تھے۔ اگر کچھ تھا تو سامنے وہ... اور صرف وہ...!

وہ نہیں جانتا کہ اسے انوشے سے محبت کب اور کیسے ہوئی تھی کہ وہ محبت خون کے ہر قطرے میں رچ بس گئی تھی۔ انوشے شاید محبت کے اس مقام تک نہیں آئی تھی اس لیے تو بہت آرام سے بچھڑنے کی باتیں کر بھی لیتی تھی مگر عمر کے لیے یہ تصور کرنا بھی محال تھا کہ وہ زندگی جیسے اور اس میں انوشے نہ ہو!

جب خاموشی کا وقفہ طویل تر ہونے لگا تو عمر گہری

سانس لیتا کرسی سے پشت سے ٹیک لگا لگا کر گویا ہوا۔

میرے چارہ گر.....!
تیری چپ کھلے کہ
ہوا کو اذن سفر ملے
میرے زخم کھل کے گلاب ہوں
یہ جو سانس سانس ہیں وحشتیں
یہ سراب و خواب کی منزلیں
یہ دیے کی لو سی جو آس ہے
تیرا حکم ہو.....
تو یہ جل بجھے!
مجھے عشق کا یہ صلہ ملے
تیرے ہاتھ روح کی گرہ کھلے!
یہ بدن کے قید سے ہو رہا
تیرا یہ کرم.....!
میرے کیمیا.....
نہ سوال ہوں'
نہ جواب ہوں
کسی طور ختم عذاب ہوں.....!!

"عمر! میں....." انوشے نے لب کاٹتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

"نہیں انوشے! جھوٹ مت بولنا.... میں اتنی دور کا سفر طے کر کے تمہارے پاس اس لیے آیا ہوں کہ تمہاری زبان سے وہ سچ سن سکوں جو ہزاروں مجبوریوں اور مصلحتوں کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ مجھ سے جھوٹ مت بولنا! میں سب کچھ داؤ پہ لگا چکا ہوں اس بازی میں!"

عمر نے میز پہ آگے کی طرف جھکتے ہوئے انوشے کے چہرے کی طرف دیکھا تھا جو حیران اور پریشان نظروں سے اپنے سامنے بیٹھے عمر کو دیکھ رہی تھی۔

"میں بابا جان کا مان نہیں توڑ سکتی' جو انہیں مجھ پر ہے!" انوشے نے کانپتی آواز میں اعتراف کیا تھا۔

"مان قائم رکھنے کے لیے' رشتے بھی نہیں توڑے جاتے ہیں انوشے عمر!"

عمر نے سنجیدگی کے ساتھ کہتے ہوئے اسے اپنے اور اس کے درمیان موجود رشتے کی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔ انوشے نے خوفزدہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"بابا جان کبھی بھی نہیں مانیں گے!" انوشے نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا تھا۔

"تم ثابت قدم رہو! سب مان جائیں گے!" عمر نے حل پیش کرتے ہوئے کہا۔ تو انوشے الجھن میں گھری نفی میں سر ہلانے لگی اور ایک دم سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"انوشے!" عمر نے پیچھے سے پکارا تھا۔ وہ رک گئی مگر مڑ کر نہیں دیکھا تھا۔ اسے اپنے پتھر ہو جانے کا خوف تھا۔

"میں بابا جان سے ملنے آؤں گا بہت جلد میرا انتظار کرنا۔" عمر کی سنجیدہ آواز سنائی دی تھی۔ انوشے نے بھاگتے قدموں سے ریسٹورنٹ کا دروازہ پار کیا تھا۔ اسی دن سے تو وہ خوفزدہ تھی جو آج اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اس کی زندگی کے دو سب سے اہم اور عزیز از جان رشتے' ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے دونوں کے بغیر زندگی گزارنے کا کوئی تصور نہیں تھا اس کے پاس۔

پچھلے کتنے مہینوں سے وہ خود سے لڑی تھی۔ بے تحاشا۔ مگر پھر بھی ہار اس کا نصیب ہی بنی تھی۔ اگر بات محبت کی ہوتی تو شاید وہ اس سے منہ موڑ بھی لیتی۔ مگر وہ عمر کے ساتھ ایک مضبوط رشتے میں بندھی ہوئی تھی۔ جس سے چاہ کر بھی وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی تو بابا جان کو اپنا منتظر پایا تھا۔ وہ لاؤنج میں ادھر سے ادھر تیزی سے چکر کاٹ رہے تھے۔ ان کے چہرے کے تاثرات بہت پتھریلے تھے۔ ماتھے کی رگیں تنی ہوئی تھیں۔ انوشے کو اندر آتا دیکھ کر وہ رک گئے تھے۔ انوشے نے اپنی الجھن میں دھیان ہی نہیں دیا اور سلام کر کے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی جب بابا جان کی سرد آواز گونجی تھی۔

"کون تھا وہ؟" اپنی پشت پہ ابھرتی آواز پہ انوشے ٹھٹک کر رکی تھی اور پلٹ کر بابا جان کے چہرے کی طرف دیکھا تو سہم گئی۔

"ک..... کون بابا جان!" انوشے نے ہکلاتے ہوئے پوچھا تھا۔ تو اچانک بابا جان کا ہاتھ اٹھا تھا اور انوشے کے منہ پہ پڑا۔ انوشے اپنے ہی دھیان میں کھڑی پاس پڑے صوفے سے ٹکرا گئی تھی۔

"وہی جس کے ہاتھوں میں تمہارا ہاتھ تھا! جس کے ساتھ ریسٹورنٹ کے الگ تھلگ گوشے میں بیٹھے ہوئے تمہیں اپنے باپ کی عزت کا کوئی خیال نہیں رہا تھا۔ انوشے! میری تربیت یہ تو نہیں تھی کہ میری بیٹی کسی نامحرم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑکوں پہ پارکوں میں بیٹھتی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم میرا مان ہو۔ اگر تمہاری کوئی پسند تھی تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا تھا، بولو جواب دو!"

بابا جان نے غصے سے دھاڑتے ہوئے صوفے کے کنارے پہ ٹکی 'حیرت و صدمے سے' زرد چہرے کے ساتھ بیٹھی انوشے سے پوچھا تھا۔ جس کے لیے تھپڑ سے زیادہ باپ کے منہ سے نکلے لفظ تکلیف دہ تھے۔ آج اسے سمجھ آئی تھی کہ کئی سال پہلے اس کی ماں پہ کیا گزری ہوگی جو اس نے گھر چھوڑنے جیسا بڑا فیصلہ کر لیا تھا۔

"بابا جان! ہمیشہ کی طرح آپ آج بھی اپنی ہی نظر سے دیکھ اور سوچ رہے ہیں! عمر میرا ماموں زاد ہے۔ احسن ماموں کا بیٹا! اور..... اور..... مما کی آخری خواہش پہ ان کے سامنے میرا اور عمر کا نکاح ہو چکا ہے۔ میں آپ کے مان اور خوف کی وجہ سے ہی اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی تھی، مگر....."

انوشے دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی جبکہ بابا جان اپنی جگہ ساکت رہ گئے تھے۔ انوشے کی اداسی، پریشانی کی اصل وجہ یہ تھی اور وہ اسے کچھ اور سمجھ رہے ہے۔

"میں آپ کو بتانا چاہتی تھی۔ بہت بار کوشش کی، مگر میری ہمت، میرا حوصلہ آپ کے سامنے آتے ہی ختم ہو جاتا تھا۔ مجھے اپنی محبت سے جدائی منظور تھی، مما کی آخری خواہش سے منہ موڑنا بھی منظور تھا مگر بابا جان میں آپ کو کھونے کا یا دکھ دینے کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ آپ نہیں جانتے مگر پچھلے ڈیڑھ سال کا عرصہ میں نے روز مرتے اور جیتے ہوئے گزارا ہے۔ آئی ایم سوری بابا جان! میں سچ میں آپ کی اچھی بیٹی نہیں ہوں۔ جو آپ کا مان نہیں رکھ سکی۔"

انوشے نے بلک بلک کر روتے ہوئے کہا اور بابا جان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ بابا جان کچھ دیر تو اسے دیکھتے رہے پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتے اپنے کمرے میں چلے گئے۔

پیچھے انوشے بری طرح روتی رہی تھی۔ مگر اسے چپ کروانے والا یا دلاسا دینے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کی قسمت کہ ہمدان کے علاوہ 'بابا جان نے بھی اسے وہاں دیکھ لیا تھا۔ وہ عمر کا سائیڈ پوز ہی دیکھ سکے تھے۔ اس سے زیادہ کا حوصلہ نہیں تھا۔ اسی لیے غصے سے بھرے وہاں سے پلٹ آئے تھے اور انوشے کی واپسی کا انتظار کرنے لگے تھے۔

انوشے نے کمرے میں آکر دروازہ بند کیا اور بیڈ پہ بیٹھ کر نمبر ملانے لگی۔

"ہیلو عمر.....!" انوشے نے بھیگی آواز میں پکارا تھا۔ انوشے نہیں چاہتی تھی کہ بابا جان کا غصہ ٹھنڈے ہونے سے پہلے عمر ان سے ملنے آئے۔ ساری بات سننے کے بعد عمر نے اسے تسلی دی تھی اور بابا جان کا غصہ ٹھنڈا ہونے تک انتظار کرنے کو کہا تھا تاکہ وہ سکون سے اس پہلو پہ سوچ سکیں۔

☆ ☆ ☆

انوشے کے آنے سے گھر بھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ماہ رخ نے اتنے مہینوں کے بعد خوشی کا ذائقہ محسوس کیا تھا۔ انوشے کے پاس ہونے سے زندگی خوب صورت لگنے لگی تھی۔ ام کلثوم کی حالت بھی بہتری کی طرف تھی۔ عمر اور انوشے میں بہت اچھی دوستی ہو چکی تھی۔ عمر بھی ماہ رخ کے پیچھے پھوپھو کرتے پھرتا تھا۔ اور انوشے بھی ماں سے لگی رہتی تھی۔

"امی جان کیا سوچ رہی ہیں۔ ڈاکٹر نے آپ کو مکمل طور پر پرسکون رہنے کا کہا ہے۔" احسن نے ماں کے

قدموں میں بیٹھتے ہوئے کہا اور نیم دراز لیٹی ہوئی ام کلثوم کے پاؤں دبانے لگا۔

"نہیں بیٹا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس ایسے ہی ماہ رخ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ کتنی اداس اور چپ چپ سی رہتی تھی اور جس دن سے انوشے آئی ہے۔ ماہ رخ کا چہرہ کھل اٹھا ہے۔ اس کے لبوں کی ہنسی واپس لوٹ آئی ہے۔ مگر کب تک؟ کچھ دنوں بعد انوشے واپس چلی جائے گی۔ پھر ماہ رخ اکیلی رہ جائے گی۔"

ام کلثوم نے اپنے دل کا حال بیٹے کے سامنے عیاں کرتے ہوئے کہا تھا۔

"ہوں! امی جان میں نے ماہ رخ سے بہت بار کہا تھا کہ انوشے کی کسٹڈی کے لیے میں وکیل سے بات کرتا ہوں۔ مگر وہ نہیں مانتی کہ اس نے اپنی رضا و خوشی سے انوشے کو جہانگیر کو سونپا ہے۔ جتنی اچھی تربیت اور حفاظت جہانگیر کر سکتا ہے اپنی بیٹی کی وہ اکیلے نہیں کر سکتی۔"

احسن نے بہت بار دہرائی اپنی اور ماہ رخ کی بحث سے ماں کو آگاہ کیا تھا۔

"ہاں! میری بھی بات ہوئی تھی اس بارے میں!"

ام کلثوم نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

"امی میں سوچ رہا ہوں کہ ماہ رخ کی دوسری شادی کر دیتے ہیں۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ میری نظر میں ایک دو رشتے ہیں۔ اگر آپ کہیں تو ان سے بات کروں؟"

احسن نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو ام کلثوم خاموش نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئیں۔

"میں ماں ہوں میرے دل کی بھی یہ شدید خواہش ہے کہ ماہ رخ کو پھر سے آباد دیکھوں۔ مگر وہ نہیں مانے گی! میں نے ایک دو بار دبے لفظوں میں یہ بات کرنی چاہی تھی مگر اس کا ردعمل بہت شدید اور سخت تھا۔ اس وقت میں نے خاموشی ہی بھلی سمجھی!"

ام کلثوم نے گہری سانس لے کر کہا۔ یہ سب باتیں ہی تو انہیں اندر سے بہت کمزور کرتی جا رہی تھیں۔

کچھ دیر کمرے میں مکمل خاموشی رہی۔ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے رہے۔ پھر اس خاموشی کو ام کلثوم کی نحیف آواز نے توڑا۔

"احسن! میرے بعد تم اس گھر کے بڑے ہو! میرے بیٹے وعدہ کرو مجھ سے کہ تم ہر ذمہ داری کو اچھے طریقے سے نبھاؤ گے۔ سب کو جوڑ کر رکھو گے اور خاص کر۔۔۔ میری ماہ رخ کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑو گے! اللہ کے بعد میں اسے تمہارے حوالے کرتی ہوں۔ میری بچی بہت سادہ اور معصوم ہے۔ اسے دنیا کی بھیڑ میں کھونے مت دینا تم نہیں جانتے اس کی فکر مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔"

ام کلثوم نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ان کا سانس پھولنے لگا تھا۔ کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے۔ احسن گھبرا کر اٹھا اور فوراً" انہیں پانی پلایا اور ان کا ہاتھ تھام کر تسلی دیتے ہوئے بولا۔

"امی جان! میں وعدہ کرتا ہوں۔ ماہ رخ کو کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ آپ بس ریلیکس رہیں۔ زیادہ مت سوچیں اللہ مالک ہے سب کا۔"

احسن نے کہا تو ام کلثوم سکون بھرا سانس لیتی ہوئی مسکرا دی تھیں۔ اس کے ٹھیک ایک ہفتے بعد ام کلثوم فجر کی نماز پڑھ کر تسبیح پڑھتے ہوئے۔ دل کا دورہ پڑنے سے وفات پا گئی تھیں۔

احسن جس کی دو دن بعد کی فلائٹ تھی واپس کینیڈا جانے کی۔ اسے کینسل کروانی پڑی۔ جنید کے آنے کی وجہ سے میت کو ایک رات کے لیے سرد خانے میں رکھا گیا تھا۔ اور جنید کے آتے ہی نماز جنازہ کے بعد تدفین کر دی گئی تھی۔ مریم کو ڈاکٹرز نے سفر کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اس لیے وہ نہیں آسکی تھی۔ جنید بھی تین دن بعد ' ہزار وعدے کیے اور ماہ رخ کو تسلی دے کر واپس چلا گیا تھا۔

ماہ رخ صدمے سے نڈھال تھی۔ انوشے کو جہانگیر ابھی لینے نہیں آیا تھا۔ ام کلثوم کے انتقال کی خبر اس تک بھی پہنچ گئی تھی۔ شاید اس لیے اس نے انوشے کو 'مزید کچھ دن ماہ رخ کے ساتھ رہنے دیا تھا۔ گھر مہمانوں

سے بھرا ہوا تھا۔ لوگوں کا آنا جانا لگا ہوا تھا اور بھاگ بھاگ کر کام کرتی، سب کو پوچھتی، زارا کا پیر سلپ ہو گیا۔ اسے فوراً" اسپتال لے جایا گیا۔ خوش قسمتی سے بچہ محفوظ رہا، مگر ڈاکٹرز نے سختی سے بیڈ ریسٹ کرنے کی ہدایت کی اور سفر کرنے سے منع کر دیا۔ یوں مجبوراً" ڈلیوری تک زارا کو پاکستان میں ہی قیام کرنا تھا۔ احسن کو اس میں اللہ کی بہتری لگی۔ یوں بھی ماہ رخ کو فی الحال اکیلا چھوڑنا یا ساتھ لے جانا ممکن نہیں تھا۔ احسن کو یہ کچھ مہینے غنیمت لگے اور وہ ماہ رخ کے ویزے کے لیے کوشش تیز کر دی۔

غم سے نڈھال ماہ رخ کے لیے ماں کی جدائی کا صدمہ بہت بڑا اور اگر ایسے میں انوشے نہ ہوتی تو شاید وہ غم سے اپنے حواس کھو بیٹھتی۔

اسکول میں پہلے ہی انوشے کی بہت چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ اسی لیے مجبوراً" اسے واپس جانا پڑا، مگر ہر ویک اینڈ پہ جہانگیر باقاعدگی سے اسے بھیج دیتا تھا۔ ماہ رخ کبھی کبھی بہت حیران ہوتی تھی کہ بغیر کچھ کہے، سنے وہ انوشے کو ماہ رخ کے پاس بھیجنے لگا تھا۔ ان دنوں ہی گرمیوں کی چھٹیاں آگئیں اور جہانگیر، انوشے کو ماہ رخ کے پاس چھوڑ کر کام کے سلسلے میں دبئی چلا گیا تھا۔

زارا کی ڈلیوری میں بہت تھوڑا وقت باقی رہ گیا تھا۔ احسن کی آمد بھی کچھ دنوں تک متوقع تھی۔ عمر اور انوشے میں وقت کے ساتھ ساتھ دوستی پروان چڑھتی جارہی تھی۔ دونوں کا وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزرتا تھا۔ ان ہی دوڑتے بھاگتے دنوں میں خوشی کے لمحات آئے اور آکر ٹھہر گئے۔ ننھے شہرام کی آمد سے غم زدہ فضا میں خوب صورت قلقاریاں گونجنے لگی تھی۔ احسن بھی پاکستان آچکا تھا۔ ماہ رخ کا ویزا بھی لگ گیا تھا۔ اب بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی، ماہ رخ کے کینیڈا شفٹ ہونے میں۔ مگر ماہ رخ، انوشے کی وجہ سے پاکستان چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ دوسری طرف احسن بھی اپنی بات اور وعدے پہ قائم تھا کہ ماہ رخ کو اکیلا نہیں چھوڑے گا۔

مگر فی الحال تو سب مسئلے مسائل کو بھلا کر سب شہرام میں مگن تھے۔ شہرام کا عقیقہ بھی ساتویں دن کر دیا گیا۔ اس موقع پہ سب نے ہی ام کلثوم کی کمی کو شدت سے محسوس کیا تھا۔ شہرام کی پیدائش کے ایک مہینے بعد جنید اور مریم کے یہاں دو جڑواں بیٹیوں کی پیدائش ہوئی۔ دونوں بچیاں ہی بہت خوب صورت اور صحت مند تھیں۔ جنید نے ان کی تصویریں بھیجی تھیں۔ سب ہی بہت خوش تھے۔ جلد ہی احسن اور زارا کی واپسی ممکن تھی۔ احسن، ماہ رخ سے دوٹوک بات کرنا چاہتا تھا۔

"ماہ رخ! کیا سوچ رہی ہو؟" احسن نے برآمدے کی سیڑھیوں پہ ماہ رخ کو بیٹھے دیکھا تو اس کے پاس ہی بیٹھتا ہوا دھیرے سے اس کا سر ہلا کر پوچھا۔ ماہ رخ گرمیوں کی ڈھلتی شام میں عمر اور انوشے کو ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دیکھ رہی تھی۔ چونک گئی اور گردن موڑ کر بھائی کا چہرہ دیکھا۔ جو اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"کچھ نہیں... بس ایسے ہی انوشے پرسوں واپس چلی جائے گی اور پھر آپ سب بھی... یہ گھر کتنا خالی ہو جائے گا۔" ماہ رخ نے یاسیت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"میں نے سوچ لیا ہے کہ جانے سے پہلے گھر کو رینٹ پہ دے دوں گا۔ میرا بچپن کا دوست ہے آذر، وہ سب کچھ دیکھ لے گا۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

احسن نے اس طرح بات کرتے ہوئے کہا جیسے ماہ رخ اور وہ کافی دیر سے گھر کے معاملے پر ہی بات کر رہے ہوں۔ ماہ رخ نے الجھن بھرے انداز میں احسن کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ احسن نے اس کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کیا اور گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

"دیکھو ماہ رخ! میں نے امی جان سے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں کبھی اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ تمہارے پاس دو راستے ہیں یا تو میرے ساتھ کینیڈا چلو یا پھر..." احسن نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے ماہ رخ کے سوالیہ چہرے

کی طرف دیکھا تھا۔

"یا پھر تم دوسری شادی کے لیے مان جاؤ۔" احسن نے بات مکمل کی تو ماہ رخ نفی میں سر ہلانے لگی۔

"نہیں میں دوسری شادی نہیں کر سکتی۔" ماہ رخ نے بے بسی سے کہا تھا۔ "پھر ٹھیک ہے' تم ہمارے ساتھ چلنے کی تیاری کرو۔ میرا وعدہ ہے تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی میری طرف سے۔"

احسن نے فیصلہ سناتے ہوئے کہا اور ماہ رخ کا جھکا ہوا سر تھپکتا ہوا اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اور یوں ماہ رخ روتی آنکھوں اور دکھی دل کے ساتھ پاکستان کو چھوڑ کر کینیڈا جا بسی۔

انوشے سے اس کا رابطہ فون پہ رہنے لگا۔ پھر نیٹ اور موبائل نے مزید سہولت مہیا کردی۔ ماہ رخ سال میں ایک بار پاکستان ضرور آتی تھی۔ اپنے آبائی گھر میں۔ اور تب انوشے بھی ماں سے ملنے ان کے پاس آجاتی تھی۔ اکثر ماہ رخ اکیلی ہی پاکستان آتی تھی۔ مگر احسن اور عمر بھی ان کے ساتھ بہت بار آئے تھے۔ انوشے کالج کے پہلے سال میں آئی تو ماہ رخ نے اسے چھٹیوں میں اپنے پاس کینیڈا بلالیا۔

انوشے کے پیپرز پہلے سے ہی تیار تھے۔ ویزا بھی لگ چکا تھا۔ ماہ رخ اور انوشے کو یہ ڈر تھا کہ جہانگیر منع نہ کردے۔ مگر انوشے کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب بابا جان نے تھوڑے تامل کے بعد اسے کینیڈا جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ان دنوں احسن پاکستان آیا ہوا تھا۔ تو انوشے ان کے ساتھ پہلی بار کینیڈا گئی تھی۔ پھر ہر سال گرمیوں کی چھٹیوں میں ایسا ہی ہونے لگا تھا اور جب انوشے ڈیڑھ سال پہلے آخری بار کینیڈا گئی تو ایک جان لیوا انکشاف اس کا منتظر تھا۔ جس نے اس کے وجود کی دیواروں کو ہلا کر رکھ دیا تھا اور اس سے وہ فیصلہ ہو گیا جس کا تصور اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

انوشے کو کتنی دیر ہو گئی تھی اس سرد رات میں لان میں ادھر سے ادھر چکر لگاتے ہوئے۔ مغرب کے وقت ہمدان کو گھر میں آتا دیکھ کر' امید کی ایک نئی کرن چمکی تھی۔ مگر ہمدان اسے نظر انداز کرتا ہوا بابا جان کے کمرے میں چلا گیا تھا۔ بابا جان کل شام سے کمرہ بند کیے بیٹھے ہوئے تھے۔ کھانا بھی اپنے کمرے میں منگوا رہے تھے۔ آج صبح آفس بھی نہیں گئے تھے۔ انوشے نے بہت بار ان کے کمرے کے دروازے تک جا کر واپس پلٹ آئی تھی۔

مختلف سوچوں میں گھرے وہ خاموشی سے اندر چلی آئی اور اپنی نگرانی میں چائے کی ٹرالی سیٹ کرکے اندر بھجوادی۔

ہمدان کے ساتھ نہ جانے کون سی باتیں تھیں جو ختم ہونے میں نہیں آرہی تھیں۔ انوشے جلے پیر کی بلی کی طرح اندر سے باہر پھر رہی تھی۔ جب اس نے ہمدان کو بابا جان کے کمرے سے نکلتے ہوئے دیکھا' اس سے پہلے کہ انوشے اسے پکارتی وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا ہوا جانے لگا۔ انوشے بھی اس کے پیچھے لپکی تھی۔

"ہمدان! میری بات سنو پلیز۔" انوشے نے تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اس کے سامنے آتے ہوئے کہا۔ انوشے کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ ہمدان اسے سامنے دیکھ کر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔

"تم میرے ساتھ ایسا کیوں کر رہے ہو؟" انوشے نے روہانسی لہجے میں پوچھا تھا۔

"تم! جو چاہو کرو وہ جائز ہے؟ تم جسے چاہے' جیسے چاہو استعمال کرو' وہ سب جائز ہے؟ تم اپنوں کو آسانی سے بے وقوف بنالو' وہ سب جائز ہے اور تم......

انوشے بابا جان کو تم پہ بہت یقین اور اعتماد تھا اور اسی یقین اور اعتماد کے تحت بابا جان نے کبھی تم پر کوئی پابندی نہیں لگائی تھی۔ حتیٰ کہ اکیلے کینیڈا آنے اور جانے پر بھی۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟ بابا جان کے ساتھ ساتھ تم نے ہم سب کو بھی شدید دھچکا پہنچایا ہے۔ شادی ہونا یا نہ ہونا ایک الگ بات تھی' مگر ہم دوست پہلے تھے کیا تمہیں نہیں لگتا تم نے یہ سب چھپا کر اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے ساتھ بھی زیادتی

کی ہے۔" ہمدان نے اپنے سامنے بیٹھی گم صم سی انوشے کو دیکھا تھا۔ جس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔

"ہمدان تم جانتے ہو زندگی میں سب سے آسان کام کیا ہے؟" اس نے بھیگی آواز میں پوچھا تھا مگر جواب کا انتظار کیے بغیر گویا ہوئی۔

"دوسروں پہ تنقید کرنا انہیں یہ بتانا کہ تم نے آج تک جو کیا غلط کیا' مگر بھی خود کو اس کی جگہ رکھ کر یہ نہیں سوچتے ہم لوگ کہ اگر کسی نے ایسا کچھ کیا تو کیوں کیا؟" انوشے کے کہنے پہ ہمدان نے "تو نہہ" کہہ کر سر جھکا کا تھا۔ جیسے وہ انوشے کی بات سے متفق ہو۔

"میں پانچ سال کی بھی نہیں ہوئی تھی جب میرے ماں' باپ میں علیحدگی ہوگئی۔ میرے ضدی اور انا پرست باپ نے میری ماں کو قصور نہ ہوتے ہوئے بھی طلاق دے دی اور کیا تم تصور کر سکتے ہو کہ ایک بچہ جو اپنی ماں کے ساتھ زیادہ وقت گزارتا ہو اور ایک دن اچانک صبح اٹھتے ہی اسے پتا چلے کہ اس کی ماں اس کے پاس نہیں ہے۔ خادموں کے ہجوم میں ہر چہرے میں اپنی ماں کو ڈھونڈتی اس بچی کی اذیت جان سکتے ہو تم؟ آپ کے اردگرد ہزاروں چہرے ہوں صرف ایک اس چہرے کو چھوڑ کر جس سے آپ کی زندگی بندھی ہو اور ایک دن اس بچی کے بہت رونے اور بلکنے پہ اس کے باپ نے سختی سے ڈانٹا تھا کہ وہ بچی سہم گئی اور دوبارہ کبھی سرعام رونے یا ضد کرنے کے بجائے راتوں کو کمبل یا تکیے میں سر دے کر رو لیتی تھی۔ ڈر تو اسے شروع سے ہی اپنے سخت گیر باپ سے لگتا تھا اور اس دن کے بعد سے اس بچی کے لبوں پہ قفل مگر ننھے سے ذہن میں لاکھوں سوالات تھے۔ جن کے جوابات رحیمہ بی بی بھی نہیں دے سکتی تھیں سوائے اس کے کہ.....

"اب تمہاری ماں کبھی اس گھر میں دوبارہ نہیں آسکتی ہیں۔" انوشے کے لہجے میں بچپن کی محرومی اور اذیت بہت نمایاں تھی۔ ہمدان نے دکھ بھری نظروں سے 'اس بکھری بکھری سی لڑکی کو دیکھا تھا۔ جس نے آج تک کبھی اپنی کسی محرومی پہ بات نہیں کی تھی اور آج.....

"ان ہی دوڑتے بھاگتے دنوں میں' میرا اسکول میں داخلہ ہوگیا۔ اسکول کا پہلا دن تھا اور رحیمہ بی بی میرے ساتھ گئی تھیں۔ بابا جان بہت مصروف تھے اور ویسے بھی ان کے نزدیک ایسی باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان کے نزدیک اولاد سے محبت یہ ہی تھی کہ اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا جائے۔

اسکول میں بچوں کو ان کی ماؤں کے ساتھ دیکھ کر' اس لمحے اس پانچ سال کی بچی کو اپنی بدقسمتی پہ بہت رونا آیا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں خشک تھیں' مگر اس کے اندر بہتے آنسو آج بھی اس لمحے کی بدنصیبی پہ گرتے ہیں۔ کبھی خشک نہیں ہوتے اور اس کے بعد بھی ایسے کتنے لمحے اور لاتعداد پل ہیں جب اس بچی نے ماں کی کمی' اس کے لمس کو محسوس نہیں کیا تھا۔ بابا جان کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ وہ دیکھتے ان کی انوشے کس تنہائی اور کرب سے گزر رہی ہے۔" انوشے نے ماضی کی سڑکوں پہ چلتے ہوئے کہا تھا۔

"پھر نہ جانے وقت کو کیسے رحم آگیا اور ایک دن رحیمہ بی بی نے میرا بیگ پیک کرتے ہوئے بتایا کہ وہ مجھے میری ماں سے ملوانے لے جارہی ہیں۔ کتنے ہی لمحے مجھے یقین ہی نہیں آیا تھا۔ سارا راستہ خوشی اور حیرانی میں کٹا تھا اور جب دس مہینوں کے بعد میں نے اپنی ماں کو دیکھا تو میرے کب کے رکے آنسو آنکھوں سے بہنے لگے تھے۔ میری ماں مجھے بے تحاشا چوم رہی تھیں۔ کبھی میرے چہرے کو' کبھی میرے ہاتھوں کو اور میں روتے روتے بھی بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی۔ وہاں سب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ نانو کے گھر میں جو محبت اور اپنائیت اور گرم جوشی کی فضا تھی۔ اسے میں آج تک بھی نہیں بھولی ہوں۔ پھر میری دوستی احسن ماموں کے بڑے بیٹے عمر سے ہوگئی۔ جو مجھ سے ایک سال ہی بڑا تھا' مگر میرا خیال اس طرح رکھتا تھا۔ جیسے میں ننھی بچی ہوں اور وہ مجھ سے کئی سال بڑا ہے۔ دن بہت خوشی اور اطمینان سے گزر رہے تھے۔ مما نانو کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھیں' مگر میرے آنے سے ان کے چہرے پہ

رونق آگئی تھی۔ مما جب بھی فارغ ہوتیں‘ ہم ڈھیروں باتیں کرتے۔ مما مجھے بہت کچھ سمجھاتی تھیں اور ان کی ہر بات کا لب ولباب یہ ہی ہوتا تھا کہ.....

”تمہیں اچھی بیٹی بن کر اپنے بابا جان کا کہنا ماننا ہے‘ ان کا خیال رکھنا ہے۔.... اور میں سمجھ داری سے سرہلا دیتی اور مما کی کہی ہر بات کو گرہ سے باندھ لیتی تھی۔ ان ہی دنوں نانو کا انتقال ہوگیا۔ مما کی قسمت عجیب تھی‘ ایک خوشی ملتی تھی اور ساتھ ہی ایک غم تیار رہتا تھا۔ مما کے لیے صدمہ بہت بڑا تھا۔ بابا جان نے نانو کے انتقال کا سن کر مجھے مما کے پاس مزید کچھ دن اور رہنے دیا۔ مگر کب تک آخر ایک دن مجھے واپس آنا ہی تھا اور پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہا۔ تب قسمت نے پھر پلٹا کھایا اور مما کو مجبوراً”احسن ماموں کے ساتھ کینیڈا جانا پڑا۔ ہر ویک اینڈ پہ ملنے والا سلسلہ ختم ہوگیا تھا‘ مگر مما ہر سال میری گرمیوں کی چھٹیوں میں پاکستان ضرور آتی تھیں اور وہ تین مہینے میں اور مما ساتھ گزارتے تھے۔ کبھی مما اکیلی آتی تھیں۔ کبھی احسن ماموں ساتھ ہوتے تھے۔ پھر جب میں کالج میں آئی تو مما نے مجھے کینیڈا بلایا پہلی بار‘ مجھے بہت ڈر تھا کہ بابا جان منع کردیں گے‘ مگر حیرت انگیز طور پر انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی تھی اور یوں میں پہلی بار احسن ماموں کے ساتھ کینیڈا گئی اور پہلی بار ہی میں نے جانا کہ گھر کسے کہتے ہیں؟“

انوشے کی نظروں دور کہیں بھٹک رہی تھیں جیسے وہ اپنے گزرے کل کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہو۔ اس کے ہونٹوں پہ مدھم سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ ہمدان بہت غور و توجہ سے اس ان کہی داستان جیسی لڑکی کو سن رہا تھا جو اتنا عرصہ خاموش رہی تھی اور آج جب بولی تو رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔

”احسن ماموں کینیڈا میں ویل سیٹلڈ تھے۔ ان کا وہ خوب صورت گھر اور اس گھر کی محبت بھری فضا میں سانس لینا مجھے بہت انوکھا اور اچھا لگ رہا تھا۔ احسن ماموں اور زارا ممانی کی نوک جھونک‘ وارفتگی ایک دوسرے کا خیال رکھنا‘ ایک دوسرے کو عزت و محبت سے دیکھنا اور پکارنا‘ بار بار میری توجہ کھینچتا تھا۔ عمر سے میں کافی عرصے کے بعد ملی تھی۔ اس میں بہت تبدیلی آچکی تھی۔ میری جھجک بہت واضح تھی۔ مگر عمر کا رویہ میرے ساتھ ایسا ہی تھا جیسے ہم آج بھی بچپن کی سرحد پہ کھڑے ہیں اور اس کے اسی دوستانہ رویے کی وجہ سے ہم پھر سے جلد گھل مل گئے۔ شہرام کی معصوم اور بچکانہ حرکتیں سارے گھر میں قہقہے بکھیر دیتی تھیں۔ شہرام مجھے پری جی کہتا تھا۔ ان سب کے لیے میں پری ہی تھی۔ مما وہاں بہت خوش تھیں۔ میں جتنا وقت وہاں گزارتی تھی‘ وہ اس انوشے سے مختلف ہوتا تھا جو یہاں ہوتی تھی۔

مما..... میں عمر‘ شہرام کبھی کبھی احسن ماموں اور ممانی بھی ہم مل کر مختلف گیمز کھیلتے‘ گھومنے پھرنے جاتے‘ کچھ اور نہیں تو ویسے ہی سڑکوں پہ واک کرنے نکل جاتے۔ مل کر موویز دیکھتے کتنے ہی خوب صورت اور یادگار پل میں اپنی مٹھی میں جگنوؤں کی طرح قید کرکے لے آتی تھی اور یہاں کے جامد سناٹے اور تنہائی میں ان لمحوں کے جگنو ——— ہر طرف چمک کر روشنی کردیتے تھے۔ بابا جان اکثر جب کبھی فارغ ہوتے تو ہم آتش دان کے پاس بیٹھ کر بہت سی باتیں کرتے تھے۔ اس گھر کے جامد سناٹے اور تنہائی سے گھبرا کر میں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ گھر میں شور ڈالے رکھتی تھی۔ کچھ اور نہیں تو علشبہ کو اکثر اپنے پاس بلا لیتی۔ دونوں پھوپھو میں سے کوئی نہ کوئی رہنے آجاتا۔ تم آجاتے تھے۔ سب کچھ ٹھیک جارہا تھا‘ پھر زندگی میں ایک ایسا موڑ آیا کہ سب کچھ بدل کر رہ گیا۔“

انوشے نے تھک کر گہری سانس لی تھی اور ہمدان کو ساتھ لیے ماضی کے اس وقت میں پہنچ گئی جس نے زندگی کا مفہوم ہی بدل کر رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

”عمر! مما نہیں آئیں مجھے لینے۔“ انوشے نے ایر پورٹ سے باہر نکلتے ہی فوراً” عمر سے سوال کیا تھا جو اس کا سامان گاڑی میں رکھ رہا تھا۔ شدید برف باری

ہو رہی تھی۔ انوشے کو روئی کے گالوں سی گرتی برف بہت پسند تھی۔ ابھی بھی سردی سی کانپتی' وہ کار کا دروازہ کھول کر جلدی سے بیٹھ گئی تھی۔ اتنے سالوں میں یہ پہلی بار ہوا تھا کہ مما اسے لینے ایرپورٹ نہ آئی ہوں۔ اسی لیے انوشے نے عمر سے پہلا سوال مما کی غیر حاضری کا کیا تھا۔

"ابھی گھر جا ہی رہی ہو نا' مل لینا پھوپھو سے۔" عمر نے سرسری سا کہا۔ انوشے کو وہ کچھ پریشان اور اداس لگا تھا۔ سارا راستہ عمر نے ادھر ادھر کی معمولی باتیں کرتا رہا۔ جیسے اپنا ذہن بٹانا چاہ رہا ہو۔

"گھر میں تو کوئی بھی نہیں ہے۔ سب کہاں گئے ہوئے ہیں۔"

انوشے گھر پہنچتے ہی فوراً" بھاگ کر اندر گئی تھی۔ مگر گھر کا مین ڈور لاک تھا۔ جسے عمر نے آگے بڑھ کر کھولا تھا اور اس کا بیگ اٹھا کر اندر لایا۔ انوشے نے الجھن بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔ جو لاؤنج کے صوفے پہ بیٹھا کار کی چابی ہاتھ میں گھماتا کسی گہری سوچ میں تھا۔

انوشے کا دل کسی انہونی کے احساس سے دھڑکنے لگا تھا۔ وہ عمر کے پاس ہی صوفے پہ ٹکتے ہوئے دھیرے سے پوچھنے لگی۔

"عمر! کیا ہوا؟ سب ٹھیک تو ہے نا؟" انوشے نے کسی خدشے کے تحت پوچھا تھا۔ تو عمر گہری سانس لیتا ہوا اپنے خیالوں سے باہر آیا۔ اور انوشے کی طرف دیکھنے لگا۔ جس کے چہرے پہ وہی ڈر اور خوف تھا جو بچپن میں ماں سے جدا ہوتے وقت ہوتا تھا۔ یہ ڈر' یہ خوف دور کرنے ہی تو وہ اس کے دوستوں میں شامل ہوا تھا۔ اور شاید دوستی کے رشتے سے بھی کچھ زیادہ! مگر کیا۔۔؟ ابھی یہ واضح نہیں تھا۔

"انوشے تمہیں میری بات کو بہت صبر اور تحمل سے سننا ہوگا۔"

عمر نے تمہید باندھتے ہوئے کہا۔ تو انوشے حیران نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔ عمر نے ہمیشہ اسے "پری" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ یہاں پہ سب اسے پری ہی کہتے تھے اور آج جب عمر نے اس کا نام لیا تو انوشے کو بہت عجیب لگا تھا۔

"کیا ہوا عمر؟ سب ٹھیک تو ہے میرا دل بہت گھبرا رہا ہے جیسے کوئی انہونی ہونے والی ہے! مما کہاں ہیں اور گھر کے باقی لوگ۔"

انوشے نے بے تابی سے سوال کیا تو عمر اسے دیکھ کر رہ گیا تھا۔

"انوشے! پھوپھو اسپتال میں ایڈمٹ ہیں!" عمر نے آہستگی سے کہا تو انوشے خوفزدہ سی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا مما کو! بتاؤ عمر میرا دل بند ہو جائے گا۔" انوشے نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا تھا مگر اس کا رنگ اڑ چکا تھا۔ اور ہاتھوں میں واضح لرزش تھی عمر نے دھیرے سے اس کا نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر جیسے حوصلہ دینا چاہا۔

"انوشے! ماہ رخ پھوپھو کو بلڈ کینسر ہے۔ اور آخری اسٹیج پر ہے۔ پچھلے کچھ عرصے سے وہ اسی وجہ سے تم سے بات نہیں کر رہی تھیں یا تمہارے سامنے آنے سے گریز کر رہی تھیں کیونکہ وہ اس موذی مرض سے لڑ رہی تھیں اور۔۔۔۔"

عمر نے اتنا ہی کہا تھا کہ انوشے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ اسے ایسے لگ رہا تھا جیسے اس کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ عمر لب بھینچے اسے روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

"مما اتنی اذیت' اتنی تکلیف میں تھیں اور مجھے کسی نے بتانا ضروری ہی نہیں سمجھا۔"

انوشے غم و غصے سے پھٹ پڑی تھی۔ پھوپھو کو جب پتا چلا کینسر اپنی آخری اسٹیج پہ تھا۔ ڈاکٹرز زیادہ پر امید نہیں تھے۔ پھوپھو تمہیں اس لیے نہیں بتانا چاہتی تھیں کیونکہ تمہارا فائنل ایئر تھا۔ اگر تمہیں پتا چلتا تو تم سب کچھ چھوڑ کر چلی آتیں۔ وہ تمہارے فارغ ہونے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ تمہیں خود آنے کو کہتی تم نے پہلے ہی اپنے آنے کے بارے میں بتا دیا تھا۔"

عمر نے آہستہ آہستہ کر کے اسے تفصیل سے آگاہ کیا تھا۔

"میں غیر نہیں ہوں ان کی بیٹی ہوں اور میرے لیے میری ماں کی زندگی اور محبت سے آگے کچھ بھی نہیں ہے۔ اس مشکل وقت میں انہیں میری ضرورت تھی۔ مگر کسی نے مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔"

انوشے نے روتے ہوئے اپنا سر عمر کے کندھے پر رکھ دیا تھا۔ کیسا عجیب رشتہ تھا نا کہ جس سے شکوہ کر رہی تھی۔ آنسوؤں بہانے کے لیے سہارا ابھی اسی کندھے کا لیا ہوا تھا۔ عمر نے خود کو ان آنسوؤں میں بہتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

"پھوپھو کی حالت پچھلے ایک ہفتے سے بہت خراب ہے۔ وہ دوائیوں کے زیر اثر مسلسل بے ہوشی کی حالت میں ہیں۔ سب گھر والے بھی وہاں ہی ہیں میں تمہیں فوراً" وہاں لے جا کر کوئی صدمہ نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ پھوپھو کے سامنے خود کو مضبوط ظاہر کرنا۔ ان کے سامنے ایسا کرو گی تو انہیں بہت تکلیف پہنچے گی۔"

عمر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔ تو انوشے اس سے الگ ہوتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"چلیں!" انوشے نے اپنا بھیگا چہرہ دوسری طرف کرتے ہوئے سوال کیا۔ اس کے منہ پھیرنے سے عمر سمجھ گیا تھا کہ وہ ابھی بھی ناراض ہے۔ عمر گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسپتال تک کا راستہ بہت خاموشی سے کٹا تھا۔ مگر عمر جانتا تھا کہ وہ سارا راستہ روتی ہوئی آئی ہے۔ انوشے اسپتال پہنچی تو وہاں اس نے احسن ماموں، ممانی جان اور شہرام کو بھی موجود پایا تھا۔ انوشے حسن ماموں کے گلے لگ کر سسک پڑی ان کی آنکھیں بھی ضبط سے سرخ ہونے لگی تھیں، اپنے سینے سے لگائے، اس کا سر تھپکتے وہ خاموش کھڑے تھے۔ اسی وقت زارا ممانی نے آگے بڑھ کر اسے ان سے الگ کیا۔ ماموں، عمر کو لیے باہر چلے گئے۔ ان کے لیے مزید یہ رکنا مشکل ہو رہا تھا۔

"صبر کرو پری بیٹا! اللہ کی مرضی اسی میں تھی ہم انسان مجبور ہے اس کے حکم کے آگے!"

زارا ممانی نے ویٹنگ روم میں بیٹھے اسے خود سے لگائے تسلی دی تھی۔

"میں مما کو دیکھ سکتی ہوں؟" انوشے نے آنسو پونچھتے ہوئے سوال کیا تھا۔ تو زارا ممانی سہلاتی اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتی اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔ انوشے نے اسپتال کے بستر پہ لیٹے وجود کو دیکھا تو اس کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ وہ منہ پہ ہاتھ رکھے۔ اپنی چیخوں کو روکنے لگی تھی۔ سامنے لیٹا ڈھانچہ، اس کی ماں کیسے ہو سکتی تھی! اس کی ماں تو زندگی کے سب خوب صورت رنگوں سے بنی، حسین تصویر تھیں۔ ماہ رخ کی خوب صورتی، ڈھلتی عمر میں بھی اپنی مثال آپ تھی۔ اور سامنے مشینوں کے سہارے سانس لیتا وجود تو اس کی ماں کا سایہ بھی نہیں لگ رہا تھا۔ انوشے چپ چاپ کھڑی ان کے قدموں کے پاس روتی رہی۔ پھر آگے بڑھی اور ان کا نحیف ہاتھ اٹھا کر لبوں سے لگا لیا۔ نیم بے ہوشی کی حالت میں بھی ماہ رخ نے اس کے لمس کو محسوس کر لیا تھا۔ جن سے دل کے رشتے جڑے ہوں وہ عالم بے ہوشی میں بھی اسی طرح محسوس ہوتے ہیں جیسے ہوش و خرد میں!

"انوشے، میری جان! میری پری!" ماہ رخ کے لبوں سے سرسراتی آواز نکلی تھی۔ انوشے نے چونک کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ زارا ممانی اسے وہاں چھوڑ کر جا چکی تھیں۔ عمر کب اس کے پیچھے آ کھڑا ہوا تھا اسے خبر ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ انوشے بے تابانہ ماں کی طرف لپکتی، عمر نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اسے سمجھایا تھا۔ انوشے ایک دم سنبھلی۔ اس وقت تک ماہ رخ آنکھیں کھول چکی تھی۔

"انوشے!" ماہ رخ کی مردہ ہوتی آنکھوں میں زندگی لہرائی تھی اسے سامنے کھڑا دیکھ کر۔

"مما! میں اب آ گئی ہوں نا دیکھنا آپ جلدی سے ٹھیک ہو جائیں گی۔" انوشے نے مضبوط بنتے ہوئے آگے ہو کر ماں کا ماتھا چوما تھا۔

"شکر ہے ان آنکھوں کی جوت بجھنے سے پہلے تمہیں دیکھ لیا میں نے! محسوس کرلیا! تمہارے لمس کو اپنے اندر جذب کرلیا۔"

ماہ رخ نے نحیف آواز میں بمشکل جملہ مکمل کیا تھا۔ ماں کی بات سن کر انوشے کا ضبط ٹوٹ سا گیا وہ بے ساختہ رو پڑی۔

"انوشے۔" ماہ رخ نے اسے روتے دیکھا تو بے ساختہ تڑپ اٹھیں۔ اور اٹھنے کی ناکام کوشش کرنے لگیں۔ انوشے کو روتے دیکھنا' ان کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔ اسی وقت پاس کھڑا عمر آگے بڑھا اور انوشے کو چپ کروانے لگا۔ ماہ رخ ایک دم سے ٹھٹک گئی۔ بظاہر بہت عام سا منظر تھا مگر اس میں کچھ خاص ضرور تھا! اس عام سے منظر کو دیکھتی' ان کی سوچ ایک خاص رنگ بھرنے لگی! کتنی خواہش اور چاہ ہوتی تھی ان کی کہ جہانگیر بھی کبھی اسی محبت اور چاہت سے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھتا۔ عمر کے چہرے پہ اذیت کی واضح لکیر تھی جو انوشے کو اس طرح سے روتے دیکھ کر اس کے چہرے پہ ابھری تھی۔ انوشے نے اپنا سر عمر کے کندھے سے لگا دیا تھا۔ ماہ رخ کی بنجر ہوتی سماعتوں سے جانفزا جیسا فقرہ ٹکرایا تھا۔

"انوشے پلیز سنبھالو خود کو! تمہارے آنسو مجھے تکلیف دے رہے ہیں۔"

اگر ایک مرد کسی عورت سے کہے کہ "تمہاری آنکھ سے بہتے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں!" تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مرد' اس عورت کو دل کی سچائیوں سے چاہتا اور عزت دیتا ہے اور زندگی میں دانستہ طور پر تو کبھی بھی اسے دکھ یا تکلیف پہنچانے کا' سوچ بھی نہیں سکتا اور اگر زندگی میں ساتھ چلنے والا اہم سفر اتنا مہربان مل جائے تو زندگی اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ بھی خوب صورت اور مہربان لگتی ہے۔

ماہ رخ کے کمزور چہرے پہ نرم سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی انوشے کی آئندہ زندگی کو لے کر جو اندیشے اور خوف اسے ستاتے رہتے تھے وہ آج ایک دم ختم ہی ہو گئے تھے۔

ماہ رخ نے اشارے سے عمر کو پاس بلایا۔ عمر "جی پھوپھو" کہتا ہوا ماہ رخ پہ جھک کر بات سننے لگا اور ان کی بات سن کر سر ہلاتا باہر نکل گیا۔ کچھ دیر میں اس کی واپسی اپنے باپ کے ساتھ ہوئی۔ ماہ رخ نے انہیں ہی بلانے کو کہا تھا' دونوں بہن بھائی کو اکیلا چھوڑ کر عمر اور انوشے باہر نکل گئے۔ احسن ماموں کے بلانے پہ زارا ممانی بھی اندر چلی گئیں۔ کچھ دیر کے بعد دونوں باہر آئے تو ان کے چہرے خوشی اور جوش سے تمتما رہے تھے احسن ماموں نے پیار سے انوشے کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا اور زارا ممانی نے اس کی پیشانی چوم کر گلے سے لگا لیا تھا۔ انوشے نے ناسمجھی سے ان کی طرف دیکھا تھا' مگر احسن ماموں نے اسے اور عمر کو ماہ رخ کے پاس جانے کا کہا' انوشے الجھتی ہوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔ ماہ رخ کے چہرے پہ اطمینان اور خوشی واضح دیکھی اور محسوس کی جاسکتی تھی۔

ان کے ایک طرف انوشے اور دوسری طرف عمر کھڑا ہو گیا تھا۔ ماہ رخ نے انوشے کا نازک ہاتھ اپنے کمزور ہاتھ میں لے کر دبایا اور دوسرے ہاتھ سے عمر کا مضبوط ہاتھ پکڑ کر انوشے کا ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔ دونوں نے چونک کر پہلے ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔ پھر طمانیت سے مسکراتی ماہ رخ کے طرف جس نے انوشے کی حیران نظروں میں دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا تھا جبکہ عمر کو اس لمحے ایسا لگا تھا جیسے یک دم ہی وہ مالا مال ہو گیا تھا۔ اسے دنیا کا سب سے قیمتی اور نایاب خزانہ مل گیا تھا۔ اس لمحے عمر کو احساس ہوا کہ اس کے لیے انوشے کیا تھی؟ اور اس کا مل جانا' س کی زندگی جیسا تھا۔

"مما!" انوشے کے لب حیرت کی شدت سے ملے تھے۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں حیرانی ٹھہر گئی تھی' مگر جب اس نے ماہ رخ کی مردہ ہوتی آنکھوں میں زندگی کی امید کی روشنی دیکھی تو دنگ رہ گئی۔ امید کے خواب کے یہ روشن جگنو نے ماہ رخ کی آنکھوں سے سفر کیا اور انوشے کی آنکھوں سے ہوتے دل کے شہر میں جگمگانے لگے۔ انوشے نے ایک نظر سامنے کھڑے عمر

پہ ڈالی جو بہت وارفتگی سے اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ عمر کی نظروں کے بدلتے انداز سے گھبرا کر انوشے نے نظریں جھکالی تھیں۔ اسی شام قریبی مسجد میں ان کا نکاح ہو گیا تھا۔ ماہ رخ کی حالت میں یک دم ہی بہت تبدیلی آئی تھی۔ اس کے کمزور اور زرد چہرے پر زندگی کی امید نظر آنے لگی تھی۔ مگر انوشے بہت چپ چپ اور پریشان نظر آئی تھی۔

"انوشے! میری جان! کیا تم میرے فیصلے سے خوش نہیں ہو؟" ماہ رخ نے اپنے بیڈ کے پاس کھڑی انوشے کا ہاتھ اپنے کمزور ہاتھ میں لیتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں مما! ایسی بات نہیں مگر...." انوشے نے ماں کو تسلی دی تھی۔

"تین دن ہو گئے ہیں تمہارے نکاح کو ہوئے اور ان تین دنوں میں تم مجھے خوش نظر نہیں آئیں۔" ماہ رخ نے استفسار کیا۔

"مما! مجھے آپ کی پسند پہ پورا یقین اور اعتبار ہے، مگر مما! جب بابا جان کو پتا چلے گا تو؟" انوشے نے دل میں پنپتے خوف کو زبان دیتے ہوئے کہا۔ تو ماہ رخ اس کا ہاتھ تھپتھپا کر بولی تھیں۔

"ہوں! میں سمجھتی ہوں، مگر تم پریشان مت ہو میں بات کروں گی تمہارے بابا جان سے اور تمہاری رخصتی پوری شان و شوکت سے، ان کی دعاؤں کے سائے میں ہی ہوگی۔"

ماہ رخ نے بیٹی کو دلاسا دیا تھا۔ وقتی طور پر ہی سہی انوشے بہل گئی تھی اور اس بات کے ٹھیک دو دن بعد ماہ رخ کا انتقال ہو گیا تھا۔ انوشے نے روتے ہوئے بابا جان کو فون پر اطلاع دی تھی۔ انوشے کے لیے یہ بہت دکھ اور بہت بڑا صدمہ تھا جس سے سنبھلنے اور نکالنے میں احسن ماموں سمیت ان کے گھر کے ہر فرد نے بہت ساتھ دیا تھا اور یہاں سے ہی اس نے عمر کی محبت، وارفتگی، فکر مندی کے نئے انداز دیکھے تھے اور جب دو مہینے کے بعد انوشے کینیڈا سے لوٹی تو یکسر بدل چکی تھی۔ ایک نئے رشتے میں بندھنے کے باوجود وہ اسے قبول کرنے سے ڈر رہی تھی کیوں کہ اس نئے رشتے

کے لیے اسے اپنے عزیز از جان بابا جان کو کھونا پڑتا اور یہ اسے منظور نہیں تھا، مگر عمر کی "محبت" سے انکار بھی اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا وہ بھی تب جب وہ خود بھی اپنے دل کو اسی لے پر دھڑکتا محسوس کرتی تھی۔

بڑے سے لاؤنج میں اب مکمل سناٹا تھا جس میں کبھی کبھی انوشے کی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ ہمدان کی آنکھیں بھی نم ہو چکی تھیں۔ اس کے پاس وہ لفظ نہیں تھے جس کے ذریعے وہ انوشے کے بچپن کی محرومی، تنہائی اور اکیلے پن کا مداوا کر سکے۔ ہمدان نے ہمیشہ اپنی ماں کے منہ سے ماہ رخ کے لیے بہت اچھے کلمات سنے تھے وہ بچپن سے سنتا آرہا تھا کہ جہانگیر ماموں بہت اکھڑ اور ضدی تھے، مگر ہمدان کو وہ صرف اصول پسند اور سنجیدہ لگتے تھے، مگر آج انوشے کی نظر سے دیکھا تو اسے احساس ہوا کہ جہانگیر ماموں کی انا، خود سری اور ضد نے کتنی زندگیوں کو تباہ کر دیا تھا۔ ہمدان نے گہری سانس لی اور سر جھکائے انوشے کو دیکھ کر اٹھتے بولا۔

"کاش انوشے میں تمہارے دکھ کا مداوا کر سکتا یا تمہیں خوشی دے سکتا، مگر خیر!" ہمدان نے اٹھتے ہوئے کہا اور داخلی دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے جب اس نے اپنی پشت پہ انوشے کی آواز سنی تھی۔

"تم مجھے خوشی دے سکتے ہو ہمدان!" ہمدان نے مڑ کر انوشے کی طرف دیکھا تھا جو اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"ہمدان زندگی میں جب محبت ہمارے دروازے پہ دستک دیتی ہے تو ہم اپنی کوتاہ نظری، کم فہمی یا اپنی ضد اور انا میں اسے نظر انداز کر دیتے ہیں اور اس کا احساس تب ہوتا ہے جب زندگی صحرا کی مانند بن جاتی ہے اور ہم آبلہ پا چلتے، خاک اڑاتے کسی محبت بھری ٹھنڈی چھاؤں کو ترستے ہیں۔"

انوشے نے کچھ دیر کا وقفہ لیا تو ہمدان الجھن بھرے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ میں سمجھا نہیں۔" ہمدان نے پوچھا تھا۔

"ہمدان جو غلطی آج سے کئی سال پہلے بابا جان نے

کی تھی سچی محبت اور مخلص رفیق کو ٹھکرا کر' وہ تم مت کرنا۔ علشبہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔ بہت مخلص اور حساس ہے تمہارے لیے اس کی محبت کی قدر کرنا اور اسے سنبھال لینا ضروری نہیں کہ تمہیں زندگی بار بار یہ موقع دے گی۔ سچے اور خالص لوگ ہیرے کی مانند ہوتے ہیں جنہیں حاصل کرنے کی تمنا سب کی ہوتی ہے اور ویسے بھی مما کہتی تھیں کہ جو مرد عورت کے آنکھوں سے بہتے آنسوؤں پہ تڑپ جائے وہ عورت اس مرد کے لیے بہت خاص ہوتی ہے جسے اپنی زندگی میں دانستہ طور پر تو وہ کبھی دکھ نہیں دے گا اور علشبہ کی آنکھوں میں آنسو تم کبھی نہیں دیکھ سکتے ہو۔"

انوشے نے اسے بیتی ہوئی ایک رات کا حوالہ دیا تھا جب علشبہ کو روتے ہوئے دیکھ کر ہمدان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ ہمدان نے خاموشی سے انوشے کو دیکھا تھا پھر ایک نرم سے مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ پھیل گئی تھی۔ ہمدان نے اثبات میں سر ہلایا اور چلا گیا۔ انوشے نے آسودگی سے گہری سانس لے کر صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بابا جان تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ گئے تھے۔ ہمدان اور انوشے نہیں جانتے تھے کہ بابا جان بھی سب سن چکے تھے۔ بابا جان کمرے میں آئے تو ان کا فون بج رہا تھا۔ اسکرین پہ جگمگاتا نمبر دیکھ کر ان کی تیوری چڑھ گئی تھی۔

"ہیلو...!" بابا جان کی بارعب آواز میں سرد مہری کا عنصر واضح تھا۔

"بس کر دو جہانگیر! کب تک تم اپنی ضد اور انا کے لیے دوسروں کے دل اجاڑتے رہو گے۔" دوسری طرف سے احسن نے غصے سے کہا تھا۔ عمر کے ذریعے انہیں اطلاع مل چکی تھی کہ بابا جان انوشے سے سخت ناراض اور خفا ہیں۔ انوشے نے فون کر کے عمر کو اس دن سب بتا دیا تھا اور اس رشتے کو ختم کرنے کے لیے زور دیا تھا۔ تب ہی عمر نے باپ کو فون کر کے فوراً پاکستان آنے کو کہا تھا تاکہ وہ بابا جان سے بات کر کے مسئلے کا حل نکال سکیں۔

"کیا چاہتے ہو تم؟" بابا جان نے اسی سنجیدگی سے پوچھا تھا۔

"سنو جہانگیر! تم نے اپنی ضد اور تنگ نظری کی وجہ سے میری بہن کی زندگی تو خراب کر دی تھی میں اس وقت بھی مجبور تھا کیوں کہ ماہ رخ ایسا نہیں چاہتی تھی کہ تمہیں کچھ بھی کہا جائے' مگر میں تمہیں تاریخ کو دہرانے نہیں دوں گا۔ تمہاری وجہ سے انوشے نے اپنی ماں کی آخری خواہش اور دل کی خوشی کو پس پشت ڈال کر عمر سے طلاق کا مطالبہ کیا ہے جبکہ وہ دل سے ایسا نہیں چاہتی ہے اور تم کیسے باپ ہو؟ جو اپنی بیٹی کے دل کا حال نہیں سمجھتے ہو؟ اسے دکھ دینا چاہتے ہو! تم کیسے انسان ہو؟ جس پہ کوئی رشتہ' کوئی جذبہ' کوئی لفظ اثر نہیں کرتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کم از کم تم ماہ رخ کی آخری کال کا ہی احترام کر لیتے۔"

احسن نے جتاتے لہجے میں کہا تو بابا جان ایک دم ہی چونک گئے اور ہکلاتے ہوئے بولے۔

"کیا تم جانتے ہو کہ...؟"

"ہاں! اس لیے کہ ماہ رخ نے جب تمہیں کال کی تھی تو میں اس کے پاس ہی تھا' مگر میں نے انوشے سے یا کسی سے بھی اس بات کا ذکر نہیں کیا تھا کہ تمہاری اور ماہ رخ کی بات ہوئی تھی۔"

احسن نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا تو بابا جان نے اپنے ماتھے پہ چمکتا پسینہ صاف کیا تھا وہ آج تک یہی سمجھتے رہے تھے کہ ان کی اور ماہ رخ کی آخری وقت ہوئی گفتگو کے بارے میں کوئی نہیں جانتا ہے۔

"میں پاکستان آ رہا ہوں انوشے کو رخصت کروانے۔"

احسن نے فون بند کرنے سے پہلے کہا تھا۔ بابا جان نے تھکے ہاتھوں سے موبائل سائیڈ ٹیبل پہ رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

عمر بیڈ پہ نیم دراز موبائل کی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھا ہوا تھا۔ اسکرین پہ انوشے کا چہرہ روشن تھا۔ یہ اس دن کی تصویر تھی جس دن دونوں نکاح جیسے مضبوط بندھن میں بندھے تھے۔ اس کی جھکی آنکھیں اور چہرے کی اداسی نہیں حیرانی نمایاں تھی۔ یہ سب تصویریں شہرام نے کھینچی تھیں۔ کچھ تصویروں میں عمر اور انوشے بھی ساتھ ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک تصویر اس دن کی بھی تھی جس دن انوشے اور عمر ریسٹورنٹ میں ملے تھے۔ نک سک سے تیار' کچھ شرمائی اور گھبرائی ہوئی سی' وہ دل میں اتر جانے کی حد تک پیاری لگ رہی تھی۔

پاکستان آنے کے بعد وہ صرف ایک بار ہی انوشے سے مل سکا تھا' مگر فون پہ اس کا رابطہ تھا انوشے سے اور انوشے کی زبانی ہی سب حالات جان کر اس نے اپنے باپ کو فون کرکے ساری صورت حال سے آگاہ کیا تھا جس کے نتیجے میں وہ سب پاکستان آرہے تھے۔ ان کا ارادہ انوشے کو رخصت کروا کر ہی واپس لے کر جانے کا تھا۔ عمر چاہتا تو بہت کچھ کر سکتا تھا' مگر اس کے نزدیک انوشے کی خوشی اور رضامندی بھی ضروری تھی۔ اس دن ملنے پر عمر کو اتنا اندازہ تو ہو گیا تھا کہ محبت کے سفر میں وہ اکیلا نہیں ہے انوشے بھی اس کی ہم قدم ہے' مگر اس کے سامنے تسلیم کرنے سے ہچکچا رہی تھی مگر بچھڑنے یا چھوڑنے کے سوال پر اس کے جملوں میں بے ربطی اور لہجے میں لرزش واضح تھی۔ ایک طرف وہ عمر کو چھوڑنے کی بات بھی کرتی تھی اور دوسری طرف آنسو بہانے' درد سنانے کے لیے بھی اسی کا کندھا درکار ہوتا تھا۔ ایک تصویر میں وہ اپنی گہری سبز ساحر آنکھوں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں کیسا طلسم تھا کہ عمر خود کو مکمل طور پر بے بس اور مجبور پاتا تھا۔ ایک حصار سا اس کے گرد کھینچ دیتی تھیں یہ ساحر آنکھیں۔

میرے ساحر سے کہہ دینا
کہ
اس کے عشق کے طلسم سے'
اب تک وہ نہیں نکلے۔۔۔
کہ
جن کو اس کی آنکھوں نے'
فقط ایک بار دیکھا تھا۔۔۔!

☼ ☼ ☼

"بابا جان!" جہانگیر نے اپنی پشت سے انوشے کی مدھم آواز سنی تو ان کے ہاتھ جہاں تھے وہاں ہی رک گئے تھے۔ بالکل ایسے ہی ان کے اندر اٹھا بھونچال تھم گیا تھا۔ ساکت ہو گیا تھا۔ انوشے کے لہجے میں کرب تھا اس کی پکار میں کیا تھا بابا جان کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا الماری کی پٹ پہ ان کے دونوں ہاتھ جمے ہوئے تھے ان کا سارا وجود کان بن گیا تھا۔ صرف انوشے کی آواز سننے کے لیے! پھر بابا جان نے اپنی پشت پہ انوشے کا لمس محسوس کیا۔ ان کا وجود پتھر سے موم بننے لگا تھا۔ وہ ایسا پتھر تھا جس کی جان جس کی زندگی انوشے میں تھی۔ انوشے نے اپنا سر ان کی پشت سے اٹکا دیا تھا۔

"بابا جان! آپ جانتے ہیں جتنا شور ہم دنیا کو یہ دکھانے کے لیے کرتے ہیں کہ ہم کتنے مضبوط اور بہادر ہیں۔ اس سے کئی زیادہ خاموشی سے ہم ریت کی بھر بھری دیوار کی طرح اندر سے ڈھے جاتے ہیں۔ اور اسی سکوت' بھید بھری خاموشی میں ہم خود سے بچھڑے' زندگی کی شاخ سے ٹوٹے ہر رشتے کی قبر پہ' برسوں یادوں کے کتنے ہی دیے جلاتے ہیں' مگر پھر بھی ہمارے اندر کی تنہائی' اندھیرا' اکیلا پن ختم نہیں ہوتا ہے۔"
انوشے کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو ان کی پشت کو گیلا کر رہے تھے۔ جہانگیر علی کی سنگلاخ پتھر جیسی آنکھوں میں بھی نمی پھیلنے لگی تھی۔ ان کی انا' غرور کے بت میں پہلے ہی دراڑیں پڑ چکی تھیں یہ ان کی آخری کوشش تھی خود کو مضبوط ثابت کرنے کی' مگر وہ بھول گئے تھے اس بار ان کے سامنے ان کی "محبت"

نہیں بلکہ ان کی "زندگی" کھڑی ہوئی تھی۔ بہت سال پہلے کسی کی "محبت" سے تو بظاہر منکر بن گئے تھے 'مگر سانس کے چلتے ہوئے "زندگی" سے انکار کیسے ممکن تھا۔

"بابا جان آپ جانتے ہیں نا کہ مما نے ہمیشہ آپ سے اور صرف آپ سے محبت کی تھی۔ اپنی زندگی کی آخری سانس تک تب ہی انہوں نے دوسری شادی کے لیے کبھی ہامی نہیں بھری تھی۔"

انوشے کی سرگوشی تھی یا صور اسرافیل! ان کا سارا وجود زلزلوں کی زد میں آچکا تھا۔ ان کا بنایا مضبوط پتھر کا بت پاش پاش ہوچکا تھا۔

"اور بابا جان! آپ بھی تو ان سے اتنی ہی محبت کرتے تھے 'مگر خود سے 'اعتراف کرنے سے کتراتے رہے ہمیشہ..... مگر محبت کب لفظوں کے سہاروں کی محتاج ہے۔ جب جب میں مما کا ذکر کرتی تھی یا کوئی ان کا نام لیتا تھا آپ کے چہرے کی چمک' آنکھوں میں بڑھتا اشتیاق اور درد آپ کے دل کا ترجمان تھا۔ محبت نے تب آپ پہ اپنا آپ ظاہر کیا جب آپ اسے ہمیشہ کے لیے کھو چکے تھے۔"

انوشے کے الفاظ ایسے تازیانے تھے جن سے ان کے زخم ادھڑنے لگے تھے۔ انوشے کیسے ان کے دل کے سب رازوں کو جان چکی تھی جس کا اعتراف کبھی انہوں نے خود سے بھی نہیں کیا تھا۔ بابا جان کے الماری کے پٹ پہ رکھے ہاتھوں کی گرفت اتنا سخت ہوئی کہ رگیں ابھر آئی تھیں۔ ہونٹوں کو سختی سے بھینچے انہوں نے آنکھیں بند کرلی تھیں 'مگر یہ ان کے کڑے ضبط کو ظاہر کررہے تھے ان کی حالت سے بے خبر انوشے بول رہی تھی۔

"پہلے مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آئی تھی 'مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے دیکھا' جانچا کہ آپ دونوں ایک دوسرے سے دور ہونے کے باوجود' ایک دوسرے سے الگ ہوجانے کے باوجود' کبھی ایک دوسرے کے خلاف نہیں بولتے تھے۔ مما ہمیشہ آپ کے اچھے پہلو پہ بات کرتی تھیں اور آپ ہمیشہ مجھے کہتے تھے کہ مجھے بھی اپنی مما کی طرح بننا ہے۔ آپ دونوں کی باتوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت اور احساس ہوتا تھا۔ مما کے پاس جاتی تو وہ بہت دلچسپی اور اشتیاق سے آپ کی باتیں سنتیں' مجھے آپ کی پسند ناپسند کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتیں۔ ان کی اس سے بڑی قربانی یا محبت کی مثال کیا ہوگی کہ حق رکھتے ہوئے بھی مما نے میری کسٹڈی کے لیے کیس دائر نہیں کیا تھا بلکہ اپنی رضا اور خوشی سے مجھے آپ کے حوالے کردیا تھا۔ جانتے ہیں کیوں بابا جان!؟"

انوشے نے ہر راز پر سے پردہ اٹھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"اس لیے کہ وہ آپ سے اتنی شدید محبت کرتی تھیں کہ آپ کو اپنی ہی ضد' تنہائی کے ساتھ تنہا نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ وہ خود نہ سہی 'مگر اپنا عکس میری شکل میں آپ کے لیے چھوڑ گئی تھیں۔"

انوشے کی بات سن کر انہیں ماہ رخ کی حویلی میں وہ آخری رات یاد آئی تھی جب انوشے کو ان کے پاس چھوڑ کر جاتے ہوئے ماہ رخ نے کہا تھا کہ "کچھ سوالوں کے جواب وقت دیتا ہے!" اور وقت نے پھر یہ ثابت کیا تھا کہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی عمر کی سیڑھیاں چڑھتے زینہ بہ زینہ' جہانگیر کو ماہ رخ کی محبت کے ایسے ایسے رنگ نظر آئے کہ دنگ رہ گئے۔ ماہ رخ کتنی مخلص اور عظیم عورت تھی اس کا اندازہ' جہانگیر علی کو تب ہوا جب وہ اسے گنوا چکے تھے۔

انوشے ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔ انوشے کی آنکھوں کے سامنے اپنے والدین کی بے رنگ اور ادھوری زندگی کے کتنے ہی لمحے تھے' پل تھے جو گھوم رہے تھے۔ اس کے رونے کی شدت میں اضافہ ہوگیا تھا۔

"اور بابا جان! آپ نے اپنے اوپر ایک سخت اور بے حس شخص کا خول چڑھالیا' صرف دنیا کو یہ دکھانے اور بتانے کے لیے کہ آپ کتنے مضبوط ہیں' آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا کسی کے آنے یا جانے سے' آپ نے بظاہر مما سے وابستہ ہر چیز' ہر نشانی ہر یاد کو مٹا دیا تھا 'مگر اپنے دل سے کبھی نہ نکال سکے یا آپ سچ میں اپنے دل

سے اتنے انجان رہے ساری عمر! بولیں بابا جان!"
انوشے کے پکارنے پر بھی جب کوئی جواب نہیں آیا تو انوشے نے اپنا سر اٹھایا اور اپنی نم آنکھوں کو صاف کرتی مضبوط لہجے میں بولی۔
"بابا جان! مما نے میرا اور عمر کا نکاح اس مان اور یقین سے کروایا تھا کہ میری رخصتی آپ کی دعاؤں کے سائے میں ہی ہوگی۔ یہ ان کا آپ پر یقین اور اعتماد تھا' اگر یہ سب ان کا وہم تھا تو آپ حکم کریں میں ہمیشہ کے لیے عمر سے ہر تعلق ختم کردوں گی' مگر میں آپ کو اس طرح تکلیف میں اور ٹوٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔"
انوشے نے امید بھری نظروں سے بابا جان کو دیکھا تھا' مگر ان کی طرف سے ہنوز خاموشی پا کر انوشے کے لبوں پہ افسردہ مسکراہٹ پھیل گئی۔
"آپ کی خاموشی ثابت کررہی ہے کہ مما کا یقین غلط نہیں تھا۔ وہ آپ کو آپ سے بہتر جانتی تھیں مگر...."
انوشے نے گہری سانس لی اور واپسی کے لیے مڑ گئی۔ دروازے کی طرف جاتی اس کی نظر نیچے قالین پہ بکھری چیزوں پہ پڑی تو اس کے بڑھتے قدم رک گئے۔
"بابا جان! آپ چیزیں توڑ سکتے ہیں' جلا سکتے ہیں' آپ ہر نشانی مٹا سکتے ہیں' مگر آپ "یادیں" نہیں مٹا سکتے ہیں۔ اگر یقین نہ آئے تو ذرا اپنے دل میں جھانک کر دیکھ لیں۔"
انوشے نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ بری طرح روتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔
اس کے جاتے ہی بت بنے بابا جان' بھر بھری مٹی کی طرح نیچے بیٹھتے گئے۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ ٹوٹ رہے تھے' بکھر رہے تھے اور انہیں سمیٹنے والا کوئی نہیں تھا اور یہ انتخاب انہوں نے زندگی میں خود کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شدید دھند کے باعث فلائٹس کی ٹائمنگ تبدیل ہوچکی تھیں' وہ لوگ پچھلے چار گھنٹے سے ایئرپورٹ پہ موجود تھے۔ عمر نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئیں ماما جان اور شہرام کی طرف دیکھا تھا۔ ماما جان شہرام کی کسی بات کا جواب دیتی' مسکرا رہی تھیں۔ عمر نے گردن گھما کر ڈیڈ کو دیکھا۔ اسی وقت انہوں نے بھی عمر کی طرف دیکھا تھا اور اسے دور سے اشارہ کرتے اپنے پاس ہاتھ ہلا کر بلانے لگے۔ عمر اٹھ کر ان کی طرف چل پڑا۔
"پری کافی ڈسٹرب اور اداس ہے۔ تم سنبھالو اسے۔" عمر کے پاس پہنچتے انہوں نے سرگوشی بھرے انداز میں کہا اور عمر کے اثبات میں سر ہلانے پر اس کا کندھا تھپتھپا کر ماما جان اور شہرام کی طرف بڑھ گئے۔
عمر خاموشی سے انوشے کے پاس آکھڑا ہوا۔ جو بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ ایئرپورٹ کے داخلی حصے کی طرف دیکھ رہی تھی۔
"انوشے!" عمر نے پاس آکر نرمی سے پکارا تھا۔ تو انوشے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا۔
"عمر بابا جان....!" انوشے نے سسکی بھری تھی۔
"ڈونٹ وری انوشے! بابا جان ضرور...." اس سے پہلے کہ عمر کی بات مکمل ہوتی اسی وقت' سر پہ کیپ اور لانگ کوٹ پہنے کوئی تیز تیز قدم اٹھاتا ان کے پاس آرکا۔
"بابا جان!" انوشے بے ساختہ خوشی سے چیختی ان کے گلے لگ گئی تھی۔ بابا جان نے انوشے کا ماتھا چوم کر "سدا خوش رہو" کی دعا دی تھی۔ عمر بھی آگے بڑھ کر ان سے ملا تھا۔ بابا جان کو دیکھ کر احسن بھی اٹھ کر آگئے تھے۔ اور مسکرا کر ہاتھ ملا کر حال احوال پوچھنے لگے تھے۔
بابا جان کے چہرے پہ بہت نرم سے مسکراہٹ تھی۔ انوشے ہلکے سے میک اپ اور ہاتھوں پہ لگی پندرہ دن پہلے کی مٹی مٹی سے مہندی کے ساتھ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ نئی زندگی کی خوشیوں اور عمر کی محبت اور ہمراہی کے رنگ بہت واضح تھے۔ بابا جان کا دل اطمینان سے بھر گیا تھا۔ انہیں اپنے فیصلے کی درستی کا یقین ہونے لگا تھا۔
انوشے کی اس دن کی باتوں اور بے تحاشا رونے سے بابا جان کی انا کا بت چکنا چور ہو کر رہ گیا تھا اور اسی لیے

احسن کے بمع فیملی پاکستان آتے اور بابا جان سے ملتے ہی انہوں نے رخصتی کی تاریخ دے دی تھی۔
تھوڑے دن میں بھی ہر کام، ہر تیاری بہت جوش و خروش سے کی گئی تھی۔ علشبہ، انوشے کی دونوں پھوپھیاں، ہمدان اور باقی خاندان کے قریبی لوگ ہر کام میں پیش پیش تھے۔ ہمدان اور علشبہ کی بات بھی طے ہو گئی تھی۔ اس لیے علشبہ کی شوخیاں اور چہکار اپنے عروج پر تھیں۔ انوشے کی شادی روایتی دھوم دھام سے ہوئی۔ دونوں طرف سے کوئی کمی نہیں رکھی گئی تھی اور ماہ رخ کے وعدے کے مطابق ہی انوشے بابا جان کی دعاؤں تلے رخصت ہوئی تھی۔ انوشے کو رخصت کرتے وقت بابا جان نے جانا تھا کہ بیٹی کی جدائی کیا چیز ہوتی ہے اس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔
آج شادی کے پندرہ دن بعد وہ سب واپس کینیڈا جا رہے تھے اور آج ہی صحیح معنوں میں انوشے اور بابا جان ایک دوسرے سے دور ہو رہے تھے جہاں ایک نئی زندگی کے شروع ہونے کی خوشی بھی تھی وہاں بابا جان سے دوری کا دکھ بھی تھا۔ جب تک فلائٹ کی اناؤنسمنٹ نہیں ہوئی انوشے بابا جان کے ساتھ لگ کر کھڑی رہی۔ بابا جان کی فکرمندی میں کتنی ہی ہدایتیں انہیں کرتی رہی تھی۔ جسے بابا جان اور عمر مسکرا کر سنتے رہے۔
"جاؤ میرے بچو! اللہ کی امان میں! زندگی نے وفا کی تو ایک بار تو ضرور اپنی انوشے سے ملنے اس کے گھر آؤں گا۔"
بابا جان نے مسکراتے ہوئے کہا تو انوشے جھینپ گئی۔ یک بار حیا کی لالی اس کے چہرے پر پھیل گئی۔ جسے عمر نے بہت دلچسپی سے دیکھا تھا۔ انوشے جاتے ہوئے بھی بار بار پیچھے مڑ کر بابا جان کو دیکھ رہی تھی۔ جن کے ہونٹوں پہ تو مسکراہٹ، مگر آنکھوں میں نمی تھی۔
کتنا مشکل ہوتا ہے اپنے جگر کے گوشے کو خود سے دور کرنا اور دوسروں کے ہاتھوں میں سونپ دینا، مگر دنیا کی یہ ہی ریت ہے۔ آج بابا جان کو بے اختیار وہ وقت یاد آیا جب وہ ماہ رخ کو میکے جانے نہیں دیتے تھے۔ روکتے ٹوکتے تھے۔ کبھی اس بات کا احساس نہیں کیا تھا کہ ماہ رخ اپنی ماں کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ان کا دل کتنا تڑپتا ہو گا اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے مگر جہانگیر کے مزاج کو دیکھ کر چپ کر جاتی تھیں۔
"ایسا کیوں ہوا ہے کہ کسی کی تکلیف یا دکھ کا احساس تب ہوتا ہے جب ہم خود اس کی کیفیت یا حالات سے گزرتے ہیں۔"
بابا جان شکستہ قدموں سے ایئرپورٹ کی عمارت سے باہر نکلے تھے۔ شدید دھند میں اپنے لانگ کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالے انہوں نے مڑ کر دھند میں جگمگاتی ایئرپورٹ کی لائٹس کو دیکھا تھا۔ ایک افسردہ سی مسکراہٹ نے انہوں کے لبوں کا احاطہ کیا تھا۔
"نظر کی دھند کے پیچھے کہیں گھپ اندھیروں میں ڈوبے، رشتوں کی قبروں پہ، یاد کے کبھی مدھم اور کبھی روشن دیے ایسے ہی ٹمٹماتے ہیں۔ اپنے ہونے کا احساس ہمیشہ دلاتے ہی رہتے ہیں۔ چاہے ہم مانیں یا نہ مانیں، مگر یادیں کبھی مٹتی نہیں ہیں۔"
جہانگیر علی شاہ نے بھی یہ بات اس دن تسلیم کر لی تھی۔ خود سے بھاگنے والے، زیادہ دور نہیں جا سکتے ہیں۔ جہانگیر علی شاہ بھی واپس پلٹ چکے تھے احتساب کے لیے! رشتوں کی قبروں پہ یاد کے روشن دیے جلانے کے لیے۔

ساتھ لاتی ہے ایک ایک منظر
یاد کچھ بھول کے نہیں آتی!

☼ ☼ ☼

اور احتساب کرنے کا عمل اسی دن شروع ہو گیا تھا جس دن مرنے سے دو دن پہلے ماہ رخ نے اسپتال کے بستر پہ لیٹے، جہانگیر علی شاہ کو کال کی تھی۔ یہ بات ان کے اور ماہ رخ کے علاوہ صرف احسن جانتے تھے۔ جو اس وقت ماہ رخ کے پاس ہی موجود تھے۔ جہانگیر علی شاہ کی سماعتوں میں وہ آواز اپنے ہر لفظ کے ساتھ ثبت ہو کر رہ گئی تھی۔

"جہانگیر!" فون سے ابھرتی اس آواز کو اس زبان سے نکلے اپنے نام کو سننے کی چاہ کتنی بار ہی دل کے چور گوشے سے ابھر ابھر کر سامنے آئی تھی اور آج اتنے سالوں بعد جب اس آواز نے پکارا ان کا نام لیا تو جہانگیر علی شاہ کو لگا جیسے ساری کائنات تھم گئی تھی۔

"میں نے ہماری بیٹی کے لیے اس یقین اور اعتماد سے ایک فیصلہ کیا ہے کہ جس یقین اور اعتبار کی وجہ سے میں اسے تمہارے پاس چھوڑ کر چلی آئی تھی! تم جانتے ہو نا وہ "جذبہ" کیا تھا؟" ماہ رخ کی نحیف اور رک رک کر آتی آواز جہانگیر کے دل پہ آرے چلا رہی تھی۔

"جہانگیر میں نہیں چاہتی کہ میری بیٹی کے نصیب میں بھی کوئی ایسا شخص آئے جو نازک احساسات اور جذبات سے قطعی عاری ہو۔ جو اپنی ضد 'انا' خود سری' ہٹ دھرمی کے پیچھے سب تباہ کر دے۔ میں نے ہماری بیٹی کے لیے ایسا شخص چنا ہے جو نازک شیشوں جیسے جذبات کی حفاظت کرنا جانتا ہے اور تم سے بہتر یہ کون جانتا ہو گا کہ ٹوٹے شیشے چننا کتنا مشکل ہوتا ہے نا! اس لیے تو تم کبھی یہ نہ کر سکے! میں نے تم سے تمہاری ہر زیادتی' ہر ظلم کے بدلے کبھی کچھ نہیں مانگا' مگر آج مانگتی ہوں' میری انوشے کو کبھی تنہا مت کرنا اسے وہ سب ضرور دینا جو اس کا حق اور تمہارا فرض ہے۔ میرے کیے گئے فیصلے کی سزا اسے مت دینا!"

یہ آخری الفاظ تھے جو جہانگیر نے سنے اور پھر ان کو سمجھنے کی کوشش میں وہ خود سے الجھنے لگے اور اس سوال کا جواب انہیں تب ملا جس دن انوشے اور عمر کو ریسٹورنٹ میں دیکھ کر وہ انوشے پہ غصے ہوئے تھے اور انوشے کے منہ سے نکلے انکشاف نے انہیں حیران کر دیا تھا اور اس دن جہانگیر کو ماہ رخ کے لفظوں کا مطلب سمجھ آیا تھا' مگر وہی فطری ہٹ دھرمی اور ضد جو ان کے آڑے آ رہی تھی' مگر احسن کی کال اور انوشے کی باتوں نے انہیں جھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔

ماہ رخ ان کی زندگی سے کیا گئی کہ اندر' باہر ایک ویرانی ان کے اندر بس گئی تھی۔ ماہ رخ سے "محبت" کا احساس اتنا شدید تھا کہ وہ کسی دوسری عورت کو اپنی زندگی میں شامل کر ہی نہ سکے۔

روز آجاتا ہے در دل پہ دستک دینے
اک شخص جس کو میں نے کبھی بلایا ہی نہیں!

ایسا ہی ہوا تھا جہانگیر کے ساتھ۔

عمر کے اس آخری حصے میں' وجود کے خالی پن میں اڑتے بکھرے لمحوں کو دیکھنا اور سہنا بہت تکلیف دہ ہوتا ہے' مگر یہ سزا بھی انہوں نے خود چنی تھی اپنے لیے۔۔۔!

زندگی خاک نہ تھی' خاک اڑاتے گزری
تجھ سے کیا کہتے تیرے پاس جو آتے گزری
دن جو گزرا تو کسی یاد کی رو پہ گزرا
شام آئی تو کوئی خواب دکھاتے گزری
رات کیا آئی کہ تنہائی کی سرگوشی میں
ہو کا عالم تھا' مگر سنتے سناتے گزری
بارہا چونک سی جاتی ہے مسافت دل کی
کس کی آواز تھی' یہ کس کو بلاتے گزری!!!

☆ ☆

مصباح علی

اس نے دائیں ہاتھ میں بریانی' بائیں میں چکن قورمے سے بھری پلیٹیں جب کہ دونوں آخری انگلیوں اور ہلیٹوں کی مدد سے ایک چھوٹی پلیٹ کو سہار رکھا تھا جس میں چکن دابو' سلاد بھری تھی' ارے ہاں! انگوٹھوں اور ہلیٹوں کے درمیانی وقفہ میں چند چمچے اڑس رکھے تھے۔ ابھی اس کا دل تھا کہ بغل میں کوئی بوتل گھسادے تاکہ ایک ہی چکر میں نمٹ جاؤں۔

"چلو جب لب شیریں لینے آؤں گی' بوتل بھی لے جاؤں گی۔" اس نے خود پر ترس کھاتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔

مطلوبہ ٹیبل تک وہ عجلت میں جانا چاہتی تھی مبادا نظر نہ لگ جائے مگر سنبھل کر چلنا ازحد ضروری تھا کیوں کہ ذرا سی لاپروائی سے اس کا نفیس پیرہن خراب ہو سکتا تھا۔ ابھی اس نے آدھا فاصلہ طے کیا تھا عقب سے گمبھیر تا آواز ابھری۔

"محترمہ! کیا آپ سرکس میں کام کرتی رہی ہیں؟"

اس نے ذرا کی ذرا گردن موڑی۔

"او۔ اوہ!" اس کی گھرکی سے وہ گھبراتا پیچھے ہٹا تھا۔

"میرا مطلب ہے' اتنا کھانا۔ ؟ آپ کی صحت دیکھ کر اندازہ تو نہیں ہوتا۔" اس کے تختی سے بھینچے ہونٹ' کینہ توز نگاہوں نے مزید کچھ کہنے سے باز ہی رکھا اور اتنے میں ہی سارا توازن بگڑ گیا۔ دابو کی ڈھیری بلی' بکھرے ٹماٹروں کے قتلوں پر پھسلے اور پھڑ پھڑ بوٹیاں سلاد سمیت گرنے لگیں۔ اس کا جی چاہا کھینچ کر بائی دو پلیٹیں بھی اس ندیدے کے منہ پر دے مارے۔ وہ جب بھی اس قدر اچانک لینڈنگ سے گھبراتا شرمندہ سا "سوری سوری" کرتا چند قدم پیچھے ہٹا۔ زوئلہ نے بے بسی سے پہلے گرتی بوٹیوں کو دیکھا پھر دور بیٹھی خوش گپیوں میں مصروف آپا اور بھابھی کو۔

"ان موٹی بھینسوں کو' اس حال میں بھی چین نہیں' کم بختوں کی وجہ سے کتنی بے عزتی ہو گئی۔" اس کا دل دہائی دے رہا تھا۔ حقیقتاً" وہ کبھی بھی کھانے کی فراہمی کے لیے نہ اٹھتی اگر ان دونوں کی حالت پر ترس نہ آتا۔ غالباً" بھابھی جان خیر سے اور ہی حال سے تھیں' مشہور کمپنیاں ہر سال پروڈکٹ کے نئے ماڈل انٹرڈیوس کرواتی ہیں اور بھابھی بچے۔ آپا۔ آپا جان اس کام سے تو فارغ ہو گئی تھیں' مگر زیادہ پروڈکشن سے احاطہ ویسا ہی رہ گیا تھا اکثر گیدرنگ میں خواتین انہیں بیٹھنے کے لیے فوراً" کرسی پیش کر دیتیں بسا اوقات اسپتال میں نرس فوراً" سے اندر لے جاتی تھیں' شاید وقت بہت قریب ہے۔ کچھ خواتین رازدرانہ انداز میں وقت بھی پوچھتیں' غالباً" وہ ہر وقت پورے دنوں سے لگتی تھیں۔ پھر اس طرح کے ڈھول کھانا لینے کے لیے جاتے کیسے لگتے۔ زوئلہ نے ازراہ ہمدردی انہیں کمک پہنچانے کی ذمہ داری لی تھی بلکہ آدھے راستے تک پہنچ بھی گئی تھی' اگر وہ قطب مینار راستے میں نہ ٹوکتا۔ اس نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی لمبی چوڑی پشت کو گھورا اور بچا کھانا لے جا کر ان دونوں کے آگے پٹخا۔

ابھی اس نے پلیٹیں رکھیں ہی تھیں کہ کسی نے پیچھے

سے ہاتھ بڑھا کر کولڈ ڈرنک سلاد‘ ڈابو سے بھری پلیٹیں سامنے رکھ دیں۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور دانت کچکچا کر رہ گئی۔

”یہ توری کے منہ والا ویٹر ہی ہوگا؟ سنورا ہوا ایسے ہے جیسے ان ہی کی شادی ہے۔“ اس نے زبان سے تو نہیں کہا بس مرا سا ”شکریہ“ کہہ کر کرسی سنبھال لی۔

☼ ☼ ☼

کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ زوئلہ کولڈ ڈرنک کے آہستہ آہستہ سپ لے رہی تھی جب دلہن ہال میں داخل ہوئی۔

”واہ‘ زبردست!“ وہ گلاس نیچے کرتے ہوئے دم بخود تھی۔ باریک پیور شفون کا ڈیپ ریڈ لہنگا‘ اوپن فیشن ٹیل گاؤن جو نگوں‘ موتیوں کے جڑاؤں سے بھرا تھا‘ لمبا سا کامدار دوپٹا‘ میچنگ جیولری‘ پرس اور سینڈل‘ آدھی آستینوں سے نظر آتے بلیچ زدہ بازو جن پر میرون گلیٹرز والی مہندی سے گل بوٹے بنے تھے‘ کلائیوں میں میچنگ چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔ اور

میک اپ کسی اعلا بیوٹیشن کو داد دیتا محسوس ہونے لگا۔

وہ کسی راجکماری کی طرح اٹھلاتی جھلملاتے لہنگے میں قدم بڑھاتی اسٹیج کی جانب تھی۔ زونکہ نے گلاس ٹیبل پر رکھا۔ اپنے ٹچ اسکرین موبائل پر کیمرہ سیٹ کیا اور دھڑادھڑ تصویریں بنانے لگی۔

"محترمہ پلیز! اگر آپ نے لہنگے ہی کی تصویریں بنانی ہیں تو اپنے گھر جاکر بنا لیجیے گا' فی الحال ہمیں دلہن دیکھنے دیں۔۔۔" عقب سے ابھرتی آواز پر اس نے خفیف سی گردن موڑ کر دیکھا' پشت پر ہی شامیانے کا بانس کھڑا مسلسل اس کے موبائل کی اسکرین تک رہا تھا۔

"آپ کو کسی نے روکا ہے۔۔۔؟ دیکھ لیں۔۔۔؟" وہ قدرے غصے سے بڑبڑائی تھی۔

"دلہن تو آپ کو دو میل دور سے بھی نظر آجائے گی' خیر سے آپ عالم چنا کے ریکارڈ توڑ تو ہوں گے ہی۔"

"چلیں! ہم تو عالم بھائی کے ریکارڈ توڑ ہی سہی' مگر باقی ٹھگنی عوام نے بھی دلہن دیکھنی ہے۔۔۔ اگر برا نہ لگے تو ایسا کریں "آپ پیچھے سے لہنگے کی تصویریں بنالیں پیچھے بھی اچھا خاصا ڈیزائن ہے۔" اس نے یہ بات تصویروں کا حال دیکھ کر کہی تھی' مگر وہ نے تب ناچڑ کر بولی۔

"میں لہنگے کی بھوکی نہیں ہوں' جو صرف اس کی۔۔۔" نظریں اسکرین پر جاتے ہی تمام الفاظ منہ میں دم توڑ گئے' شرمندگی سے چہرہ سرخ ہو گیا کیوں کہ اسکرین پر صرف دلہن کا لہنگا جھلملا رہا تھا۔ اس نے تیزی سے تصویریں بیک کیں کسی میں کلائی چوڑیاں' مہندی تو کسی میں لہنگے کا بارڈر' سینڈل' پرس' دلہن کا چہرہ تقریباً" ہر تصویر میں غائب تھا۔ گویا جس جس چیز پر نظریں گئیں وہ اسکرین پر نقش ہوتی گئیں۔ اصولاً" تو اسے کھسیانا ہونا چاہیے تھا' مگر گردن مار کر پیچھے ہو گئی۔

اس کے پیچھے ہٹتے ہی وہب نے آگے جگہ بنائی تھی اور باقی کزنز کے ہمراہ دلہن کو اسٹیج پر بٹھایا۔ دلہا سرخ اور ڈل گولڈن شیروانی میں ملبوس ہمراہ بیٹھ گیا۔ وہ چند تصویریں بنانے کے بعد آپا اور بھابھی کے پاس آبیٹھی تھی۔ غالباً" اس کے خالہ زاد اسفند علی کی شادی تھی۔

ہر فنکشن اس نے خوب انجوائے کیا تھا اور بارات کے فنکشن کو چار چاند دلہا دلہن کے خوب صورت ملبوسات نے لگادیے تھے۔ وہ آپا اور بھابھی کے پاس بیٹھی مسلسل ملبوسات پر فریفتہ تھی۔

"واہ! آپا دل ہو تو اسفند بھائی جیسا' تنخواہ پینتیس' چالیس ہزار اور لباس لاکھ ڈیڑھ لاکھ کا۔۔۔" بھابھی کو اس کی بات ذرا اچھی نہ لگی تب ہی کڑوا سا منہ بنا کر بولیں۔

"بڑی عقل مندی ہے ہونہہ' چار پانچ ماہ کی تنخواہ دو جوڑوں کی نظر۔۔۔ دوسروں کو سادگی کا درس دیتا تھا اور اپنی باری دیکھو۔۔۔" بھابھی کو اچھی طرح یاد تھا ان کی شادی کا ہر فنکشن اسفند کی وجہ سے سادگی لیے تھا۔ پرانی رقابت لہجے میں در آئی تھی' مگر آپا نے بات کو سنبھال لیا۔

"کیا کرتا بے چارہ دلہن کی پرزور فرمائش تھی کہ' بری میں کچھ ہونا ہو' مگر عروسی لباس "بانے" ڈیزائنو کے ہوں' دونوں کے ہم رنگ اور میچنگ بھی۔"

"کیوں؟ بھیڑ میں کھو جانے کا خطرہ تھا کہ ہم رنگ دیکھ کر لوگ ملوادیں گے۔" بھابھی پرس میں سے سلامی کے پیسے نکالتے ہوئے مسلسل منہ بناتیں رہیں۔ زونکہ نے ان کی قطعاً" پروانہ کی بلکہ سب سے پہلے اسٹیج پر چڑھ دوڑی تھی۔

سلامی و تحائف کے بعد دودھ پلائی کی رسم جاری تھی۔ ہر کوئی اپنی بولی لگا رہا تھا۔ سالیوں کی لمبی قطار 'موتیے کی کلیوں سے سجا کلوتا گلاس لیے ایسے ہل رہی تھیں' جیسے چلتی ٹرین میں بہت سے مسافر کھڑے ہوں۔ یقیناً" افراد اسٹیج کی گنجائش سے زیادہ چڑھ گئے اور ہر کوئی پہلی صف میں شامل ہونے کی دھکم پیل میں تھا۔ دلہن کو اگر فکر تھی تو صرف اپنے قیمتی لہنگے کی۔ کہیں لالچ میں بہنیں قیمتی لہنگا دودھ سے نہ دھودیں۔ کبھی ادھر سے سمیٹ' کبھی ادھر سے سمیٹ۔ البتہ اسفند ایسے چہک رہے تھے جیسے زندگی میں پہلی بار ٹوتھ برش کیا ہو اور مہکتی سانسیں کیوں نہ بکھیرتے

بھئی ان کے سامنے بجی سنوری کنواری دوشیزائیں منتیں کر رہی تھیں۔ ڈیمانڈ بیس ہزار سے کم ہونے کا نام نہ لے رہی تھی۔ بڑی سالی ذرا کی ذرا دلہا کے کھسے کی جانب لپکی۔ پیچھے سے نسوانی آواز نے ہاتھ روک دیے۔

"ارے گرو گرو' پیروں میں گرو' ناک رگڑو' تب ہی بات بنے گی۔۔۔" زوئلہ دو افراد کے درمیان فاصلے سے گردن نکالے حظ اٹھا رہی تھی' بڑی سالی فوراً" سیدھی ہوگئی اور برابر کھڑی بہن کو ٹہوکا دیا۔

"تم چھوٹی ہو' جوتا تم اتارو۔۔۔!" چھوٹی تو سنا تھا جمناسٹر رہ چکی ہے' ایسا جمناسٹک کا مظاہرہ کیا باقیوں سمیت دلہا کی آنکھیں بھی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے ایک پاؤں دولہا کے پیچھے پر مارا اور جوتا پاؤں سے نکل ہوا کے دوش پر وہب کے ہاتھ میں آگیا۔

"ارے واہ۔۔۔!" اس نے سب کو تلوا دکھایا تھا۔

"اف خدایا! دولہا کے ساتھ یہ سلوک۔۔۔" زوئلہ اتنے اچانک حملے پر تلملا گئی تھی۔

"اب بے چارے بھیا کی شیروانی مت اتار لینا۔۔۔ بھوکوں۔۔۔"

"میڈم۔۔۔ ہم میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے' جو ایکسرے دیکھنے کا شوقین ہو۔" وہب کے جواب پر کچھ نے اونچا اور کچھ نے پھس پھسا قہقہہ لگایا تھا۔ اسے ہر جگہ پیش پیش دیکھ کر آخری زوئلہ نے پوچھ ہی لیا۔

"ارے آپ لگتے کیا ہیں دلہن کے۔۔۔؟"

"فرسٹ کزن۔۔۔ بھائی۔۔۔!" وہ خوب جسلا کر کہہ رہا تھا۔

"اور اب یہ جوتا بیس ہزار سے کم کا نہیں ملے گا۔"

"توبہ ہی ہے۔ بہت ہی فقطوں کا خاندان ہے۔" اس نے کانوں کی لو چھوئیں۔

"سالیاں تو مانگتیں دیکھی تھیں یہاں تو سالے بھی فقراء نکلے۔۔۔" ایک کے بعد ایک تلملاتا جملہ نکل رہا تھا۔ اتنے میں بڑے بھیا آگے بڑھے اور باقاعدہ بارگین کرتے ہوئے سالے' سالیوں کو فارغ کیا تھا۔ مجمع اسٹیج سے چھٹا تو زوئلہ نے دونوں کے بیچ بیٹھ کر تصویر بنوانا چاہی تھی۔ ایک تو درمیان میں گھس کر بیٹھی اوپر سے لہنگا نیچے دب گیا۔ وانیہ کا دل چاہا اس زوئلہ کی بچی کا گلا دبا دے' لیکن اس نے شادی کا خیال کرتے آہستہ سے سرگوشی کی۔

"ایکسوزمی میرا لہنگا۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ سوری' سوری۔۔۔" اس نے ذرا سا اوپر اٹھ کر لہنگا کھینچ پیچھے کیا اور نظر صوفے کی بیک پر کہنیاں لگائے وہب سے ٹکرائی۔ اس نے دانت جما کر فوٹو گرافر سے کہا تھا۔

"بھیا! ذرا دھیان سے' یہ سرو کا بوٹا تصویر میں نہ آنے پائے۔۔۔"

"کیوں' کیوں محترمہ۔۔۔ جب دلہا کی کزن کباب میں ہڈی بن سکتی ہے تو دلہن کا کزن کیوں نہیں۔۔۔" اسے اس کی بات پر تپش آگیا تھا۔

"آپ خود کو سمجھتے کیا ہیں' توپ کی نال کی طرح آگے جھکتے ہی چلے آرہے ہیں۔" اور جب وہب نے موقع سے فائدہ اٹھاتے یاددہانی کروائی۔

"ارے! آپ تو وہی ہیں نا جس کی چاول گوشت کی ریڑھی الٹنے لگی تھی۔۔۔" تو وہ کیمو چھین واک آؤٹ کر گئی۔

"بی بی۔۔۔ تم ڈال ڈال' میں پات پات۔۔۔" وہب کا قہقہہ اس کے کانوں میں سنسناہٹ بن گیا تھا۔ دلہن نے شکر کیا اس کا لہنگا مزید کچلنے سے بچ گیا اور دلہا کو رخصتی کی خوشی تھی۔ قرآن پاک کے سائے میں بابل کی دعائیں سمیٹتے وانیہ نے میکہ چھوڑا تھا۔ شادی بخیر وخوبی انجام پائی اور مہمان اپنے ٹھکانوں پر۔۔۔

☼ ☼ ☼

چند ہفتے بعد کی بات تھی وہب کی والدہ وانیہ کے میکے آئی تھیں۔ وہ اس کی چچی تھیں اور یقیناً" دعوت کا پہلا حق رکھتی تھیں اور خاص کر وہ ضد کر کے لایا تھا۔ وہ جیٹھانی کے پاس بیٹھیں ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہوئے مناسب لفظوں میں مطلب کی بات کر چکی تھیں۔

"ائے...! تم ایسے فراڈیوں میں رشتے کرنے کا سوچے بیٹھی ہو... رہنے دو بھئی' وہب کا کیا ہے' بچہ ہے ٹال دو گی' ٹل جائے گا۔" جیٹھانی نے نہ صرف برا سامنہ بنایا بلکہ تڑاخ سے اظہار کیا تھا' غالباً" بہت جلی بھنی بیٹھی تھیں۔

"کیوں بھابھی... خیریت؟ ایسا کیا فراڈ کر دیا۔" وہ رازدارانہ انداز میں کھسکتے ہوئے ان کے خاصا قریب ہوئیں۔

"فراڈ سا فراڈ..." وہ غصے میں بولیں۔

"وہ جو اتنا مہنگا لہنگا لائے تھے نا..." ان کے سانس لینے کے وقفے میں وہب کی والدہ فوراً" سے بولیں۔

"ہاں... ہاں... جل گیا...؟"

"کہاں...!" انہوں نے ناک چڑھائی۔ "کم بخت جل ہی جاتا۔" ان کا غصہ کم ہونے میں نہ آتا تھا۔

"ساری برادری میں لشکا پشکا کرواہ' واہ کروالی... بدبخت کرائے پہ اٹھا لائے تھے۔" وہب کی والدہ کا ہاتھ سینے پر پڑا اور منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

"لے آئی ہوں اپنی بیٹی کو' اور تب تک نہ بھیجوں گی جب تک ویسا ہی جوڑا نہیں لاتے۔ چاہے خریدیں یا نیا بنوائیں... بدبختوں نے شگن کی چیز پر کل کل ڈال دی' آگے جانے کیا کریں گے؟" صدمے سے ان کی آواز پھٹ رہی تھی۔ دیورانی نے بھی خوب حوصلہ افزائی کی۔

"بھابھی یہ تو تم نے عقل مندی کی' جو وانیہ کو گھر لے آئیں اور بالکل نہ بھیجنا جب تک بات نہ مانیں۔" دونوں دیورانی جیٹھانی کو دکھ روتے' وہ حیرت سے باری باری تک رہا تھا پھر جھلا کر بولا۔

"کیا خاک عقل مندی کی... امی آپ بھی عجیب مشورے دے رہی ہیں... لوگ کیا کہیں گے' ہفتے بعد ہی دلہن روٹھ کر میکے جا بیٹھی۔"

"تم بیچ میں مت بولو۔"

"کیوں نہ بولوں... بھئی لہنگا ہی کرائے کا تھا دلہا تو کرائے پر نہیں لائے تھے۔"

"اچھا! امی کو حیرت ہوئی۔"

"تمہارے نزدیک یہ کوئی بڑی بات ہی نہیں ہے' شگن کا جوڑا کرائے پر اٹھا لائے۔"

"نہیں بالکل نہیں۔"

اس کا جواب قطعیت بھرا تھا۔

"ہاں بھیا تم کیوں کہو گے' تم خود جو اس خاندان میں دل اٹکائے بیٹھے ہو۔" تائی اماں نے طنز کیا تھا۔

"تائی جان یہ بات ہرگز نہیں ہے' اگر میں وہاں شادی کا ارادہ نہ بھی رکھتا' تب بھی اس بات کی تائید ہرگز نہ کرتا' بھئی ٹھیک ہے انہوں نے غلطی کی مگر یہ بھی عقلمندی نہیں کہ اتنی سی بات پر گھر چھوڑ دو۔"

"اتنی سی بات...؟"

امی تائی یک زبان بولی تھیں۔

"ہاں تو اتنی سی بات۔ بھئی اتنا مہنگا جوڑا خریدنے کی تک ہی کیا بنتی ہے' بعد میں پہنتا ہی کون ہے اس جوڑے کو' خوامخواہ کا خرچہ۔"

"کیوں' نہیں پہنتے۔" دونوں نے اسے ڈپٹا تھا۔

"ہم نے تو پہنا تھا بلکہ جی بھر کر پہنا تھا' کیوں بھابھی! اماں ہر روز فرمائش نہیں کرتی تھیں کہ اپنا شنیل کا سرخ قمیص شلوار پہن لو۔" جیٹھانی تائید میں سر ہلاتی رہیں۔ "کتنے سالوں ہم نے نکاح کا جوڑا پہنا اور دل جان سے پہنا۔"

"تب ہی اولاد بھی خوب جی لگا کر پیدا کی۔" وہ ان کے انداز پر تلملاتے ہوئے بڑبڑایا تھا۔

"یہ جو اتنا نور ظہور پھیلا ہے ناں' اسی جوڑے کی کرامات ہیں۔" وہیب کا طنز ان کے آٹھ آٹھ بچوں پر تھا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے' تم کیوں ان کے حمایتی بنے جا رہے ہو۔" وانیہ چند لمحے پہلے چچی کو سلام کرنے آئی تھی اور اس کی بے جا حمایت پر اندر تک سلگ گئی۔

"آپی آپ بھی..." وہ حیران سا حیران اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ "کم از کم آپ تو پڑھی لکھی ہیں' آپ کو تو سوچنا چاہیے' آپ کی بے جا ضد پوری کرنے میں' آپ ہی کے میاں کے چند ہزار میں لاکھ روپیہ بچ گیا۔ وہ آپ ہی

کے کام آئے گا' ڈھیروں جوڑے آجائیں گے اس میں' کسی غریب کو دے دیں ان بے چاروں کا پورا فرنیچر آجائے گا۔ ثواب الگ۔"

"تم اپنا درس اپنے پاس ہی رکھو۔۔۔" وانیہ کو اس کا سمجھانا برا لگا تھا۔

"آپی درس کی کیا بات۔۔۔" وہ بہت پیار سے بولا تھا۔

"آپ ہی نے ان سے مہنگے ترین ڈیزائنر کی فرمائش کی تھی' جو ہماری کلاس کو بالکل سوٹ نہیں کرتی' نارمل کلاس کا کہا ہوتا تو یقیناً" وہ مجبور نہ ہوتے' صرف آپ کی خاطر۔۔۔" اس نے وانیہ کے کندھے پر سمجھاتے ہوئے ہاتھ رکھے۔

"صرف آپ کی خوشی کی خاطر' انہیں ایسا کرنا پڑا' آپ کی خواہش پوری ہوگئی قیمتی لہنگے میں دلہن بننے کی تصویریں' مووی سب بن گئیں' اب تو بے کار ہی جانا تھا نا' کچھ عرصے میں اولڈ فیشن۔۔۔ اب یہ کیا عقل مندی ہے' جوڑے کی خاطر میاں کو چھوڑدو۔۔۔ کم خرچ بالا نشین ہوتا ہے آپی' آپ کو تو سلوٹ کرنا چاہیے اسفند بھائی کی عقل مندی پر۔۔۔"

"تاں تم کیوں ان کی چمچہ گیری کررہے ہو۔۔۔" چچی کے کہنے پر وانیہ سے چھوٹی رانیہ نے بھی سر دھنا۔

"چچی! چمچہ گیری نہیں' کفگیر گری کہیے۔" اس نے چائے کے برتن سمیٹتے ہوئے اک نیا مشورہ دے ڈالا۔

"اور اب ہم اس کفگیر کا رشتہ کریں گے زوئلہ کوئلہ سے۔۔۔ اور کرائے کا لہنگا ہی لے کر جائیں گے۔ انہوں نے ہمارا شگن پھیکا کیا' ہم ان کا کرکے حساب برابر کردیں گے۔۔۔ کیوں کیسا ہے بھائی۔۔۔" وہب کی' کندھے پر تھپکی محسوس ہوتے ہی' آنکھیں روشن ہوگئیں۔

✡ ✡ ✡

تو یوں سب کے ذہن میں بدلے کی نئی ترکیب کوندی۔ البتہ وانیہ کو بدلے کے ساتھ اپنا لہنگا بھی چاہیے تھا جو اس نے لے کر ہی دم لینا تھا۔ بقول اس کے تمام جذبات لہنگے میں جڑے تھے اور اپنے خاص وقت کی چیز کو ہمیشہ یادگار بناکر پاس رکھے گی۔ اب کچھ کم قیمت ہوتی تو یقیناً" خواہش بے جا نہ تھی' مگر اس قدر مہنگا۔۔۔؟

دونوں طرف شادی کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ حقیقتاً" زوئلہ کے والدین کو رشتے پر بالکل اعتراض نہ تھا۔ لمبا چوڑا بر سرروزگار خوب رو لڑکا' دیکھا بھالا خاندان' پھر پہلے بھی رشتے داری بن چکی تھی۔ سودیرنہ کی اور عید کے چاند شادی کی تاریخ دے دی۔ اسفند اور وانیہ کا معاملہ ابھی پھیلا نہ تھا وہ خاموشی سے اسے حل کرنا چاہ رہا تھا۔ اسے سمجھانے کی بارہا کوشش کی' مجبوری بتائی۔

"عید سر پر ہے' خاندان میں بہت قریبی شادی ہونے والی ہے اور نئی دلہن روٹھی بیٹھی ہے۔۔۔ لوگ باتیں بنائیں گے پلیز۔۔۔" مگر وانیہ اپنی ضد کی ایک تھی۔

"مجھے ہر صورت لہنگا ہی چاہیے' بمع میچنگ کے۔۔۔" آخر ہتھیار اسفند کو ہی ڈالنے پڑے' بھئی خاندان میں عزت بھی رکھنا تھی۔

✡ ✡ ✡

بانے ڈیزائنر کے لہنگے میں وہ دوبارہ دلہن بنی اس کے گھر آئی تھی اور بات مانی جانے پر اس کی خوشی کی انتہا نہ تھی اور خوشی تو تب غائب ہوئی جب ہر دوسرے دن لہنگا پہننے کی فرمائش ہونے لگی۔ وہ گھر کے کسی سامان کا پوچھتی تو ایک ہی جواب

"ہاں بھئی مہینہ پہلے تو تھا مگر کیا کریں آپ کے لہنگے کی خاطر بیچنا پڑا۔۔۔" عید قریب تھی اس کے نئے کپڑوں کی فرمائش بے حد جائز تھی' مگر جواب ملا۔

"یار اتنا خوب صورت لہنگا ہے تمہارا' وہ پہن لینا' لون کے کپڑے تو ہر سال پہنتی ہو۔۔۔ کچھ چینج ہونا چاہیے۔" آج تو حد ہوگئی شدید حبس اوپر سے لوڈشیڈنگ۔ روزہ کھولنے کے بعد وہ درمیان میں کٹے آموں کی ڈش رکھے بیٹھے تھے۔ وانیہ کی نگاہ بار بار چھت پر خاموش لٹکے پنکھے پر جاتی کبھی دوپٹا جھل کر ہوا

کرتی آخر بہت جھنجلا کر بولی تھی۔

"سارے پاکستان نے U.P.S لگوالیا ہے' آپ آخر کیوں نہیں لگواتے۔"

"تم سے کس نے کہا کہ ہم نے نہیں لگوایا۔۔۔؟" وہ حیران سا حیران تھا۔

"یار۔۔۔ وہ بھی مہینہ پہلے تمہارے لہنگے کی میچنگ کی نظر ہو گیا۔ پینتس ہزار میری تنخواہ ہے' ایک لاکھ کا لہنگا میں کہاں سے خریدتا' گھر بسانا ضروری تھا سو جو' جو چیزیں بیچ کر بات بنی۔ ہوتا گیا۔" وہ آم کی قاش منہ تک لے جاتے ہوئے بہت معصومیت سے کہہ رہا تھا۔

"وانیہ بیگم تم ایسا کرو' اپنا لہنگا پہن لو اس میں گرمی کا احساس بھی جاتا رہے گا۔۔۔ میں نے سنا ہے' انسان پر نفسیات کا بڑا اثر پڑتا ہے' من پسند چیز جب سامنے ہو تو وقت' موسم کا احساس مٹ سا جاتا ہے' تم لہنگا پہن لو تمہیں گرمی محسوس نہیں ہو گی' میں تمہیں دیکھتا رہوں گا میرا حبس مٹ جائے گا۔" وہ ہر جملے پر اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسفند کا قہقہہ گونج اٹھا۔

"تم مجھے میری امی کے ہاں چھوڑ آؤ' مجھ سے اتنی گرمی برداشت نہیں ہوتی۔" وہ تلملا گئی۔

"اچھا۔۔۔" اس نے حظ اٹھایا تھا۔

"کیا اچھا۔۔۔ ابھی چھوڑ کر آؤ۔۔۔" اس کے حکمیہ کہنے پر وہ فوراً "اٹھ کھڑا ہوا" آموں کی ڈش سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔

"ایسا کرو' تم اپنا لہنگا پہنو میں ابھی رکشہ لے آتا ہوں۔" "مانو" اس کا تو دماغ گھوم گیا۔

"میرا دماغ خراب ہے جو اتنی گرمی میں لہنگا پہنوں۔۔۔ اور یہ رکشہ کیوں۔۔۔؟ تمہاری بائیک کہاں ہے۔۔۔؟" دوسرا جملہ زیادہ حیرانگی سمیٹے تھا۔

"یار۔۔۔ کہاں جانا ہے۔۔۔" وہ اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ایسے دلار سے بولا جیسے وہ سنتے ہی ناچنے لگے گی۔

"کتنی بار ایک ہی بات بتاؤں' اپنی خوب صورت سی بیوی کو لانے کے لیے' مجھے کتنی چیزوں کی قربانی دینا پڑی۔" اسے رومانٹک انداز میں اپنے قریب کرتے ہوئے کہا۔

"آہستہ آہستہ کمیٹیاں ڈال کر سب دوبارہ خرید ہی لوں گا۔۔۔ جان۔۔۔! سب سے اہم چیز تمہارا لہنگا تھا' وہ بھی پسندیدہ ڈیزائنر کا' وہ تو خرید ہی لیا۔۔۔ باقی سب بھی آ ہی جائے گا۔"

"بھاڑ میں گیا لہنگا۔۔۔" اس نے بے دردی سے اس کے ہاتھ جھٹکے اور دوپٹا بیڈ پر پھینکا۔

"چولہے میں گئی ساری میچنگ۔۔۔ میں تنگ آ گئی ہوں یہ ہر وقت کی لہنگا لہنگا سن کر' کہیں جانا ہو' لہنگا پہن لو' کسی نے آنا ہو' لہنگا پہن لو' کسی سامان کا کہو' ایک ہی جواب لہنگے کا صدقہ کر دیا' لہنگا نہ ہو گیا تاج محل ہو گیا۔ نہیں چاہیے مجھے ایسا لہنگا جسے دیکھ دیکھ کر میں فاقوں مر جاؤں۔۔۔"

"واقعی۔۔۔!" اس کے روہانسی انداز پر اسفند پھر سے چہکا قدرے قریب آ کر سرگوشی کی۔

"اک بار پھر سے کہنا۔۔۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں آگ لگا دو' اسے۔۔۔" وہ کہہ کر تیزی سے دروازے کی جانب لپکی تھی' مگر اسفند نے پھرتی سے اس کی نازک کلائی تھام لی مبادا آگ لگا ہی نہ دے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔ دراصل وہب کا دوست ڈیزائنر تھا اور وہب نے اپنے دوست کو اسفند کی مجبوری اور وانیہ کی انوکھی ضد کھول کر بتا دی تھی۔ اپنی ضمانت پر وہ چند دن کے لیے "ہانے" سے لہنگا لایا تھا اور گھر کا تمام سامان جان بوجھ کر ادھر ادھر کیا تھا۔ اب اتنی تنگی برداشت کرنے پر اسفند کی ایک ایک بات یاد آنے لگی۔

"یار ہم مڈل کلاس لوگوں کو یہ افسانوی، فلمی چونچلے نہیں بچتے کہ خاص موقعوں کے کپڑے' پھول' ٹوٹی چوڑیاں' ٹشوز سنبھال کر صندوقچوں میں رکھ چھوڑیں یا پھر انہیں ساری زندگی گھنٹوں کے حساب سے ڈسکس کریں' بلکہ مڈل کلاس تو نام ہی رشتوں' ضرورتوں اور جذبات کے درمیان بیلنس رکھ کر جینے کا

ہے کیوں کہ خاص موقعوں کی چیزوں سے زیادہ اہم وہ خاص رشتے ہوتے ہیں' جن سے یہ چیزیں وابستہ ہوتی ہیں' کم از کم ان رشتوں میں خلوص کرائے کا نہیں ہونا چاہیے۔" ایک ایک لفظ اسے بار بار یاد آتا رہا اور جب حقیقتاً "توبہ ہوئی تو اسفند کا خلوص بھی کھل کر سامنے آگیا تھا۔ جہاں لہنگا وہب کے دوست کو لوٹایا گیا۔ وہاں نہ صرف گھر کا سامان سامنے آگیا بلکہ محبتیں لیے دل بھی سامنے تھا۔

وانیہ آج بہت نک سک سے تیار ہوئی تھی۔ گلابی جامے وار کی ساڑھی' اونچی ہیل کا سینڈل پہنے وہ اسفند کے ہمراہ وہب اور زوئلہ کی شادی میں شریک ہوئی۔ زوئلہ میرون کامدار قیمتی لہنگے میں وہب کے ہمراہ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ نہ صرف اس کا فرمائشی لباس قیمتی تھا بلکہ بھاری جیولری' پرس' سینڈل ہر چیز میچنگ اور خاصی مہنگی معلوم ہوتی تھی۔ ہر شادی کی طرح خوب ہنگامہ آرائی' جملہ بازی کے بعد تمام رسمیں ادا ہوئیں۔ چند لمحے کے لیے دلہا' دلہن اسٹیج پر اکیلے تھے غالباً" فوٹوگراف بن رہی تھیں۔ زوئلہ نے ہلکا سا لہنگے کو درست کرتے ہوئے بہت آہستگی سے پوچھا۔

"یہ آپ نے پسند کیا ہے۔۔۔؟"

"ہوں"

وہب نے بند ہونٹوں سے جواب دیا۔

"بہت پیارا' بہت ہی خوب صورت ہے۔۔۔" وہ بہت کھل کر تعریف کر رہی تھی۔

"خاصا مہنگا معلوم ہو رہا ہے۔۔۔" اس نے فوٹوگرافر کی طرف دیکھتے ہوئے صرف "ہوں" پر ہی اکتفا کیا۔

"یہ۔۔۔ کرائے پر تو نہیں لائے۔۔۔؟" وہب نے یک لخت نظریں ترچھی کیں براہ راست اس کی آنکھوں میں چھپی خفگی کو بھانپا۔ چند لمحے خاموش رہا پھر دھیرے سے کہنے لگا۔

"مائی ڈیر! دلہن صاحبہ' یہ کرائے کا کیوں ہونے لگا' بلکہ میں نے اپنی تمام ذاتی قیمتی چیزیں بیچ کر خریدا ہے' بھلا اب مجھے' بائیک' موبائل اور بے کار کے الیکٹرونکس کی کیا ضرورت' میری کل کائنات تو آپ ہیں' پھر اتنے خوب صورت پیرہن میں آپ جو آجائیں گی میری زندگی میں' ہر چیز کی کمی خود بخود پوری ہو جائے گی۔ کیوں اچھا کیا نا۔۔۔" اس نے بھنویں اچکائی تھیں اور ہر جملے پر زوئلہ کی آنکھیں پھیلتی جارہی تھیں' مگر وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا۔

"بلکہ میں تو رخصتی کے لیے بھی سجائی گاڑی لانے کے بجائے رکشہ سجوانے لگا تھا' ارے رقم کم پڑ گئی تھی۔ پھر دوستوں نے مشورہ دیا۔ یار! شادی ایک بار ہی ہونا ہے' چلو ہم سے قرض لے لو۔۔۔ تم فکر نہیں کرو' چند ماہ میں اتر جائے گا۔۔۔ ڈونٹ وری یار۔۔۔" اس کا سر گھومنے لگا' قریب تھا وہ چکرا کر گرتی مگر مسکراتے ہوئے اسٹیج پر چڑھتے وانیہ اور اسفند نے وہب کو گھر کتے ہوئے اسے سنبھالا۔ البتہ وہب اندر تک شانت رہا۔ اسفند نے قدرے سرگوشی میں ایک نوحہ سنایا تھا۔

کھلتا کسی پہ کیوں ہماری غربت کا معاملہ
تمہاری خواہشوں کی بہتات نے رسوا کیا ہمیں۔۔۔

وانیہ' زوئلہ کے منہ سے ہم آواز نکلا تھا۔

"کنجوس' مکار ہو۔۔۔ تم لڑکے۔۔۔"

نبیلہ ابر راجہ

چھٹی قسط

"انکل.... انکل.... کیا ہوا ہے۔" اس نے ہذیانی انداز میں سینے پہ رکھا گیا ان کا ہاتھ ہٹایا' انہیں جھنجوڑا۔ ان کا سانس جیسے سینے میں اٹک گیا تھا۔
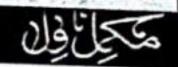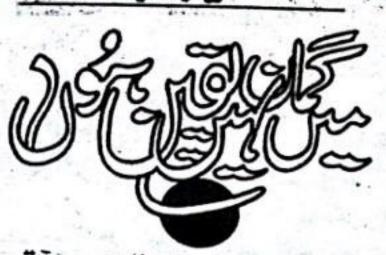
"میں کسی کو بلا کے لاتی ہوں۔" زیان نے ان کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے تسلی دی۔ وہ جانا چاہ رہی تھی پر انہوں نے کمزور گرفت سے اسے روکنے کی کوشش کی اور کسی چیز کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے پورے کمرے میں نظر دوڑائی' جانے وہ کس کی طرف اشارہ کررہے تھے۔ انہوں نے اس کی بے چارگی اور پریشانی دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اشارہ کیا۔ اس بار وہ سمجھ گئی۔

ان کا اشارہ سائیڈ ٹیبل پہ پڑے انہیلر کی طرف تھا۔ ملک جہانگیر کو دمہ بھی تھا' کافی عرصے سے انہیں یہ مرض چلا آرہا تھا۔ سردیوں میں تو ان کی حالت قابل رحم ہوتی۔ صرف اس سال سردیوں کے موسم میں وہ دوبار ہسپتال ایمرجنسی میں رہ کر آئے تھے۔ زیان نے بھاگ کر پھرتی سے انہیلر اٹھایا اور ان کی ناک سے لگایا۔

اتنے میں افشاں بیگم اور ملک ایبک کمرے میں داخل ہوئے۔ افشاں بیگم نماز پڑھ رہی تھیں۔ نماز ختم کرنے کے بعد نوکرانی نے انھیں زیان کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ اسی کی طرف جارہی تھیں جب' ملک ایبک سے سامنا ہوا۔ انہوں نے بیٹے کو بھی زیان کی آمد کا بتایا۔ ان کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ ایبک کو خوش گوار سی حیرت ہوئی۔

زیان انہیلر ناک سے لگائے۔ ان کی مدد کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ ملک ایبک پریشانی سے ملک جہانگیر کی طرف بڑھا۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ بابا جان کو دمہ کا اٹیک ہوا ہے۔ اگلا پندرہ منٹ میں زیان کے ساتھ ساتھ اس کی بھی بھرپور کوشش سے ملک جہانگیر کی حالت سنبھل چکی تھی۔ اب وہ پرسکون تھے۔ انہیں دمہ کا اٹیک ہوا تھا۔ ایبک نے فارغ ہوکر سب سے پہلے اے سی بند کیا۔

"بیٹی کیسی ہو' تم کب آئیں۔ میں نماز پڑھ رہی تھی' نوکرانی نے مجھے بتایا کہ تم آئی ہو تو نماز پڑھ کر فوراً" ادھر آئی ہوں۔ تم بھی کہتی ہوگی کہ آتے ہی پریشانی سے واسطہ پڑگیا۔" ان کا اشارہ ملک جہانگیر کی اچانک بگڑ جانے والی طبیعت کی طرف تھا۔ انہوں نے قریب آکر زیان کا ماتھا چوما۔

"ادھر یہاں میرے پاس بیٹھو۔" افشاں بیگم نے اپنے پاس اس کے لیے جگہ بنائی۔ وہ مڑی تو کمر پہ گرے بالوں کے آبشار نے خاص ردھم میں ہلکورے لیے۔

"نہیں آنٹی اس میں پریشانی کیسی' بلکہ میں گھبرا گئی تھی۔ آپ کو بلانے کے لیے آنے ہی والی تھی کہ آپ لوگ خود ہی آگئے۔" اس نے مدھم آواز میں وضاحت دی۔ ایبک نے اس کی طرف دیکھا' پر ادھر نو لفٹ کا بورڈ آویزاں تھا۔ حالانکہ اس نے زیان کو بڑی گرمجوشی سے سلام کرکے حال احوال دریافت کیا تھا۔

نوکرانی نے کمرے میں داخل ہوکر آہستہ آواز میں افشاں بیگم سے کچھ کہا۔ زیان اس طرف متوجہ نہیں

تھی۔ اس لیے سن نہیں پائی۔

"آؤ زیان بیٹی ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں یہاں ملک صاحب آرام کر رہے ہیں۔"

"تو یہاں ادھر ان کے پاس کون ہوگا؟" اس نے فوراً سوال کیا۔

"دراصل میں انکل کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے پوچھا ہے۔" افشاں بیگم کی نگاہیں خود پہ مرکوز دیکھ کر اس نے وضاحت کی۔

"یہاں ایبک ہے نا، تم فکر مت کرو۔" انہوں نے ہلکی سی مسکراہٹ سمیت اپنائیت بھری نگاہوں سے اس کی سمت دیکھا۔ زیان نے ان کی معیت میں قدم آگے بڑھادیے۔

ڈرائنگ روم میں بڑی ٹیبل اشیاء خورد و نوش سے پوری طرح بھری ہوئی تھی۔ افشاں بیگم نے اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود بھی اس کے لیے بڑی پلیٹ خوب بھردی۔

"آج تمہیں کھانا کھائے بغیر جانے نہیں دوں گی۔" انہوں نے اسے اپنے ارادوں سے خبردار کیا۔

"آنٹی میں نے ابھی اتنا کچھ کھالیا ہے۔ رات کے کھانے کی تو ذرا بھی گنجائش نہیں ہے۔"

"کہاں تم نے اتنا کچھ کھایا ہے' چکھا ہی تو ہے۔ تم کھاؤ پیو' میں باورچی خانے سے ہو کر آتی ہوں۔"

زیان کے لاکھ انکار کے باوجود انہوں نے اس کی ایک نہ مانی۔ اب باورچی خانے میں زیان کے لیے خاص طور پہ اہتمام ہو رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہو رہی تھی۔ افشاں بیگم اس کے پاس پھر سے آکر بیٹھ گئی تھیں۔ انہوں نے اسے اپنی فیملی فوٹو البم دکھائی۔ جس میں ان کی شادی کی لاتعداد تصاویر تھی۔ اس کے ساتھ ایبک کے بچپن اور جوانی کے بھی بہت سے فوٹو گرافس تھے جو اس نے عدم دلچسپی کے ساتھ صرف اور صرف افشاں بیگم کا دل رکھنے کے لیے دیکھے۔ وہ اسے ان فوٹوؤں کے ساتھ جڑی تاریخ بھی بتا رہی تھیں۔ بہت دیر بعد انہوں نے بھاری بھرکم فوٹو البم واپس رکھی۔

"آنٹی میں ذرا انکل کو ایک نظر دیکھ آؤں؟" اس نے سوالیہ نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ افشاں بیگم کو ملک جہانگیر کے لیے اس کی پریشانی دیکھ کر خوشی ہوئی۔

"ہاں.... ہاں.... ضرور جاؤ میں بھی آرہی ہوں۔" انہوں نے بخوشی رضامندی کا اظہار کیا۔

انکل جہانگیر اب پہلے سے کافی بہتر حالت میں تھے اور ایبک کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔

"ادھر میرے پاس آکر بیٹھو پتر۔" زیان بیڈ کے پاس پڑی کرسی پہ بیٹھنے والی تھی' جب ملک جہانگیر نے بیڈ پہ اسے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ان کی زبان سے "پتر" کا لفظ ادا ہونے کے بعد زیان کو بہت اچھا لگا تھا۔ وہ ان کے حکم کی تعمیل میں ان کے پاس بیٹھ گئی۔ ملک جہانگیر نے اپنے کمزور ہاتھوں سے زیان کا موی سفید ہاتھ تھاما۔

"اس بچی نے آج میری بڑی مدد کی ہے۔ ذرا سی دیر ہو جاتی تو میرا سانس ہمیشہ کے لیے رک جاتا تھا۔" ملک جہانگیر کا مخاطب ملک ایبک تھا۔ وہ ایک سانس بولنے کے بعد لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔ افشاں بیگم بھی آچکی تھیں۔ "بہت خدمت گزار اور پیاری بچی ہے یہ۔" انہوں نے پیار بھری نگاہ اس پہ ڈالی تو وہ شرمندہ ہو گئی۔ کیونکہ کمرے میں موجود تینوں نفوس کی توجہ اس کی طرف تھی۔

"نہیں انکل ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے آپ کی چھوٹی سی ہیلپ کی ہے' کیونکہ آپ کی طبیعت بہت خراب ہو رہی تھی نا۔" وہ اس توجہ سے گھبرا رہی تھی۔ افشاں بیگم اور ایبک اس کی گھبراہٹ کو محسوس کر رہے تھے۔ پھر افشاں بیگم نے ہی اسے گھبراہٹ اور نروس پن کے حصار سے باہر نکالا۔ وہ زیان کو خصوصی طور پہ بہت زیادہ توجہ دے رہی تھیں۔ کچھ محسوس کرکے اور سوچ کر ایبک کے لب گھنی مونچھوں تلے مسکرا اٹھے۔

افشاں بیگم نے رات کے کھانے پہ ملک ارسلان اور عنیزہ کو بھی اپنی طرف بلوالیا تھا۔ ان دونوں کے آنے پہ زیان کی گھبراہٹ قدرے کم ہو گئی۔ ان سب کو باتوں میں مصروف چھوڑ کر زیان باہر آگئی۔ اندر کمرے میں بیٹھ کر وہ بور ہو گئی تھی۔ پھر افشاں بیگم کی حد درجہ توجہ اور محبت بھی اسے پریشانی کے ساتھ ساتھ شرمندگی و جھنجلاہٹ سے دوچار کر رہی تھی۔ اس نے منظر سے ہٹ کر سکون محسوس کیا۔

☼ ☼ ☼

ملک افتخار نے ارسلان کو اعلا تعلیم کے حصول کی خاطر بیرون ملک بھجوانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ارسلان نے بجھے دل کے ساتھ عنیزہ کو یہ خبر سنائی۔ کتنی دیر تو وہ اسے بے یقینی کے عالم میں تکتی رہی۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو نا؟"

"کاش کہ یہ جھوٹ ہی ہوتا۔ لیکن حقیقت یہ ہی ہے کہ میں بہت جلد پاکستان سے جا رہا ہوں۔" ارسلان کے لہجے میں گہری اداسی تھی۔

"لیکن تم تو اپنے بابا جان اور بھائی کو رشتہ مانگنے کے لیے 'ہمارے گھر بھیجنے والے تھے۔" عنیزہ نے شاکی نگاہوں سے تکتے ہوئے اسے یاد دلایا۔

"بابا جان ضرور آئیں گے تمہارے گھر میرا رشتہ لے کر۔ لیکن جب میں پڑھ کے ڈگری لے کے آؤں گا تب۔" ارسلان نے اسے دلاسا دیا۔

"میری تعلیم مکمل ہونے والی ہے۔ ابو جان کو میری شادی کی بہت زیادہ فکر ہے۔" عنیزہ نے مجبوری بتائی۔

"تم کہتی ہو تو میں جانے سے پہلے ان سے بات کرلوں۔" ارسلان نے اس کی اداسی بھری آنکھوں میں جھانکا۔

"نن نہیں.... رہنے دو۔ یہ مناسب نہیں ہوگا کہ تم خود ان سے بات کرو۔"

"میں انتظار کرلوں گی۔" وہ آنکھوں کی نمی چھپاتے ہوئے زبردستی مسکرائی۔

"تم آرام سے ہنسی خوشی مجھے الوداع کہو گی تو میں بھی یہ کڑا وقت تب ہی کاٹ پاؤں گا۔"

"نہیں تمہیں الوداع نہیں کہوں گی۔ مجھے الوداع کہتے ہوئے ڈر لگتا ہے جیسے تم ہمیشہ کے لیے بچھڑ جاؤ گے۔"

"تم پاگل ہو بس اور کچھ نہیں۔"

"ہاں مجھے پاگل کہہ لو' پھر میں تمہیں گڈ بائے نہیں کہوں گی۔"

"میں تمہیں گڈ بائے بول کے جاؤں گا۔" وہ اسے ستانے کے لیے بولا تو عنیزہ نے فوراً اس کے لبوں پہ اپنا ہاتھ رکھا۔

"پلیز ارسلان مجھے کبھی بھی گڈ بائے مت بولنا' میں جی نہیں پاؤں گی۔ مجھے تم سے بچھڑنے سے خوف آتا ہے۔" ارسلان اس پاگل سی لڑکی کو دیکھتا رہ گیا۔

☆ ☆ ☆

افشاں بیگم بڑی دیر سے خاموش بیٹھیں اپنی سوچوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ملک جہانگیر ان کا ارتکاز محسوس کررہے تھے۔ وہ ان ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ افشاں بیگم اپنی سوچوں کی محویت سے چونکیں۔

"کیا سوچ رہی ہو ملکانی؟" وہ بڑے موڈ میں تھے۔ تب ہی انہیں ملکانی کہہ کر مخاطب کیا۔

"ملک صاحب میں زیان کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"کیا سوچ رہی ہو پتا تو چلے۔"

"کل وہ جب تک یہاں تھی ہمارے گھر میں کتنی رونق تھی نا۔ پوری حویلی اس کے آنے سے جیسے بج سی گئی تھی۔"

"ہاں ملکانی اللہ نے ہمیں بیٹی نہیں دی' بیٹی دیتا تو وہ زیان جیسی ہوتی۔ محبت کرنے والی' خیال رکھنے والی۔ کل وہ میرے لیے اتنی پریشان تھی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے گھر میں بیٹی کی کمی محسوس ہوئی۔" وہ بولتے بولتے اداس سے ہوگئے۔

"ہم زیان کو بیٹی بنا سکتے ہیں۔" افشاں بیگم کا لہجہ پر سوچ تھا۔

"کیسے ہم اسے بیٹی بنا سکتے ہیں؟" وہ الجھے۔

"زیان خوب صورت ہے' پڑھی لکھی ہے عنیزہ کی بیٹی ہے' آپ کا کیا خیال ہے اس بارے میں؟" افشاں بیگم نے ان کے سوال کو ذرہ بھر اہمیت نہیں دی تھی۔

"ملکانی مجھے لگتا ہے تم کچھ خاص سوچ رہی ہو؟"

"ہاں آپ ایسا کہہ سکتے ہیں۔" افشاں بیگم نے انہیں جھٹلانے کی کوشش نہیں کی۔

"لگتا ہے تم نے میرے دل کی بات سمجھ لی ہے۔ کل جب وہ آئی تو کمرے میں میرے پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے ڈھونڈ کر مجھے انہیلر دیا۔ سہارا دے کر اٹھایا۔ اس وقت وہ بہت پریشان نظر آرہی تھی۔ تب سے ہی میں اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں' بہت سلجھی ہوئی خاموش طبع بچی ہے۔" ملک جہانگیر کا انداز تعریفی تھا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں زیان' میں آج کل کی لڑکیوں والی بات ہی نہیں ہے' نہ کوئی نخرا' نہ چھچھورا پن۔ چپ چاپ رہتی ہے۔ ہمارے گھر آئی تو سب میں بیٹھ کر بھی خاموش رہی۔ سچ مانو تو میرا دل دکھ رہا تھا۔" افشاں بیگم کی بات پہ وہ تھوڑی دیر خاموش رہے

جیسے لفظ جمع کر رہے ہوں۔
"تو ملکانی صاحبہ کو زیان بیٹی بہت پسند آگئی ہیں۔"
کچھ دیر بعد وہ بڑے شگفتہ لہجے میں گویا ہوئے۔
"ہاں میرا تو ارادہ ہے کہ ہم زیان کو بیٹی بنا کر اپنے گھر لے آئیں۔" جہانگیر کی طرف سے حوصلہ افزائی محسوس کرتے ہی افشاں بیگم نے اچانک دل کی بات کھل کے کہہ دی۔
"اس سے اچھی تو کوئی بات ہی نہیں ہوگی پھر۔۔۔ زیان 'عزت دار خاندان کا خون ہے' پھر اس کی ماں عنیزہ ہے۔ مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔"
"ملک صاحب سچ پوچھیں تو مجھے زیان پہلی نظر میں ہی بہت اچھی لگی تھی۔ میں نے دل میں سوچ لیا تھا اسے عنیزہ سے اپنے ایبک کے لیے مانگ لوں گی۔"
"ملکانی تم نے اتنے بڑے فیصلے اکیلے ہی کر لیے۔" ملک جہانگیر شرارت سے مسکرائے۔
"میں اکیلی رہ رہ کر تنگ آگئی ہوں" اس لیے یہ فیصلہ کیا ہے۔ ایبک کی دلہن آئے گی تو میری تنہائی تو ختم ہوگی نا۔ آپ باپ بیٹے کو میری پروا ہی کب ہے۔ میں عنیزہ سے بات کرتی ہوں جلدی۔" افشاں بیگم شکوہ کناں انداز میں بولیں۔
"ایبک کی رائے لے لینا۔" انہوں نے مشورہ دیا۔
"میں آپ کی طرح نہیں ہوں کہ اٹھ کر بیٹے کو بتائے بغیر عنیزہ اور ارسلان کے پاس چلی جاؤں۔"
ان کا اشارہ احمد سیال کے گھر جانے کی طرف تھا۔ وہ کھسیانے سے ہو کر مسکرائے۔ "میں ایبک سے بات کروں گی۔ ویسے میرا نہیں خیال کہ اسے اعتراض ہوگا۔ شہزادیوں جیسا حسن اور آن بان پائی ہے زیان نے 'ایبک انکار کر ہی نہیں سکتا۔" افشاں بیگم کے یقین کا پیمانہ بھی عجیب تھا۔ وہ سر ہلا کر رہ گئے۔ افشاں بیگم ابھی سے ہی ایبک اور زیان کے بارے میں مستقبل کے خواب بننا شروع ہو گئی تھیں۔ زیان کو وہ تصور کی آنکھ سے دلہن بنے گھر میں چلتے پھرتے دیکھ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼

ایبک ان کی پوری بات سننے کے بعد خاموشی سے کچھ سوچ رہا تھا۔ افشاں بیگم کو الجھن سی ہو رہی تھی کہ جانے وہ خاموش کیوں ہو گیا ہے۔ کیا سوچ رہا ہے۔ بہت دیر توقف کے بعد اس نے خاموشی کا قفل توڑا۔
"امی زیان مجھے بہت مغرور لگتی ہے۔" افشاں بیگم کا دل چاہا اپنا سر پیٹ لیں۔ اس نے کیا اعتراض کیا تھا۔
"وہ مغرور نہیں ہے' بس زیادہ گھلتی ملتی نہیں ہے۔ نئی نئی یہاں آئی ہے تو مانوس ہونے میں کچھ وقت تو لگے گا ہی۔"
"ٹھیک ہے امی جیسی آپ کی مرضی۔"
"میری مرضی نہیں۔۔۔ زندگی تم نے گزارنی ہے فیصلہ اور مرضی بھی تمہاری ہوگی۔ ابھی میں نے صرف سوچا ہے زیان کا' جانے کی بات نہیں کی ہے۔"
"امی رسک لے لیتے ہیں۔" ایبک کا لہجہ آخر میں شرارتی ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں زیان کا کچھ دن پہلے کا "میں ہی میں ہوں۔" والا روپ لہرا گیا تھا۔ اس نے اپنی مسکراہٹ دبالی تھی۔
"میں عنیزہ اور ارسلان سے بات کروں گی جلدی۔"
"آپ کو اتنی جلدی کیوں ہے امی؟" ایبک نے ان کو چھیڑا۔ ایبک کی رضامندی کے بعد ان کا چہرہ خوشی سے جگمگا رہا تھا۔
"میں سارا دن اکیلی ہوتی ہوں' بات کرنے تک کو ترستی ہوں' میری بہو آئے گی تو تنہائیاں بانٹ لے گی میری۔" ان کا لہجہ محبت میں ڈوب گیا تھا متوقع بہو کے خیال سے ہی۔

☼ ☼ ☼

ملک ارسلان' زیان کی پرابلم سمجھ گئے تھے۔ وہ اسے خود سے سنبھلنے کا سوچنے کا موقع دے رہے تھے۔ ان کا رویہ محبت بھرا تھا' جس میں حد درجہ اپنائیت تھی۔ انہیں یقین تھا۔ ایک دن وہ ان کی محبت کی

قائل ہو جائے گی۔ وہ عنیزہ کی کوکھ سے تھی، لیکن انہیں کبھی حسد محسوس نہیں ہوا کہ بچی کسی اور کا بویا ہوا ہے۔ وہ اس سے اپنی سگی اولاد کا سا برتاؤ کر رہے تھے۔ رہ گئے ملک جہانگیر اور افشاں بیگم تو انہوں نے بڑی محبت سے اس کے لیے بازو وا کیے تھے۔ افشاں بیگم کو اس کی خوب صورتی بھا گئی تھی۔

اپنے سگے باپ کے گھر کے مقابلے میں وہ یہاں محفوظ تھی۔ ایک اب گاؤں میں ہی تھا۔ اس کا ملک ارسلان کی طرف روز کا آنا جانا تھا۔ زیان سے بھی آمنا سامنا ہوتا، پر اس نے زیان پر کبھی بری نظر نہیں ڈالی تھی۔

زیان کو اس بات پہ شکر ادا کرنا چاہیے تھا۔ وہ خوف وڈر کے حصار سے نکل آئی تھی، پر ماضی کی تلخیوں کو وہ اتنی جلدی فراموش کرنے والوں میں سے نہیں تھی۔ اس کی اپنی عدالت اور انصاف تھا۔

☆ ☆ ☆

کمرے میں موجود سب نفوس سہمے ہوئے تھے اور تو اور زرینہ بیگم بھی بے حد خائف تھیں، وہاب بری طرح گرج برس رہا تھا۔ اس کے ساتھ روبینہ بھی کینہ توز تیور چہرے پہ سجائے موجود تھیں۔

"خالہ سیدھی طرح بتا دو کہاں ہے زیان؟" وہ ایک بار پھر غصے سے غرایا۔

"بتایا تو ہے مجھے نہیں پتا کہاں ہے۔ گھر سے اپنی سہیلی کے ہاں جانے کا بول کر نکلی تھی، اب مجھے کیا پتا کہاں گئی۔"

"خالہ آپ نے پوچھا نہیں اس کی سہیلی سے۔" وہ ان کی بات پہ یقین نہ کرنے والے انداز میں بولا۔

"پوچھا تھا اس نے صاف انکار کر دیا کہ وہ یہاں آئی ہی نہیں۔"

"آپ نے کیا، کیا پھر؟"

"میں نے کیا کرنا تھا۔ خاموش ہو گئی ہوں، اپنی عزت کے ڈر سے۔"

"یہ مت سمجھنا کہ میں ان باتوں کا یقین کر لوں گا۔

میں خود کھوج لگاؤں گا اور بوا اگر آپ کو کچھ پتا ہے تو بتا دیں۔ میں کسی کو کچھ بھی نہیں کہوں گا۔" وہ بات کرتے کرتے بوا کی طرف مڑا۔

"وہاب میاں مجھے کچھ پتا نہیں ہے۔ سارا دن اپنے کام میں لگی رہتی ہوں۔" وہ خوف زدہ لہجے میں بولیں۔

"کمال ہے یہاں کسی کو کچھ پتا نہیں ہے۔ جیتی جاگتی جوان جہان لڑکی غائب ہو گئی ہے اور سب آرام سے بیٹھے ہیں۔" روبینہ طنزیہ تاثرات چہرے پہ سجائے زرینہ کو دیکھ رہی تھیں۔ زرینہ نے بڑی مشکل سے خود کو کوئی سخت بات کہنے سے روکا۔ کیونکہ اس وقت ان کی پوزیشن کمزور تھی وہ اپنے گھر میں رہتے ہوئے بھی بے سائباں تھیں۔ آفاق جس نے بڑے ہو کر ان کا سہارا بننا تھا خود ناداں اور کمسن تھا۔

وہاب زیان کی گمشدگی کا سن کر آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اسی سلسلے میں اس نے عدالت لگائی تھی۔ روبینہ پوری طرح ساتھ دے رہی تھیں۔ اس لیے وہ اور بھی شیر ہو رہا تھا

وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔ ساتھ ٹیبل پہ پڑی ایش ٹرے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھر چکی تھی۔ "اماں، زیان بھلا خود سے گھر چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہے؟" اس نے بڑبڑاتے ہوئے جیسے سوال کیا۔

"مجھے تو زرینہ پہ شک ہے کہ اسی نے کہیں زیان کو ادھر ادھر کیا ہے، کیونکہ وہ کسی صورت بھی زیان کی شادی تم سے کرنے کے حق میں نہیں تھی۔" روبینہ نے آج زرینہ کی ناپسندیدگی سے پردہ اٹھایا۔

"اماں مجھے پتا ہے سب۔"

"ساتھ زیان باپ کی جائیداد میں حصے دار بھی تو ہے۔ زرینہ نہیں چاہتی کہ اسے کچھ دینا دلانا پڑے۔" روبینہ کا لہجہ پر سوچ تھا۔

"میں چھوڑوں گا نہیں خالہ کو انہوں نے اچھا نہیں کیا ہے یہ سب کر کے۔"

"ہاں۔۔۔ زرینہ تو میری ماں جائی ہے اسے اپنی بہن کا بھلا سوچنا چاہیے تھا۔ زیان کی شادی تمہارے ساتھ

ہو جاتی تو اس کا کیا جاتا۔" روبینہ بہن سے بے حد شاکی اور کبیدہ نظر آرہی تھیں۔

"خالہ کو تو میں چھوڑوں گا نہیں۔ ساتھ بوا سے بھی پوچھ گچھ کروں گا۔" اس نے خطرناک انداز میں اپنا ارادہ ظاہر کیا۔

☆ ☆ ☆

وہاب اور روبینہ آپا کے جانے کے بعد زرینہ تینوں بچوں اور بوا سمیت وہیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

"بوا اب کیا ہوگا؟ اس وہاب سے نمٹنا آسان نہیں ہے میرے لیے۔" خاموشی میں زرینہ کی پریشان آواز ابھری۔

"وہاب میاں اس معاملے کو یہاں چھوڑنے والے نہیں ہیں، کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔" بوا خود ازحد پریشان تھیں۔

"بوا نے وہاب کا انداز دیکھا؟ کتنی بدتمیزی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ اس نے تو میرا بھی لحاظ نہیں کیا ہے اور آپا روبینہ نے اسے ذرا بھی نہیں روکا۔"

"چھوٹی دلہن میرا خیال ہے وہاب میاں پھر آئیں گے۔" بوا کا لہجہ تفکر سے بھرپور تھا۔

"میں کیا کروں بوا۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ ذیان کے جانے کے بعد یہاں ایسے ایسے مسئلے سر اٹھائیں گے۔"

"چھوٹی دلہن حوصلہ مت ہاریں۔ اللہ مسبب الاسباب ہے۔"

"بوا میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں، میں امیر علی کے بعد جیسے جلتے سورج کے نیچے آگئی ہوں۔ پے در پے پریشانیاں، مشکلات اور خوف۔" زرینہ کا لہجہ دل گیر تھا۔

"چھوٹی دلہن آپ سنبھالیں خود کو۔ بچوں کا کیا ہوگا۔ آپ کا ٹھیک رہنا بہت ضروری ہے اور آپ اکیلی تو نہیں ہیں، میں ہر حال میں آپ کے ساتھ ہوں۔" بوا نے حتی الامکان تسلی دی۔

"آپ فکر مت کریں چھوٹی دلہن، جو ہوگا اچھا ہوگا۔" "ان شاء اللہ" جواباً" زرینہ نے دل کی گہرائیوں سے کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

ملک جہانگیر، افشاں بیگم کے ساتھ خود آئے تھے۔ حالانکہ ان کی طبیعت ابھی بھی پوری طرح سنبھلی نہیں تھی، مگر یہ ان کے بیٹے کے رشتے کا معاملہ تھا۔ وہ ازحد خوش تھے۔ خود کو پہلے سے بڑھ کر توانا اور جوان محسوس کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ آئی نوکرانیوں نے مٹھائی کے ٹوکرے، خشک میوہ جات، موسمی پھل اور اس نوع کے دیگر لوازمات اٹھا اٹھا کے اندر لانے شروع کیے تو فریدہ نے فوراً" سے عنیزہ کو مطلع کیا۔ وہ فون پہ بات کر رہی تھیں۔ اسی وقت فون بند کر کے ڈرائنگ روم کا رخ کیا۔

ذیان ظہر کی نماز پڑھ کر آئی تو اس نے بھی انواع و اقسام کی سب اشیاء دیکھیں۔ آج تو جہانگیر انکل بھی اس کی یہاں موجودگی میں پہلی بار وہاں آئے تھے۔ اس لیے اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔

"انکل میں بہت خوش ہوں، آپ یہاں آئے ہیں۔" اس نے اپنی خوشی کا اظہار کرنے میں کنجوسی سے کام نہیں لیا۔ ساتھ آئی افشاں بیگم کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی، انہوں نے اسے ساتھ لپٹا کے پیار کیا، جہانگیر نے اس کا ماتھا چوما۔

عنیزہ کی نگاہ سب سے پہلے ٹوکروں پہ پڑی تو ان کے دل میں عجیب سی پکڑ دھکڑ شروع ہوگئی۔ اس طرح اتنی ساری سوغات سمیت جہانگیر بھائی اور افشاں بھابھی کا آنا بے سبب نہیں تھا۔ عنیزہ نے جہانگیر بھائی اور افشاں بیگم کی لائی گئی تمام چیزیں نمثال کے سپرد کیں۔ "انہیں رکھوا دو۔" ان کا اشارہ ٹوکروں کی طرف تھا۔ فریدہ کے ساتھ مل کر اس نے سب کچھ اٹھوایا۔ دونوں اس سلسلے پہ باتیں کر رہی تھیں۔ فریدہ اسی گاؤں کی پروردہ تھی، اسے اچھی طرح پتا تھا کہ یہاں مٹھائی اور دیگر چیزوں سمیت کس کے

گھر جانے کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ مٹھائی خوشی کے اظہار، مبارک باد اور رشتہ مانگنے کے موقعہ پہ لازمی دی جاتی تھی یہ ان کی دیہاتی رسومات کا حصہ تھا۔

"نینناں تمہیں پتا ہے بڑے ملک صاحب یہ سب کس لیے لے کے آئے ہیں؟" اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ وہ خاموشی سے کچھ بولے بغیر اسے تکنے لگی اتنا تو اسے بھی پتا تھا کہ مٹھائی خوشی کے موقعوں کا لازمی جزو ہوتی ہے۔

"میرا خیال ہے کہ بڑے ملک صاحب رشتہ مانگنے آئے ہیں۔" اس نے انتہائی آہستہ سے کہا جیسے کسی کے سن لیے جانے کا ڈر ہو۔

"کس کا رشتہ؟"

"ارے زیان یعنی چھوٹی بی بی کا رشتہ" فریدہ نے جیسے اس کی کم عقلی پہ ماتم کیا۔

"کس کے لیے؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"مجھے تو ایسا لگ رہا ہے کہ بڑے صاحب کے لیے کیونکہ چھوٹے صاحب ولایت گئے ہوئے ہیں پڑھنے۔" فریدہ نے اس کی معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا۔ نینناں یعنی رنم کے پھرتی سے چلتے ہاتھ یکدم سست پڑ گئے۔

ایبک کو وہ روز ہی دیکھتی تھی دل ہی دل میں اس نے کئی بار ایبک کی مردانہ وجاہت کو سراہا تھا۔ اس میں وجاہت کے ساتھ وقار بھی تھا ذہن میں اسے دیکھتے ہی ایک لفظ گونجتا پیور۔ ریفائنڈ۔ اس کی باوقار مردانہ وجاہت میں کسی شے کی بھی کمی نہیں تھی۔

ابھی مٹھائی اور دیگر اشیاء کے ٹوکرے اٹھاتے وقت اس نے زیان کو بھی دیکھا تھا۔ اس نے آج بھی بہت مہنگا ڈیزائنر سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ وہ ملک جہانگیر اور افشاں بیگم سے ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی۔ کھلے بالوں کو بار بار کان کے پیچھے کرتی، کمیٹتی وہ سادہ سے روپ میں بھی نینناں کو جانے کیوں شدید قسم کی کوفت میں مبتلا کر رہی تھی۔ ابھی فریدہ نے اپنے قیاس کی بنا پہ جو پیش گوئی کی تھی اس نے اس کی جھنجلاہٹ اور بھی بڑھادی تھی۔

زیان کچھ دیر ہی وہاں بیٹھی۔ افشاں بیگم کے تاثرات بہت معنی خیز قسم کے تھے۔ وہ اٹھ کے باہر نکلی۔ اور چلتے چلتے باغ کی طرف نکل گئی۔

فریدہ اسے تلاش کرتی بھاگنے والے انداز میں چلتی اس کے پیچھے آئی۔

"چھوٹی بی بی آپ کو ادھر بلا رہے ہیں سب" فریدہ کا اشارہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ملک جہانگیر اور افشاں بیگم کی طرف تھا۔ اس کا سانس تیز چلنے اور بھاگنے کی وجہ سے بری طرح پھول گیا تھا۔ چہرے پہ دبا دبا اشتیاق تھا جیسے وہ کچھ کہنے کے لیے بے قرار ہو۔

"ٹھیک ہے جاؤ میں آرہی ہوں" فریدہ سر ہلاتی واپس چلی گئی۔ اس نے بھی اپنے قدم موڑ لیے۔

زیان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی واپس رہائشی حصے کی طرف آرہی تھی جب اس کے پاس سے نینناں بہت تیز رفتاری سے گزری۔ عنیزہ بیگم نے نینناں کے بارے میں اسے تفصیل سے بتایا تھا زیان کو ایک ثانیے کے لیے نینناں بہت اداس اور پریشان محسوس ہوئی تھی۔ وہ ذرا دیر کے لیے بھی اس کے پاس نہیں رکی تھی۔ زیان اس سے کچھ پوچھنا چاہ رہی تھی اس لیے اس نے نینناں جس سمت میں گئی تھی اس طرف قدم بڑھائے۔ وہ چلتے ہوئے کافی آگے نکل آئی۔ نینناں کہیں نہیں تھی۔ البتہ آگے سے ملک ایبک اسی طرف آرہا تھا، جہاں زیان کھڑی متلاشی نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایبک شاید یہاں اس کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہا تھا اس لیے رک گیا۔

"کس کو ڈھونڈ رہی ہیں؟" زیان کو ایسے لگا جیسے ایبک نے اپنی مسکراہٹ کا گلا گھونٹا ہو۔

"میں نینناں کو دیکھ رہی تھی وہ شاید اس طرف آئی ہے۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا۔

ایبک دونوں ہاتھ سینے پہ باندھے اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ زیان اس کی گہری نگاہوں کے ارتکاز سے گھبرا گئی۔ اس کی چھٹی حس بار بار کوئی احساس دلا رہی تھی۔

"آپ کو غیر اہم لوگوں اور واقعات سے دلچسپی کیوں ہے؟" ایبک نے کوئی تبصرہ کرنے یا جواب دینے کے بجائے عجیب سا سوال کر دیا۔ وہ اس کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ انہی قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔ ملک ایبک پہ اسے غصہ آرہا تھا۔

وہ جیسے ہی سیڑھیاں چڑھ کر رہائشی حصے میں داخل ہوئی سامنے سے آتی عنیزہ اسے دیکھ کر رک گئیں۔ ان کے ساتھ ملک ارسلان بھی تھے۔

"اُفوہ کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی ہوں۔ اندر آؤ رسم کرنی ہے۔ افشاں بھابھی انتظار میں ہیں۔" اس کے کچھ سوچنے سمجھنے سے پہلے ہی عنیزہ نے اس کا ہاتھ تھاما اور ڈرائنگ روم میں لائیں۔ ملک ارسلان عنیزہ کے ساتھ تھے اس لیے وہ کچھ بول ہی نہیں پائی۔ افشاں بیگم نے اسے پکڑ کر اپنے برابر خالی جگہ پہ بٹھایا۔ ملک جہانگیر اور ملک ارسلان دلچسپی سے ساری کاروائی دیکھ رہے تھے۔

افشاں بیگم نے سرخ رنگ کا بھاری کام سے مزین دوپٹا اس کے سر پہ ڈال دیا۔ یہ دوپٹا ان کی ساس نے ملک جہانگیر کے ساتھ نسبت طے ہونے کے موقع پہ انہیں اوڑھایا تھا۔ اور اب انہوں نے نیک شگون کے طور پہ اور خاندانی روایت کو زندہ رکھتے ہوئے اسے اوڑھایا تھا۔ ملک جہانگیر نے مٹھائی کی پلیٹ میں سے ایک گلاب جامن اٹھا کر زیان کا منہ میٹھا کروایا۔

"مبارک ہو مبارک ہو" سب ایک دوسرے کو آپس میں مبارکباد دے رہے تھے۔ زیان کے اعصاب حیرت کی زیادتی سے جیسے فریز ہو رہے تھے۔ دماغ جو سمجھ رہا تھا دل اسے قبول کرنے سے انکاری تھا۔

"اب یہ میرے ایبک کی امانت ہے۔ میں بہت جلد اسے لے جاؤں گی دلہن بنا کے۔" افشاں بیگم کا اشارہ یقیناً" زیان کی سمت تھا۔ سرخ کامدار دوپٹے کے ہالے میں اس کا چہرا چھپا ہوا تھا اور زیان گنگ تھی۔

اس کی زندگی کا اہم فیصلہ اس سے پوچھے بغیر کر دیا گیا تھا۔ ایبک کے ساتھ اس کا رشتہ طے ہو چکا تھا۔ وہ اتنی گئی گزری ہے کہ اس سے پوچھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی گئی۔

یہ عورت جو اس کی ماں ہونے کی دعویدار ہے وہ اسے اس کی اس حرکت کا مزا چکھا کے رہے گی۔ جس اذیت سے وہ گزری ہے ایسی ہی اذیت سے وہ انہیں بھی گزارے گی۔ اس عورت سے وابستہ ہر رشتے' ہر شخص سے اسے نفرت ہے۔

لیکن وہ الجھ رہی تھی۔ ملک جہانگیر نے اپنا کمزور سا ہاتھ اس کے سر پہ رکھا تو ایک دم امیر علی اس کی نگاہوں کے سامنے آگئے۔ وہ ان سے بھلا کیسے نفرت کرے گی' وہ انہیں کیسے اذیت دے پائے گی ان میں تو امیر علی کا عکس ہے۔

باقی سب عنیزہ کے حوالے سے اس کی زندگی میں آئے تھے۔ وہ کسی کو بھی معاف نہیں کرے گی' ہر کام کرے گی جس سے انہیں تکلیف ہو' دکھ پہنچے۔ ان کی اذیت میں اضافہ ہو۔ وہ انہیں کوئی رعایت نہیں دے گی رحم نہیں کرے گی۔" زیان کے چہرے پہ نفرت کی پرچھائیاں تھیں۔

☆ ☆ ☆

وہ اپنے ہاتھ کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ الٹے ہاتھ کی تیسری انگلی میں ہیرے کی نازک سی انگوٹھی کا اضافہ ہو چکا تھا جو ملک ایبک کے ساتھ اس کے طے پانے والے رشتے کا واضح اعلان تھا۔ انگوٹھی کو تکتے ہوئے اس کے ہونٹوں پہ زہریلی مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اسے بتائے بغیر اچانک اس کے مستقبل کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اس کا غصہ اور نفرت حد سے سوا تھی۔

عنیزہ اس رشتے سے بے پناہ خوش تھیں۔ ملک جہانگیر نے جب پہلی بار گھر میں ایبک کی شادی کی بات کی تھی تو ان کا دھیان فوراً" زیان کی طرف گیا تھا۔

ان کے دل نے بے اختیار خواہش کی تھی کہ کاش زیان ان کے پاس ہوتی اور ایبک اس کا نصیب بنتا۔ ایبک ہر لحاظ سے ایک آئیڈیل اور شاندار نوجوان تھا۔ انہیں خبر بھی نہیں ہوئی اور قدرت نے ان کی یہ خواہش من و عن پوری کر دی۔ وہ بے پناہ خوش تھیں

کیونکہ ذیان نے اب ہمیشہ ان کے پاس رہنا تھا۔ یہ احساس ہی ان کے لیے طمانیت انگیز تھا۔

ذیان نے رشتہ طے ہونے کے بعد کوئی ہنگامہ یا احتجاج نہیں کیا تھا' نہ کوئی باز پرس کی۔ ورنہ ان کا خیال تھا کہ اپنا رشتہ اس طرح طے کیے جانے پہ وہ شکوہ کرے گی۔ عنیزہ توقع نہیں کر پا رہی تھیں کہ افشاں بھابھی اور جہانگیر بھائی اس طرح اچانک ذیان کے لیے سوالی بن کے آئیں گے۔ اس خوشی نے ان کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔ انہوں نے ذیان سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی اور اس سے پوچھنے کا موقع بھی نہیں تھا ملک ارسلان بھی جوش ـــ تھے۔ ایبک کو شروع سے پسند کرتے تھے۔ ان کے خیال میں ایبک اور ذیان کی جوڑی شاندار تھی۔

☆ ☆ ☆

ذیان کے بیڈ روم کی لائٹ بند تھی وہ خود ٹیرس پہ تھی۔

"ملک محل" کے دوسرے حصے میں ایبک بھی ٹیرس پہ پڑی کرسی پہ نیم دراز تھا۔ سارے دن کی بھاگ دوڑ سے وہ تھک چکا تھا۔ انڈسٹریل ہوم کی تعمیر مکمل ہونے کے مراحل میں تھی۔ پھر اس کے بعد وہاں اصل کام کا آغاز ہونا تھا جس کے لیے اسے بنایا گیا تھا۔ گاؤں کی بہت سے عورتیں اور لڑکیاں ہنر مند اور محنتی تھی وہ سب ہی اپنی محنت اور ہنر کے جوہر دکھانے کے لیے بے تاب تھیں۔ ملک ایبک ان کے ہنر 'صلاحیتوں کے لیے انہیں انڈسٹریل ہوم کی صورت میں پلیٹ فارم دے رہا تھا۔ وہ اپنے گھر کی حالت بہتر بنا سکتی تھیں معیار زندگی اچھا بنا سکتی تھیں' آمدنی میں اضافہ کر سکتی تھیں۔

دن بھر مصروفیات کا وہی عالم رہا تھا۔ پورے دن میں یادگار لمحہ وہی تھا جب اچانک اتفاقی طور پہ ذیان سے سامنا ہوا تھا۔ بابا جان اور افشاں بیگم اس کی اطلاعات کے مطابق ارسلان چچا ہی کی طرف تھے۔ ایبک کے راستے میں آجانے سے اس کے چہرے اور آنکھوں میں غصہ اتر آیا تھا۔ وہ منظر یاد آتے ہی اسے ایک بار پھر ہنسی آئی۔

وہ کھانا کھا کے اوپر آیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا تھوڑی دیر کھلے آسمان تلے بیٹھے۔ کبھی کبھی اچانک جڑ جانے والے تعلق کے بارے میں سوچنا کتنا حسین لگتا ہے ابھی ایبک بھی اسی کیفیت سے گزر رہا تھا۔ کرسی پہ بیٹھے بیٹھے اس کی نگاہ سامنے کی طرف اٹھی۔ وہاں آج مکمل اندھیرا تھا شاید آج روشنی سے کوئی پرانا ادھار چکایا جا رہا تھا۔ اندھیرے کے باوجود بھی وہ نسوانی ہیولے کو پہچان چکا تھا۔ چاند کی ہلکی ہلکی سی روشنی چیزوں کی ہیت اور خدوخال کو واضح کر رہی تھی۔ ذیان ٹیرس پہ ٹہل رہی تھی۔ ایبک کی طرف کے حصے کی تمام لائٹس آن تھیں۔ وہ تھکے تھکے سے انداز میں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے نیم دراز تھا۔

سر میں کچھ گھنٹے قبل شروع ہونے والا درد' اب شدت اختیار کر چکا تھا۔ بے اختیار اس کے دل میں ایک خواہش ابھری۔ اک دلنشیں اور خوب صورت سی خواہش کہ ذیان اس کے دکھتے سر اور کنپٹیوں کو ہاتھ سے دبائے۔ پھر یقیناً" اس کے سر درد میں افاقہ ہو گا۔ اپنی اس بچکانہ خواہش پہ اسے خود ہی ہنسی آ گئی۔

ذیان اسے ٹیرس پہ بیٹھا دیکھ چکی تھی۔ پچھلے پندرہ منٹ سے وہ اسی پوزیشن میں نیم دراز تھا۔ اس نے نگاہ موڑ لی اور ہونہہ کہہ کر رہ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ کرسی سے اٹھا۔ اب ذیان کے سامنے اس کا چہرہ تھا۔ اس نے پشت موڑ لی اور کمرے میں آکر دروازہ بند کر لیا۔ پر وہ بند دروازے کے پیچھے اسی کو سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

معاذ اسکائپ پہ سب گھر والوں سے بات کر رہا تھا۔ افشاں بیگم نے ایبک اور ذیان کا رشتہ طے ہونے کی بریکنگ نیوز سنائی تھی۔ وہ ذیان کے "ملک محل" میں آنے کے شاک سے بھی ابھی نہیں سنبھلا تھا۔ کیونکہ اسے عنیزہ چچی کے ماضی کا زیادہ نہیں پتا تھا۔ پھر اس کے سامنے کم کم ہی تذکرہ ہوتا تھا۔ وہ تعلیم کے سلسلے

میں پہلے گھر سے دور رہا پھر پاکستان سے۔ اس لیے جب اسے بتایا گیا کہ "ملک محل" کے مکینوں میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا ہے اور اضافہ بھی عنیزہ چچی کی بیٹی کا' تو وہ جی بھر کے حیران ہوا۔ پاکستان والوں نے شاید اسے جی بھر کے حیران کرنے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔

"مجھے فورا" میری بھابھی کی فوٹو دکھائیں۔" اس نے افشاں بیگم سے مطالبہ کیا۔

"چھری تلے دم تو لو' ابھی میں ایبک سے کہتی ہوں تمہیں بھیج دے گا۔" اس کی بے قراری پہ وہ مسکرائیں۔

"نہیں' میں بات بعد میں کروں گا پہلے فوٹو دکھائیں مجھے" اس نے ضدی لہجے میں کہا۔

ملک ارسلان نے کیمرے میں ذیان کی اس خاص موقعے پہ بے شمار فوٹو بنائی تھیں۔ وہ کیمرا افشاں بیگم کے پاس تھا۔ نوکرانی ان کی ہدایت پہ ان کے کمرے سے جھٹ پٹ لے آئی۔

"ایبک' معاذ کو ذیان کی فوٹو ابھی بھیجو پاگلا ہو رہا ہے۔" افشاں بیگم نے کیمرا اس کے ہاتھ میں تھمایا۔

ایبک' معاذ کے ساتھ بات کرتے ہوئے ذیان کی تصویریں اسے سینڈ کرنے لگا۔ افشاں بیگم جا چکی تھیں لہٰذا ایبک نے بھی بڑے غور سے ذیان کی سرخ دوپٹے والی تصویریں دیکھیں' ہر فوٹو میں اس کے لب باہم پیوست تھے ہلکی سی مسکراہٹ تک کی رقم نہ تھی۔ جھکی آنکھیں اس کے تاثرات چھپانے میں کامیاب ثابت ہوئی تھیں۔ ایبک نے ذیان کی تمام تر فوٹو ایک الگ فولڈر میں سیو کرلیں۔

ذیان کے ساتھ رشتہ طے ہو جانے کے بعد ذیان کے لیے اس کے تاثرات خود بہ خود ہی بہت نرم اور خاص قسم کے ہو گئے تھے۔ اس کے ذہن میں کبھی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ اس طرح اچانک ایک اجنبی لڑکی اس کی زندگی میں خاص اہمیت اختیار کر جائے گی۔ اسے حویلی آئے ٹائم ہی کتنا ہوا تھا۔

آتے ساتھ ہی اس نے سب کے دل میں جگہ بنالی تھی اور اب تو ایبک کے خیالات پہ بھی وہ اثر انداز ہونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

ذیان جب سے گاؤں آئی تھی' سوائے ایک بار کے حویلی سے باہر نہیں نکلی تھی۔ صرف ایک بار وہ عنیزہ کے ساتھ شہر شاپنگ کرنے گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا باہر نکل کر گاؤں دیکھے لوگوں سے ملے۔ اس کی یہ بے ضرر سی خواہش عنیزہ اور ارسلان تک پہنچی تو انہوں نے فورا" اسے پورا کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے۔

لینڈ روور میں وہ دو نوکرانیوں اور ڈرائیور کے ساتھ جا رہی تھی۔ گاؤں آنے کے بعد آج پہلی بار وہ حقیقی معنوں میں خوش نظر آ رہی تھی۔ گاڑی دو رویہ درختوں والی سڑک سے گزر رہی تھی۔ تاحد نظر سبزا تھا۔ سڑک کے اختتام پر ملک محل کے ذاتی باغات کا سلسلہ شروع تھا جو کافی وسیع رقبے پہ پھیلا ہوا تھا۔

اس کے اشارے پہ ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ ذیان نیچے اتر آئی۔ نیناں اور فریدہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ ذیان گھوم پھر کے باغ دیکھ رہی تھی۔ یہاں آم کی فصل کاشت کی گئی تھی۔ فریدہ نیناں کے ساتھ مل کر آم جمع کرنے لگی' جبکہ ذیان باغ کے بیچوں بیچ گزرنے والی پانی کی نہر میں پاؤں لٹکا کے بیٹھ گئی۔ گرمی کے موسم میں گھنے درختوں کے سائے میں ٹھنڈا پانی اسے ایک عجیب سے لطف سے ہم کنار کر رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی جس نے گرمی کی شدت کو کافی قابو میں کیا ہوا تھا۔

ایبک صبح سے باغ میں تھا۔ وہ آج کل روزانہ اس طرف آتا تھا' کیونکہ تھوڑے دنوں تک پھل کو درختوں سے اتارنے کا کام شروع کیا جانے والا تھا۔ وہ باغ کے آخری سرے سے واپس آ رہا تھا جب اس کی نظر نیناں پہ پڑی۔ ذیان اور فریدہ کو اس نے بعد میں دیکھا۔ اس کے ساتھ باغ میں کام کرنے والا ملازم بھی تھا اسے واپس بھیج کر وہ کچے راستے سے اوپر ذیان کی سمت آیا۔

فریدہ اور نمناک اسے سامنے دیکھ کر الرٹ ہو گئیں۔ ایبک کا رخ زیان کی سمت تھا۔

"ادھر آنے کا موڈ تھا تو مجھے بتایا ہوتا۔ میں خود لے آتا آپ کو۔" ایبک زیان کے پیچھے درخت سے ٹیک لگا کر کھڑا تھا۔ خوشگوار موسم اس وقت کچھ اور بھی خوشگوار معلوم ہو رہا تھا۔ زیان کی سفید سفید پنڈلیاں پانی سے جھانک رہی تھیں۔ لمبے بالوں کا آبشار حسب معمول اس کی کمر کو بوسے دے رہا تھا۔ وہ ایبک کی ہونے والی بیوی تھی' وہ اسے اس وقت خاص نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ دل کی دھڑکن اور تال دونوں پہ احساس ملکیت کا تازہ تازہ خمار چھایا ہوا تھا۔

نمناک درخت کی اوٹ میں تھی۔ ایبک اور زیان دونوں اس کی نگاہوں کی گرفت میں تھے اور اس ٹائم زیان کی سمت اٹھی نگاہوں میں بے پناہ نفرت کا جذبہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

"اب تو ہم آگئے ہیں۔" نمناک کو زیان کے اس جملے سے غرور کی بو آئی تھی۔ اس نے ترچھی نگاہ زیان پہ ڈالی۔

پھر ملک ایبک کی سمت دیکھا جو سفید کڑ کڑاتے لٹھے کے کرتے شلوار میں ملبوس اپنی تمام تر مردانہ وجاہت کے ساتھ ماحول پہ چھایا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے زیان کے پیچھے درخت کے تنے سے ٹیک لگائی ہوئی تھی۔ اپنی پشت پہ وہ اس کی نگاہوں کی تپش محسوس کر چکی تھی پر نمناک کی نفرت سے بھرپور نگاہیں اس سے نہاں تھی۔

اس نے فوراً" دونوں پاؤں پانی سے باہر نکالے۔ نازک سی سینڈل پاس ہی پڑی تھی۔ اس نے گیلے پاؤں جلدی جلدی سینڈلز میں ڈالے۔

"میں واپس جا رہی ہوں۔" زیان کی مخاطب نمناک اور فریدہ تھی۔ ایبک کو تو اس نے ذرہ بھر اہمیت نہ دی تھی۔ ایبک کی موجودگی میں وہ یہاں ایک پل بھی رکنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

ملک ایبک کو پہلی بار شدید توہین کا احساس ہوا۔ مانا کہ حسن میں ادا نخرا اور بانکپن ہوتا ہے' اپنے ہونے کا غرور ہوتا ہے' پر وہ تو سراسر اس کی مردانہ انا اور عزت نفس کو مجروح کر رہی تھی۔ حالانکہ اس کا ایبک کے ساتھ رشتہ طے ہو چکا تھا۔ مستقبل قریب میں وہ ایک دوسرے کے جیون ساتھی بننے والے تھے۔ ایسے میں زیان کی بے رخی بیگانگی کی حد سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔

مانا کہ وہ عنیزہ چچی کی بیٹی تھی' پر وہ ان کے ہاتھوں اور گود میں نہیں پلی بڑھی تھی' نہ ان کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی۔ "ملک محل" میں ابھی اسے آئے بہت زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اس لیے عادات' مزاج اور طبیعت کا بھی ایبک کو خاص اندازہ نہ تھا۔

کہیں ملک جہانگیر نے اس کا رشتہ طے کرنے میں جلد بازی سے تو کام نہیں لیا۔ ایبک اسی پہلو پہ سوچ رہا تھا۔ زیان اسے دیکھتے ہی افراتفری میں یہاں سے گئی تھی' ورنہ وہ اچھے خاصے موڈ میں تھی۔ ایبک کا ارادہ تھا کہ وہ واپس جا کر عنیزہ چچی سے اس سلسلے میں بات کرے گا۔

زیان کے آج کے اس عمل سے اسے اپنی عزت نفس اور خودداری مجروح ہوتی محسوس ہوئی تھی۔ زیان کے ساتھ آئی فریدہ اور نمناک نے بھی زیان کا یہ انتہائی رد عمل نوٹ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

افشاں بیگم نے ایک نوکرانی کے ہاتھ پیغام بھیج کر زیان کو بلوایا تھا۔ وہ اپنی سوچوں میں غلطاں ان کے پاس پہنچی کہ جانے کیوں اس طرح پیغام بھیج کر مجھے بلوایا گیا ہے۔ افشاں بیگم ایک نقشین صندوق کھولے بیٹھی تھیں۔

"آؤ آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔" وہ اسے دیکھ کر مسکرائیں اور پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ صندوق میں ہاتھ مار کر کچھ نکال رہی تھیں۔ زیان نے دیکھا وہ سونے کے جگ مگ کرتے زیورات تھے۔ انہوں نے ایک جڑاؤ کنگن نکالا اور اس کی کلائی میں پہنا دیا۔

"یہ میرے ایبک کی دلہن کے لیے" انہوں نے پیار سے اس کا ماتھا چوما "میں نے تمہارے لیے رکھا

تھا۔ کہ بات طے ہو جائے گی تو تمہیں پہناؤں گی۔ لیکن بھول بھال گئی۔ آج ادھر آئی تو یاد آیا" انہوں نے وضاحت کی اور اسے دیگر زیورات دکھانے لگیں۔ ان میں سے کچھ ان کی مرحومہ ساس نے شادی کے موقعے پہ انہیں دیئے تھے۔ اور کچھ ملک جہانگیر نے خریدے تھے' باقی ان کے میکے والوں کی طرف سے تھے۔ افشاں بیگم اسے ساتھ ساتھ زیورات کی تفصیل بتا رہی تھیں' جب ایبک سیل فون کان سے لگائے کمرے میں داخل ہوا۔ زیان کو اچانک یہاں اپنے گھر میں دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا مگر بہت جلد اس نے اپنے تاثرات چھپا لیے۔

"امی معاذ کا فون ہے لیں بات کریں۔" اس نے سیل فون افشاں بیگم کی طرف بڑھایا۔

"کیسی ہیں آپ؟" وہ زیان کے مقابل بیٹھ گیا۔

"فائن آپ سنائیں؟" وہ رسمی انداز میں بولی۔

"کیا سناؤں؟" وہ بے تکلف ہوا۔ اس سے پہلے کہ زیان کوئی جواب دیتی افشاں بیگم نے سیل فون زیان کے کان سے لگا دیا۔ معاذ اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا وہ پہلی بار اس کی آواز سن رہی تھی۔ معاذ شریر اور زندہ دل تھا فون پہ بات کرتے ہوئے اسے چھیڑنے لگا۔ زیان کو تھوڑی دیر میں ہی گھبراہٹ ہونے لگی۔ معاذ کی ہربات کے جواب میں اس کے منہ سے ہوں ہاں سے زیادہ کوئی آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔ بہت مشکل سے اس نے اللہ حافظ کہہ کر معاذ کی شرارتوں سے دامن بچایا۔ اب وہ ایبک سے بات کر رہا تھا۔

"بھائی جان آپ نے چپکے چپکے سب کام کر لیے اور مجھے انوائیٹ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔" وہ پیار بھرے شکوے کر رہا تھا۔

"چپکے چپکے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ تمہیں بتایا تو تھا کہ سب بہت اچانک ہوا۔ امی نے عین وقت پہ مجھے بتایا" وہ اپنی مخصوص گہری مردانہ آواز میں بولا۔ زیان اس کے مقابل ہی تو بیٹھی تھی۔

معاذ کی آواز بخوبی اس کی سماعتوں تک رسائی حاصل کر رہی تھی۔

"ویسے بھائی جان ہماری بھابھی بہت خوب صورت ہیں میں تو فوٹو گرافس دیکھ کر ہی فدا ہو گیا ہوں۔ لال دوپٹے میں مغلیہ شہزادی لگ رہی تھیں۔ دل کر رہا ہے اڑ کر پاکستان آجاؤں۔ مگر میرے پروگریس ٹیسٹ ہو رہے ہیں' نہیں آسکتا" معاذ کا لہجہ بات کرتے کرتے آخر میں اداس ہو گیا۔

"ڈونٹ وری تم شادی پہ آجانا میں کوشش کروں گا شادی تمہاری چھٹیوں کے دوران ہو۔" ایبک نے معاذ سے بات کرتے ہوئے ساتھ بیٹھی زیان پہ ایک نظر ڈالی تو اس نے بے اختیار پہلو بدلا۔

"بھائی جان میں کیا سن رہا ہوں۔" معاذ حیرت سے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"آپ اور شادی کا ذکر! آپ تو شادی کے نام پہ دامن بچاتے تھے۔۔۔ گریٹ! اس کا مطلب ہے کہ میری بھابھی نے آپ کو تبدیل کر دیا ہے" معاذ کے لہجے میں شرارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایبک مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

افشاں بیگم اپنے زیورات کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔

نوکرانی نے چائے کے ساتھ انواع و اقسام کی خورد و نوش سے بھری ٹرے زیان کے سامنے رکھی تو ایبک نے اسے کھانے کا اشارہ کیا۔

"میں ابھی کچھ دیر پہلے لنچ کر کے آئی ہوں اب کچھ بھی نہیں کھا سکوں گی" اس نے انکار کیا۔

"لیکن یہ سب خاص الخاص اہتمام آپ کے لیے کیا گیا ہے۔" ایبک نے کھانے پینے کی چیزوں کی سمت اشارہ کیا۔

"میں چائے نہیں پیتی۔" اس نے منہ بنایا۔

"لیکن ابھی آپ کو چائے پینی پڑے گی۔" ایبک بولتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات بھی نوٹ کر رہا تھا۔ افشاں بیگم زیورات سے نمٹ کر ان کے پاس آکر بیٹھیں' تو زیان نے قدرے سکون کا سانس لیا۔

چائے پینے کے بعد وہ عصر کی نماز پڑھنے میں

مصروف ہو گئیں۔ اب وہاں صرف زیان اور ایبک تھے‘ وہ جانے کے لیے اٹھی تو ایبک نے اچانک اپنا پاؤں آگے کر دیا وہ گرتے گرتے سنبھلی۔

”بیٹھئے ناں تھوڑی دیر اور“ وہ بالکل انجان بنا ہوا تھا۔

”نہیں اب میں گھر جاؤں گی“ اس نے مصلحت کے تحت نرمی اپنائی۔ تب ایبک نے اپنا پاؤں راستے سے ہٹایا۔

✡ ✡ ✡

نیناں یعنی رنم لیٹی ہوئی تھی۔ باہر سناٹا طاری تھا۔ کسی بھی قسم کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے تکیہ دونوں بازوؤں اور ہاتھوں کے مابین سختی سے دبایا ہوا تھا۔ اس کے دانت بھی سختی سے ایک دوسرے پہ جمے تھے جیسے وہ سخت خلفشار اور اذیت کا شکار ہو۔ بات اذیت والی ہی تھی۔ وہ اپنی فضول ضد کے پیچھے گھر بار‘ سب سہولیات کو ٹھوکر مار کر نکل آئی تھی۔ قسمت کی ستم ظریفی تھی وہ خود مالکن ہوتے ہوئے یہاں اس ”ملک محل“ میں معمولی نوکرانی کی حیثیت سے رہ رہی تھی۔ وہ ہرگز مطمئن نہیں تھی۔

جب سے زیان یہاں آئی تھی۔ اس کا سکون جیسے ختم ہو کے رہ گیا تھا۔ رنم کی نگاہوں میں اپنے سوا کوئی کچھ بھی نہیں تھا۔ احمد سیال کی بیٹی ہونے کی حیثیت سے اس نے بہت رعائتیں حاصل کی تھیں۔ پھر رہی سہی کسر بے پناہ دولت اور اختیار نے پوری کر دی تھی۔

گھر‘ خاندان‘ یونیورسٹی دوستوں میں ہر جگہ اسے ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ وہ جیسے کسی ریاست کی بے تاج ملکہ ہو۔ ”ملک محل“ میں اس کی وہ حیثیت نہیں تھی یہاں کی شہزادی زیان تھی۔ مغرور اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والی بیٹھے بٹھائے یہاں کی مالک بن گئی تھی۔ فریدہ اور دیگر نوکرانیوں نے زیان کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کیے تھے۔ کہ وہ ملک ارسلان کی بیٹی نہیں ہے اور اپنی پیدائش کے بعد پہلی بار حویلی میں آئی ہے۔ کیا قسمت پائی تھی اس نے۔ حویلی آتے ہی سب پہ دھاک بٹھا دی تھی۔ افشاں بیگم اس کے حسن سے متاثر اور ملک جہانگیر اسے بیٹی کے روپ میں دیکھتے۔ ملک جہانگیر کو — وہ یہاں دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ جس دن زیان کا رشتہ مانگنے آئے تب رنم نے انہیں پہلی بار دیکھا اور دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ پاپا کے وہی دوست ہیں‘ جن کا ذکر انہوں نے خاص طور پہ کر کے کہا تھا کہ یہ اپنے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ مانگ رہے ہیں۔ وہ پہلے سے کچھ کمزور لگ رہے تھے لیکن سو فی صد پاپا کے وہی دوست تھے جن کی وجہ سے وہ گھر چھوڑ کر یہاں پڑی تھی۔

انہوں نے رنم پہ کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ اور وہ ایک بار کے علاوہ پھر ڈرائنگ روم میں آئی بھی نہیں۔ وہ اسے دیکھ لیتے تو بھی پہچان نہ پاتے کہ یہ احمد سیال کی بیٹی ہے۔ اسے دیکھ کر تو کوئی بھی نہ پہچان پاتا۔ سراپا وہ بدل گئی تھی۔ رنم کو سو فی صد یقین تھا کہ ملک جہانگیر نے ایبک کے لیے ہی اس کا رشتہ مانگا ہوگا۔ اس ایبک کے لیے‘ جو غریبوں اور انسانیت کا درد اپنے دل میں رکھتا تھا۔ وہ اپنے طبقے کے عام نوجوانوں سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی پوری شخصیت سے متاثر کن وقار جھلکتا۔

یہی ایبک زیان کو بغیر کسی کوشش اور محنت کے مل رہا تھا۔ اسے رنم کی طرح گھر چھوڑ کر دربدر نہیں ہونا پڑا تھا۔ پپا صرف اس کی وجہ سے دنیا سے چلے گئے۔ کاش وہ فضول سی ضد کے پیچھے اپنا گھر نہ چھوڑتی‘ پاپا کا دل نہ دکھاتی۔ اب وہ لوٹ کر کیسے جائے گی۔ ہمت کر کے چلی بھی جاتی ہے تو کون سا پاپا اس دنیا میں ہیں۔ ہر چیز پہ قبضہ ہو چکا ہو گا‘ وہ بالکل محروم اور خالی دامن ہے۔ اپنے پاپا کی شہزادی.... نوکرانی بن گئی ہے۔ اسی ملک محل میں نوکرانی بنی ہے‘ جبکہ قدرت اسے مالک بنانا چاہ رہی تھی۔ بھلا کیا ملا اسے؟ رنم روئے جا رہی تھی۔

✡ ✡ ✡

انڈسٹریل ہوم مکمل ہو چکا تھا۔ ایبک ارسلان چچا

کی طرف آیا تھا۔ عنیزہ چچی کی بات اسے یاد تھی انہوں نے نینا کے بارے میں خاص طور پہ مدد کی تلقین کی تھی کہ بے سہارا اور بے آسرا لڑکی ہے، پڑھی لکھی بھی ہے، بہت کام آئے گی۔ یہاں چھوٹے موٹے کاموں میں لگی رہتی ہے تم اسے انڈسٹریل ہوم میں کہیں نہ کہیں لگا دینا۔

وہ عنیزہ چچی کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ زیان موٹی سی کتاب کے مطالعے میں مصروف تھی۔ ایبک کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے اپنی توجہ کتاب کی طرف پھیرلی تھی۔ فریدہ، عنیزہ کی ہدایت پہ نینا کو بلا کے لے آئی تھی۔ اب وہ ملک ایبک کے سامنے بیٹھی تھی اور وہ اسے انڈسٹریل ہوم کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

"میں دو دن بعد آپ کو لینے آؤں گا آپ چل کر دیکھ لیجئے گا سب کام۔ اگر سمجھ میں آئے تو ٹھیک ہے۔"

"نہیں نہیں میں سب کام سمجھ لوں گی۔" نینا فوراً بولی جیسے اس نے ہاں نہ کی تو وہ اپنا ارادہ بدل دے گا۔

"ایبک، نینا پڑھی لکھی ہے، بہت جلدی سمجھ لے گی" عنیزہ نے بھی اس کی حمایت کی تو زیان نے نظر اٹھا کر نینا کی سمت دیکھا۔ وہ بے پناہ خوش نظر آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر چلی گئی۔ اس کی واپسی چائے اور دیگر لوازمات سمیت ہوئی۔

اس نے ٹیبل پہ سب کچھ طریقے سے رکھا اور خود بھی ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ ایبک عنیزہ کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔ زیان جو سر جھکائے کتاب میں محو تھی اچانک اس کی نگاہ نینا کی طرف اٹھی۔ وہ پوری دلچسپی سمیت، ملک ایبک کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ نظر بچا کر یہ سب کر رہی تھی پر زیان سے اس کی یہ چوری مخفی نہیں رہ پائی تھی۔

زیان نے دوسری نگاہ ایبک پہ ڈالی جو چائے پیتے ہوئے عنیزہ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا وہ قطعاً" نینا کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ زیان نے دوبارا نینا کی طرف دیکھا تو گھبرا سی گئی اور فوراً" چلی گئی۔ زیان کو یہ سب عجیب سا لگا۔ اس جذبے کو اس احساس کو وہ کوئی نام نہیں دے پائی۔

☼ ☼ ☼

نینا، ملک ایبک کے ساتھ جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔ آج اس نے اپنا سب سے اچھا سوٹ پہنا تھا جو عنیزہ نے ہی اسے دلوایا تھا۔ شکل و صورت ویسے بھی اچھی تھی تھوڑی توجہ سے اور بھی جاذب نظر لگنے لگی تھی۔

ملک ایبک کی شاندار گاڑی میں بیٹھ کر جاتے ہوئے اسے لگ رہا تھا جیسے وہ ایک بار پھر سے رنم سیال بن گئی ہے۔ کام سٹ یونیورسٹی کا سرسبز گراؤنڈ، اپنی گاڑی، تیز رفتار ڈرائیونگ، سب سے پہلے پہنچنے کی دھن، پھر سے یہ سب اسے یاد آ رہا تھا۔ ایک حسرت نے انگڑائی لی کہ کاش سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے۔ اس نے چور نگاہوں سے آگے بیٹھے ملک ایبک کی پشت کی طرف دیکھا۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اس کے پسندیدہ پرفیوم کی خوشبو پوری گاڑی مہک رہی تھی۔ ہر معاملے میں اس کا ذوق اعلیٰ تھا۔

اسے پتا ہی نہیں چلا گاڑی ایک دم رکی تو وہ اپنے خیالوں سے باہر آئی۔ سامنے خوب صورت سے احاطے میں تازہ پودے لگائے گئے تھے۔ ایبک نے اسے گاڑی سے اترنے کا اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے چلتی وہ اس تازہ تازہ تعمیر کی گئی عمارت میں داخل ہوئی۔ مشرقی دیوار کے ساتھ ایک کمرا آفس کے طور پہ سیٹ کیا گیا تھا۔ ملک ایبک اسے ساتھ لیے سیدھا ادھر آیا اور کرسی پہ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"اب آپ یہاں کی انچارج ہیں، میں یہ سب معاملات آپ کے سپرد کرنے لگا ہوں۔ امید ہے آپ بخوبی سنبھال لیں گی۔ ایک دو دن میں باقی سب سامان بھی آ جائے گا۔ ابھی تھوڑی دیر میں انڈسٹریل ہوم میں داخلے کی خواہش مند خواتین اور لڑکیاں آنا شروع ہو جائیں گی۔ آپ نے سب کے نام درج کرنے ہیں، پھر

طریقہ کار اور اصول کے بارے میں بتاتا ہے۔" وہ اسے انتظامی امور کے بارے میں گائیڈ کرنے لگا۔ نیناں پوری توجہ سے سن رہی تھی۔ یہ کام اسے بالکل نیا اور دلچسپ لگ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد ایبک کے کہنے کے مطابق عورتیں اور لڑکیاں آنا شروع ہو گئیں۔ یہ تعداد خاصی حوصلہ افزا تھی۔ ایبک کچھ دیر وہاں رکا پھر سب کچھ اس کے سپرد کر کے خود شہر جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اسے سلائی کڑھائی کے اس مرکز کے لیے مشینوں اور دیگر اشیاء کی خریداری کرنی تھی ساتھ ایک دو کام بھی نمٹانے تھے۔ نیناں کو چھوڑ کر آنے کے بعد وہ خاصا پر امید تھا کیونکہ وہ اسے کافی سمجھ دار اور جلد سیکھنے والی لڑکی لگی تھی۔ اب وہ شہر میں بغیر کسی پریشانی کے اپنے کام سرانجام دے سکتا تھا۔

☆ ☆ ☆

انڈسٹریل ہوم کا آغاز ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ مشینیں اور دیگر سامان آ چکا تھا۔ عورتوں کی تعداد چالیس ہو گئی تھی۔ ان میں سے دو عورتوں کو نیناں نے سلائی کڑھائی کے شعبے کی انچارج بنا دیا تھا کیونکہ وہ اپنے کام میں ماہر تھیں۔ یہاں کل چھ کمرے تھے۔ ایک کمرا بطور آفس استعمال ہو رہا تھا جبکہ باقی پانچ کمروں کو شعبوں کے لحاظ سے تقسیم کر دیا گیا تھا۔

نیناں' داخلے کی خواہشمند خواتین کا اندراج کرتی اور انتظامی معاملات دیکھتی۔ لڑکیوں عورتوں میں وہ "میڈم" کے نام سے مشہور ہو رہی تھی۔ اس کام میں اسے بے پناہ مزا آ رہا تھا۔ شروع میں وہ ایبک کے ساتھ آتی رہی۔ وہ خود مصروف رہتا تھا اس لیے نرمی سے اسے منع کر دیا کہ وہ روز اسے ساتھ نہیں لا سکتا چنانچہ وہ خود اب آتی جاتی تھی۔

عنیزہ بیگم نے بہت کہا کہ ڈرائیور کے ساتھ چلی جاؤ مگر اس نے طریقے سے منع کر دیا اور پیدل آنے جانے لگی۔ مناظر فطرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے وہ آتی اور جاتی۔ وقت گزرنے اور راستہ طے ہو جانے کا پتا ہی نہ چلتا۔

صبح دس بجے تک وہ انڈسٹریل ہوم میں موجود ہوتی۔ شام چار بجے چھٹی ہوتی۔ یہ وقت اس کا بہت اچھا گزرتا۔ اپنا آپ معتبر لگتا۔ ملک ایبک نے تو اس کی کھوئی ہوئی خودداری اور عزت نفس بحال کر دی تھی۔ اب وہ ملک محل میں کام کرنے والی عام سی نوکرانی نہیں رہی تھی بلکہ انڈسٹریل ہوم کی انچارج تھی۔ ملک ایبک نے اس کی معقول تنخواہ بھی مقرر کر دی تھی۔ ہفتے میں ایک دن کی چھٹی تھی۔ طبیعت کی خرابی یا کسی ایمرجنسی کی صورت میں وہ چھٹی کرنے کی حق دار تھی۔

☆ ☆ ☆

معاذ کا سمسٹر ختم ہونے کے قریب تھا وہ پاکستان آنے اور اپنی ہونے والی بھابھی سے ملنے کے لیے سخت بے قرار تھا۔ ادھر ملک جہانگیر' ایبک کی شادی کا پروگرام بنا رہے تھے پر وہ شادی کو موخر کرنے کا بول رہا تھا۔ ابھی بھی اس مسئلے پہ ملک جہانگیر' افشاں بیگم اور ایبک تینوں میں بحث ہو رہی تھی۔

"ایبک اب کس بات کی دیر ہے۔ ماشاء اللہ تم اپنا کما رہے ہو کسی کے محتاج نہیں ہو" افشاں بیگم نے ناراضی سے لاڈلے بیٹے کو دیکھا۔

"امی آپ کو پتا تو ہے کہ میں انڈسٹریل ہوم کے ساتھ اب اسکول کی تعمیر کو بھی مکمل کروانا چاہتا ہوں۔ میں اس کے بعد شادی کروں گا۔" وہ بے حد سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"تم پہلے شادی کرو باقی بعد میں چلتا رہے گا" ملک جہانگیر خاصے رسان سے گویا ہوئے۔

"ٹھیک ہے بابا جان میں بات کروں گا اس پہ آرام سے۔" اس نے بحث ختم کرنی چاہی۔ وہ جس وجہ سے شادی کو ٹال رہا تھا۔ افشاں بیگم اور ملک جہانگیر دونوں اس سے لاعلم تھے۔

"جیسے تمہاری مرضی" ملک جہانگیر نے جیسے ہار مان لی۔

"ویسے تمہارا اسکول کب تک مکمل ہوگا؟" افشاں بیگم نے پوچھا۔ "ابھی ابھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔" اس نے کمبھم سا جواب دیا۔

☆ ☆ ☆

عنیزہ کی پوری بات سننے کے بعد زیان نے جھکا سر اوپر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں عنیزہ کی طرف اٹھیں۔ ان آنکھوں میں عجیب سی بیگانگی اور سرد مہری تھی۔ ہونٹوں پہ مبہم سی مسکراہٹ رقصاں تھی جسے عنیزہ کوئی معنی پہنانے سے قاصر تھیں۔ زیان انہی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ دل میں وہ بے پناہ خوش ہو رہی تھی کہ اس کا رویہ اب "ملک محل" میں بسنے والوں پہ اثر انداز ہونے لگا ہے۔ عنیزہ کی حالیہ گفتگو اور فکر مندی اس کے رویے کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

"دیکھو میں بہت خوش ہوں۔ تم یہاں میرے پاس آگئی ہو اور ہمیشہ کے لیے میرے پاس رہو گی۔ لیکن تمہیں اپنے اور ایبک کے مابین رشتے کو نہیں بھولنا چاہیے۔ اگر وہ یہاں آتا ہے تو اس کے ساتھ اچھے طریقے سے بات کرو۔ میں یہ ہرگز نہیں چاہتی کہ تم اپنی مشرقیت اور نسوانیت کو فراموش کردو مگر ایبک کو منفی خیالات دل میں لانے کا موقعہ بھی مت دو۔ اس نے مجھ سے بات کی ہے کہ زیان شاید اس رشتے سے خوش نہیں ہے میں نے اسے مطمئن کر دیا ہے اور یہ بھی سوچا ہے کہ تمہاری شادی جلدی ہونی چاہیے۔"

زیان نے ان کے آخری جملے پہ بے اختیار پہلو بدلا۔

"جی ٹھیک ہے۔" ہمیشہ روز اول کی طرح وہ مختصراً بولی تو عنیزہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

"تم خوش رہا کرو" انہوں نے پیار سے اس کا سر اپنے کاندھے سے لگالیا تو زیان کے اندر بگولے سے اٹھنے لگے۔

"اور ہاں رات کو تمہارے لیے معاذ کی کال آئی تھی تم سو رہی تھیں میں نے نہیں اٹھایا۔ ہو سکتا ہے آج وہ پھر تمہیں کال کرے۔ اس سے بات کر لینا۔" اس کے بالوں میں عنیزہ نے ہاتھوں سے کنگھی کرتے ہوئے بتایا۔

"جی ٹھیک ہے کرلوں گی" وہ پھر اسی انداز میں بولی۔ عنیزہ کی اتنی ساری باتوں کے جواب میں اس کے پاس ایک آدھ جملہ ہی تھا۔ وہ بحث یا تکرار بھی تو نہیں کرتی تھی جو کہا جاتا مان لیتی۔ عنیزہ نے تھک ہار کر نظریں چھت پہ جمادیں۔

☆ ☆ ☆

ملک ایبک' آفس میں نہناں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

"آپ کا انڈسٹریل ہوم کیسا چل رہا ہے؟" وہ دوستانہ انداز میں باتیں کر رہا تھا۔

"شکر ہے اچھے طریقے سے کام ہو رہا ہے۔" ایبک کے اس طرح اچانک یہاں آنے سے وہ خوش ہوگئی تھی۔

"کوئی مشکل تو نہیں ہے؟"

"نہیں کوئی مشکل نہیں ہے۔" "پھر بھی کوئی مسئلہ ہو تو مجھے ضرور بتایئے گا۔"

"جی ایسا ہی ہوگا" وہ سرہلاتے بولی۔ لان کے خوب صورت پرنٹڈ شلوار قمیض میں ملبوس نہناں کو' ایبک نے غور سے دیکھا۔

"کام کرنے میں کوئی دشواری ہو تو کاریگر عورتوں میں سے آپ کسی کو ساتھ رکھ سکتی ہیں۔"

"کام بہت اچھا چل رہا ہے۔ انڈسٹریل ہوم کی شہرت اردگرد کے دیہاتوں تک بھی پہنچ گئی ہے۔ چھ لڑکیاں آئی ہیں میرے پاس وہاں سے۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو بہت جلد سب کمرے بھر جائیں گے۔ میں بہت پر امید ہوں لڑکیاں بہت محنت سے کام کر رہی ہیں۔"

"ان شاء اللہ ان کو اپنی محنت کا معاوضہ بھی ملے گا۔" ایبک مضبوط لہجے میں بولا۔

"میں بہت خوش ہوں آپ نے مجھے یہاں کام کرنے کا چانس دیا" وہ ممنون لہجے میں بولی تو ایبک ایک

بار پھر اسے دیکھنے پہ مجبور ہو گیا۔ اس نے نیناں کے الفاظ اور لہجے پہ غور کیا۔

"آپ یہاں مطمئن ہیں میرا مطلب ہے اس کام سے؟" ایبک نے اچانک سوال کیا۔

"میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں مجھے اتنی عزت ملے گی۔ یہ زندگی کا ایک نیا رخ ہے میرے لیے، پر میں خوش ہوں" وہ بہت شائستہ انداز میں بولی تو ایبک ایک بار پھر الجھنے لگا۔ اسے یقین ہونے لگا کہ لان کے عام سے سوٹ میں ملبوس اس کے سامنے جو لڑکی بیٹھی ہے وہ عام سی ہر گز نہیں ہے۔ اس کا لہجہ و انداز، شائستگی سب کچھ اور ہی ظاہر کرتی تھی۔

"ویسے آپ کی تعلیم کتنی ہے کہاں سے پڑھا ہے آپ نے؟"

"میں نے کام .... میرا مطلب ہے گورنمنٹ اسکول سے صرف میٹرک کیا ہے۔" جتنا اچانک سوال تھا اتنا اچانک جواب دیتے دیتے وہ رک گئی اور فوراً" گورنمنٹ اسکول کا نام لے دیا۔ ملک ایبک چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ نیناں نے جس طرح اچانک ہڑبڑا کر جواب دیا وہ اسے شک میں ڈالنے کے لیے کافی تھا۔

"ویسے آپ میٹرک پاس لگتی نہیں ہیں۔" ایبک اسے گہری نگاہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے گھبرا کے پہلو بدلا اور گھبراہٹ زائل کرنے کے لیے مسکرانے لگی۔ اسے ایبک کی گہری نگاہوں سے ڈر لگ رہا تھا۔

نیناں یعنی رنم ایبک کے جانے کے بعد گہری سوچ میں گم تھی۔

عنیزہ اور ملک ارسلان اسے ملک محل میں ساتھ لائے تھے۔ اسے گھر میں جگہ دی اس کے ساتھ محبت سے پیش آئے کبھی اسے بے سہارا، بے آسرا نہیں سمجھا نہ تحقیر اور ذلت والا سلوک کیا۔ ان کے اعلا ظرف اور بامروت ہونے کے لیے ان کا نرم رویہ ہی کافی تھا۔ وہ گھر سے ایک معمولی سی بات پہ ناراض ہو کر نکلی تھی۔ اس کی یہ احمقانہ بہادری اور بے وقوفی اسے ہوٹل میں کسی بھی بڑے مسئلے میں پھنسا سکتی تھی اگر ملک ارسلان اور عنیزہ وہاں رحمت کے فرشتے بن کر نازل نہ ہوتے۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ گاؤں لے آئے۔ "ملک محل" کے مکینوں نے اسے پیش آنے والی بہت سے مشکلات سے بچا لیا تھا۔ ملک ایبک نے انڈسٹریل ہوم کی ذمہ داری اس کے سپرد کر کے اس پہ مکمل اعتماد کا ثبوت دیا تھا۔ اب اسے گھر کی یاد بھی کم کم آتی۔ اپنی ہٹ دھرمی اور بے وقوفی کو بھی وہ بھول گئی تھی۔

اب اسے ملک ایبک کی ذہانت سے خوف آ رہا تھا۔ اگر اس نے نیناں کی اصلیت پکڑ لی تو کیا ہو گا۔ اس نے اپنا بالوں کا اسٹائل، لب و لہجہ، پہناوا سب کچھ ہی تو بدل لیا تھا۔ اس کے باوجود بھی جانے کیوں ملک ایبک کو اس پہ شک ہو گیا تھا۔ اپنے اس شک کا اظہار اس نے کسی پہ بھی عیاں نہیں کیا تھا۔ خاموشی سے نوٹ کر رہا تھا۔ نیناں کا لب و لہجہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ اعلا تعلیمی اداروں میں پڑھتی رہی ہے۔ اس کا انداز، بات چیت، رکھ رکھاؤ ایک ایک بات اس کی چغلی کھاتی تھی کہ وہ بے سہارا یا بے آسرا نہیں ہے۔ عنیزہ چچی نے بھی زیادہ کھل کر کچھ نہیں بتایا تھا۔

☆ ☆ ☆

ملک ایبک زیان کے رویے کی وجہ سے الجھا ہوا تھا۔ عنیزہ چچی کی وضاحت اور یقین دہانی اسے قائل نہیں کر پائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ زیان کی رضامندی جانے بغیر اچانک رشتہ طے ہوا اور وہ ذہنی طور پہ ابھی تک تسلیم نہیں کر پائی ہے۔ اس لیے وہ شادی کو موخر کرنا چاہتا تھا تاکہ زیان بھی تب تک تیار ہو جائے۔

وہ جب بھی ارسلان چچا کی طرف جاتا، زیان اسے دیکھتے ہی سرد سے تاثرات چہرے پہ سجا لیتی جیسے باقی دنیا اس کے قدموں میں ہو اور کسی کی کوئی اہمیت نہ ہو۔ کبھی کبھی اس کے تاثرات میں گرم جوشی بھی جھلک آتی پر ایسا بہت کم ہوتا۔ اکثر اوقات وہ گم صم رہتی۔ ایبک کو دیکھ کر کبھی اس کے تاثرات سے ایسا نہیں لگا کہ وہ اس کی پرسنالٹی، مردانہ وجاہت اور وقار سے متاثر ہوئی ہو۔

اس کے ایک ایک انداز سے "میں ہی میں ہوں" کا اظہار ہوتا ایبک کو کبھی کبھی وہ ناراض بگڑی بچی لگتی۔ اس کی "میں" پہ ایبک کو ہنسی بھی آتی۔ پر یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ اس کے لیے اپنے دل میں لطیف سے جذبات محسوس کر رہا تھا۔ ان جذبات کو ایبک نے اظہار کی آنچ نہیں پہنچائی تھی ابھی تک۔ لیکن کیا سچ میں زیان اتنی ہی انجان اور لاپروا تھی جتنا خود کو ظاہر کر رہی تھی۔ ایسا ممکن تھا کہ محبت کی جس میٹھی میٹھی آگ میں نازک جذبوں کی تپش سے ایبک پگھلا جا رہا تھا وہ ان سے لاعلم تھی۔ کیا ایسا ممکن تھا کہ زیان کو کچھ خبر ہی نہ ہو۔ وہ اتنی ہی لاعلم ہو جتنی نظر آ رہی ہو۔

ایک شادی کے بعد اسے اپنے جذبات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا اس سے پہلے شاید وہ بدک جاتی اگر وہ کچھ ایسا کرتا تو۔ جب وہ قانونی اور شرعی طور پر اسے اپنا بنا لیتا تب اظہار کرنے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔ وہ اپنی محبت اور جذبوں کی طاقت سے اسے پگھلا لیتا۔ زیان شاید لڑکیوں کی اس قسم سے تعلق رکھتی تھی جو انجان بن کر فریق مخالف کی تڑپ سے لطف اندوز ہوتی ہیں۔ ورنہ ملک ایبک نظرانداز کیے جانے کے قابل تو نہ تھا۔ صنف نازک کی جو نگاہیں اس کی طرف اٹھتیں۔ ان میں تعریف ہوتی' ستائش ہوتی۔ اس کی بھرپور مردانہ وجاہت سے متاثر ہونے کا جذبہ ہوتا۔ بس زیان ہی تھی جس پہ اثر نہ ہوا تھا۔

✡ ✡ ✡

ملک ارسلان' عنیزہ قاسم کو انتظار سونپ کر بیرون ملک جا چکا تھا۔ وہ یونیورسٹی سے آکر بولائی بولائی پھرتی ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے تمام رنگ' خوشیاں' امنگیں ملک ارسلان اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ اسے سچ میں ایسا لگ رہا تھا وہ ملک ارسلان کے بغیر زیادہ جی نہیں پائے گی۔

ادھر قاسم صاحب نے اپنے دوستوں' جاننے والوں سے بیٹی کے رشتے کی پریشانی کا ذکر کیا ہوا تھا۔ وہ چاہ رہے تھے کوئی اچھا سا رشتہ ملے تو دیکھ بھال کر عنیزہ کو اپنے گھر کا کر دیں۔ کیونکہ وہ اب بیمار رہنے لگے تھے۔ اللہ کے سوا کسی کا آسرا نہیں تھا۔ وہ خود اپنے ماں باپ کے اکلوتے بیٹے تھے ادھر سے بیوی کے میکے میں بھی کوئی خاص رشتہ دار نہیں تھے۔ وہ بھی ان کی طرح اکلوتی تھیں۔ کینسر کے موذی مرض کے ہاتھوں لاچار ہو کر وہ ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں تب سے عنیزہ ان کی زندگی کا محور تھی۔ وہ اس کے لیے ماں اور باپ دونوں کا رول ادا کر رہے تھے۔ اسے تعلیم دلواتے ہوئے یونیورسٹی تک پہنچا دیا تھا اب ان کی دلی خواہش تھی کہ بیٹی اپنے گھر کی ہو جائے۔ دوستوں' جاننے والوں نے جو رشتے اب تک دکھائے تھے ان میں سے کوئی بھی انہیں اس حد تک پسند نہیں آیا تھا کہ وہ عنیزہ کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں تھے۔

✡ ✡ ✡

وہ غنودگی میں تھی جب اس کے کمرے کا دروازہ زور زور سے بجایا گیا۔ باتیں کرنے کی بھی آواز آ رہی تھی۔ ان میں سے ایک آواز تو عنیزہ کی تھی جبکہ دوسری نامانوس اجنبی مردانہ آواز تھی۔ اس نے دوپٹے کی تلاش میں بیڈ پہ ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ دوپٹا تکیے کے پاس پڑا تھا۔ اس نے اٹھا کر کندھے پہ ڈالا۔ کچھ دیر قبل ہی تو وہ سوئی تھی ابھی سہ پہر کے صرف چار ہی تو بجے تھے لمبے دوپہریں کٹنے کا نام نہ لیتی تھیں تھک ہار کر وہ سو جاتی۔

پتا نہیں اس طرح دروازے پہ دستک دینے والا کون تھا اس نے سوچتے ہوئے دروازہ کھولا۔ عنیزہ کے ساتھ نوجوان لڑکا کھڑا تھا سرخ و سفید رنگت اور دلکش مردانہ نقوش لیے وہ لڑکا زیان کو دیکھے جا رہا تھا وہ جھینپ گئی تھی کیونکہ اس کا انداز بے پناہ بے تکلفی لیے ہوئے تھا پر عنیزہ بالکل پرسکون نظر آ رہی تھیں۔

"تو یہ ہیں ہماری بھابھی زیان یعنی چاند کا ٹکڑا۔" آنے والے نے بڑی بے تکلفی سے اس کا ہاتھ خود ہی

پکڑ کر مصافحہ کیا اور پرجوش انداز میں خیر خیریت دریافت کی۔

چند منٹ بعد وہ زیان کے کمرے میں بیٹھا ہنس ہنس کر پاکستان آنے کے بارے میں بتا رہا تھا۔ یہ معاذ تھا' ملک ایبک کا چھوٹا بھائی' اس کا ذکر تواتر سے گھر میں ہوتا تھا۔ زیان کو اس کی بے دھڑک بے تکلفی کا سبب سمجھ میں آگیا تھا۔

''آخری پیپر دے کر میں نے بوریا بستر سمیٹا اور پاکستان بھاگا۔ مجھے اپنی بھابھی سے ملنا تھا۔ امی جان اور بابا سے مل کر سیدھا ادھر آرہا ہوں۔'' وہ روانی سے اور مسلسل بول رہا تھا۔

زیان اسے حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔ معاذ ایبک کے بالکل الٹ تھا۔ اس کے آنے سے گھر میں جیسے خوشیوں کی بارات اتر آئی تھی' ہر سو رونق تھی' وہ اپنے نام کا ایک ہی تھا زندہ دل' ہنوز سب کا دل خوش کرنے والا۔ اپنی شوخ اور ہر ایک سے جلد گھل مل جانے والی فطرت کی بدولت وہ زیان سے بھی بے تکلف ہو چکا تھا۔ آدھے گھنٹے میں ہی اس سے معلومات حاصل کر کے پوسٹ مارٹم کر چکا تھا۔

نہنال انڈسٹریل ہوم سے فارغ ہو کر گھر لوٹی تو معاذ رونق کا بازار گرم کیے بیٹھا تھا۔ اس پہ نظر پڑتے ہی معاذ نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکوڑے۔

''یہ کون ہے۔ جب میں گیا تھا تب تو نہیں تھی۔ کیا کوئی نئی نوکرانی رکھی ہے۔ واہ جی یہاں رہنے والے بڑے باذوق ہو گئے ہیں۔'' وہ بے تکان بولے جا رہا تھا۔ عنیزہ نے اس کی چلتی زبان کے آگے بند باندھا۔

''یہ نہنال ہے اور.....'' عنیزہ اس کے بارے میں ہوٹل میں ملنے والا قصہ گول کر کے باقی سب بتا رہی تھی۔ سن کر اس نے تاسف سے نہنال کی طرف دیکھا۔

''مس نہنال آپ کے بارے میں جان کر بہت دکھ ہوا ہے۔'' اس کے چہرے کے تاثرات لہجے کا ساتھ دے رہے تھے۔ نہنال اس کی فراٹے بھرتی زبان سے خائف ہو گئی تھی اس لیے دانستہ منظر سے غائب ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

ملک جہانگیر نے معاذ کی آنے کی خوشی میں سب دوستوں اور خاندان والوں کی دعوت کی تھی۔ معاذ صرف چند دنوں کے لیے آیا تھا اسے اپنی ہونے والی بھابھی سے ملنے اور دیکھنے کی جلدی تھی۔ زیان پہلی بار ملک ایبک کے سارے خاندان سے مل رہی تھی۔

پرپل کلر کی میکسی میں ملبوس وہ معاذ ملک کے ساتھ پورے گھر میں گویا اڑتی پھر رہی تھی۔ وہ ایک ایک فیملی ممبر کے پاس لے جا کر اس کا تعارف کروا رہا تھا۔ معاذ نے اپنی بے تکلفی اور بے پناہ خلوص کی بدولت اجنبیت کی بھاری دیوار گرادی تھی جو زیان نے از خود اپنے اردگرد تعمیر کر رکھی تھی۔ جو کام کوئی نہ کر سکا تھا وہ معاذ نے کر دکھایا تھا۔ زیان کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ آج اس کے چہرے پہ سختی اور اجنبیت کی بجائے نرمی اور گرم جوشی تھی۔

ایبک قدرے ہٹ کر الگ تھلگ کھڑا تھا۔ نہنال بھی وہیں چکرا رہی تھی۔ عنیزہ نے اس موقعے کے لیے اسے بہت خوب صورت اور مہنگا سوٹ دلوایا تھا۔ اس سوٹ کو زیب تن کرنے کے بعد وہ قابل توجہ بن گئی تھی۔

نہنال' ملک ایبک کی سمت ایک مخصوص حصے میں موجود گھوم پھر کر چیک کر رہی تھی کہ مہمانوں کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔

ابھی تک وہ بہت پرسکون تھی کیونکہ ملک ایبک' زیان کے بغیر اکیلا اس طرف کھڑا تھا۔ نہنال کا سارا سکون معاذ غارت کرنے آپہنچا۔ اس نے زیان کا ہاتھ پکڑا ہوا تھا۔ ایبک کو تلاش کرتے کرتے وہ سیدھا اس کے پاس آر کا۔

''لیں اپنی امانت۔ میں تعارف کروا کروا کے تھک گیا ہوں باقی کام آپ خود کریں'' معاذ نے زیان کا ہاتھ بڑی معصومیت سے ایبک کے ہاتھ میں لا تھمایا اور خود نہنال کی طرف بڑھ گیا۔

"مس نمناں مجھے کچھ پینے کو دیں پیاس سے دم نکلا جا رہا ہے۔" وہ پاس پڑی کرسی پہ گرنے والے انداز میں بیٹھ گیا جیسے بری طرح تھک گیا ہو۔ اس نے مڑ کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی کہ اس کی بے باک سی حرکت کا کیا انجام ہوا۔ وہ مزے سے نمناں کی طرف متوجہ تھا جس کی نگاہ بہانے بہانے سے ملک ایبک اور زیان کا طواف کر رہی تھی۔

ایبک نے نظر بھر کر غور سے زیان کو دیکھا وہ آج بہت قریب تھی معاذ کی شرارت سے کچھ سنہرے پل اس کی مٹھی میں قید ہونے جا رہے تھے۔ اس کا گلابی چہرہ سرخ ہو چلا تھا۔ ایبک نے اس کا ہاتھ بڑے زور سے دبایا وہ ہاتھ چھڑانا چاہ رہی تھی پر جانے ایبک کس موڈ میں تھا۔ شاید وہ سارے خاموش جذبوں کو کوئی زبان دینا چاہ رہا تھا۔ زیان اتنے مہمانوں کی موجودگی سے گھبرا رہی تھی۔ اس نے دوسرے ہاتھ کا ناخن ایبک کے ہاتھ کی پشت پہ مارا۔ یہ اس کی طرف سے احتجاج تھا۔ ایبک کی گرفت 'پرجوش اور مضبوط تھی کچھ کہتی ہوئی۔

اس کے ہاتھ میں گویا سارے جذبے سمٹ آئے تھے ہاتھ زبان بن گیا تھا۔ زیان بزور طاقت ہاتھ چھڑا کر تیزی سے دور ہوئی اور معاذ کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ نمناں معاذ کے لیے سوفٹ ڈرنک لے آئی تھی۔ معاذ کو گلاس تھماتے ہوئے اس نے ایک نظر زیان پہ ڈالی جہاں خفت اور گھبراہٹ تھی۔ دوسری نگاہ ملک ایبک کی طرف اٹھی جو استحقاق کے سب رنگ سمیٹے زیان کی طرف متوجہ تھا۔ اس کا دل دھڑ دھڑ جلنے لگا۔ معاذ سے ایبک کی جسارت پوشیدہ نہیں تھی۔

"بھابھی آج آپ نے اپنی نظر اتروا لینی ہے لوگوں کے دل بے ایمان ہو رہے ہیں۔" معاذ نے ملک ایبک لطیف سی چوٹ کرتے ہوئے زیان کو مشورہ دیا تو اسے غصہ آ گیا۔ تقریب کے دوران پہلی بار اس کا موڈ آف ہوا۔ ایبک اسے یوں دیکھ رہا تھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

معاذ نے نمناں سے پانی کا گلاس لے کر بیٹھنے کا اشارہ کیا "مس نمناں آپ تھک گئی ہوں گی۔ دو گھڑی دم لے لیں۔"

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"ویسے آج آپ بہت حسین و جمیل لگ رہی ہیں۔ اچھا آپ کہاں سے آئی ہیں آپ کے کتنے بہن بھائی ہیں کیا کیا کرتی ہیں آپ؟" معاذ کی فراٹے بھرتی زبان شارٹ ہو چکی تھی وہ نمناں سے بھرپور انٹرویو کے موڈ میں تھا۔ نمناں نے امداد طلب نگاہوں سے پاس کھڑے ایبک کی سمت دیکھا۔ اسے ترس سا آ گیا۔

زیان سے اس نے توجہ ہٹالی تھی۔

"معاذ ان کو عنیزہ چچی ساتھ لائی ہیں۔ میرے انڈسٹریل ہوم کا سب انتظام انہوں نے ہی سنبھالا ہوا ہے۔" ملک ایبک نے جواب دیتے ہوئے نمناں کو مشکل سے نکالا۔

"میں آؤں گا انڈسٹریل ہوم دیکھنے باقی بہت سی باتیں وہاں کروں گا۔" معاذ نے جھٹ پٹ آئندہ کا پروگرام دے ڈالا۔ نمناں نے متشکرانہ نگاہوں سے ملک ایبک کی سمت دیکھا تو زیان کے ہونٹوں پہ عجیب سی مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہو گئی۔ معاذ مسلسل بول رہا تھا اس کی بے تکلفی اور شرارتوں کا نشانہ اب نمناں تھی۔ وہ گھبرا رہی تھی کہ معاذ کے سامنے کوئی ایسی ویسی بات اس کے منہ سے نہ نکل جائے جو اسے ملک محل کے مکینوں کی نگاہوں میں مشکوک بنا دے۔ اور ملک ایبک کے سامنے تو بالکل بھی نہیں۔ یہی نمناں جو رنم تھی کبھی کسی سے نہ دبنے والی نہ ڈرنے والی۔ آج معاذ کے سامنے اس کی بولتی بند تھی۔

تقریب کے اختتام پہ معاذ 'زیان کا ہاتھ پکڑ کر اپنے کمرے میں لے گیا۔ اس نے نمناں کو بھی پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی کہ اسے کیوں بلوایا جا رہا ہے۔

"آپ دونوں خواتین تھک گئی ہوں گی اس لیے میں چاہتا ہوں کہ میوزک سے لطف اندوز ہوں" وہ ایسے بے تکلفی سے بولا جیسے وہ دونوں مل کر اس کے

ساتھ شروع سے ہی موسیقی کی محفلوں میں حصہ لیتی آ رہی ہوں۔ نیناں نے بے چارگی سے معاذ کی سمت دیکھا۔ چلو زیان تو اس کی ہونے والی بھابھی ہے مگر اسے معاذ کس کھاتے میں یہاں تک لایا ہے۔

اگر کوئی برا مان جاتا تو۔ اسے یہی فکر کھائے جا رہی تھی۔

معاذ نے ریحانہ کے دھوم دھڑکے والے سونگز چلا دیے۔ یہ رنم کی فیورٹ سنگر تھی یونیورسٹی جاتے ہوئے وہ اکثر گاڑی میں ریحانہ کو فل والیوم میں سنتی تھی۔ معاذ اب زیان کو اپنی فوٹوز دکھا رہا تھا اس کا ہر فوٹو کی تفصیلات بتاتے ہوئے انداز بیان اتنا دلچسپ تھا کہ زیان ہنس ہنس کر دہری ہو رہی تھی۔ "مس نیناں آپ کو انگلش آتی ہے" معاذ نے ایک دم سوال کیا تو وہ بوکھلا گئی۔ "نہیں تو۔"

"اچھا جس طرح آپ میوزک انجوائے کر رہی ہیں مجھے لگا کہ آپ کو آتی ہوگی۔ ویسے آپ نے پڑھا کتنا ہے؟"

"میں نے بی ایس آنرز کیا ہے" سچ بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔ ریحانہ کی پرشور آواز میں معاذ نے سنا ہی نہیں۔ اس نے شکر ادا کیا۔ معاذ کی بے تکلفی سے وہ ڈر گئی تھی۔ کیونکہ اس کی پوری توجہ نیناں کی طرف تھی۔ زیان کو جانے کیوں نیناں کی موجودگی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ معاذ اپنی ہانکے جا رہا تھا۔

"میں نے سوچا تھا یہاں آ کر بھائی جان کی شادی کی دعوتیں اڑاؤں گا مگر وہ بھی ابھی میرے نصیب میں نہیں ہیں.... کہتے ہیں ابھی شادی نہیں کرنی۔" اس نے منہ بنا کر چہرے پہ مصنوعی اداسی طاری کر لی۔ زیان کی آنکھیں سلگ اٹھیں۔

معاذ اپنے بیگ سے زیان کے لیے چاکلیٹس اور دیگر گفٹس نکال رہا تھا۔ معاذ کی بات پہ نیناں کی آنکھوں میں چمک ابھری جیسے اس نے کوئی من پسند بات کہہ دی ہو۔ اب اس کے تاثرات میں دلچسپی تھی۔ معاذ بے دھیانی اور بے تکلفی میں کام کی باتیں کر رہا تھا۔ زیان کاؤچ سے اٹھی۔

"معاذ میں جا رہی ہوں۔ سر میں اچانک درد ہو رہا ہے۔"

"بھابھی اپنے گفٹس تو لے جائیں۔"

"بعد میں لے لوں گی۔" نیناں نے اسے اٹھتے دیکھا تو وہ بھی معاذ کے کمرے سے نکل آئی۔ وہ آخری سیڑھی پہ تھی جب اس نے ملک ایبک کو اس سمت آتے دیکھا اس کا رخ بھی سیڑھیوں کی طرف تھا۔ نیناں کے آگے بڑھتے قدم خود بہ خود ہی سست پڑ گئے۔

زیان 'معاذ کے روکنے کے باوجود رکی نہیں۔ وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہی تھی جب اوپر کی طرف آتے ایبک سے اس کا ٹکراؤ ہوا وہ ادھر ہی رک گئی تھی کیونکہ ایبک اس کے راستے میں حائل تھا وہ بالکل درمیان میں تھا 'دائیں بائیں اتنی جگہ نہیں تھی کہ وہ سائیڈ سے ہو کر نکل جاتی۔ چند ثانیوں کے لیے دونوں کی نگاہیں آپس میں ملیں۔ زیان کی آنکھیں لال ہو رہی تھیں جیسے وہ اندر ہی اندر کسی کرب کو برداشت کر رہی ہو۔ اس نے فوراً" پلکوں کی چلمن گرائی اور ایبک کو ایک ہاتھ سے پرے ہٹاتے ہوئے نیچے جانے کی کوشش کی۔ اس کے مہکتے رنگین آنچل کا کونہ ایبک کے بازو سے چھو گیا۔ وہ فوراً" سائیڈ پہ ہوا۔ زیان سیڑھیاں اتر گئی تھی۔ ایبک کو اس کی نگاہوں میں خاموش شکوؤں کا سیلاب مچلتا نظر آیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا وہ جیسے ابھی رو پڑے گی اس کی پلکوں کو ہلاتے ہی فوراً" موتی ٹپک پڑیں گے۔ نیچے کھڑی نیناں نے یہ تصادم دیکھا۔ ایبک کی پشت اس کی سمت تھی پر زیان اس کے سامنے تھی۔

اس کی لال لال آنکھوں نے نیناں کو عجیب سی تسکین بخشی تھی۔ وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ایبک نے آخری سیڑھی چڑھ کر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ زیان برآمدے سے گزر رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا زیان کے پیچھے جائے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنی اس خواہش پہ قابو پایا۔ اور معاذ کی طرف بڑھ گیا جو زیان کے لیے لائے گئے گفٹس کو دیکھ رہا تھا۔

"بھائی جان یہ دیکھیں میں نے بھابھی کے لیے

اتنے شوق سے یہ چیزیں لیں نکال رہا تھا انہیں دینے کے لیے کہ چلی گئیں۔" اس نے ایبک کو دیکھتے ہی شکائتی انداز میں کہا۔

"مجھے دو میں خود دے دوں گا" ایبک نے آفر کی۔

"آپ کو دیکھ کر وہ نروس ہو جائیں گی یہ نہ ہو لینے سے ہی انکار کر دیں۔" معاذ شرارت سے ہنسا۔

"نہیں نروس ہو گی تم فکر مت کرو" ایبک نے اسے تسلی دی۔ "آپ ان کے ساتھ انڈر سٹینڈنگ ڈیولپ کریں گھومیں پھریں لانگ ڈرائیو پہ لے جائیں بھابھی کو۔ ڈنر کریں ایک ساتھ۔ کیونکہ بھابھی مجھے بہت شائے لگتی ہیں۔" معاذ نے مشورہ دیا۔

"تم مجھے اپنے ماحول کے مطابق ایڈوائس دے رہے ہو یہ ہمارا گاؤں ہے کوئی یورپ نہیں ہے۔" ایبک نے اسے سرزنش کی تو اس نے منہ بنا لیا۔

✡ ✡ ✡

آج سامنے والے کمرے کی سب لائٹس آف تھیں۔ کھڑکیاں کھلی تھیں، کمرے سے اندر مکمل طور پہ اندھیرا تھا۔ ایبک دونوں ہاتھ ریلنگ پہ ٹکائے وہ ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ زیان شاید اس کی ہاتھ دبانے کی جرات کو مائنڈ کر گئی تھی۔

تب ہی تو سیڑھیوں پہ سامنے ہوتے وقت اسے شکوہ کناں نگاہوں سے دیکھا تھا۔ حالانکہ ایبک نے محض شرارت میں زیان کا ہاتھ دبایا تھا۔ معاذ کی وہ حرکت اچانک اور بے ساختہ تھی اس نے زیان کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں لا تھمایا تھا۔

وہ پہلی بار اتنے قریب آئی تھی کہ ایبک اس کا لمس محسوس کرنے کے قابل ہوا تھا۔ اس کا نازک گلابی مخروطی انگلیوں والا ہاتھ، ایبک کے ہاتھ کی گرفت میں آ کر جیسے احتجاج کر رہا تھا۔ زیان نے ناخن اس کے ہاتھ پہ مارا تھا۔ ایبک نے ہاتھ آنکھوں کے سامنے کیا جہاں ناخنوں سے لگنے والی خراشیں بہت واضح تھیں۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔ صرف ہاتھ دبانے پہ اسے اتنا تاؤ آیا تھا۔ کیا واقعی وہ اسے ناپسند کرتی ہے؟

ایبک کو رہ رہ کر یہ سوال پریشان کر رہا تھا۔

✡ ✡ ✡

وہاب کے درشت تیور اور دھمکانے والے انداز دیکھ کر بوا اور زرینہ سچ مچ سہمی ہوئی تھیں۔

"مجھے ہر حال میں زیان کا پتا چاہیے خالہ اور یہ مت کہنا کہ مجھے نہیں معلوم" اس کے تاثرات بہت سفاک اور سرد تھے۔

"وہاب میاں ہمیں نہیں معلوم" بوا نے کمزور سے لہجے میں ایک بار پھر اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو وہاب غصے سے گھورتا ان کے پاس آ رکا۔

"بڑھیا تم تو خالہ کے ہر راز میں شریک ہو۔ تم مجھے بتاؤ گی کہ زیان کہاں ہے، کہاں چھپایا ہے تم نے اسے بولو۔" وہاب کا لہجہ بدتمیزی اور سفاکی کو چھو رہا تھا۔

"وہاب بوا کے ساتھ بدتمیزی مت کرنا چھوڑ دو انہیں۔" زرینہ سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ بوا کے ساتھ اس کا لب ولہجہ بہت نامناسب تھا۔

"تو خالہ تم تمیز سے بتا دو کہ کہاں ہے زیان؟" وہ طنزیہ انداز میں بولتا ان کے قریب چلا آیا۔

"زیان اپنی ماں اور سوتیلے باپ کے پاس ہے۔" دل کڑا کے انہیں یہ سچ بولنا ہی پڑا ورنہ وہاب سے کچھ بعید نہیں تھا۔

"کیسے گئی وہ اپنی ماں کے پاس۔ یہ ایک دم سے اس کی ماں کہاں سے ٹپک پڑی۔ پہلے کہاں سوئی ہوئی تھی۔"

"اس کی ماں ٹپکی نہیں ہے پہلے سے تھی اور اپنی بیٹی سے ملنے کے لیے تڑپ رہی تھی۔" زرینہ بیگم نے بڑی مشکل سے خون کے گھونٹ پی کر وہاب کا یہ انداز برداشت کیا تھا۔

"جب اس کی ماں آئی تو مجھے کیوں نہیں بتایا کیوں جانے دیا اسے۔ پتا نہیں تھا کہ وہ میرے ہونے والی بیوی ہے۔ اور اس کی ماں کیوں لینے آئی اسے۔ خالو کی وفات کا کس نے بتایا اسے؟" وہاب کے اعصاب غصے سے تن رہے تھے۔

"میں نے بتایا اسے اور زیان کی ماں کو میں نہیں روک سکتی تھی وہ اس کی ماں ہے۔"

"خالہ بڑے خدمت خلق کے شوق چڑھے ہیں تمہیں۔ زیان کو ساری عمر تم نے خون کے آنسو رلایا چین سے ٹکنے نہیں دیا اور اب اچانک انسانیت جاگ پڑی۔ پہلے تو ہمیشہ اسے ماں کے طعنے دیتی رہیں کہ تمہاری ماں ایسی تمہاری ماں ویسی۔" وہاب طنزیہ انداز میں ماضی کا آئینہ زرینہ بیگم کو دکھایا تو وہ نظر چرا گئیں۔

"یہ میرا اور زیان کا معاملہ تھا تم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہو۔" اندر سے خود کو مضبوط کرتے ہوئے زرینہ نے اس کی بات کا جواب دیا۔

"میں اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ خالہ بتاؤں گا آپ کو۔ پہلے زیان سے نمٹ لوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

"کیا کرو گے تم؟"

"زیان میری ہونے والی بیوی ہے سب سے پہلے جا کر اسے واپس لانا ہے مجھے ایڈریس چاہیے۔"

"ہمیں ایڈریس نہیں معلوم۔ زیان کا سوتیلا باپ خود اسے لینے آیا تھا۔" زرینہ کا لہجہ کافی مضبوط تھا۔

"خالہ مجھے ایڈریس چاہیے ورنہ میں کسی کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ پورے گھر کو آگ لگا دوں گا۔" وہ زرینہ کے قریب جا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بول رہا تھا۔ زرینہ بیگم کو معلوم تھا کہ وہاب جو کہتا ہے وہ کرتا بھی ہے۔

"زیان کی ماں کوئی معمولی عورت نہیں ہے۔ نہ اس کا سوتیلا باپ گرا پڑا ہے۔ جاگیر دار ہے وہ۔" زرینہ نے اپنے تئیں اسے متاثر کرنے کی کوشش کی۔

"ہاہاہاہا۔۔۔" وہاب نے بے ڈھنگا قہقہہ لگایا۔ "خالہ تمہیں تو زیان کے بارے میں سب کچھ پتا ہے۔"

"ہاں پتا ہے اور اس بھول میں مت رہنا کہ تم وہاں تک پہنچ کر زیان کو واپس لا سکو گے۔"

"خالہ میرا نام وہاب ہے اور زیان میری ہونے والی بیوی ہے۔ اسے کیسے اور کس طرح واپس لانا ہے یہ میرا کام ہے۔ بس مجھے وہاں کا پتا دو۔"

"وہاب میاں، چھوٹی دلہن کو کچھ نہیں معلوم ہوا" زرینہ بیگم کی مدد کے لیے آگے بڑھیں۔

"تو پھر کسے معلوم ہے۔ یہ معلوم ہے کہ زیان کی ماں کوئی معمولی عورت نہیں ہے اس کا باپ جاگیر دار ہے۔ بس پتا نہیں معلوم۔" وہ خوفناک طنزیہ ہنسی ہنس رہا تھا۔ زرینہ اور ہوا دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہاب ٹلنے والا نہیں تھا۔ اس نے ایڈریس لے کر ان دونوں کو چھوڑا۔

"خالہ ابھی بہت سے حساب آپ کی طرف باقی ہیں۔ لیکن پہلے زیان والا معاملہ سیٹ کرلوں۔" وہ اب قدرے پر سکون نظر آرہا تھا۔

"خالہ آپ کے اس گھر کی موجودہ مالیت کتنی ہو گی؟" اس نے اچانک سوال کیا تو زرینہ چونک گئیں۔

"مجھے کیا پتا؟" وہ تیکھے لہجے میں بولیں۔

"خالہ اگر اس کو آپ فروخت کردیں تو بہت اچھی قیمت پہ بک جائے گا۔"

"مجھے اپنا گھر نہیں فروخت کرنا یہ میرے بچوں کا ہے۔ آسرا ہے ہمارا۔"

"ٹھیک ہے خالہ آپ اس پہ سوچ لینا۔ میں جا رہا ہوں پھر ملاقات ہوگی۔" وہ گیٹ سے باہر نکلا تو زرینہ نے خود دروازہ لاک کیا۔ شکر ہے کہ تینوں بچے اسکول میں تھے ورنہ وہاب کا یہ انداز و تیور دیکھ کر سہم جاتے۔

"بوا اب کیا ہوگا؟ وہاب مردود کی نظر تو اب اس گھر پہ ہے۔" زرینہ کو اب گھر کی فکر لگ گئی تھی۔

"میں تو کہتی ہوں کہ خاموشی سے یہاں سے نکل چلیں تاکہ وہاب میاں سے جان ہی چھوٹ جائے۔" بوا نے مشورہ دیا۔

"بوا گھر چھوڑ کر جائیں گے تو وہاب کا کام آسان ہو جائے گا۔ وہ اس گھر پہ قبضہ کرلے گا۔" زرینہ بہت فکر مند تھیں۔

"چھوٹی دلہن میری مانیں تو اس گھر کو فروخت کر دیں۔ ورنہ وہاب میاں آپ کو گھر سے بھی محروم کر دیں گے۔"

"بوا آپ ٹھیک کہتی ہیں۔ اس کا شک تو مجھے پہلے سے تھا کیونکہ روبینہ آپا بھی بہانے بہانے سے بہت بار مجھے اپنے گھر رہنے کے لیے کہہ چکی ہیں۔ لیکن کیا کروں میں کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے۔ میں اکیلی عورت کہاں اس گھر کے لیے گاہک ڈھونڈوں گی۔"

"آپ امیر میاں کے وکیل سے بات کریں انہیں اپنی پریشانی بتائیں۔ وکیل صاحب بھلے مانس آدمی لگتے ہیں مجھے۔"

"بوا یہ بات آپ نے اچھی کہی ہے۔ میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی کہ مجھے بیگ صاحب سے رابطہ کرنا چاہیے۔" زرینہ کے لہجے میں ایک دم امید جاگی۔

"میں ابھی بیگ صاحب سے بات کرتی ہوں۔" زرینہ نے سیل فون اٹھا کر وکیل کا نمبر ملانا شروع کر دیا۔

☆ ☆ ☆

زیان تکیے میں منہ چھپائے خوب اونچی اونچی آواز میں رو رہی تھی۔ تکیے نے اس کا بھرم رکھ لیا تھا ورنہ اس کی آواز سب کو متوجہ کرچکی ہوتی۔ کمرے میں لگا میوزک سسٹم آن تھا۔ جانے کیوں آج اسے اتنا زیادہ رونا آرہا تھا۔ امیر علی کی وفات کے بعد آج وہ پہلی بار اتنا زیادہ رو رہی تھی۔ کوئی ٹھیس تھی یا پچھتاوا جس کی وجہ سے دل درد کا ٹکڑا بنا ہوا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پارہی تھی۔

عین جس لمحے وہ رو رہی تھی اسی وقت ملک ایبک' عنیزہ سے اسی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ کوئی ضروری بات کرنے آیا تھا۔ عنیزہ نے بخوشی اسے زیان کے کمرے میں جانے کی اجازت دی تھی۔ ایبک نے بات ہی ایسی کی تھی وہ خود اب امید و بیم کی حالت میں تھیں۔

زیان کو ایسے محسوس ہوا جیسے دروازے پہ دستک ہو رہی ہے۔ اس نے تکیے سے منہ باہر نکالا۔ واقعی سچ مچ دستک ہو رہی تھی اس کا وہم نہیں تھا۔ اس نے بے دردی سے دوپٹے سے آنکھیں رگڑیں اور دروازہ کھول کر دیکھے بغیر باتھ روم میں گھس گئی۔ اسے نہیں معلوم کہ کون آیا تھا۔ واش بیسن کا نل کھول کر اس نے لگاتار ٹھنڈے پانی کے چھپاکے ہاتھ بھر بھر منہ پہ مارے۔ باتھ روم کا دروازہ ہلکا سا کھلا ہوا تھا زیان کے دوپٹے کی ہلکی سی جھلک ایبک کو نظر آئی۔ کمرے میں اداس آواز بکھری ہوئی تھی جیسے پوری فضا سوگ منا رہی ہو۔

ایبک شدت سے زیان کے باہر آنے کا منتظر تھا۔ چند لمحے بعد منہ ہاتھ دھو کے فارغ ہونے کے بعد وہ باہر نکلی تو سچ مچ ملک ایبک کو سامنے دیکھ کر پچھتائی۔ ایبک اس کی شدت گریہ سے لال آنکھیں دیکھ چکا تھا پھر گانے کے اداس سے بول۔ ملک ایبک کو کوئی حق نہیں پہنچتا تھا کہ اس کے روم میں آئے۔

☆ ☆ ☆

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں)

☆ ☆ ☆

روزینہ حنیف
مجھے ایسے پیا کا پیار ملے

محبت ایک ایسی داستاں ہے جو ازل سے شروع ہوئی اور ابد تک رہنے والی ہے۔ دنیا میں سب آتا جاتا ہے مگر محبت' چاند' سورج اور روشنی ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گی۔ جیسے خدا کبھی نہ ختم ہونے والی محبت کا سب سے مضبوط اور ناقابل تسخیر ایسا کردار ہے کہ کائنات کے ذرے ذرے میں اس کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے باقی سب گم کردہ راہ! اسے ایسا لگتا تھا جیسے محبت کا جو سمندر اس کے دل میں ٹھاٹھیں مارتا ہے اس کی ایک بوند بھی اس کی محبوبہ کو چھو کر نہیں گزرتی۔ پھر بھی اس نے جیسے آخری امید پر کہا۔

"میں تمہارے بغیر مرجاؤں گا زریں!" بڑی تھکن تھی کمال کے لہجے میں۔

"ایسا کیوں کہتے ہو.....!" زریں کی بے نیازی برقرار تھی۔

"یہ آخری الفاظ آخری سطح ہے۔ جس کے بعد میرے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں۔ تم آج نہ مانی تو میں ہمیشہ کے لیے اس دنیا سے چلا جاؤں گا.....!" کمال نے کمال بے بسی سے کہا۔

"محبت میں مرنا کبھی بھی مشکل نہ تھا۔ مشکل ہے محبت میں جینا.....!" زریں نے غالباً" پہلی بار سنجیدگی سے کہا۔

"تم کسی اور کی ہو جاؤ تو میں کیسے..... کیسے جی سکتا ہوں بھلا۔ یہ احساس ہی مجھے جاں بلب کرنے کو کافی ہے کہ تم میری نہیں ہو سکتیں..... اور میں تمہیں چشم تصور سے کسی اور کی باہنوں میں سمٹتے ہوئے دیکھوں۔" وہ رکا اس نے باہنیں ہوا میں پھیلا دیں۔

"اف! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔ کہ محبت میں اتنا حوصلہ نہیں ہوتا۔ یوں ہر روز ایک اذیت ناک تصور سے مرتے رہنے سے بہتر ہے کہ میں ایک ہی جھٹکے میں اپنی جان دے دوں.....!"

درختوں کے بیچ سے ہوا اس خموشی سے گزری کہ ایک پتا تک نہ ہل سکا۔ کوئی چیخ زمین و آسمان کے نیچے سے سرک گئی عین دبے پاؤں۔ بنا آواز کے۔ سینے میں گھٹی ہوئی سی۔ پھولوں نے مہیب اداسی سے ادھوری انگڑائی لی۔

"یہ محبت ہی ہے کمال کہ مجنوں نے لیلیٰ کو۔ رانجھے نے ہیر کو اور مہینوال نے سوہنی کو دوسرے کی ہوتے ہوئے دیکھا اور یہ دکھ کسی زہریلے پل اور امرت کی مٹھاس کی طرح جیسا تھا۔ تو کیا وہ محبت نہیں تھی!"

"اے عورت! تو کتنی وافر اور وسیع ہے' تیرے سینے میں کیسی بارش ہے جو برستی ہے اور دکھائی نہیں دیتی۔ یعنی یہ تیری کیسی عجیب خواہش ہے کہ تو چاہتی ہے ایک مرد تیرا مالک بن جائے اور دوسرا تیرے فراق میں راتیں سیاہ کرے۔ بے چینی سے مچلے اور اس کا سارا وجود کرب سے دکھتا ہوا پھوڑا بن جائے وہ نہ جی سکے نہ مر سکے۔ یہ محبت نہیں خود غرضی ہے۔" کمال کو یکایک طیش آگیا۔

"بکومت ایسی ہی اذیت عورت نے بھی جھیلی انار کلی کے روپ میں۔" زریں کا اطمینان دیدنی تھا۔

"یہ سچ نہیں ہے۔ یہ سچ نہیں ہے' بخدا یہ سچ نہیں ہے۔ انار کلی کے دیوار میں چنے جانے تک صاحب عالم شہزادہ سلیم نے کسی دوسری عورت کو اپنی زندگی میں داخل نہ ہونے دیا تھا۔ کوئی مرد محبت میں اتنا خود غرض کبھی نہیں ہوا کہ وہ شادی کسی اور سے کرے اور محبت کسی اور سے۔ کیا تم.....!" وہ ایک دم زریں کے سامنے کھڑا ہوا پھر دو زانو بیٹھتا ہوا بولا۔

"تم بھی ایسا ہی کرو گی۔ محبت کی اس کہانی کا انجام مختلف نہیں ہو سکتا زریں!"

"ہرگز نہیں۔ دریا الٹا چل سکتا ہے۔ سورج کی کرن تھم سکتی ہے مگر محبت کی ریت بدلی نہیں جا سکتی یہ اٹل ہے اور ہمیشہ اٹل رہے گی۔ مرد کا نصیب ہے کہ وہ اپنی محبوبہ دل نواز کو کسی اور کی ملکیت میں جاتے ہوئے دیکھے۔ اور..... اور..... بھلا نصیبوں کو کوئی کیسے بدل سکتا ہے نادان لڑکے!" زریں کی آواز میں جیسے اداسی نے پہلی بار کروٹ لی۔

"تو کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟" وہ قدرے خشک لہجے میں اس طرح بولا جیسے اس کی آنکھیں زریں کے چہرے کا طواف کر رہی ہوں۔

"میں محبت کرتی ہوں۔ صرف تم سے کمال صرف تم سے۔ میرے دل میں تمہارے علاوہ کوئی نہیں ہے میری ہر سانس پر صرف تمہارا ہی نام لکھا ہے۔ صرف تمہارا۔۔۔!"

"اف۔۔۔ زریں۔۔۔ تمہاری باتوں نے مجھے ہمیشہ دیوانہ بنایا ہے۔ اتنی بے کنار محبت اور پھر بھی تم اس گھٹیا حامد سے شادی کر رہی ہو؟ کتنی عجیب بات ہے؟"

کمال کے چہرے پر الجھن نے اژدھے کی طرح منہ کھولا اور اس کے حسین چہرے کا سارا حسن نگل گئی۔

"ہیں یہ حامد کہاں سے آگیا بیچ میں۔۔۔" فریسا کا فلو ٹوٹ گیا اور وہ جھنجلا کر بولی۔

"ارے یار یہ پتا نہیں اس گدھے رامس نے کیا کیا اول جلول لکھ مارا ہے شکل سے ہی پٹا ہوا مجنوں لگتا ہے کمینہ۔" آیان بھی جھنجلا گیا تھا۔

"لیکن سچ کہوں تو مجھے یہ سب پڑھ کر بڑا مزا آرہا تھا۔"

"او اچھا تو تمہیں لگا تم کوئی لیلیٰ یا ہیر وغیرہ قسم کی کوئی چیز ہو!"

"کیوں نہیں ہو سکتی کیا؟" فریسا جیسے ڈٹ گئی۔

"بس بس منہ دھو رکھو۔۔۔ یہ سب کتابی اور خیالی باتیں ہیں۔۔۔ اور ڈرامے بھی بس ڈرامے ہی ہوتے ہیں پتا نہیں کون سے زمانوں کی باتیں ہیں جو اب تک لوگ لکھ رہے ہیں۔ رامس بھی نا۔۔۔ کیا کہوں اسے۔"

"اچھا بس بس اب زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ چلو آگے بڑھو۔۔۔ ویسے بھی صرف تین دن باقی ہیں اور تمہیں تو اب تک کچھ بھی یاد نہیں ہوا اسٹیج پر کھڑے ہو کر بھول جانے سے بہتر ہے اچھی طرح یاد کرلو۔۔۔"

"ٹھیک ہے کرتے ہیں۔۔۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا ایک کپ چائے مل جاتی تو۔"

"جب سے آئے ہو دو بار چائے پی چکے ہو اب کیا ہوٹل سمجھا ہوا ہے تم نے میرے گھر کو۔" فریسا چڑنے لگی۔

"تو میں نے تو کہا تھا تم میرے گھر آجاؤ۔۔۔ قسم سے دو دو منٹ بعد چائے پلاتا۔۔۔ مگر تمہیں تو۔۔۔ امی اجازت نہیں دے رہیں یار" آیان نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب اور بکواس نہیں میں لاتی ہوں چائے۔۔۔" اس نے چائے کو چبا کر کہا۔

"جیتی رہو میری بچی۔۔۔" آیان اسے اور چھیڑنے لگا اور وہ اسے منہ چڑا کے اندر چلی گئی۔

"چلو اب شروع کرو۔۔۔" چائے دینے کے کچھ دیر بعد فریسا نے کہا لیکن آیان نے اب تک اپنی چائے ختم نہیں کی تھی۔ "اب پی بھی چکو نا۔۔۔ مجھے شام کو امی کے ساتھ ڈاکٹر کے ہاں بھی جانا ہے" وہ جھنجلا کر بولی۔

"اچھا شروع کرو تو ہم کہاں تھے۔۔۔ ہاں یہ" آیان نے کہا۔ "تمہاری باری ہے۔"

"میں مجبور ہوں کمال۔ بے حد مجبور!" زریں کی آواز میں سینکڑوں غموں کی آہیں اور سسکاریاں در آئیں۔

"مجبور۔۔۔! محبت کسی مجبوری کو نہیں مانتی۔ ہم بھاگ چلتے ہیں یہاں سے کہیں بہت دور جہاں ہمارا کوئی رقیب نہ ہو کوئی مجبوری ہماری محبت کو یوں ہڑپ نہ کرسکے۔ کیا تمہیں نہیں لگتا زریں کہ محبت میں اپنے گھروں سے بھاگنا اور محبت کے دشمنوں سے بغاوت کرنا بھی اٹل روایت ہے۔ کیوں صحیح کہہ رہا ہوں نا میں۔۔۔؟" کمال کے لہجے میں ایک ان دیکھا فخر سرسرایا۔

"ہاں ایسا تو ہے۔ مگر ڈرتی ہوں کہ اس طرح میں اکیلی رہ جاؤں گی بالکل اکیلی۔۔۔ جو میں ہونا نہیں چاہتی۔ میرے محبوب!" زریں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی نمی تیر گئی۔

"یہ کتنی عجیب بات کی تم نے زریں۔۔۔ میں بھلا تمہیں اکیلا چھوڑ کے جا سکتا ہوں۔۔۔ کیا تم مجھے بے وفا اور ہرجائی وغیرہ سمجھتی ہو!" کمال نے اپنے اندر اٹھنے والے اس غصے پر پوری طرح قابو پا کر کہا جو زریں کی اس احمقانہ بات سے کھول اٹھا تھا۔

"نہیں کمال میں تمہیں ہرجائی اور بے وفا نہیں سمجھتی۔"

"تو پھر یہ بے سروپا بات کرنے کا مطلب!" کمال نے بعجلت کہا۔

"تم ہمیشہ بھول جاتے ہو کہ میں چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن ہوں۔ وہ ہمیں ڈھونڈ نکالیں گے اور پھر تمہاری جان! جان آفریں کے سپرد کرنے سے انہیں کوئی نہ روک سکے گا۔ میں یہ سوچ کر کبھی سکھ سے نہ جی سکوں گی کہ تمہیں میری وجہ سے ہلاک کر دیا گیا۔ کبھی نہیں۔ کبھی بھی نہیں.....!"

"تو کیا یہ تمہیں منظور ہے کہ میں تڑپ تڑپ کر، بلک بلک کر، پاؤں رگڑ رگڑ کر، مل مل کر کے، سسکتا ہوا۔ تمہاری جدائی اور اس احساس کے نیچے دب کر جان دے دوں کہ تمہارا یہ پھول سا کومل جسم کسی اور کی باہنوں میں ہے....." کمال نے افسردگی کے سب احساسات جمع کر دیے۔

"لیکن اس طرح تم زندہ تو رہو گے نا کمال۔ میں سوہنی کی طرح کبھی کبھی تم سے ملنے آتی رہوں گی۔ سچ کہتی ہوں۔" زریں کے لہجے اور آنکھوں میں امید باقی تھی۔

"جسے تم زندگی کہتی ہو وہ موت سے بھی بدتر ہے میری دلربا..... اس سے وہ موت کہیں زیادہ حلاوت انگیز ہے جو تمہارے ساتھ تمہارے بھائیوں کے ظلم اور بربریت کے نتیجے میں میرا مقدر بنا دی جائے کم سے کم اس طرح میں اس احساس سے تو نجات حاصل کر لوں گا کہ تم کسی اور کی ملکیت ہو!" کمال نے پھر ایک مرتبہ وہی بات دوہرا دی جو اس کی زندگی کا سب سے زیادہ تکلیف دہ احساس تھی۔

"صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم قیس، رانجھے اور مہینوال کی طرح میری جدائی میں جینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ تمہیں محبت کے دکھ سے زیادہ محبت میں ملی ہوئی موت سے دلچسپی ہے۔ میں..... میں تمہیں ایسا کٹھور نہیں سمجھتی تھی تم میری زندگی کو دوزخ بنانے پر آمادہ ہو!" زریں بھل بھل کر کے رو پڑی۔

"اچھا تم مت رو میرا دل اداس ہوتا ہے تمہارے یہ موٹے موٹے آنسو دیکھ کر۔" وہ کچھ دیر چپ رہا۔

سکوت کے اس منظر میں اشجار کے دامن میں مسکراتے پھولوں نے جیسے سانسیں لینا چھوڑ دیں۔ وہ منتظر تھے کہ اس عظیم محبت کا انجام کیا ہوتا ہے اس لاحاصل بحث کو کمال اپنے کمال ہنر سے جیت لیتا ہے یا زریں اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

"ایک حل ہے.....؟" وہ برستے سناٹے کے بھیتر سے بولا۔

"وہ کیا.....!" زریں اپنے آنسو صاف کر چکی تھی اور اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"تم شادی کی پہلی رات حامد کو زہر دے دینا.....!"

زریں کا چہرہ فق ہو گیا۔ "یہ زہر آئے گا کہاں سے؟"

"میں لا کر دوں گا تمہیں.....!" کمال نے سوچتے ہوئے کہا۔

"اور پھر میں جو جیل کی سلاخوں کے پیچھے سڑوں گی اس کا کیا.....؟" وہ روکھائی سے بولی۔

"تب میں تمہاری جدائی میں رو رو کے جی لوں گا.....!"

"یعنی میری جدائی۔ اس شکل میں منظور ہے تمہیں.....؟"

"ہاں..... کم سے کم اس طرح مجھے اس جان لیوا احساس سے تو نجات مل جائے گی کہ تم کسی اور کی باہنوں میں....."

"شٹ اپ۔ شٹ اپ کمال۔ یہ سراسر خود غرضی ہے۔ سچی محبت ایسی خود غرض نہیں ہوتی۔ میں یہ نہیں کر سکتی۔ یہ سب..... کیونکہ تم مجھ سے سچی محبت نہیں کرتے۔" زریں نے منہ پھیر لیا۔

"خود غرض تو تم ہو جو مجھے اذیت کے جہنم میں دھکیلنا چاہتی ہو!" کمال نے شعلے برساتے لہجے میں کہا۔

"میں تمہیں قیس، رانجھا اور مہینوال بنا رہی ہوں اور تم مجھے قاتلہ بنانا چاہتے ہو۔ تم ہی نہیں تمہاری محبت بھی تاریخ سے بچھڑ چکی ہے۔ دفعان ہو جاؤ۔

رذیل میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتی۔" وہ اپنی انا کی پھنکار سے کانپنے لگی۔

"تم جیسی لڑکی سے مجھے بھی سچی محبت کی توقع نہیں تھی جو محبت کا دم مجھ سے بھرتی ہے اور شادی حامد سے کرتی ہے، خود غرض عورت تم تاریخ کا نوحہ ہو....!"

دونوں نے جھٹ پٹ اپنے اپنے موبائل نکالے اور دیر تک کچھ ڈھونڈنے کے بعد نمبر ملائے۔ زریں بولی۔

"اوہ.... اظفر مجھے یقین ہو گیا کہ تم ہی مجھ سے سچی محبت کرتے ہو۔ میں یہاں سٹی پارک میں تمہاری منتظر ہوں بے بی۔"

اوہ.... عاشی.... تم اب تک آئیں نہیں۔ تمہارا ٹائم تو اوور ہو رہا ہے جان۔ محبت میں تو بڑی تڑپ ہوتی ہے پھر تم لیٹ کیوں ہوئیں ہم نے آج آٹھ بجے کا ہی وقت طے کیا تھا....!"

"میں جلدی سے آجاؤں....!" دوسری طرف سے ملنے والے جواب کے بعد کمال خوشی سے جھومنے لگا۔

کچھ دیر بعد۔ اشجار ہواؤں سے لرز اٹھے۔ جھکڑ سے چل پڑے۔ پھولوں کی ٹہنیوں میں لرزش طاری تھی.... ایک افسردہ پھول نے چاند کی طرف دیکھا اور دل مسوس کے رہ گیا کہ چاند پوری ڈھٹائی اور بے شرمی سے مسکرا رہا تھا۔

ڈراما ختم کرتے ہوئے بھی آیان کی زور کی ہنسی چھوٹ گئی.... "سچ میں یہ ڈراما تو مجھے مزاحیہ لگتا ہے" وہ ہنسی سے دہرا ہوتا ہوا بولا۔

"اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے؟" فریسا آیان کو بے تحاشا ہنستا دیکھ کر چڑ کر بولی۔

"تم جو بھی کہو یہ رامس کا بچہ ہے بڑا مسخرہ۔"

"تم ہو کیا چیز آیان کبھی تمہیں رامس کوئی پرانی روح لگنے لگتا ہے کبھی پٹا ہوا مجنوں اور اب مسخرہ.... خیر میرا خیال ہے اب ہم نے کافی یاد کر لیا اور تمہاری چائے بھی ختم ہو چکی ہے مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں اس لیے...."

"دفع ہو جاؤ.... یہی کہو گی نا.... چلو پھر ٹھیک ہے تم اپنے کام کرو میں چلتا ہوں" آیان نے سنجیدگی سے کہا اور جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

فریسا کو آیان کی یہ غیر سنجیدہ اور حد سے زیادہ اوپن شخصیت کبھی اچھی نہیں لگی اس سے تو اچھا تھا یہ بے پناہ حسین آدمی برفی کے رنبیر کپور کی طرح گونگا ہوتا.... فریسا نے سمجھا تھا اس غیر معمولی رومانٹک ڈرامے کا اسکرپٹ پڑھ کر آیان پر کچھ نہ کچھ اثر تو ضرور ہو گا اور اسے احساس ہو جائے گا کہ محبت کس قدر حسین جذبہ ہے۔ جس کے لیے ماضی میں دیوانوں نے کیسی کیسی قربانیاں دی تھیں پر اس کی سب سوچوں پر پانی پھر گیا آیان بدستور اسکرپٹ اور رامس کا مذاق اڑاتا رہا اس نے اسکرپٹ میں موجود محبت بھرے لفظوں اور مکالموں کا ایک فیصد بھی اثر نہیں لیا۔ فریسا کو رامس پر بھی غصہ تھا جس نے ڈرامے کے اینڈ میں ایسی فضول سچویشن بنا دی تھی کہ، آج کل کے لڑکوں اور لڑکیوں کا اگر ایک بوائے فرینڈ سے بریک اپ ہو جائے تو وہ فوراً" دوسرے کو آواز دینے لگتے ہیں اور ایک لمحے میں ساری محبت رفو چکر ہو جاتی ہے.... لیکن رامس بھی کیا کرے اس پر غصہ کرنا بے کار ہے۔ اس نے جو محسوس کیا وہ ہی لکھ دیا اور پھر اس میں اتنا غلط بھی کیا ہے زمانے کے انداز ہی بدل چکے ہیں پل میں کچھ پل میں کچھ محبت بھی کوئی دکان میں بکنے والی چیز بن کر رہ گئی ہے جس میں ایک پسند نہ آئے تو یا تو کوئی دوسری تبدیل کر لو یا کسی اور دکان سے کوئی اور خرید لو....

تو کیا وہ اس دنیا کی نہیں ہے؟ کوئی ماضی کی بھٹکی ہوئی روح ہے جو بھٹک کر غلطی سے اس زمانے میں نکل آئی ہے جب محبت کی کوئی توقیر ہی نہیں رہی.... کاش وہ اپنے دل کو سمجھا سکتی جو لاکھ سمجھانے پر بھی آیان کے نام سے ہی دھڑکتا ہے اس کی آہٹ کا متلاشی اور اسی کے آنے کا منتظر اسے تو جیسے دنیا میں صرف آیان ہی چاہیے.... حالانکہ اسے لگتا تھا اگر وہ رامس کے لیے فرش دل بچھا دے تو شاید وہ اس پر براجمان ہونے میں اتنی بھی دیر نہ لگائے جتنی وہ یونیورسٹی کے کلاس روم میں کرسی پر بیٹھنے میں لگاتا ہے.... بیٹھنے سے پہلے ہمیشہ ایک دو منٹ ادھر ادھر دائیں بائیں دیکھتا ہے

اور پھر جیسے پورا اطمینان کرنے کے بعد ہی تشریف رکھتا ہے۔ پتا نہیں رامس نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہو گا جب اس نے رامس سے کہا کہ "اس بار ڈپارٹمنٹ کی طرف سے جو ڈراما ہونے والا ہے اسے محبت اور لو سے بھرپور ہونا چاہیے ۔۔۔ اب جو بھی تھا اسے ڈراما کرنا تو تھا۔ پتا نہیں کہیں یہ آیان کا بچہ اسٹیج پر اسی طرح ہنسی کے فوارے چھوڑ بیٹھا تو ڈرامے کا کیا بنے گا۔۔۔ فریسا نے سوچا اور پھر ذہن سے سب کچھ جھٹک کر گھر کے کاموں میں مصروف ہو گئی "جو ہو گا دیکھا جائے گا" اس نے دل میں کہا۔

☆ ☆ ☆

"تم یہ کس قسم کی باتیں ڈرامے میں لکھتے ہو یار؟"
"کیا مطلب ہے اس بات کا؟" رامس واقعی آیان کی بات سمجھ نہیں سکا۔
"یہی جو تم نے اس تاریخی ڈرامے میں لکھی ہیں۔"
"اچھا تم اس ڈرامے کی بات کر رہے ہو محبت کی تلاش"
"جی جی میں اسی ڈرامے کی بات کر رہا ہوں۔"
"وہ تو مجھ سے ۔۔۔" رامس کہنے ہی والا تھا کہ اس سے فریسا نے کہا تھا کہ اس قسم کا ڈراما لکھے اور بولتے بولتے اسے جیسے یاد آ گیا۔
"مجھ سے کیا ۔۔۔ بات تو پوری کرو" آیان اس کی طرف متوجہ تھا۔
"وہ میں نے ٹھیک تو لکھا ہے ایسی تو ہیں آج کل کی محبتیں ۔۔۔" رامس نے بات بدل ڈالی۔
"اچھا ایسی ہیں ۔۔۔ بڑا تجربہ ہے بھئی تمہارا ۔۔۔"
"نہیں تجربہ تو نہیں ہے مشاہدہ کہہ سکتے ہو" رامس خفیف سا ہو کے بولا۔
"تجربہ ہو یا مشاہدہ پر مجھے تو اس ڈرامے کو پڑھ کے بہت ہی ہنسی آئی ۔۔۔ لیکن وہ جو آخری بات تم نے لکھی ہے وہ مجھے بہت پسند آئی کیا بات ہے ۔۔۔ ادھر بریک اپ ادھر پھر شروع ۔۔۔ ویسے ایک بات کہوں زمانہ اتنا تیز بھی نہیں چل رہا بریک اپ کے بعد دو چار دن تو لگتے ہیں کوئی دوسری چڑیا پکڑنے میں" آیان بے شرمی سے بولا۔
"ہاں تو اب ڈراما دیکھنے والوں کو دو چار دن کا انتظار تو نہیں کرایا جا سکتا نا!"
"یہ بھی خوب کہا تم نے ۔۔۔ اینی وے میں اب چلوں گا مجھے ذرا ایک کام سے جانا ہے۔" اس سے پہلے کہ رامس اس سے کچھ اور پوچھتا وہ جا چکا تھا۔
فریسا کو رامس سے پتا چلا کہ آیان اس ڈرامے کے بارے میں الٹا سیدھا بول رہا تھا یہ سن کر فریسا کا دل چاہا کہ ڈرامے میں کام کرنے سے انکار کر دے مگر وہ جانتی تھی یہ ممکن نہیں ہے کیونکہ وہ کمٹمنٹ کر چکی تھی لیکن اب اس کا ڈرامے میں کام کرنے کا وہ جوش اور وہ اندر سے پھوٹتی ہوئی خوشی باقی نہیں رہی تھی۔ اس نے تو سمجھا تھا کہ آیان اس ڈرامے میں موجود محبت کے اس احساس کو محسوس کرے گا اور رامس کے لکھے الفاظ اس پر اثر کریں گے تو اسے اس کی محبت کا کچھ تو احساس ہو گا مگر اس کی ساری سوچیں اکارت چلی گئیں۔ آیان کچھ ایسی مٹی کا بنا ہوا تھا کہ وہ لڑکیوں کو محبت کی دیوی بنا کر ان کی پوجا کرنے کے بجائے انہیں استعمال کر کے ٹشو پیپر کی طرح پھینک کر بھول جاتا تھا اور پتا نہیں قسمت کو کیا منظور تھا جو اسے اسی مٹی کے مادھو سے محبت ہوئی۔ ویسے یہ محبت ہے ہی کمینی چیز ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں بندے کو مرتے وقت پانی بھی نصیب نہ ہو ۔۔۔!
"تو رامس میں کیا خرابی ہے اچھا خاصا تو ہے" انابیہ نے کہا تو اس نے انابیہ کو گھور کے دیکھا اور بولی۔
"جانتی ہوں پر محبت کو یہ بات سمجھ نہیں آتی وہ کوئی شاپنگ کرنے کی چیز نہیں ہے کہ کسی مہنگی چیز کو خریدنے کے پیسے نہیں تو اس سے ملتی جلتی کوئی دوسری دو نمبر چیز لے لو ۔۔۔ اب تک ایک ہی چیز ایسی ہے جس کا سائنس بھی دو نمبر نہیں بنا سکی سمجھی میری اسٹوپڈ فرینڈ۔"
"اچھا تو پھر بھگتو!" انابیہ نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"تم کہو تو میں آیان سے بات کروں ایٹ لیسٹ اسے پتا تو چلے کہ تمہارے دل میں اس کے لیے کیا جذبات ہیں ہو سکتا ہے اسے معلوم ہو جائے تو وہ تمہارے بارے میں سوچنے پر آمادہ ہو جائے" انابیہ نے کچھ دیر بعد اپنی دانست میں بڑا ہمدردانہ مشورہ دیا اور ایک لمحے کو تو فریسا کا بھی دل چاہنے لگا کہ کاش ایسا ہو جائے یا کم سے کم انابیہ کو یہ تجربہ کر کے دیکھ لینا ہی چاہیے پھر ایک انجانے خوف سے اسے جھرجھری آ گئی "نہیں نہیں ایسا مت کرنا۔"

"کیوں؟"

"اگر اسے منظور نہ ہوا تو سمجھو میں تو شرم سے مر ہی جاؤں گی اب تک اس کی آنکھوں میں میرے لیے جو تھوڑی بہت عزت ہے وہ بھی جاتی رہے گی اور میں اپنی ہی نظروں میں گر کے رہ جاؤں گی۔"

"بس تو پھر تمہاری اس لاعلاج بیماری کا علاج کسی کے پاس نہیں ہے" انابیہ نے کہا اور کینٹین کی طرف بڑھ گئی۔

☆ ☆ ☆

ڈراما ہوا اور خوب شور مچا خوب تعریفیں ہوئیں خاص طور سے فریسا کی ایکٹنگ کی اور رامس کے اسکرپٹ کی۔ انجام میں تو ہال زور زور سے تالیاں پیٹ کر ایسے ہنس رہا تھا کہ فریسا کو لگتا تھا یہ سب اس کی محبت اور اس کے احساس کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ وہاں زیادہ دیر نہیں رکی اور وہاں سے چلی گئی۔

"تم کتنی ہی لڑکیوں سے فلرٹ کر چکے ہو یہ بتاؤ فریسا کو کیوں چھوڑ دیا اس سے تو تمہاری دوستی بھی ہے اور تم چاہو تو اسے آسانی سے اپنے پاکٹ میں ڈال سکتے ہو؟" آیان کے ہم خیال اور ہم مذاق دوست عادل نے اس سے کہا تو پہلی مرتبہ آیان کو کسی لڑکی کے بارے میں اس طرح عادل کا یوں بات کرنا اچھا نہیں لگا "میں تیرا نا منہ توڑ دوں گا سمجھا تو" آیان نے قدرے غصے سے کہا۔

"ابے ابے یہ تو اتنا بھڑک کیوں رہا ہے کیا ہوا تجھے ۔۔۔ وہ بھی اسی طرح کی لڑکی ہے جیسی سب ہیں اگر وہ تجھے گھاس نہیں ڈالتی تو اس میں اتنا غصہ کرنے کی کیا ضرورت ہے" عادل کو بھی غصہ آنے لگا اب سے پہلے کسی بھی لڑکی کے بارے میں آیان نے اس طرح کا ری ایکشن کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔

"سوری یار میں کچھ زیادہ ہی بول گیا اصل میں پتا نہیں کیوں فریسا کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے وہ فلرٹ کرنے کے لیے نہیں بنی۔۔۔ اسے دیکھ کر اس کی عزت کرنے کو دل چاہتا ہے۔۔۔"

"یہ تو ہی ہے نا آیان!" عادل کو شدید حیرت ہوئی اور آیان کوئی بھی جواب دیے بغیر وہاں سے چلا گیا۔ عادل کو بھی کافی حیرت ہوئی کہ آیان کا یہ رویہ اس کے لیے چونکا دینے والا تھا۔ لیکن وہ سمجھ نہیں سکا کہ آخر آیان کو ہوا کیا ہے پر وہ عادل ہی کیا جو کسی بات کو زیادہ سیریس لے کر اپنے دل پر بوجھ بڑھائے وہ تو دوسرے ہی لمحے اس بات کو ایسے بھول گیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ۔۔۔

آیان کی اپنی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے کیا ہو گیا تھا اس نے عادل سے ایسے بات کیوں کی حالانکہ عادل تو نہیں کہہ رہا تھا فریسا بھی ایک لڑکی ہی تو تھی اور لڑکیاں تو بس یونہی ہوتی ہیں انہیں اتنا سیریس لینا یا ان کی عزت کرنا تو اس کی ڈکشنری میں تھا ہی نہیں اسے یاد ہے اس سے پہلے کسی لڑکی کے بارے میں اس نے ایسا نہیں سوچا تھا پھر اسے آج کیا ہوا۔ کتنی ہی دیر وہ اکیلے میں اس بات کو سوچتا رہا مگر اسے سمجھ نہیں آیا کہ اسے کیا ہوا ہے اور پھر پتا نہیں کب اسے نیند آ گئی۔

امتحانات شروع ہوئے تو ایسا لگنے لگا جیسے یونیورسٹی میں کوئی کسی کو جانتا ہی نہ ہو سب اپنی اپنی پڑھائی میں جت گئے صرف آیان ہی تھا جسے ایگزامز کی کوئی ایسی خاص فکر نہیں تھی۔ فریسا نے بھی آنا چھوڑ دیا تھا اور عادل بھی یہ کہہ کر سیریس ہو گیا تھا کہ بھئی یہ تو لاسٹ سمسٹر ہے اب تھوڑا پڑھ لینا چاہیے ورنہ میرا باپ تو مجھے گھر سے ہی نکال دے گا۔۔۔ آیان نے اسے اپنی مثال دیتے ہوئے لاکھ سمجھایا کہ یار ایسی باتیں تو ماں

باپ کیا ہی کرتے ہیں پر اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ واقعی گھر سے نکال دیں گے۔ اس وقت تو عادل دیر تک آیان کے پاس بیٹھا رہا لیکن دوسرے دن سے وہ بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا آیان روزانہ آتا اور اکیلا گھوم کر ادھر ادھر بیٹھ کر چلا جاتا کچھ تو اس کی طرح بے پروا اسٹوڈنٹس بھی تھے پر ان سے اس کی دوستی نہیں تھی اس لیے ان کے ساتھ بیٹھ کر وقت گزارنا ممکن بھی نہیں تھا۔ ہوائیں عجیب اداسی سے چلتیں اور دور دور تک پھیلی ویرانی اسے کاٹتی ہوئی لگتی۔ ایسی ہی کیفیت میں اس نے ایک دن یونہی فریسا کو فون کیا تو اس کا نمبر دیکھ کر فریسا بہت حیران ہوئی پھر فون ریسیو کر کے بولی۔

"کیا بات ہے تمہیں چین نہیں ہے امتحانوں کے دن ہیں کچھ پڑھ ہی لو کیا ساری زندگی یونیورسٹی میں لٹکے رہنے کا ارادہ ہے۔"

"ارے یار میں نے تو اپنی تنہائی سے گھبرا کے تمہیں فون کیا تھا اور تم ہو کہ چھوٹتے ہی شروع ہو گئیں۔"

"کیوں کیا ہوا تمہارے وہ آوارہ دوست کہاں گئے؟" فریسا نے اب بھی اس پر چوٹ کرنے سے خود کو نہیں روکا۔

"سب تمہاری طرح پڑھنے میں لگے ہوئے ہیں۔" وہ رکا پھر بولا "اچھا ایک بات تو بتاؤ؟"

"پوچھو مگر جلدی سے مجھے بہت پڑھنا ہے۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اکتاہٹ ظاہر کرنے لگی۔

"یہ محبت کیا ہوتی ہے؟"

سچ مچ فریسا کو غصہ آگیا "تم نے یہ پوچھنے کے لیے مجھے فون کیا ہے؟"

"ہاں تو کیا بتاؤ نا تمہیں ہی تو اس سوال کا جواب معلوم ہے۔"

"کیوں تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مجھے بھی محبت ہو گئی ہے۔"

فریسا کا یہ سن کر یک بارگی دل زور سے دھڑکا اور وہ جیسے چپ سی ہو گئی۔

"کیا ہوا تم ہو نا لائن پر؟" کچھ دیر کے انتظار کے بعد

وہ پھر بولا۔

"اچھا دیکھو اب مذاق بند کرو۔۔۔ تمہیں تو دن میں کئی کئی محبتیں ہوتی ہیں یہ کونسی انوکھی بات ہے۔۔۔ بس کسی لڑکی کو دیکھ لیا ہو گا اور لگے۔۔۔ اول فول سوچنے۔۔۔ اب میرا ٹائم خراب مت کرو میں فون رکھ رہی ہوں۔" یہ کہتے ہی فریسا نے فون رکھ دیا اور وہ ہیلو۔۔۔ ہیلو ہی بولتا رہ گیا۔

"اس کا مطلب ہے میری بات کا کسی کو یقین نہیں آئے گا۔ مجھے سچ مچ کسی سے محبت ہو جائے تب بھی کوئی نہیں مانے گا میں بھی کسی سے محبت کر سکتا ہوں۔" اس نے اداسی سے سوچا اور ویران پگڈنڈی پر شکست خوردہ مسافر کی طرح قدم بڑھا دیے۔

امتحان ختم ہو گئے اور سب اپنے گھروں میں اپنے رشتے داروں اور اپنی مصروفیات میں مگن ہو گئے، کچھ لڑکیاں اپنی مستقبل کی پلاننگ کرنے میں دن رات سوچوں کی وادیوں میں بھٹکا کرتیں اور کچھ کے ماں باپ نے شادی کا ڈول ڈالنا شروع کر دیا، کچھ کے گھر رشتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

"اور کتنے دن رشتوں کو ٹھکراتی رہو گی کبھی نہ کبھی تو ہاں کہنا ہی ہو گی" انابیہ نے کہا تو اسے لگا وہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہے وہ۔

"میری مان تو اب اپنے ماں باپ کو زیادہ امتحان میں مت ڈال فریسا آج تمہاری امی نے بھی مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں۔۔۔ وہ بہت پریشان ہیں، میں مانتی ہوں سب ہی لڑکیوں کو کسی ایسے پیا کا انتظار ہوتا ہے جو ان کے خوابوں سے ملتا جلتا ہو لیکن سب کے خواب پورے تو نہیں ہوتے۔۔۔ اس لیے اب اس کا انتظار کرنا چھوڑ دے ویسے بھی وہ اب یہاں سے جا رہا ہے۔"

"جا رہا ہے کہاں؟" فریسا نے برجستہ کہا۔

"باہر جا رہا ہے شاید امریکا ہائر ایجوکیشن کے لیے۔"

"تجھے کس نے بتایا؟" انابیہ نے اس کے لہجے میں چھپی بے چینی کو محسوس کر لیا تھا۔

"ایسی باتیں کہاں چھپتی ہیں وہ اس کی دوست ہے نا فرح... دوست کیا ہے اسے بھی تیری طرح یہ امید ہے کہ وہ اسی سے شادی کرے گی اسی نے بتایا ہے۔"

"اچھا!"

اس اچھا میں انابیہ کو لگا جیسے فریسا کے سارے ارمان سارے خوابوں کی ٹوٹ پھوٹ تھی جو اسے سنائی دی... انابیہ چلی گئی اور وہ سوچتی رہی کیا وہ اسی طرح چلا جائے گا اس سے ملنے تک نہیں آئے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا اور ایک دن وہ رامس کے ساتھ آدھمکا اسی طرح چمکتا پھیکتا بالکل غیر سنجیدہ اور زندگی سے بھرپور' فریسا نے اسے ایک زخمی اور تڑپتی ہوئی نظر سے دیکھا اور نظریں جھکالیں...

"کب جارہے ہو؟"

"کل جارہے ہیں موصوف!" اس کی جگہ رامس نے جواب دیا۔

"کل...!" تمہاری نظروں میں میری اتنی بھی حیثیت نہیں... کہ مجھ سے ملنے ہی سب سے پہلے آجاتے' سب سے آخر میں آئے ہو کتنے کٹھور اور سنگ دل ہو تم آیان" اس نے سوچا پر کہہ نہیں سکی۔

"اور واپس کب آؤ گے؟"

"پتا نہیں... شاید نہ بھی آؤں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا "اصل میں یہاں کی سب لڑکیاں مجھے اتنا بے اعتبار اور چالو سمجھتی ہیں کہ اب کوئی مجھ سے بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تو میں نے سوچا یہاں واپس آکے کیا کروں گا۔"

"اس کا مطلب ہے اب تم امریکا کی لڑکیوں کو بے وقوف بنانے والے ہو؟" رامس نے بسکٹ منہ میں ڈالتے ہوئے اس پر چوٹ کی تو وہ جیسے ڈھٹائی سے ہنس دیا۔ اس کا دل چاہا اس سے کہے "نہ جاؤ' رک جاؤ' رک نہیں سکتے تو کم سے کم میرے لیے واپس ہی آجانا' مجھے بتاؤ تمہارا کتنا انتظار کرنا ہے میں تو جنم جنم تک تمہارا انتظار کرسکتی ہوں کیونکہ میں تم سے محبت کرتی ہوں آیان" پر سب کچھ دل میں مسوس کر رہ گئی دل کی محبت کی بے حرمتی اسے گوارہ نہیں تھی اور اس کا کیا

پتا اس ڈرامے کے مکالموں کی طرح اس کی محبت میں ڈوبے ہوئے لفظوں کا بھی مضحکہ بنا دے پھر وہ کہاں کی رہے گی خود سے نظر ملانا بھی دشوار ہو جائے گا۔۔۔ ایسی ہی کتنی باتیں وہ بار بار سوچتی رہی اور وہ چلا گیا۔۔۔ بے نام اور بلا عنوان آنسو اس کی پلکوں سے پھسلے اور دل کی زمین میں جذب ہو گئے۔۔۔ دن اور رات سب جیسے اداسی کے بوجھ سے کسمساتے رہے اور وہ تل تل کر کے مرتی رہی۔ اب ویسے بھی موت ہی اس کی سب سے بڑی رفیق اور سب سے اچھی سہیلی تھی پر موت کوئی انسان کے اختیار میں ہے اور لڑکیوں کی بے وقت موت تو ماں باپ کو بھی زندہ درگور کر دیتی ہے۔ ایک مدت تک لوگ ایسی موتوں کو یاد کر کر کے درس عبرت دیا کرتے ہیں۔ اس لیے اس نے جینے کا فیصلہ کیا وہ کوئی انوکھی تھی جس کی محبت تاراج ہوئی دنیا میں تو پتا نہیں کتنے دل ہیں جو اسی طرح خاموشی سے ٹوٹ کر چکنا چور ہوتے ہیں اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ اتنے دن تک انکار کرنے کے بعد ایک دن اس نے امی کے بہت اصرار پر رامس کے رشتے کے لیے ہاں کہہ دی۔۔۔

رامس بہت ہی اچھا انسان اور بہترین شوہر ثابت ہوا وہ رامس کی محبت اور اس کا ہر وقت خیال رکھنے کی عادت کے حصار میں کچھ ایسی قید ہوئی کہ کچھ ہی عرصے میں اپنی لا حاصل محبت اور آیان دونوں کو بھولنے لگی اور ایسا اس نے قصداً" بھی کیا کیونکہ اب وہ ایک وفادار بیوی اور اپنے شوہر کی رفیق حیات بن کر جینا چاہتی تھی۔۔۔ کئی سال اسی طرح گزر گئے وہ دو پیارے پیارے بیٹوں کی ماں بن گئی ایک کا نام اس نے شرجیل رکھا اور دوسرے کا آیان اور ایسا اس نے نہیں بلکہ رامس نے کیا۔ وہ چاہتا تھا دوسرے بیٹے کا نام وہ خود رکھے اور جب اس نے آیان نام تجویز کیا تو اس نے رامس کی طرف ایسے دیکھا جیسے وہاں اپنے لیے کوئی شک اور کوئی بے اعتباری تلاش کر رہی ہو۔ پر رامس کے چہرے پر ازلی شانتی اور مسکراہٹ کھیلتی دیکھ کر اس نے بھی اپنے ذہن کو جھٹک دیا اور وہ کبھی نہیں سمجھ پائی کہ رامس نے دوسرے بیٹے کا نام آیان کیوں رکھا۔ نہ ہی اس نے اس موضوع پر کبھی رامس سے کوئی بات کی ویسے بھی اسے رامس اور اپنی شادی شدہ زندگی سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اس کی دوست انابیہ کہا کرتی تھی "تمہیں رامس کے ساتھ خوش دیکھتی ہوں تو رامس کی دل سے عزت کرنے کو دل چاہتا ہے کیونکہ رامس جیسا شوہر ہر کسی کو نہیں ملتا تم بہت خوش قسمت ہو۔ فریسا میں تو کہتی ہوں یہی ہے وہ پیا جس کی محبت تمہاری جیسی لڑکی کے نصیب میں لکھی جانی تھی"۔ انابیہ کی بات کے جواب میں وہ ہلکے سے مسکرا کے رہ گئی اور اس کے لیے کافی بنانے کچن میں چلی گئی۔ انابیہ کوئی دو گھنٹے بیٹھی اور ان دو گھنٹوں میں اس نے بھی آیان اس کے بیٹے کو کئی بار پکارا پر انابیہ نے بھی آیان کا ذکر نہیں کیا اور اسے تو ویسے بھی اب اس نام سے ممتا بھری محبت ہو چکی تھی وہ کیوں چھیڑتی بے وقت کی راگنی۔۔۔

آٹھ سال اسی طرح گزر گئے اور ایک دن شام کو جب رامس گھر لوٹے تو ان کے ساتھ اس اجنبی کو دیکھ کر وہ تھوڑی دیر کو دھک سے رہ گئی۔ وہ آیان تھا۔ پہلے جیسا خوب صورت اور چلبلا نہیں رہا تھا اب بلکہ کافی سنجیدہ اور سوبرد کھائی دے رہا تھا۔

"آ۔۔۔ پ" وہ حیرت سے پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"جی یہ ہمارے ڈرامے کے ہیرو آیان ہی ہیں" رامس نے جواب دیا۔

"یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔۔۔" کہتے کہتے رہ گئی اور بولی۔ "کب آئے امریکا سے؟"

"یہی کوئی دس دن ہوئے ہیں۔"

"کس کس سے ملے؟" مجھے پتا ہے مجھ سے ملنے تو سب سے آخر میں آئے ہو گے۔ اس نے پوچھا اور ساتھ ہی سوچا بھی پر اب ایسی باتیں وہ کیوں سوچ رہی ہے اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی۔

"کسی سے نہیں۔۔۔ امی کی طبیعت خراب تھی اس لیے۔۔۔ یہ تو رامس مل گئے راستے میں تو۔۔۔"

"ہاں معلوم ہے ورنہ تم کہاں آنے والے تھے۔"

وہ سوچ کر رہ گئی۔

"ارے تم لوگ یونہی کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہو گے بیٹھو گے نہیں" رامس نے یاد دلایا تو اس نے آیان کو بیٹھنے کو کہا اور وہ ایسے خاموشی سے بیٹھ گیا ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کہ اسے اس کے آیان ہونے پر شبہ ہونے لگا۔

"رامس نے راستے میں بتایا تمہارے بیٹے کا نام آیان ہے؟"

"ہاں رامس نے ہی رکھا ہے۔۔۔ میں نے تو شرجیل کا نام رکھا ہے۔"

"ہاں تمہیں تو ڈر ہو گا کہ کہیں یہ میرے جیسا فلرٹی اور بکواسی نہ نکل جائے کہیں" یہ کہتے ہوئے وہ پہلی بار ہنسا تو اسے اس کی ہنسی میں طویل درد کی آہیں سنائی دیں۔

"اپنی بیوی اور بچوں کو بھی لایئے گا اگر وقت ملے تو!"

"ارے بھئی موصوف نے شادی ہی نہیں کی۔۔۔ ویسے بھی یہ شادی وغیرہ جیسی فضول رسموں پر کہاں یقین رکھنے والے ہیں" رامس نے کہا تو اسے ایک لمحے کو حیرت ہوئی۔

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔۔۔ اصل میں مجھے لگتا تھا میں کسی لڑکی کو یہ یقین نہیں دلا سکوں گا کہ میں اس سے شادی کر کے خوش رہوں گا اس لیے نہیں کی۔"

"ہاں شاید ایسا ہی ہو!" پتا نہیں کیوں اس کے منہ سے یہ جملہ نکلا اور پھر کچھ دیر بیٹھنے کے بعد وہ جانے کو تیار ہو گیا۔۔۔ اس کے چہرے پر کھیلتی ہوئی ہنسی کو وہ سارا وقت ڈھونڈتی رہی اور جواب میں دبیز اداسی اسے نظر آتی رہی۔۔۔ جب وہ جانے لگا تو اس نے کہا۔

"رکو!"

وہ رک گیا رامس بچوں کو لے کر آگے نکل چکا تھا۔

"ایک بات بتاؤ گے؟"

"ہاں پوچھو ضرور بتاؤں گا۔"

"اس دن تم نے مجھے فون کیا تھا۔۔۔ کسی لڑکی سے تمہیں محبت ہو گئی تھی۔۔۔ کون تھی وہ کہاں گئی؟"

"سچ کہوں تو اس نے بھی میرا اعتبار نہیں کرنا تھا اس لیے میں نے اس سے کہا ہی نہیں کہ میں اس سے سچ مچ محبت کرتا ہوں۔"

"کیا میں اسے جانتی ہوں؟" ایک فطری جھجک اس کے لہجے میں کسمسائی۔

"کیا کریں گی پوچھ کر!"

"آپ کو اعتراض ہے تو پھر رہنے دیجیے۔"

"اعتراض کوئی نہیں۔۔۔"

"تو پھر بتایئے کون تھی وہ؟"

"تھی ایک ڈرامے کی ہیروئین!"

یہ کہہ کر وہ جھٹ سے آگے بڑھ گیا اور اسے لگا وہ کھڑے کھڑے پتھر کی ہو گئی۔۔۔ جیسے اس کے پاؤں زمین نے پوری مضبوطی سے جکڑ لیے ہوں!

☼ ☼

عزہ خالد

وہ سوٹ کیس لیے باہر آئی تھی گوہر'جو گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا اس کا انتظار کررہا تھا فورا" اس کی طرف بڑھا تھا اور اس کے ہاتھ سے سامان لیا تھا۔ عینا نے تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا پر اس کے چہرے پر بے نیازی کے سوا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس نے سامان گاڑی میں رکھا تھا اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ عینا نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ایک نظر سامنے عالیشان عمارت پر ڈالی تھی اور طویل سانس بھرتے ہوئے فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔

ناول ولٹ

اسے نہیں معلوم تھا کہ وجدان اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑا مشکور نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ ہوگئی تھی۔ عینا نے بیگ سے موبائل نکال کر ٹائم دیکھا تھا رات کے نو بج رہے تھے۔ کراچی سے حیدر آباد جانے میں دو گھنٹے لگتے تھے۔

عینا کو سمجھ نہیں آرہی تھی گوہر آدھے گھنٹے میں کراچی کیسے پہنچ گیا.... اس نے گوہر کی طرف دیکھا تھا وہ اردگرد سے بے نیاز ڈرائیونگ میں مصروف تھا۔

"گوہر بھائی پہلے سے زیادہ سنجیدہ ہوگئے ہیں۔" اس نے گوہر کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔ "یا شاید مجھ سے خفا ہیں...."

اس کا دل چاہا گوہر سے پوچھے.... پر اسے گوہر سے بات کرتے ہوئے ہچکچاہٹ ہورہی تھی۔

جب ہم کسی اپنے سے کافی عرصے بعد ملتے ہیں تو اجنبیت کی ایک نادیدہ دیوار سی بن جاتی ہے ہمارے بیچ۔ جو بظاہر نظر نہیں آتی.... پر ہوتی ہے۔

"پھپھو۔ حیا اور منال ٹھیک ہیں؟" بہت سوچنے کے بعد آخر کار اس نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں۔ سب ٹھیک ہیں۔" وہ اسٹیئرنگ پر ہاتھ جمائے سنجیدگی سے بولا تھا اس کی نظر سامنے سڑک پر تھی۔

"یہ گاڑی کس کی ہے؟"

"میری ہے۔"

"آپ کی...." اسے خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔

"آپ نے کب لی....؟" اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا تھا۔

"دو ماہ ہوگئے ہوں گے۔"

"دو ماہ.... اور مجھے کسی نے بتایا بھی نہیں.... آپ لوگوں نے ایک بار بھی میری خبر نہیں لی.... آپ لوگوں نے مجھے بالکل ویسے ہی اپنی زندگیوں سے نکال دیا جیسے دودھ سے مکھی نکال کر پھینکتے ہیں۔" اس نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

گوہر نے چونک کر اسے دیکھا تھا اور پھر اپنی نظریں ونڈ اسکرین پر ٹکادی تھیں وہ ایک لفظ نہیں بولا تھا۔ وہ اپنی ناراضی اور غصے کا اظہار خاموش رہ کر کرتا تھا۔

عینا منتظر تھی کہ وہ کچھ بولے.... اپنی صفائی میں کچھ کہے.... اور نہیں تو کوئی بہانہ ہی کردے۔ پر عینا کو شدید مایوسی ہوئی تھی۔ اس نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی تھی گوہر خاموشی سے ڈرائیونگ کررہا تھا گاڑی تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

اسے اب اپنے فیصلے پر افسوس ہورہا تھا۔ ایک بار پھر اس نے جلدی میں غلط فیصلہ کرلیا۔ پہلے شہناز آفندی کے ساتھ کراچی آنے کا فیصلہ غلط تھا اب شاید گوہر کے ساتھ واپس حیدر آباد جانے کا فیصلہ بھی غلط تھا۔

وہ ہونٹ کچلتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ پر اس کے

پاس حیدر آباد واپس جانے کے سوا کوئی اور چارہ بھی تو نہیں تھا۔ اس نے خود سے اپنی مجبوری بیان کی تھی اور طویل سانس لیتے ہوئے آنکھیں موندلی تھیں اور اپنی زندگی کی کتاب سے تھوڑے سے ورق پلٹے تھے اور ان ہی دنوں میں کھوگئی تھی۔ جہاں زندگی ہر لمحے مسکرایا کرتی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج گھر کی صفائی حیا کے ذمے تھی۔ وہ اسی لیے دیر سے اٹھی تھی۔ وہ ناشتا کرنے کچن کی طرف جارہی تھی جب ہی منال گاؤن پر اسکارف لپیٹتی تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ گئی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اسے یاد

آیا تھا کہ آج روبی کی مہندی ہے گائٹ کا کوئی بھروسا نہیں تھا کسی بھی وقت جاسکتی تھی اور آنے کا بھی کوئی ٹائم ٹیبل نہیں تھا' وہ اپنے کمرے میں آئی اور الماری کھول کر اپنا فیروزی سوٹ ڈھونڈنے لگی۔

"حیا! تم نے روبی کی مہندی کے لیے کپڑے استری کر لیے؟" حیا کمرے میں داخل ہوئی تو اس نے الماری میں منہ دیے دیے پوچھا تھا۔

"نہیں۔۔۔ ناشتے کے برتن دھو لوں۔۔۔ پھر کروں گی۔" حیا ابھی صحن دھو کر آئی تھی اور پنکھے کے نیچے بیٹھی پسینہ سکھا رہی تھی۔

"حیا۔ تم نے میرا فیروزی سوٹ دیکھا ہے۔۔۔؟" پوری الماری چھان مارنے کے بعد بھی آخر کار اسے اپنا مطلوبہ جوڑا نہیں ملا تو حیا سے پوچھا تھا۔ حیا کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر الماری سے منہ نکالتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"وہ۔" حیا بولتے بولتے چپ ہوئی تو عمنا نے الماری بند کی اور مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"وہ کیا؟" عمنا نے بے چینی سے پوچھا تھا۔

"تمہارا وہ سوٹ منال کالج پہن کر چلی گئی ہے۔۔۔ آج پارٹی تھی نا اس کے کالج میں۔۔۔"

"کیا۔۔؟" عمنا غم و غصے سے چلائی تھی یہ اس کے لیے چھوٹا موٹا صدمہ نہیں تھا ایک تو اس کا نیا سوٹ پہن کر چلی گئی اور دوسرا اس سے پوچھنا تو دور رہا نا تک گوارا نہیں کیا۔ عمنا ٹہل ٹہل کر اس کا انتظار کر رہی تھی۔

"وہ ایک بجے تک آئے گی تب تک ہم یوں ٹہل ٹہل کر اپنا دو تین کلو وزن گھٹا لوگی۔۔۔ بیٹھ کر بھی انتظار کیا جا سکتا ہے۔" حیا نے اسے مخلصانہ مشورے سے نوازا تھا۔

"تم نے بھی مجھے نہیں بتایا۔۔۔ وہ کتنے آرام سے میری آنکھوں کے سامنے میرا فیروزی سوٹ پہن کر نکل گئی۔۔" عمنا نے شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"اس نے میری اتنی منتیں کی تھیں کہ میں نہ بتاؤں۔۔۔ وہ جتنی خاموشی سے سوٹ پہن کر جا رہی ہے اتنی ہی خاموشی سے واپس الماری میں رکھ دے گی۔۔۔"

"چھوڑوں گی نہیں اسے۔۔۔ آنے دو۔۔" عمنا کے خطرناک تیور بتا رہے تھے کہ آج پانی پت کی لڑائی دوبارہ چھڑ سکتی ہے۔

اللہ اللہ کر کے گھڑی نے ایک بجایا تھا۔ عمنا گیٹ کی طرف کان لگائے بیٹھی تھی۔ وین کی آواز سن کر وہ باہر آگئی تھی اور اوپر چھت پر جاتی سیڑھیوں پر بیٹھ گئی تھی۔ گیٹ سے اندر آتی منال نے حیرت سے اسے دیکھا تھا۔

"سردیوں میں تو دھوپ سینکتے تھے تم گرمیوں میں بھی دھوپ سینک رہی ہو۔۔۔ سر میں موجود سارا بھوسا جل جائے گا۔۔"

عمنا نے قہر برساتی نظروں سے اسے دیکھا' گاؤن کے نیچے سے جھانکتے فیروزی ٹراؤزر پر نظر پڑتے ہی' وہ خطرناک تیور لیے اس کی طرف بڑھی تھی۔ منال کو فوراً" اپنی غلطی کا احساس ہوا تھا سینڈل وہیں اتار کر اس نے اندر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ عمنا نے اس کی سینڈل اٹھا کر اس کا نشانہ لیا تھا غصے میں نشانہ غلط ہو گیا تھا' سینڈل کمرے سے باہر آتی حیا کو لگی تھی اس اچانک افتاد پر حیا کے حلق سے دلدوز چیخ برآمد ہوئی تھی۔

حیا کو جیسے ہی ہوش آیا تھا اس نے جھک کر سینڈل اٹھانی چاہی تھی۔ عمنا نے اس کا ارادہ بھانپتے ہی کسی محفوظ مقام کی تلاش میں نظر دوڑائی تھی اور کچھ نہ ملا تو اس کی پہنچ سے دور ہونے کے لیے گیٹ کی طرف جانے کا ارادہ کیا۔ اسی لمحے باہر سے آتے گوہر سے بری طرح ٹکرا گئی۔

"یہ کیا مصیبت ہے۔" گوہر نے اسے ایک طرف کرتے ہوئے ناگواری سے کہا تھا' اسی لمحے حیا کی پھینکی ہوئی سینڈل کسی بلٹ کی طرح گوہر کے بازو کے قریب سے ہوتی ہوئی دور جا گری تھی۔

حیا کے رکے ہوئے سانس بحال ہوئے تھے شکر تھا کہ سینڈل گوہر کو نہیں لگی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے۔۔۔ بچوں کی طرح اودھم مچائے رکھتی ہو سارا دن۔۔۔" گوہر نے حیا اور عمنا کو باری باری گھورتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دونوں شرمندگی سے سر جھکائے خاموش رہی تھیں۔ گوہر انہیں گھورنے کے بعد سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا تھا۔

گوہر کا کمرا اوپر تھا وہ زیادہ تر اوپر کمرے میں ہی پایا جاتا تھا اسی لیے حیا، منال اور عمنا جی بھر کر شور و غل مچاتی تھیں۔ گوہر کے جانے کے بعد عمنا کو منال کا خیال آیا تھا۔

منال کی اچھی طرح خبر لینے کے بعد اس کا موڈ کچھ بہتر ہو گیا تھا پھر منال اور حیا کے ساتھ مل کر روبی کی مہندی کی تیاری کرنے لگی تھی۔ روبی ان کے محلے میں رہتی تھی حیا سے اس کی دوستی تھی جس کی وجہ سے اس نے ان تینوں کو شادی میں بلایا تھا۔ دو گھر چھوڑ کر روبی کا گھر تھا ان کے گھر پر لگے برقی قمقموں نے پورا محلہ روشن کر دیا تھا۔

"بے گانی شادی میں عبداللہ دیوانہ بننے کی کوشش مت کرنا۔۔۔ تھوڑی دعا سلام تھی اس لیے موت میں اس نے بلا لیا ہے۔" حیا نے منال کی تیاری دیکھتے ہوئے ٹوکا تھا۔

"اب بلایا ہے تو تیار تو ہو کر جائیں گے نا۔۔۔" عمنا نے مہارت سے منال کی آنکھوں پر آئی لائنر لگاتے ہوئے کہا تھا۔

"جلدی تیار ہو جاؤ۔۔۔ تم لوگ تو تیار ہونے میں ہی بارہ بجا دو گی۔" حیا کی تیاری مکمل ہوئی تو اس نے شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ منال اور عمنا نے بھی جلدی تیاری مکمل کی اور حیا کے ساتھ روبی کے گھر کی طرف چل پڑیں۔

مہندی کا فنکشن رات دو تین بجے تک چلنا تھا وہ تینوں بارہ بجے ہی واپس آگئی تھیں۔ گوہر کو پتا چلا تو وہ بہت خفا ہوا تھا اس نے شادی میں جانے سے منع کر دیا تھا۔ اسے شادی میں جانے پر اعتراض نہیں تھا بلکہ اتنی دیر سے آنے پر اعتراض تھی۔ وہ تینوں منہ بسور کر رہ گئی تھیں۔

منال کو کچھ زیادہ ہی نہ جانے کا غم ستا رہا تھا۔

"ویسے سچ بتاؤں تو مجھے مہندی میں ذرا مزا نہیں آیا تھا بس روبی کے ایک ہی کزن "چٹیاں کلایاں" پر ڈانس کر کر کے پاگل ہو رہی تھی حالانکہ جیسی اس کی صحت تھی اس حساب سے اسے "چٹیاں کلایاں" کے بجائے "سوکھیاں کلایاں" پر ڈانس کرنا چاہیے تھا۔"

عمنا کے تبصرے پر وہ دونوں ہنس پڑی تھیں۔

☆ ☆ ☆

مکھڑے پہ سہرا ڈالے
آجا او آنے والے
چاند سی عمنا میری
تیرے حوالے

عمنا وانپر لیے صحن میں مصروف ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی سریلی آواز کا جادو بھی جگا رہی تھی۔ حیا، جو فجر کی نماز کے بعد سوئی تھی اس کی آنکھ کھلی تو وہ اٹھ کر باہر آگئی تھی۔ واش بیسن پر منہ دھونے کے بعد اس نے عمنا کو دیکھا تھا، جو بڑا دل لگا کر صحن صاف کرنے کے ساتھ ساتھ گانے میں "بنو" کی جگہ عمنا کا استعمال کر رہی تھی۔

حیا کو یہ اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی تھی کہ گوہر بھائی جا چکے ہیں ورنہ گوہر کی موجودگی میں گانا اور وہ بھی اس قسم کا گانا ہرگز نہیں گا سکتی تھی، جانتی تھی کہ گوہر کسی بھی لمحے سر پر کھڑا ہو گا اور قہر برساتی نظروں سے گھورے گا تو عینی کی قینچی کی طرح چلتی ہوئی زبان تالو سے جا لگے گی۔

ابھی ایک ہفتہ پہلے کی بات تھی جب عمنا سیڑھیوں پر بیٹھی شفقت امانت بنی ہوئی اپنا ہاتھ لہرا لہرا کر آنکھیں میچے "ساون بیتو جائے بے رحما" گا رہی تھی۔ اس کا یہی خیال تھا کہ حیا اور منال اس کے سروں پر سر دھن رہی ہوں گی۔

ساون بیتو جائے بے رحما

من میرا گھبرائے
موراسیاں مجھ سے بولے نا
میں لاکھ جتن کرہاری

آخری لائن گا کر عینا نے ذرا سی آنکھیں کھولتے ہوئے حیا اور منال سے داد لینی چاہی پر وہاں حیا اور منال کے بجائے گوہر کو کھڑا دیکھ کر سر اس کے حلق میں پھنس گئے تھے۔ گوہر خونخوار نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ گوہر کچھ دیر گھورنے کے بعد اس کے قریب سے گزرتا ہوا اوپر چلا گیا تھا۔

اس دن کے بعد عینا گوہر کی موجودگی میں دوپٹا سر پر ٹکائے بڑی عقیدت سے فصیح الدین سوہروردی اور وحید ظفر قاسمی کی نعتیں پڑھتی ہوئی پائی جاتی تھی۔

"تم کالج نہیں گئیں؟" منال کو کچن سے نکلتے دیکھ کر حیا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"نہیں۔" منال نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"کیوں؟" حیا نے بڑے پن کا رعب ڈالتے ہوئے سختی سے پوچھا تھا۔

"بس آج موڈ نہیں تھا۔"

"صدقے جاؤں تمہارے اس موڈ کے... گوہر بھائی کو پتا ہے؟"

"نہیں بھائی جب تک گھر میں تھے میں کچن سے نہیں نکلی انہیں پتا ہی نہیں چلا۔" منال نے بڑے فخر سے اپنا کارنامہ بتایا اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ یہ عینا کا مشورہ تھا۔

"تم اسے اور الٹی پٹیاں پڑھاؤ۔" حیا نے عینا سے شکوہ کیا تھا۔

"ماشاءاللہ سے یہ پہلے ہی پڑھی پڑھائی ہے... مجھے الزام مت دو۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" منال نے عینا کو گھورتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میرا مطلب ہے کہ تم ایک پڑھی لکھی باشعور اور باوقار لڑکی ہو۔"

"باشعور کی حد تک ٹھیک ہے، پر وقار کا نام مت لو۔" منال نے چڑتے ہوئے کہا تھا۔ وہ دونوں جانتی تھیں کہ وقار ان کے وین ڈرائیور کا نام ہے، جو اسے کالج چھوڑ کر آتا ہے اور منال کو اس سے چڑ تھی وہ اسے بے کار اور فنکار کے خطاب سے نواز چکی تھی۔

"شعور سے یاد آیا شعور ایک ناول کے ہیرو کا نام تھا یاد ہے تم دونوں کو؟" حیا نے سوالیہ نظروں سے ان دونوں کو دیکھا تھا۔

"ہاں۔" عینا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے وائپر واپس اس کی جگہ پر رکھا تھا وہ اپنا کام مکمل کر چکی تھی۔

"پتا ہے میں کیا سوچتی ہوں..."

"کیا؟" دونوں نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"یہ شاہ زین مغل، یہ عدن مراد عباسی اور زاویار ہمدانی... بھاری بھرکم ناموں والے خوب صورت ہیروز اصل زندگی میں کہاں مرجاتے ہیں؟" عینا نے جلے دل سے پوچھا تھا۔

"میں تو خود یہی سوچتی ہوں۔" حیا نے مصنوعی آہ بھرتے ہوئے کہا تھا۔

"تم دونوں کی زندگی میں کوئی ہیرو انٹری نہیں دینے والا، تمہارے ہاتھوں میں وہ لکیر ہی نہیں ہے۔"

"کیا بک رہی ہو... تم ہمارا نصیب پڑھ کر آئی ہو..."

"اور تمہیں کون سا ہاتھوں کی لکیریں پڑھنی آتی ہیں..."

منال نے جو بدفال منہ سے نکالی تھی اس کے بعد ان دونوں کو غصہ آگیا تھا۔

"میرا مطلب ہے تم دونوں کی زندگی میں وہ سچویشنز ہی نہیں ہیں، جب ہیرو صاحب پوری شان کے ساتھ ہیروئن کی زندگی میں انٹر ہوتے ہیں۔" منال کچھ دیر خاموشی کے بعد دوبارہ گویا ہوئی۔

"پہلی سچویشن... ہیروئن کالج یا یونیورسٹی میں پڑھتی ہے اور کلاس کی طرف جاتے ہوئے سب سے خوب صورت، ذہین اور ٹاپر لڑکے سے ٹکرا جاتی اور بس... ہیرو گیا کام سے... وہ چاند، تارے، سیارے،

مرچ اور زہرہ سب ہیروئن کے قدموں میں ڈھیر کردیتا ہے۔۔۔ پر افسوس۔۔۔ چچ چچ چچ۔" منال نے باقاعدہ افسوس کرتے ہوئے ان دونوں کو دیکھا۔

"تم دونوں اپنی تعلیم مکمل کر چکی ہو۔ اور وہ بھی ان اداروں سے جو صرف خواتین کے لیے مخصوص ہیں۔"

"دوسری سچویشن۔۔۔ ہیرو ہیروئن شادی بیاہ میں ملتے ہیں۔۔۔ پر مجھے لگتا ہے ہمارے رشتے داروں میں سب کی شادیاں ہمارے دنیا میں آنے سے پہلے ہی ہو گئی تھیں۔ اتنے بے مروت رشتے دار ہیں شادیوں میں بلاتے ہی نہیں" منال نے دکھی دل سے کہا اور پھر تیسری سچویشن بتانے لگی۔

"ہیروئن کسی ضروری کام سے چھت پر جاتی ہے وہاں اڑوس پڑوس میں آیا کوئی ہینڈسم نوجوان اسے دیکھ کر اپنا دل ہار بیٹھتا ہے۔۔۔ اف۔۔۔ ہاں۔۔۔ یہ سین تم دونوں کی زندگیوں میں ہو سکتا ہے۔۔۔ تم دونوں ہر روز بیس پچیس چکر چھت کے کاٹ آیا کرو۔۔۔ ہو سکتا ہے کسی شاہ زین عباسی اور زاویار ہمدانی کی نظر تم پر پڑ جائے۔"

منال نے ان دونوں کو مفت مشورے سے نوازا جواب میں وہ دونوں اسے گھور کر رہ گئی تھیں۔

"ہاں۔۔۔ تاکہ گوہر بھائی ہم دونوں کو چھت پر ہی زندہ دفن کر دیں۔" عینا نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

"اور اب ہم اتنے گرے پڑے بھی نہیں ہیں کہ ایسی اوچھی حرکتیں کرتے پھریں۔۔۔ جسے ہماری زندگی میں آنا ہو گا خود آجائے گا ہم کسی کو نہیں ڈھونڈنے والے۔۔۔" حیا نے مضبوط لہجے میں کہا تھا اور عینا نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔

"میں تو ایسے ہی مشورے دے رہی تھی۔" منال نے دانت نکالتے ہوئے کہا تھا۔

"مہربانی فرما کر تم ایسے ہی مشورے نہ ہی دیا کرو۔" حیا نے چڑتے ہوئے کہا تھا۔

عینا پھر سے شروع ہو گئی تھی اب کے گانا چینج تھا گانے کے حساب سے آواز کو دکھی بنایا گیا تھا۔

کہاں ہو تم چلے آؤ محبت کا تقاضا ہے
غم دنیا سے گھبرا کر تمہیں دل نے پکارا ہے۔

☆ ☆ ☆

گھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی اعجاز صاحب کو فیکٹری کی طرف سے عمرے کے ٹکٹ ملے تھے رافعہ بیگم تو خوشی سے نہال ہو گئی تھیں۔ پروردگار نے اپنے گھر بلایا تھا یوں اچانک اتنی بڑی خوشی۔۔۔ وہ فوراً شکرانے کے نفل پڑھنے چل دی تھیں اور اب کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔

"میں سوچ رہی ہوں، ہم تو چلے جائیں گے بچیوں کا کیا بنے گا۔" رافعہ بیگم کی بات پر سب نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا اور ان کی بات کا مقصد جاننا چاہا تھا۔

"کیا مطلب۔۔۔ صرف بیس دن کی تو بات ہے۔" اعجاز صاحب نے ان کی پریشانی کی وجہ جاننی چاہی۔

"بیس دن تو ہے۔ پر یہ کیسی اکیلی رہیں گی۔۔۔ گوہر تو رات کو اکثر دیر سے آتا ہے۔" رافعہ بیگم نے اپنی پریشانی بتائی۔ "جوان بچیاں ہیں۔"

حیا کو بے ساختہ ہنسی آئی تھی اس نے فوراً عینا کو دیکھا تھا۔

"پھپھو آپ ہماری فکر مت کریں۔۔۔ ہم بہت بہادر ہیں۔۔۔ گوہر بھائی کے آنے تک منال ڈنڈا' حیا چاقو اور میں گوہر بھائی کی پسٹل لے کر گھر کا پہرا دیں۔۔۔"

"وہ گھر کا پہرہ نہیں۔۔۔ تمہارے پہرے کی بات کر رہی ہیں۔" منال نے عینا کے کان کے قریب ہوتے ہوئے شرارت سے کہا تھا۔

"لو ہمارا پہرا کیوں۔۔۔ ہم کہیں بھاگ رہے ہیں کیا؟" عینا نے چڑتے ہوئے کہا تھا آواز آہستہ تھی۔

"پاگل ہوئی ہو کیا۔۔۔ ذرا سی اونچ نیچ ہو جائے تو۔۔۔" پھپھو نے جانے کون سی اونچ نیچ سمجھانی چاہی تھی عینا فوراً بول پڑی۔

"پھپھو آپ پتا نہیں کون سے دور کی بات کر رہی ہیں اب وہ دور نہیں ہے لڑکیاں بہت بہادر ہو چکی ہیں ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔" عینا نے پر عزم انداز میں

کہا تھا۔

"چھپکلی مار لوگی۔۔۔" پھپھو نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا نفی میں سر ہلانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

یہ لڑکیاں بھی نا۔۔۔ کتنی ہی بہادر اور باہمت ہو جائیں پر جب بات چھپکلی اور کاکروچ کی آئے تو حلق سے ایک بے چاری سی "چیخ" کے علاوہ کچھ بر آمد نہیں ہوتا۔۔۔

"ارے یاد آیا۔۔۔ خالہ صغریٰ سے بات کرتی ہوں وہ آجائیں گی یہاں۔" خالہ صغریٰ کا نام یاد آتے ہی رافعہ بیگم کی آنکھیں چمک گئی تھیں۔ اور ان تینوں نے پریشانی سے ایک دوسرے کو دیکھا تھا بلکہ حیا نے تو کانوں پر ہاتھ رکھ کر "نہیں" کی آواز بھی لگائی تھی پر تب تک رافعہ بیگم اپنی دور کی خالہ "صغریٰ بیگم" کو فون کرنے جاچکی تھیں۔

"خالہ صغریٰ کے ساتھ رہنے سے تو بہتر ہے میں اپنی جان سے ہی ہاتھ دھولوں۔۔۔"

"تم واقعی ہاتھ دھولو تو بہتر ہے تمہارے ہاتھوں سے لہسن 'پیاز کی سمیل آرہی ہے۔" عینا نے حیا کو مشورہ دیا تو وہ بولی تو کچھ نہیں تھی پر اسے ایسی نظروں سے دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو۔

"تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں۔"

"ہائے خالہ صغریٰ کے ساتھ تو بندہ بیس منٹ نہیں گزار سکتا بیس دن۔۔۔ کیسے گزریں گے۔" منال کو بیس دن کا سوچ سوچ کر ہول اٹھ رہے تھے۔

"فجر کی نماز کے بعد دوبارہ مت سوؤ۔۔۔ بندہ پوچھے جب کرنے کو کچھ نہیں تو سونے میں کیا حرج ہے۔۔۔ ٹی وی مت دیکھو' رسالے مت پڑھو۔۔۔ دماغ خراب ہوتا ہے کوئی بتائے پہلے کون سا دماغ ٹھیک ہے۔۔۔ اور رافعہ نے لڑکیوں کو کچھ نہیں سکھایا' یہ تو ان کا تکیہ کلام ہے شاید۔" حیا نے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے۔

"تم تو ایسا مت کہو' تمہیں تو خاصا پسند کرتی ہیں وہ۔۔۔" عینا نے شرارت بھری مسکراہٹ چہرے پر سجائے ہوئے حیا کو دیکھا تھا۔

"اور مطلوب صاحب بھی۔۔۔"

مطلوب کا نام سنتے ہی حیا آگ بگولہ ہوگئی تھی منال اور عینا ہنس ہنس کر دوہری ہوگئی تھیں۔

چار پانچ ماہ پہلے خالہ صغریٰ اپنے بڑے پوتے مطلوب کے ساتھ حیدر آباد آئی تھیں تو منال اور عینا نے اس کا خوب ریکارڈ لگایا تھا۔ آنکھوں میں من من بھر سرمہ ڈالے مطلوب صاحب بہاتی گھبرو تھے۔

"مطلوب صاحب آپ مجھے یہ بتائیں آپ کس کو مطلوب ہیں؟"

"پولیس کو۔۔۔" عینا کے سوال پر منال نے فوراً جواب دیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ آثار قدیمہ والوں کو۔۔۔" عینا نے ہنستے ہوئے منال کی تصحیح کی تھی۔ حیا کو مطلوب سے ہمدردی کا بخار چڑھا تھا اور اس نے ان دونوں کو ٹوکا تھا کہ وہ اس "بے چارے" کا مذاق نہ اڑائیں اور حیا کو یہ ہمدردی خاصی مہنگی پڑی تھی۔ مطلوب صاحب بار بار بڑی پیار بھری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ حیا کے ہاتھوں کے توتے اڑ گئے تھے اس صورت حال پر' اسے اندازہ نہیں تھا کہ ہمدردی اتنی مہنگی پڑے گی۔۔۔

"حیا۔۔۔ خالہ صغریٰ اگر مطلوب میاں کے لیے تمہارا ہاتھ مانگ لیں تو۔۔۔"

"بکو مت۔" حیا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے گھورا تھا۔ "مطلوب میاں سے شادی سے اچھا' میں چھت سے کود کر خودکشی کرلوں۔"

"چھت سے کود کر' کبھی خودکشی کی کوشش ضائع مت کرنا حیا۔ چھت زیادہ اونچی نہیں ہے اس سے کود کر صرف ٹانگیں ہی ٹوٹیں گی اگر کبھی خودکشی کا ارادہ بنے تو مجھ سے مشورہ مانگنا' یقین کرو نت نئے آئیڈیاز دوں گی۔"

"تم مجھے روکو گی نہیں۔۔۔ الٹا مشورے دو گی۔۔۔ یعنی مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔" حیا نے حیرت اور صدمے سے اسے دیکھا تھا۔

"دیکھو حیا جانے والوں کو روک سکتے نہیں ہیں اور پھر

میرے خیال میں انسان کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ وہ جو ارادہ کرے اس پر عمل بھی کرے۔" عمنا نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

"صدقے جاؤں تمہارے فلسفے کے۔۔۔ اللہ نہ کرے کہ میں کوئی ایسا ارادہ کروں۔۔۔ اللہ تمہاری زندگی بھی مجھے لگادے۔" حیا نے آخری جملہ شرارت سے کہا تھا۔

"اللہ میری زندگی مجھے ہی لگائے ابھی تو میں نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں۔۔۔"

"کیا نہیں دیکھا؟" منال کے سوال پر عمنا نے کچھ دیر خاموشی کے بعد جواب دیا تھا اس پر منال اور حیا نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"ابھی تک تو میں نے اپنی ماں بھی نہیں دیکھی۔" حیا فوراً" اٹھ کر اس کے قریب آئی تھی وہ اس کا دکھ سمجھ سکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اُمڈتے آنسوؤں نے کمرے کا ماحول بدل دیا تھا۔ منال بھی فوراً" اس کے پاس آئی تھی۔ ہر دم ہنستی مسکراتی عمنا کے آنسو ان دونوں کے لیے ناقابل برداشت تھے۔

عمنا کے والد کی وفات کے بعد' شہناز بیگم نے ڈیڑھ سالہ عمنا کو پھپھو کے پاس چھوڑا اور ایاز آفندی کے ساتھ دوسری شادی کرلی تھی' پھر سننے میں آیا تھا وہ دبئی شفٹ ہوگئی تھیں۔ انہوں نے کبھی عمنا سے فون پر بھی رابطہ نہیں کیا تھا۔ عمنا کی یادداشت میں ماں کا دھندلا سا عکس ہی تھا اسے شہناز بیگم سے بہت شکایتیں تھیں۔ اسے امید تھی کہ وہ کبھی نہ کبھی تو اس سے ملنے آئیں گی۔۔۔ کبھی نہ کبھی۔۔۔ زندگی کے کسی موڑ پر انہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہوگا کہ ڈیڑھ سالہ معصوم عمنا کو پھپھو کے پاس چھوڑ کر دوبارہ کبھی اس کی خبر تک نہ لی۔۔۔ اور عمنا سوچے بیٹھی تھی جس دن وہ آئیں گی وہ خوب جی بھر کر اپنے دل کی بھڑاس نکالے گی۔

☼ ☼ ☼

ان تینوں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی' جب انہیں معلوم ہوا کہ صغریٰ بیگم نے اپنی طبیعت کی خرابی کا کہہ کر آنے سے معذرت کرلی ہے۔ منال کا دل چاہا تھا بھنگڑے ڈالے' پر رافعہ بیگم کو پریشان دیکھ کر اس نے دل کی اس ننھی سی خواہش کو دل میں ہی دبالیا تھا۔

شام میں نند کی آنے والی کال نے ان کی پریشانی دور کردی تھی جنہیں جیسے ہی معلوم ہوا بھائی بھابھی عمرے پر جارہے ہیں اور بھابھی حیا' منال اور عمنا کی وجہ سے پریشان ہیں تو فوراً" انہوں نے ان کی پریشانی دور کی تھی جب تک وہ پاکستان آئیں گی تب تک وہ تینوں ان کے پاس کراچی میں رہیں گی۔ رافعہ بیگم شروع میں تھوڑا ہچکچائی تھیں ان کی نند طاہرہ کی شادی خاصے کھاتے پیتے گھرانے میں ہوئی تھی' شروع میں تو طاہرہ بھائی بھابھی سے ملنے آتی رہتی تھیں پر اب عرصہ ہوا وہ اپنی زندگی میں ایسی مصروف ہوئی تھیں کہ کبھی دو چار ماہ بعد ایک آدھ بار فون کال کرلیتی تھیں۔

"طاہرہ' منال' عمنا اور حیا کو کراچی بھیجنے کا کہہ رہی ہے۔" فون بند کرنے کے بعد رافعہ بیگم نے سوالیہ نظروں سے شوہر کو دیکھا تھا۔

"ہاں تو بھیج دو' اس سے اچھی کیا بات ہے سگی پھپھو ہے ان کی۔۔۔ کوئی غیر تو نہیں ہے۔" اعجاز صاحب نے فوراً" حامی بھرلی تھی۔

"پر۔۔۔ وہ۔۔۔"

"وہ۔۔۔ کیا؟"

"عمنا۔۔۔ بھی تو ہے۔۔۔ وہ تو اس کی بھتیجی نہیں ہے نا۔"

"طاہرہ ایسا کچھ نہیں سوچے گی اسے معلوم ہے عمنا کو ہم نے ہمیشہ اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھا ہے' وہ عمنا کو منال اور حیا کی طرح ہی عزیز رکھے گی۔" اعجاز صاحب کے سمجھانے کا خاطر خواہ اثر ہوا تھا رافعہ بیگم ساری پریشانیاں بھلائے عمرے پر جانے کی تیاریاں کرنے لگی تھیں۔

ان تینوں کو جیسے ہی سامان پیک کرنے کا حکم ملا تھا وہ جلدی جلدی اپنی تیاری کرنی لگیں۔ وہ کافی ایکسائیٹڈ تھی ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی بار پھپھو کے گھر

جا رہی تھیں۔
گوہر نے پہلے ان تینوں کو پھپھو کے گھر چھوڑا تھا اور پھر رافعہ بیگم اور اعجاز صاحب کو ایئرپورٹ چھوڑ کر واپس حیدر آباد چلا گیا تھا۔
انہیں معلوم تو تھا ہی کہ پھپھو خاصی امیر ہیں پر ان کا لیوش لائف اسٹائل دیکھ کر ان آنکھیں چمک گئی تھیں۔
"آنکھیں کم پھاڑو۔۔۔ اس طرح تو ہم پینڈو اور اجڈ لگیں گے۔۔۔ ہم تو اس سے بھی بڑے اور خوب صورت گھر دیکھ چکے ہیں۔" عمنا نے ان دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔
"کہاں دیکھ چکے ہیں؟" منال نے سوال کیا تھا۔
"تم بھول گئی عدن مراد عباسی اور زاویار تیمور کے' اس سے بڑے محل نما بنگلے تھے۔" عمنا نے فوراً" یاد دلایا تھا۔
"اور تین تین چار چار گاڑیاں تھیں ان کے پورچ میں' جب کہ تمہاری پھپھو تو ان کے سامنے غریب غرباء میں شمار ہوتی ہیں۔" عمنا نے پورچ میں کھڑی واحد مہران کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" منال چڑی تھی۔
"ویسے مجھے بہت برا لگ رہا ہے تمہاری پھپھو نے بلا تو لیا ہے' پر استقبال کے لیے تو آئیں نہیں نہ ہی گوہر بھائی اندر تک چھوڑنے آئے۔"
"ہاں تم تو بڑی فیمس پرسنالٹی ہو نا تمہارے لیے ریڈ کارپٹ بچھانا چاہیے تھا۔" وہ داخلی دروازے تک پہنچی تھیں کہ ملازمہ انہیں دیکھ کر دوڑ کر ان کے پاس آئی تھی اور ان سے سامان لے کر اور ڈرائنگ روم میں بٹھا کر جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔
کچھ دیر بعد ملازمہ کے ساتھ آتی خاتون کو دیکھ کر وہ تینوں ہی احتراماً" کھڑی ہوگئی تھیں۔
"ارے بیٹھو بیٹھو۔۔۔ کھڑی کیوں ہوگئیں۔۔۔"
پھپھو باری باری تینوں سے ملی تھیں۔ وہ ان تینوں سے بہت محبت اور شفقت برت رہی تھیں' عمنا کچھ دیر پہلے کہے الفاظ پر تھوڑی شرمندہ سی ہوئی تھی۔

"میں خود تم لوگوں کو ریسیو کرنے آتی' بھابھی بھائی کو بھی ایئرپورٹ چھوڑنے جاتی پر اچانک ہی میری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔"
"اوہ۔۔۔ کوئی بات نہیں پھپھو۔" منال نے فوراً" مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ اتنے میں ملازمہ کولڈ ڈرنک لے آئی تھی۔
"کھانا کھایا ہے تم لوگوں نے؟" طاہرہ بیگم نے بڑی محبت اور اپنائیت سے پوچھا تھا۔
"جی ہم لنچ کر کے ہی نکلے تھے گھر سے۔"
"گوہر اور بھائی بھابھی گھر نہیں آئے؟ میں تو سوچ رہی تھی وہ لوگ آئیں گے۔"
"وہ ایکچولی پھپھو امی ابو کو دیر ہو رہی تھی ان کی فلائٹ مس ہو جاتی تو اس لیے وہ لوگ ہمیں گیٹ پر ہی چھوڑ گئے تھے۔" منال نے فوراً" وجہ بتائی۔
"اچھا۔۔۔ چلو تم لوگ بھی آرام کرلو۔۔۔ ملازمہ تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آتی ہے۔" طاہرہ بیگم نے ملازمہ کو حکم دیا تھا اور وہ تینوں ملازمہ کی رہنمائی میں اپنے کمرے تک آئی تھیں۔ سامان ملازمہ پہلے ہی کمرے میں رکھ کر جا چکی تھی۔ منال اور عمنا تو کمرے کا معائنہ کر رہی تھی جبکہ حیا بیڈ پر ڈھے گئی تھی۔
"میں تو سونے لگی ہوں۔" حیا نے اپنا ارادہ بتایا تھا۔
"یہ کون سا ٹائم ہے سونے کا؟" عمنا نے کھڑکی سے غروب ہوتے سورج کو دیکھتے ہوئے اسے سونے سے منع کیا تھا پر وہ اس کے منع کرنے کے باوجود بھی سوگئی تھی۔ ڈنر کے لیے جب ملازمہ بلانے آئے تو ان دونوں نے حیا کو جگانا چاہا تھا پر وہ ڈھیٹ بنی سوتی رہی تھی۔
وہ دونوں کھانے کے بعد واپس آئیں تو حیا گہری نیند میں تھی' وہ دونوں بھی کچھ دیر بعد سوگئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

رات کا جانے کون سا پہر تھا جب بھوک اور پیاس

کی وجہ سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے ساتھ لیٹی عینی کا بازو ہلا کر اسے جگانا چاہا تھا' پروہ اس کا ہاتھ جھٹک کر کروٹ لے کر دوبارہ سو گئی تھی۔ اس کی طرف سے مایوس ہو کر اس نے دائیں طرف لیٹی منال کو جگانا چاہا۔

"منال..." اس نے منال کو جھنجوڑتے ہوئے پکارا تھا۔

"کیا ہے؟" نیند میں ڈوبی منال کی جھنجلاتی ہوئی آواز آئی تھی۔

"مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

"میں کیا کروں..."

"میرے ساتھ چلو' مجھے کھانا کھانا ہے۔"

"صبح کھالینا... ایک وقت کا کھانا نہ کھانے سے بندہ مرتا نہیں ہے۔" منال کو یوں نیند خراب کرنے پر حیا پر بہت غصہ آرہا تھا۔

"بکو مت... ٹھنڈی رات میں بدفعال منہ سے مت نکالو۔" حیا کو مرنے والی بات بہت بری لگی تھی اور یہ ٹھنڈی رات والی منطق خالصتاً" رافعہ بیگم کی تھی۔ ان کا خیال تھا شاید ٹھنڈی راتوں میں منہ سے نکلی ہوئی بات جلدی قبول ہوتی ہے۔

"دروازہ کھولوگی دائیں طرف جانا تھوڑے سے فاصلے پر کچن ہے۔" منال نے بمشکل آنکھیں کھولتے ہوئے اسے کچن کا راستہ سمجھایا تھا اور ساتھ ہی تاکید بھی کی تھی۔

"اور ہاں کھانے پر ندیدوں کی طرح مت ٹوٹ پڑنا ہم یہاں مہمان ہیں۔" اس کی اس بات پر حیا اسے گھور کر رہ گئی تھی اور بیڈ سے اتر کر لائٹ آن کی تھی وال کلاک پر نظر پڑی تو رات کے دو بج رہے تھے۔ دوپٹا اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ دروازہ کھول کر باہر آئی اور دروازے کو کھلا رہنے دیا۔ دائیں بائیں دیکھا کوریڈور سنسان تھا۔ ایک لمحے کو تو دل چاہا واپس مڑجائے' پر پھر دل کو مضبوط کرتے ہوئے منال کے سمجھائے ہوئے راستے پر چل پڑی۔

یہ شکر تھا کہ کچن کی لائٹ آن تھی۔ دروازہ بھی کھلا تھا سامنے چند قدم کے فاصلے پر فریج تھا۔ اس نے بڑھ کر فریج کا دروازہ کھولا۔ اور اس میں سے دو سیب اور پانی کی بوتل نکال کر سیدھی ہوئی ہی تھی کہ لائٹ چلی گئی تھی۔ واپسی کے لیے مڑی ہی تھی کہ سامنے کھمبے کی طرح کھڑے اتنے لمبے جن کو دیکھ کر اس کے ہاتھ سے پانی کی بوتل اور سیب چھوٹ کر نیچے گرے۔ جن نے مڑ کر اسے دیکھا' جن اب تک اس کی آمد سے بے خبر تھا شاید اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا' پر حلق سے آواز برآمد نہ ہو سکی اسے اور کچھ نہ سوجھا تو ہاتھ میں پکڑے سیب سے جن کے سر کا نشانہ لیا اور وہاں سے دوڑ لگادی۔

خوش قسمتی سے بدحواس ہونے کے باوجود وہ صحیح راستے پر تھی کمرے میں آکر اس نے جلدی سے دروازہ لاک کیا۔

"منال... عینی... ج ج... جن۔" اس نے منال اور عینی کو ہلاتے ہوئے بتایا۔

"کیا مصیبت ہے... اب کیا ہو گیا۔" منال جھنجلا گئی تھی حیا دوسری بار اس کی نیند خراب کررہی تھی۔

"کچن میں جن تھا... اتنا لمبا... چھت جتنا۔"

"تمہارا وہم ہوگا۔" عینا کو یقین نہیں آیا۔

"نہیں... سچ کہہ رہی ہوں... ابھی میں نے خود دیکھا... مجھے ڈر لگ رہا ہے... ہائے امی۔" حیا تقریباً" رونے کو ہوگئی تھی۔

"دیکھو تمہیں اللہ کا واسطہ ابھی خاموشی سے سو جاؤ... صبح دیکھیں گے۔" منال نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ کر منت کی تھی' حیا آنکھیں سختی سے میچے لیٹ گئی اور جو جو دعا یاد تھی باری باری سب کا ورد کرتی وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی تھی۔

رات خوف سے تھر تھر کانپتی حیا ابھی فخر سے گردن اکڑائے انہیں اپنی بہادری کا قصہ سنا رہی تھی کہ اس نے کس دیدہ دلیری سے جن پر حملہ کیا تھا اور جن ایک پل میں رفوچکر ہو گیا تھا اس کی اس بہادری کی وجہ سے پورا گھر جن کی خوراک بننے سے بچ گیا تھا اس نے جان پر کھیل کر ان سب کی جان بچائی ہے اس پر کم سے کم تمغہ جرات تو بنتا تھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ تم اگر جن دیکھ لیتی تو پہلی ہی فلائٹ سے اوپر ہوتیں۔" عمنا نے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میرا تم دونوں کی طرح نڈی سا دل نہیں' اس جن کے اتنے لمبے لمبے دانت تھے۔" حیا نے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہوئے کہا ورنہ حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے جن کی شکل غور سے نہیں دیکھی تھی۔

"پر لمبے دانت تو ڈریکولا کے ہوتے ہیں' جاؤ رہنے دو' تمہیں ڈریکولا اور جن کے درمیان فرق تک نہیں پتا۔" منال نے ایسے کہا تھا جیسے جنہیں ڈریکولا اور جن کے درمیان فرق نہ پتا ہو ان جیسا کم عقل کوئی نہیں ہے۔

"ہاں تمہیں بڑا پتا ہے تم نے تو پورا بچپن ڈریکولا اور جن کے ساتھ کھیلتے ہوئے گزارا ہے نا؟" حیا کو اس کی بات بری لگی تھی اس لیے فوراً جواب دیا تھا۔

"حیا ڈریکولا تو ایک کالے رنگ کا کوٹ پہن کر رکھتا ہے جس کے کالر بڑے بڑے ہوتے ہیں۔" عمنا نے جو ڈراموں میں ڈریکولا کی ڈریسنگ دیکھی تھی وہ بتائی۔

"پتا نہیں' میں نے اتنے غور سے اس کی ڈریسنگ نہیں دیکھی تھی کہ اس کے کوٹ کے کالر کی لمبائی بھی ناپتی۔ میں کالر کی لمبائی پر غور و خوض کرتی رہ جاتی اور وہ مجھے اگلے جہان پہنچا دیتا۔" حیا ان کے پے در پے سوالات سے چڑ گئی تھی۔

ملازمہ نے ان کے کمرے کا دروازہ بجا کر انہیں ناشتے کے لیے بلایا تھا تو وہ تینوں ڈائننگ ہال کی طرف چل دی تھیں۔

ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے ہی صدارتی کرسی کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے شخص کو دیکھ کر وہ تینوں ہی حیران رہ گئی تھیں اس کے ماتھے پر بنا' بڑا سا گومڑ کسی حادثے کی نشاندہی کر رہا تھا۔

اسی لمحے کاشان ہال میں داخل ہوا تھا اور چیئر کھینچتے ہوئے اس پر بیٹھ گیا تھا۔

"بھائی یہ کیا ہوا؟" کاشان کی نظر جیسے ہی شایان پر پڑی تھی اس نے ماتھے پر بنے گومڑ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

شایان نے ایک نظر اسے دیکھا اور ٹھنڈی سانس بھر کر دوبارہ ناشتے میں مصروف ہو گیا تھا۔ کاشان سمجھ گیا تھا جو بھی ہوا تھا اچھا نہیں ہوا تھا اسی لیے شایان بتانے سے گریز کر رہا ہے۔

"تم لوگ کھڑی کیوں ہو بیٹھو۔" پھپھو ملک شیک کا جگ لے کر آئیں تو ان تینوں کو یوں کھڑا دیکھ کر فوراً ٹوکا۔ وہ تینوں فوراً" کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔

"کل کس وقت آئے تھے تم؟"

"رات دو بجے۔" شایان کے بتاتے ہی حیا کا چائے کا کپ اٹھایا' ہاتھ کانپا تھا اس نے تھوک نگلتے ہوئے ساتھ بیٹھی عینی کو دیکھا تھا' جو اسے ہی دیکھ رہی تھی حیا کو لگا تھا' عمنا بھی وہی سوچ رہی ہے جو وہ سوچ رہی ہے۔

"آپ ابھی ناشتے کے بعد کہیں جائیں گے؟" کاشان نے ناشتا کرتے ہوئے شایان سے پوچھا تھا۔

"نہیں اب ایسے میں کہیں جانے سے تو رہا جسے دیکھو یہی پوچھے گا ماتھے پر کیا ہوا ہے۔" شایان نے چڑتے ہوئے کہا تھا۔

حیا جو سر جھکائے بڑی مشکلوں سے ناشتا کر رہی تھی اس نے اپنا سر مزید جھکا لیا تھا اس کی کوشش تھی کہ شایان کی نظر اس پر نہ پڑے اسے یہ خوف تھا کہیں شایان اسے پہچان نہ لے اس کا یہی خیال تھا کہ شایان کو بالکل اندازہ نہیں ہوا ہو گا کہ وہ "حیا" تھی۔

"پھر ایسا کریں گاڑی کی چابی مجھے دے دیں' میں آپ کی گاڑی لے جاتا ہوں۔"

"میرے کمرے سے سائیڈ ٹیبل سے لے لینا۔"

کاشان ناشتا کر کے یونیورسٹی کے لیے نکل گیا تھا۔ وہ تینوں بھی ناشتے کے بعد اپنے کمرے میں آ گئی تھیں۔

"حیا اس جن کے لمبے لمبے دانت تھے نا؟" عمنا نے حیا سے پوچھا تھا۔

حیا نے سارے جہاں کی معصومیت سجاتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"دیکھو عینا میں نے اس کا چہرہ نہیں دیکھا تھا دیکھتی بھی کیسے فوراً" لائٹ چلی گئی تھی اس کا قد اتنا لمبا ہے میرا کوئی قصور نہیں ہے اتنے لمبے صرف جن ہوتے ہیں میرے خیال میں تو۔ اور پھر اسے ضرورت کیا تھی رات کے دو بجے کچن میں جانے کی۔" حیا کے خیال میں اس سارے واقعے میں اس کا ذرا قصور نہیں تھا۔

"حیا بی بی یہ آپ کا گھر نہیں ہے ان کا گھر ہے ان کی مرضی رات کے دو بجے کچن میں جائیں یا چار بجے۔"

"میں تو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہو رہی ہوں شایان بھائی کی نظروں میں ہمارا امیج کتنا برا بنا ہو گا۔ انہیں یہ تو اندازہ ہو گا ہی کہ جس نے انہیں سیب مارا ہے وہ ہم تینوں میں سے ایک ہے یا پھر ہو سکتا ہے کہ انہیں پتا ہو کہ وہ حیا ہے۔" منال نے بات سن کر حیا نے پریشانی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں حیا تم شایان سے معافی مانگ لو۔" عینا نے مشورہ دیا تھا حیا نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"اپنی غلطی مان کر معافی مانگنے والا عظیم ہوتا ہے۔" منال نے اسے عظمت کا لالچ دیا تھا پر وہ اب بھی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔

"اگر میں ان سے معافی مانگنے گئی اور انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا تو پھر میری کتنی انسلٹ ہو گی۔" حیا پہلے تو اس کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی اور دوسرا اس کے ردعمل کا سوچ کر گھبرا رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس نے پوری طاقت سے سیب اس کے سر پر دے مارا تھا۔ تب ہی تو سر پر اتنا بڑا گومڑ تھا۔

"تم ان کے ردعمل کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو تو یوں کرو معافی نامہ لکھ دو میں اور عینی چپکے سے ان کے کمرے میں رکھ آئیں گے۔ اس سے یوں ہو گا انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ جس نے بھی یہ کیا ہے وہ شرمندہ ہے۔" منال کی اس بات پر عینا نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے شعر پڑھا تھا

گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی
دل کو لگتی ہے بات بکری کی

"تم نے مجھے بکری کہا ہے؟" منال نے برا مناتے ہوئے پوچھا تھا۔

"نہیں میں نے تمہیں "چھوٹی" کہا ہے۔" عینا نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی تھی۔

"پر معافی نامہ لکھے گا کون؟ مجھے تو معافی نامہ لکھنا نہیں آتا۔" حیا نے صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا تھا۔

"میں لکھ دوں گی' ویسے بھی میں اسکول میں معافی نامے لکھ لکھ کر اچھی خاصی یوز تو ہو چکی ہوں۔ ہماری پرنسپل نے عجیب رول بنائے ہوئے تھے ہر چھوٹی بڑی غلطی پر معافی نامہ لکھواتی تھیں اور پورے اسکول سے معافی نامے لکھوا لکھوا کر انہوں نے آفس میں تین الماریاں بھری تھیں اور پھر وہ ساری ردی بیچ کر ایک گاڑی خریدی تھی۔" منال کی بات پر حیا اور عینا ہنس ہنس کر بے حال ہو گئی تھیں۔

"مبالغہ آرائی کی بھی حد ہوتی ہے اگر ایسا ہوتا تو ٹین ڈبے والے جہاز میں ردی لینے آنے لگ جاتے۔"

"تم لوگ کیا فضول بحث لے کر بیٹھ گئی۔ اس فضول بحث کو چھوڑو اور جلدی سے معافی نامہ لکھ کر دو۔" حیا نے فوراً" ان دونوں کو ٹوکا۔

منال کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئی تھی اور معافی نامہ لکھنے لگی۔ معافی نامہ لکھنے کے بعد آخر میں معافی کی طلب گار کے نیچے حیا کا نام لکھنے ہی لگی تھی کہ حیا نے فوراً" روک دیا۔

"خبردار میرا نام مت لکھنا۔ XYZ لکھ دو" حیا نے اسے مشورہ دیا۔ حیا چاہتی تھی کہ شایان کو نہ ہی پتا چلے کہ یہ اس کا کارنامہ ہے۔

"پورا معافی نامہ اردو میں لکھ کر اب آخر میں XYZ لکھوں پاگل نہیں ہوں میں۔" منال نے کہا اور آخر میں 'اب ج د' لکھ کر صفحہ تہ کر دیا۔

منال اور عینی چپکے سے وہ معافی نامہ شایان کے کمرے میں رکھ آئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

شایان جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا اس کا

موبائل بج اٹھا تھا اس نے جینز کی جیب سے موبائل نکالا تھا موبائل اسکرین پر اس کے بہترین دوست احمد کا نام جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو۔" اس نے کال ریسیو کر کے فون کان سے لگایا تھا۔

"کہاں ہے تو؟"

"گھر پر، کیوں؟"

"آج مووی کا پروگرام ہے۔ تو بھی چلے گا نا؟"

"نہیں یار۔"

"کیوں؟" احمد نے حیرت سے پوچھا تھا۔

"میری گاڑی کاشان لے گیا ہے۔"

"تو اس کی فکر نہیں کر۔ میں پک کر لوں گا تجھے۔" احمد نے فوراً اس کی پرابلم حل کی تھی۔

شایان نے سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں خود کو دیکھا ماتھے پر بنا گومڑ بہت بدنما لگ رہا تھا۔

"نہیں یار۔ میرا موڈ نہیں ہے۔ پھر کسی دن۔"

"چل ٹھیک ہے۔ جیسے تیری مرضی۔" احمد نے کال کاٹ دی تھی۔

شایان کی نظر ڈریسنگ ٹیبل سے ہوتے ہوئے بیڈ کے سائیڈ ٹیبل پر گئی تو وہاں رکھے کاغذ نے اس کی توجہ کھینچ لی تھی۔ کاغذ کے اوپر گلاس رکھا ہوا تھا۔

وہ حیران سا سائیڈ ٹیبل کے قریب آیا اور تجسس سے تہ شدہ کاغذ کھولا تھا۔

کاغذ پر لکھی تحریر پڑھتے ہوئے وہ مسکرا رہا تھا اس کا موڈ بحال ہو گیا تھا۔ "معافی کی طلب گار۔"

"م' ب' ج' د'" وہ ہنسا تھا۔

اور ہنستے ہوئے وہ کاغذ سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ دیا تھا۔

✡ ✡ ✡

تین چار دن خیر و عافیت سے گزرے تھے شایان نے اس معافی نامے کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا تھا اس کے ماتھے پر بنا گومڑ ٹھیک ہو چکا تھا۔ حیا خوش تھی۔ بات آئی گئی ہو گئی تھی۔

اس وقت وہ تینوں کچن میں تھیں عینا نے فروٹ باسکٹ سے تین چار کیلے اٹھائے تھے اور سلیب پر چڑھ کر بیٹھ گئی تھی حیا نے اس کی دیکھا دیکھی فروٹ باسکٹ سے سیب اٹھایا تھا اور کرسی گھسیٹ کر اس کے بالکل سامنے بیٹھ گئی تھی۔ منال کچن کا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔

"عینا۔ میں تو جب یہاں سے جاؤں گی دیکھ لینا میرا پانچ چھ کلو وزن کم ہو گیا ہو گا۔"

"کیوں؟" عینا نے کیلے کھاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"بھوکے رہ رہ کر۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ یہاں کھانا تو مزے کا ہوتا ہے پر پھپھو، پھپھا اور ان کے دونوں بیٹوں کے ہوتے ہوئے میں ٹھیک سے انصاف نہیں کر پاتی کھانے سے۔" حیا نے افسردگی سے کہا تھا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔" عینا نے مسکراتے ہوئے تائید کی تھی۔

"منال ذرا ایک گلاس جوس کا تو دو بھر کر۔ صبح پھپھو کے بیٹوں کو دیکھا تھا کیسے جوس کے گلاس بھر بھر کر پی رہے تھے۔ میرا بھی اتنا دل چاہ رہا تھا۔" حیا نے مڑے بغیر منال کو حکم دیا تھا اس کی نظر سامنے عینا پر تھی۔ عینا کے چہرے کا رنگ بدلا تھا حیا کو محسوس ہوا عینا کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔

"کیا ہوا؟" حیا نے سوالیہ نظروں سے عینا کو دیکھا تھا عینا نے اشارے سے اسے پیچھے دیکھنے کا کہا تھا۔ حیا مڑی تھی سامنے جوس کا گلاس لیے پھپھو کا بڑا فرزند کھڑا تھا۔

"یہ لیجیے۔ اور جب آپ کا دل چاہے آپ بھی جوس کے گلاس بھر بھر کر پی سکتی ہیں ہم آپ کو بالکل منع نہیں کریں گے۔" شایان نے جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تھا۔ حیا جی بھر کر شرمندہ ہوئی تھی اور اس کا دل چاہا تھا کاش وہ کسی طرح یہاں سے غائب ہو جائے شایان نے جوس کا گلاس ٹیبل پر رکھ دیا تھا وہ مڑ کر آسانی سے اٹھا سکتی تھی اور مسکراتے

ہوئے واپس پلٹ گیا تھا۔
"میرا ڈوب مرنے کو دل چاہ رہا ہے۔" حیا نے رونی صورت بناتے ہوئے کہا تھا۔
"نیک کام میں دیر کیسی۔" عینا سلیب سے اتری تھی کیلے کے چھلکے ڈسٹ بن میں پھینکتے ہوئے کہا تھا۔
"بکو مت۔ کم از کم میں اب دوبارہ اس بندے کا سامنا نہیں کر سکتی۔ یا اللہ جلدی سے امی بابا آجائیں اور ہم اپنے گھر چلے جائیں۔" حیا نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی تھی۔
اسی لمحے منال کچن میں داخل ہوئی تھی۔
"تم کہاں مر گئیں تھی؟" حیا نے اسے دیکھتے ہی غصے سے پوچھا تھا۔
"کیا ہوا؟" حیا کو یوں غیظ و غضب ڈھاتے دیکھ کر اس نے حیرت سے عینا کو دیکھا تھا۔
عینا نے اسے پوری بات بتائی تھی۔
"اس طرح کے اتفاقات تو کہانیوں میں ہوتے ہیں۔" منال نے دانت نکالتے ہوئے کہا تھا۔
"اور اس طرح کے اتفاقات کہانیوں میں ہی ہوں تو بہتر ہے اصل زندگی میں ہوں تو بندہ شرمندہ ہو کر مر جائے گا۔ اور میں اب شایان کا سامنا نہیں کر سکتی۔" حیا وہاں سے چلی گئی تھی وہ دونوں بھی ہنستے ہوئے اس کے پیچھے ہولی تھیں۔
اگلے دن شایان کسی ضروری کام سے شہر سے باہر چلا گیا تھا وہ ان کے جانے سے دو دن پہلے واپس آیا تھا حیا نے شکر ادا کیا تھا۔
رافعہ بیگم اور اعجاز صاحب عمرے سے واپس آئے تو پھپھو اور ان کی فیملی بھی انہیں لینے ایئرپورٹ گئی تھی گو ہر انہیں ایئرپورٹ پر ہی مل گیا تھا۔
وہ رافعہ بیگم اور اعجاز صاحب کے ساتھ پھپھو کے گھر آئے تھے اور دو تین گھنٹے وہاں گزار کر حیدر آباد واپس آ گئے تھے۔
گھر کی ہر چیز پر منوں مٹی جمی ہوئی تھی۔ عینا اور حیا نے فوراً کمر کس لی تھی اور گھر کی صفائی میں جت گئی تھی۔ وہ جانتی تھیں جیسے ہی عزیز و اقارب کو رافعہ بیگم اور اعجاز صاحب کی عمرے سے واپس آنے کی خبر ملے گی مبارکباد دینے آنے والوں کا تانتا بندھ جائے گا۔
اور ہوا بھی یہی تھا وہ گھر کی صفائی سے فارغ ہی ہوئی تھیں کہ آس پڑوس کی خواتین رافعہ بیگم سے ملنے آگئی تھیں۔ اور پھر یہ سلسلہ ہفتے دو ہفتے تک چلا تھا۔
یہ سلسلہ ختم ہوا تو ان تینوں نے شکر ادا کیا تھا رافعہ بیگم ان تینوں کے لیے اچھی خاصی شاپنگ کر کے لائی تھیں عینا کے لیے لی گئی ہر چیز منال اور حیا جیسی تھی۔ ہر چیز ان کے برابر تھی یہ سب دیکھ کر عینا کے دل میں ان کے لیے محبت مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ جانتی تھی وہ زندگی بھر رافعہ بیگم کی محبتوں کا قرض نہیں چکا پائے گی۔

☼ ☼ ☼

زندگی پھر سے پرانی ڈگر پر چل نکلی تھی۔ منال کالج چلی جاتی تھی حیا اور عینا گھر کے کاموں کے ساتھ ساتھ ڈھیروں باتیں اور چھوٹے موٹے لڑائی جھگڑے کرتیں اور ناول کے کرداروں پر باتیں کرتیں۔
عینا اپنی زندگی سے خوش اور مطمئن تھی کہ اچانک ایک دن وہ آگئیں۔ جس کا وہ سالوں سے انتظار کر رہی تھی۔ شہناز آفندی۔
عینا نے سوچا ہوا تھا کہ وہ جب ماں سے ملے گی تو خوب خفگی کا اظہار کرے گی۔ بیس سال میں جتنے شکوے شکایات جمع ہوئی ہیں سارے کہہ دے گی۔ ان سے لڑے گی کہ وہ اسے چھوڑ کر کیوں گئیں۔
پر ایسا کچھ نہ ہوا۔ شہناز آفندی کو سامنے بانہیں پھیلائے دیکھ کر وہ سارے شکوے شکایات بھول کر ان کے گلے لگ گئی تھی، اسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ کیا کہنا ہے وہ تو بس روئے جا رہی تھی۔
اس کے پاس ماں جیسے پھپھو تھیں پر پھر بھی ماں کی کمی اپنی جگہ موجود تھی۔ ہم عمر کے کسی بھی حصے میں پہنچ جائیں ہمیں ہر تکلیف ہر دکھ میں سب سے پہلے جو ہستی یاد آتی ہے وہ ماں ہے۔
شہناز آفندی محبت اور شفقت سے اس کے بالوں

میں ہاتھ پھیرتی اپنی مجبوریاں بیان کر رہی تھیں۔
"تمہیں چھوڑ کر جانا میری مجبوری تھی۔ اتنے سالوں میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں آیا جب تمہارا خیال یا تمہاری یاد نہ آئی ہو" وہ اس کے کسی شکوے سے پہلے ہی صفائی دینا شروع ہو گئی تھیں۔
"بارہا سوچا تمہیں فون کروں پر میرے پاس تمہاری پھپھو کا نمبر نہیں تھا۔"
"اپنی ماں کو معاف کر دو۔ میں نے اتنے سال تمہاری خبر تک نہیں لی۔" پلیز مجھے گناہ گار نہ کریں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔"
عینا نے ان سے الگ ہوتے ہوئے انہیں یقین دلایا تھا۔
"تم سچ کہہ رہی ہو نا؟"
"جی۔"
"میں تمہیں لینے آئی ہوں۔ تم میرے ساتھ چلو۔"
عینا نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا اس نے یہ تو بارہا سوچا تھا کہ شہناز آفندی آئیں گی پر کبھی یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ اسے لینے آئیں گی۔
"میں اب تمہیں خود سے دور نہیں کروں گی۔ میں جب تک پاکستان میں نہیں تھی تب تک بات اور تھی۔ پر اب تم میرے ساتھ رہو گی۔" شہناز آفندی نے پیار سے اس کے گال پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔
"تم جلدی سے اپنا سامان پیک کر لو۔"
"پر بھابھی عینا یہاں خوش ہے آپ اسے کیوں لے کر جا رہی ہیں؟" رافعہ بیگم پہلی بار کچھ بولی تھیں۔
"رافعہ یہ اس کا گھر نہیں ہے۔ میں اس کی ماں ہوں۔ اسے میرے ساتھ رہنا چاہیے۔ اور ویسے بھی جب میرے پاس اللہ کا دیا سب کچھ ہے تو میری بیٹی ایسی زندگی کیوں گزارے۔" ان کا آخری جملہ سن کر رافعہ بیگم دوبارہ نہیں بولی تھیں۔ عینا نے ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔
"تم جا رہی ہو۔؟" حیا اور منال نے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔
"پر کیوں؟"
"یہ میرا گھر نہیں ہے حیا، مجھے اپنی ماں کے ساتھ رہنا چاہیے۔ بہت دن تم لوگوں پر بوجھ بن گئی۔"
"ہم نے کبھی تمہیں محسوس ہونے دیا کہ یہ تمہارا گھر نہیں ہے۔ کبھی تمہیں بوجھ سمجھا۔؟" حیا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا تھا۔
"یہ تو تم لوگوں کا بڑا پن ہے۔" عینا نے مشکور نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "اور مجھے اس گھر سے جتنی محبتیں ملی ہیں وہ میں کبھی نہیں بھلا سکتی۔ میں تم لوگوں کا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"
عینا نے جھلمل کرتی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا اس گھر کو چھوڑ کر جانا اس کے لیے اتنا آسان نہیں تھا اس گھر کے در و دیوار سے اس کی یادیں وابستہ تھیں اس گھر کے مکینوں کی دی ہوئی محبت کا قرض وہ ساری زندگی نہیں چکا سکتی تھی۔
اس نے آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتے ہوئے اپنا سامان بیگ میں ڈالنے لگی تھی۔
"ایسے بھی کوئی جاتا ہے بھلا۔" منال نے جھنجلاتے ہوئے کہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کس طرح عینا کو روک لے۔
"جانے والوں کو ایسے الوداع کیا جاتا ہے بھلا؟" عینا نے دونوں کو خفگی سے دیکھتے ہوئے کہا تھا اس نے ضروری سامان بیگ میں ڈال دیا تھا اور اب کھڑی ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ حیا اٹھی تھی اور بڑھ کر اس سے گلے ملتے ہوئے پوچھا تھا۔
"مجھے بھول تو نہیں جاؤ گی۔؟"
تم بھی کوئی بھولنے والی چیز ہو۔" عینا نے کچھ ایسے انداز میں کہا تھا کہ حیا نے ماتھے پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا تھا۔
"کیا مطلب؟"
"مطلب دنیا کی ذہین فطین لڑکی حیا اعجاز کو کون بھول سکتا ہے۔" عینا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا تو وہ دونوں ہنس پڑی تھی۔

وہ منال سے ملنے کے بعد بیگ اٹھا کر باہر آگئی تھی۔ شہناز آفندی تو جیسے اس کے انتظار میں تھیں اسے آتا دیکھ کر فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی تھیں۔

"بھابھی کھانا وغیرہ تو۔۔۔" رافعہ بیگم نے حق میزبانی نبھایا۔

"نہیں کھانے کو رہنے دو۔۔۔ چلو عینا۔"

عینا رافعہ بیگم کے پاس آئی تھی۔

"اچھا پھپھو۔"

"اللہ تمہیں ہمیشہ اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ تمہارا جب دل چاہے آجانا اس گھر کے دروازے ہمیشہ کھلے ملیں گے۔" رافعہ بیگم نے اس کا ماتھا چومتے ہوئے کہا تھا۔

"اور آپ بھی مجھ سے ملنے آتی رہیے گا۔" عینا نے لاڈ سے ان کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے کہا تھا' شہناز آفندی کو پھپھو بھتیجی کا یہ پیار بڑا ناگوار گزرا تھا۔

"عینا دیر ہو رہی ہے۔" شہناز آفندی نے ہاتھ میں پکڑے بیش قیمت آئی فون کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

حیا' منال اور پھپھو اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی تھیں۔

شہناز آفندی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے اس نے مڑ کر انہیں دیکھا حیا اور منال نے ہاتھ ہلایا تھا وہ بھی ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔

اس کی زندگی ایک نیا موڑ لینے جا رہی تھی۔ ڈرائیور نے فوراً" گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔

☆ ☆ ☆

"آپ پاکستان کب آئیں؟"

"یہ تم مجھے "آپ" کہہ کر مخاطب کیوں کر رہی ہو۔ اپنا آپ مجھے غیر غیر سا لگتا ہے۔ ماما کہا کرو مجھے' عمار بھی یہی کہتا ہے۔" شہناز آفندی نے بڑی خوب صورتی سے اس کا سوال گول کرتے ہوئے کہا تھا۔

"عمار۔" عینا نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا تھا۔

"تمہارا بھائی ہے تمہیں اس سے مل کر خوشی ہوگی۔ اولیول کر رہا ہے۔" شہناز بیگم نے عمار کا غائبانہ تعارف کروایا تھا۔

عینا کو خوشی ہوئی تھی گو ہر بھائی ہمیشہ حیا اور منال کی طرح اس کا خیال رکھتے تھے ان کا رویہ ہمیشہ بڑے بھائیوں والا ہی ہوتا تھا پر آج یوں اچانک عمار کا سن کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی کہ اس کا اپنا بھائی بھی موجود ہے پر رات کھانے کی میز پر عمار سے مل کر اسے تھوڑی مایوسی ہوئی تھی شہناز بیگم نے جب اس کا تعارف کروایا تھا تو عمار نے کوئی خاص خوشی کا اظہار نہیں کیا تھا بلکہ ایک نظر مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تھا اور کھانے میں مگن ہو گیا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر ایک اور نوجوان بھی موجود تھا جو بہت خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا اس کے انداز میں بے نیازی تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا اسے ارد گرد کے ماحول سے کوئی لینا دینا نہیں ہے وہ کھانا کھا رہا تھا خاموشی سے وہاں سے چلا گیا تھا۔ آفندی انکل بزنس ٹرپ پر گئے ہوئے تھے وہ ان سے نہیں مل سکی تھی۔

رات جب ملازمہ دودھ کا گلاس لے کر اس کے کمرے میں آئی تھی تو وہ ڈائننگ ٹیبل پر موجود اس نوجوان کے متعلق خود کو پوچھنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھی۔

"وہ۔۔۔ وہ تو جی وجدان صاحب ہیں۔ بڑے صاحب کی پہلی بیوی کے بیٹے۔ بہت اچھے ہیں۔ پر بیگم صاحبہ کا رویہ۔۔۔" ملازمہ کہتے کہتے فوراً" رک گئی تھی اسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا وہ شہناز آفندی کی بیٹی کے سامنے اس کی برائی کرنے جا رہی تھی۔

"رویہ کیا۔ اپنی بات مکمل کرو۔"

"کچھ نہیں جی۔ بس غلطی سے بات منہ سے نکل گئی۔ میں یہ دودھ کا گلاس رکھ کر جا رہی ہوں۔ آپ یاد سے پی لیجیے گا۔" ملازمہ نے دودھ کا گلاس سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

عینا حیرت سے اسے دیکھتی رہ گئی تھی۔

اس کا دودھ پینے کا موڈ نہیں تھا اس نے کمرے کی لائٹ آف کر دی تھی اور سونے کی کوشش کرنے لگی

تھی۔ رات اسے ٹھیک سے نیند نہیں آئی تھی۔ اور صبح آنکھ کھلتے ہی اس نے حیا اور منال کی تلاش میں نظر دوڑائی تھی پر کمرے کے فرنیچر پر نظر پڑتے ہی اسے فوراً" یاد آیا تھا وہ حیدر آباد چھوڑ آئی ہے۔ وہ اب کراچی میں اپنی ماں کے پاس ہے۔

"میں تمہارا ایڈمیشن کروا رہی ہوں۔ میں چاہتی ہوں تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔ اپنا لائف اسٹائل چینج کرو۔ آج تم میرے ساتھ شاپنگ کے لیے چلنا۔ اور پارلر میں ٹائم لے لیا ہے میں نے۔" وہ ناشتا کرتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

عینا کا آگے پڑھنے کا موڈ نہیں تھا پر یہاں سارا دن گھر میں بور ہونے سے بہتر یہی تھا وہ آگے ایڈمیشن لے لے۔ یہاں ہر کام کے لیے ملازموں کی فوج تھی۔

شاپنگ اور پارلر سے آکر وہ بہت تھک گئی تھی۔

رات کھانے پر ایاز آفندی سے بھی ملاقات ہو گئی تھی۔ انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تھا اور پھر شہناز آفندی کو اپنے بزنس ٹرپ کا احوال بتاتے رہے تھے۔

آج عمار کھانے پر موجود نہیں تھا اور وجدان ہمیشہ کی طرح اردگرد سے بے نیاز کونے والی کرسی پر بیٹھا خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا' جیسے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو۔

☆ ☆ ☆

اگر مائرہ نہ ہوتی تو اسے یہاں ایڈجسٹ ہونے میں کافی پرابلم ہوتی مائرہ ایاز آفندی کی بھتیجی تھی۔ ساتھ والا بنگلہ ایاز آفندی کے بھائی عباس آفندی کا تھا۔ اور سب سے اچھی بات کہ مائرہ اس کی کلاس فیلو بھی تھی۔

مائرہ کا ساتھ اس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔ وہ اکثر بور ہوتی تو اس کے گھر چلی جاتی تھی۔ پر اس نے نوٹ کیا تھا کہ مائرہ اس کے گھر بہت کم آتی ہے ہمیشہ اسے فون کر کے بلا لیتی ہے۔ پر خود نہیں آتی۔

آج اتوار تھا اس کا مائرہ کی طرف جانے کا موڈ تھا پر ملازمہ ابھی کچھ دیر پہلے اسے بتا کر گئی تھی کہ شہناز بیگم اسے بلا رہی ہیں۔

"کیوں۔ خیریت؟" اس نے سوالیہ نظروں سے ملازمہ کو دیکھا تھا۔

"وہ زیب بی بی آئی ہیں۔"

"زیب کون؟"

"بیگم صاحبہ کی بہن۔"

عینا مسکرائی تھی وہ جب سے یہاں آئی تھی' ہر ہفتے کسی نئے رشتے دار سے ملاقات ہوتی تھی' وہ تمام رشتے دار جو سالوں سے غائب تھے' ایک ایک کر کے سامنے آ رہے تھے۔

"شہنی تم نے بہت اچھا کیا جو اسے یہاں لے آئیں۔ اصولاً تو تمہیں پاکستان شفٹ ہوتے ہی اسے اپنے پاس لے آنا چاہیے تھا' پر چلو شکر ہے تمہیں ابھی بھی اس کا خیال تو آگیا۔ دیر آید درست آید۔" زیب النساء نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"زیبی میرے بس میں ہوتا تو اسے کبھی خود سے دور ہی نہ کرتی۔ بس کچھ مجبوریاں تھیں۔" اس سے پہلے کہ شہناز اپنی خود ساختہ مجبوریاں بیان کرتیں کہ زیبی نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ارے بس رہنے دو۔ میرے سامنے زیادہ ڈرامے بازی مت کرو جانتی ہوں تمہیں۔ آفندی شروع سے تمہارے قابو میں تھا۔ تم چاہتیں تو اسے دبئی بھی ساتھ لے کر جا سکتی تھیں۔ پر چھوڑو پرانی باتوں کو۔ بلاؤ تو سہی اسے۔ آخری بار ڈیڑھ سال کی تھی جب اسے دیکھا۔"

"ملازمہ کو بھیجا ہے آتی ہو گی۔" شہناز آفندی کی بات مکمل ہی ہوئی تھی کہ عینا کمرے میں داخل ہوئی۔

"عینا یہ تمہاری آنٹی ہیں زیب۔" شہناز آفندی نے تعارف کروایا تھا زیب النساء بڑی گرم جوشی سے ملی تھیں۔ پھر گھنٹے تک عینا سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھیں۔ وہ جاتے ہوئے عینا کو اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر گئی تھیں۔

☆ ☆ ☆

آج صبح ہی ماما نے اسے بتادیا تھا کہ آج انہیں کسی پارٹی میں ان کے ساتھ چلنا ہے' وہ ناچاہتے ہوئے بھی تیار ہو رہی تھی' پتا نہیں کیوں وہ ماما کی ہر بات پر سر جھکالیتی تھی۔ وہ ابھی تک اس ماحول میں رچ بس نہیں سکی تھی۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی منال اور حیا سے دوبارہ کبھی بات نہیں ہو سکی تھی۔ وہ افسردہ تھی۔ انہوں نے ایک بار بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ اسے لگا تھا وہ لوگ شاید اس کے جانے پر شکر منا رہی ہوں گی۔

"کیا واقعی انہیں میری یاد نہیں آتی ہوگی؟" اس نے خود سے سوال کیا تھا۔ "جب میں آرہی تھی' تب تو وہ دونوں بہت رو رہی تھیں۔" اس نے خود کلامی کی تھی۔

ملازمہ نے دروازہ بجا کر اسے شہناز بیگم کا حکم سنایا تھا۔ وہ جلدی آجائے' وہ نیچے اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ عینا نے جلدی جلدی تیاری کمپلیٹ کی تھی اور ایک نظر خود کو آئینے میں دیکھ کر بیڈ سے ہینڈ بیگ اٹھا کر جلدی سے کمرے سے نکل کر تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگی تھی۔ شہناز بیگم اسے دیکھتے ہی پورچ کی طرف چل پڑی تھیں۔

اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا تھا اور اندر بیٹھ گئی تھی۔

"مجھے تمہیں دیکھ کر بری طرح اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے' مجھے تمہیں وہاں نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ تمہارے اندر وہ اعتماد نہیں ہے جو شہناز آفندی کی بیٹی میں ہونا چاہیے تھا۔" عینا انہیں دیکھ کر رہ گئی تھی اور وہ افسوس بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

مسز جمال کا لان روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ وہاں رات میں بھی دن کا سماں تھا۔ شہناز بیگم سب سے باری باری اس کا تعارف کروا رہی تھیں۔ عینا چہرے پر زبردستی مسکراہٹ سجائے سب سے مل رہی تھی۔ عینا نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے یوں خوش مزاجی کا ڈھونگ رچانا پڑے گا۔ پھپھو کے گھر کی طرح بے تحاشا ہنسنا بولنا تو وہ کب کا چھوڑ چکی تھی۔ اسے اپنا آپ کسی مشینی انسان جیسا لگ رہا تھا یا پھر ایسی کٹھ پتلی جس کی ڈور شہناز بیگم کے ہاتھ میں تھی۔ شہناز بیگم کبھی اس سے اس کی مرضی نہیں پوچھتی تھیں۔ بس اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیتی تھیں اور وہ خاموشی سے سر جھکالیتی تھی۔

یہاں محفل موسیقی کا بھی انتظام تھا۔ لان کے ایک طرف اسٹیج پر کوئی گلوکار مائیک تھامے کوئی غزل گا رہا تھا' جسے کچھ خاص پسند نہیں کیا جا رہا تھا۔

"مسز جمال یہ آپ نے کس بے سرے سنگر کو بلالیا۔" مسز انصار نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا اور ساتھ ہی شہناز بیگم کی رائے جاننا چاہی تھی۔

"کیوں مسز آفندی ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟"

"ہاں مسز انصاری ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"پتا نہیں... یار جمال تو آج تھے نہیں' ان کے مینجر نے ہی یہ گل کھلایا ہوگا۔" مسز جمال نے شان بے نیازی سے کہا تھا۔

"اس سے اچھا تو میری عینا گا سکتی ہے۔"

"او رئیلی..." شہناز بیگم کی بات پر مسز جمال نے حیرت سے پوچھتے ہوئے عینا کو دیکھا تھا۔

"ہاں بہت سریلی آواز ہے اس کی۔" شہناز بیگم نے بڑے فخر سے کہا تھا۔

"چلو پھر ہٹاؤ اس بے سرے سنگر کو' عینا کچھ سنائے گی ہمیں۔" مسز انصاری کی بات پر عینا نے گھبرا کر شہناز بیگم کو دیکھا تھا۔ وہ اتنے سارے لوگوں کے سامنے نہیں گا سکے گی۔ پر شہناز بیگم اس کی گھبراہٹ کو نظر انداز کرتے ہوئے مسز انصاری کی بات کی تائید کر رہی تھیں۔

"ماما..." اس نے بے چارگی سے انہیں پکارا تھا۔ شہناز بیگم نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ وہ ان کی نظر کا مفہوم سمجھ گئی تھی۔ وہ اپنی دوستوں میں اپنی انسلٹ نہیں کروانا چاہتی تھیں اور پھر وہ مسز جمال کے ہمراہ اسٹیج پر آگئی تھی۔

"حاضرین! آپ کی سماعتوں پر جو ظلم ہوا اس کے لیے میں معذرت خواں ہوں۔" مسز جمال نے مائیک

تھامتے ہوئے تمام لوگوں کو متوجہ کیا تھا۔

"پر اب آپ کی سماعتوں پر مزید ظلم نہیں ہو گا۔ کیونکہ مسز آفندی کی بیٹی عینا بہت خوب صورت گاتی ہیں اور اب یہ مائیک میں ان کے حوالے کر رہی ہوں۔ وہ اپنی خوب صورت آواز سے آپ کے کانوں میں رس گھولیں گی۔" مسز جمال نے بات مکمل کی تھی تو لان میں تالیوں کا شور گونج رہا تھا۔ عینا نے لان میں جمع اس ہجوم کو دیکھا تھا۔ وہ بڑی مشکلوں سے اپنی گھبراہٹ پر قابو پا سکی تھی۔ مسز جمال نے مائیک تھما کر اسٹیج سے اتر گئی تھیں۔

عینا نے مائیک تھامتے ہوئے شہناز بیگم کو دیکھا تھا۔ وہ اس کی حوصلہ افزائی کے لیے مسکرائی تھیں۔

اے جذبہ دل گر میں چاہوں
ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں
اور سامنے منزل آجائے
اے دل کی خلش چل یوں ہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے
آتا ہے جو طوفاں آنے دو کشتی کا خدا خود حافظ ہے
مشکل تو نہیں ان موجوں میں بہتا ہوا ساحل آجائے
اے رہبر کامل چلنے کو تیار تو ہوں پر یاد رہے
اس وقت مجھے جھنکا دینا جب سامنے منزل آجائے

اس نے گانے کے دوران ایک بار بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ غزل مکمل ہوئی تو اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تھا۔ وہ ہق دق سی رہ گئی تھی۔ سامنے گوہر بھائی کھڑے تھے ان کی نظروں میں ناپسندیدگی کا عنصر واضح تھا۔ وہ تو اسے گھر میں گاتا دیکھ کر غصہ ہو جاتا تھا اور وہ یہاں اتنے لوگوں میں گا رہی تھی۔ یہ وہ کیسے پسند کر سکتا تھا۔ تالیوں کا شور بتا رہا تھا کہ اس کی غزل بہت پسند کی گئی ہے۔ یعنی اسے صرف خوش فہمی نہیں تھی کہ وہ خوب صورت گا سکتی ہے۔ وہ حقیقت میں بہت اچھا گاتی ہے، پر وہ آج اس بات پر خوش نہیں ہو سکی تھی، وجہ گوہر کی ناراضی تھی۔ اسے بس یہ ہی فکر ستا رہی تھی کہ گوہر کو برا لگا ہو گا۔ وہ اسٹیج سے نیچے اتر گئی تھی۔

"واؤ... زبردست۔" مسز انصاری اور مسز جمال اس کی تعریفوں میں رطب اللسان تھیں، پر اس کی نظریں گوہر کو ڈھونڈ رہی تھیں جو نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ "گوہر بھائی! یہاں کیسے آئے؟"

"ہو سکتا ہے مسز جمال کی فیملی اسے جانتی ہو۔ ہاں اور یہ بھی ہو سکتا ہے وہ جمال صاحب کے آفس میں کام کرتے ہوں... پر گوہر بھائی کو مجھ سے مل کر جانا چاہیے تھا۔ بالکل بھول گئے ہیں وہ لوگ مجھے۔ نہ کبھی فون کرتے ہیں، کیا پھپھو کو بھی میرا خیال نہیں آتا ہو گا۔ کتنا پیار کرتی تھیں پھپھو مجھ سے اور اب بھی فون کر کے خیریت تک نہیں پوچھتیں۔

ہو سکتا ہے وہ یہ سوچتی ہوں کہ میں اپنی ماں کے پاس خوش ہوں گی... خوش... کیا میں خوش ہوں؟ اس نے خود سے سوال کیا تھا۔

کیا خوشی یہ ہوتی ہے کہ آپ کی زندگی میں پیسوں کی ریل پیل کر دی جائے اور آپ کو محبتوں سے محروم کر دیا جائے" اس نے ایک نظر ارد گرد لوگوں پر دوڑائی تھی۔ ہنستے مسکراتے چہرے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ ہر غم، ہر فکر سے آزاد ہیں۔ پر عینا کو یہ سب مصنوعی لگتا تھا۔ ان کی ہنسی ان کی محبتیں سب مصنوعی لگتی تھیں۔

اس کا دل چاہا تھا وہ یہاں سے چلی جائے۔ پر جانتی تھی شہناز بیگم ایک دو گھنٹے سے پہلے نہیں جانے والی اور مجبوراً" اسے بھی انتظار کرنا پڑے گا۔

زندگی میں پہلے کبھی اس نے خود سے اتنی باتیں نہیں کی تھیں، جتنی وہ یہاں آکر کرنے لگ گئی تھی۔ جب ہمارے پاس کوئی سننے والا نہ ہو تو ہم اپنی باتیں خود سے ہی کرنے لگ جاتے ہیں۔

"ہائے..." اس نے سر اٹھا کر سامنے کھڑی لڑکی کو دیکھا تھا جو اس سے ہی مخاطب تھی۔

"میں زوبا انصاری ہوں۔ وہ میری ماما ہیں۔" اس

نے مسز انصاری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔ وہ اگر یہ نہ بھی بتاتی تو عینا اندازہ لگالیتی کیونکہ زوہا کے نقوش مسز انصاری سے کافی ملتے تھے۔

"آپ شہناز آنٹی کی بیٹی ہیں نا؟" زوہا کے سوال پر اس نے اثبات میں سرہلا دیا تھا۔

"آپ کو کیسے پتا چلا؟" اسے حیرت ہوئی تھی۔ حالانکہ کچھ دیر پہلے مسز جمال نے سب کو بتایا تھا' پر یہ بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ وہ بس یہ سوچ رہی تھی کہ وہ اس کے نقوش' اس کی عادات و اطوار کچھ بھی شہناز بیگم پر نہیں گئے۔ وہ اپنے بابا پر گئی ہے اور یہ بات اکثر پھپھو کہا کرتی تھیں۔

"ابھی زیبی آنٹی نے بتایا اور اکثر آپ کو مائرہ کے ساتھ دیکھا ہے۔"

زوہا کے ساتھ باتوں میں اسے وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوا تھا۔ شہناز بیگم نے جب واپسی کا قصد کیا تو اس نے شکر ادا کیا تھا۔ مسز انصاری کا بیٹا شارق انہیں لینے آیا تھا۔ زوہا نے بطور خاص شارق کو اس سے ملوایا تو اس کا ماتھا ٹھنکا تھا۔ شارق کا رویہ ایسا تھا کہ اس نے ایک منٹ لگائے بغیر اسے "چھچھورا" کا خطاب دے ڈالا تھا۔

گاڑی تک آتے آتے شارق نے عینا کا خاصا دماغ کھالیا تھا۔ وہ فوراً" گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ شہناز بیگم بھی مسز انصاری کو الوداعیہ کلمات کہتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی تھیں۔

ان کے بیٹھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔ گاڑی گھر کی طرف رواں دواں تھی۔ مسز آفندی کا فون بجا تھا۔ انہوں نے کال ریسیو کرتے ہوئے فون کان کو لگالیا تھا۔

ان کے انداز سے عینا نے فوراً" اندازہ لگالیا تھا کہ دوسری طرف آفندی انکل ہوں گے۔ وہ کوشش کے باوجود بھی انہیں پاپا یا بابا نہیں کہہ پائی تھی۔ حالانکہ شہناز بیگم نے اس کے انکل کہنے پر اسے دو تین بار ٹوکا تھا۔

"اوہ... آپ مجھے فون کر کے بتا دیتے۔" عینا نے انہیں دیکھا تھا۔ کچھ ہی دیر میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ آفندی انکل کو آفیشل کام سے کہیں جانا پڑ گیا ہو گا۔ وہ اکثر کاروبار کے سلسلے شہر یا ملک سے باہر جاتے رہتے تھے۔ گھر میں داخل ہو کر وہ سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھی۔ شہناز بیگم جو اس سے تھوڑی ہی پیچھے تھیں' ملازمہ سے عمار کے متعلق پوچھنے لگیں۔

"عمار بابا تو ابھی تک گھر نہیں آئے۔" سیڑھیاں چڑھتی ہوئی عینا نے مڑ کر شہناز بیگم کے ایکسپریشن دیکھنے چاہے تھے۔

"چلو کوئی نہیں' دوستوں میں ہو گا۔ میں سونے جارہی ہوں۔ وہ آئے تو اسے کھانا دے دینا۔" وہ ملازم کو حکم دے کر اپنے بیڈ روم کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ عینا کو افسوس ہوا تھا۔ شہناز بیگم کی اسی ڈھیل نے عمار کو اچھا خاصا بگاڑ دیا تھا۔

مائرہ ٹھیک ہی کہتی ہے عمار کو بگاڑنے میں ماما کا ہاتھ ہے۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی عمار کو بہت کم گھر میں دیکھا تھا۔ وہ زیادہ دیر باہر دوستوں میں ہی رہتا تھا۔

چینج کر کے جب وہ سونے کے لیے لیٹی تو اسے گوہر کا خیال آیا تھا۔ گوہر بھائی کو آج مجھ سے مل کر جانا چاہیے تھا۔ پر انہیں تو بہت برا لگا ہو گا۔ کتنا ناراض لگ رہے تھے۔ اسے گوہر کے ایکسپریشن یاد آئے تھے۔ "پتا نہیں کیا سوچ رہے ہوں گے میرے بارے میں۔" وہ یہ ہی باتیں سوچتے سوچتے نیند کی وادی میں کھو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن اس کے ساتھ عجیب واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ یونی ورسٹی سے آکر معمول کے مطابق سو گئی تھی۔ پانچ بجے اٹھ کر نیچے آئی تو ملازمہ کی تلاش میں نظر دوڑائی' اس کا چائے پینے کا موڈ تھا۔

"ہائے۔" عمار کی آواز پر اسے لگا اس کا وہم ہے' اس نے مڑ کر دیکھا تو عمار اسے دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اسے خاصی حیرت ہوئی تھی۔ عمار نے اتنے دنوں میں پہلی بار اسے مخاطب کیا تھا۔ آج حیرت انگیز طور پر اس

کاموڈ بہت اچھا تھا۔

"تمہیں میں اچھا نہیں لگتا؟" اس عجیب و غریب سوال پر **عمنا** کو سمجھ نہ آئی کیا جواب دے۔ عمار کی عمر سولہ سترہ سال تھی، پر وہ بڑے اور چھوٹے سے ایک ہی لہجے میں بات کرتا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم مجھ سے بات نہیں کرتیں۔۔۔ میرا خیال ہے تمہیں میں پسند نہیں ہوں۔" وہ اپنا نوٹیب ہاتھ میں لیے مسلسل ٹائپنگ کر رہا تھا۔

"نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔ بلکہ میں سمجھی تھی کہ تمہیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔" **عمنا** نے اپنے دل میں چھپے خدشے کا اظہار کر دیا تھا۔

"مجھے کیوں برا لگے گا، تم ماما کی بیٹی ہو۔" **عمنا** "ماما کی بیٹی" جملے میں الجھ گئی تھی۔

وہ کافی دیر اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا تھا۔ **عمنا** کی رائے اس کے بارے میں تھوڑی سی تبدیل ہوئی تھی۔ پھر وہ کسی کام سے باہر چلا گیا تھا۔ **عمنا** کا موڈ تھوڑا بہتر ہو گیا تھا۔ اسے عمار سے بات کر کے خوشی ہوئی تھی۔ عمار کا اسے مخاطب کرنا ہی اس کے لیے بہت خوشی کی بات تھی۔

رات ڈنر کے بعد عمار باہر نہیں گیا تھا۔ اس کے کمرے کی لائٹس آن تھی۔ **عمنا** کا دل چاہا عمار سے باتیں کرنے کو، اس نے دو کپ چائے بنائی اور ٹرے میں رکھ کر عمار کے کمرے کی طرف چل پڑی تھی۔

اس نے کمرے کے دروازے پر ذرا سا زور دیا تو کمرہ کھلتا چلا گیا تھا۔ کمرے کے اندر کا منظر دیکھ کر وہ جہاں کھڑی تھی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔

سگریٹ کا دھواں اڑاتا عمار فون پر کسی سے بات کرنے میں مصروف تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر اس نے چونک کر **عمنا** کو دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات لمحے میں بدلے تھے۔ اس نے فوراً" کال ڈسکنکٹ کی تھی اور قہر برساتی نظروں سے دروازے میں کھڑی **عمنا** کو دیکھا تھا۔

"تم۔۔۔ ال مینرڈ، جاہل لڑکی۔۔۔ تمہیں تمیز نہیں ہے کسی کے کمرے میں آنے سے پہلے ناک کرتے ہیں۔" عمار جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ **عمنا** کے چہرے کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ اسے ایک لفظ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ وہ تو بس اس کے ہتک آمیز لہجے کو سن رہی تھی۔

"اب یہاں کھڑی میرا منہ کیا دیکھ رہی ہو، دفع ہو جاؤ۔" وہ دہاڑا تھا۔ **عمنا** آنکھوں میں آئے آنسو چھپاتی واپس کچن میں چل دی تھی۔ ٹرے کچن کی سلیب پر رکھی اور اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اس نے اتنی محبت سے بنائی چائے وہیں چھوڑ دی تھی۔

وہ جی بھر کے رونا چاہتی تھی۔ اس نے کمرے کی لائٹ آف کر دی تھی اور بیڈ پر ڈھے گئی تھی۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے اس سے اس لہجے میں بات کی تھی۔ اس کی اتنی تذلیل کی تھی۔

اس نے خود سے عہد کر لیا تھا کہ اب دوبارہ کبھی عمار سے بات نہیں کرے گی۔

✡ ✡ ✡

آج مائرہ یونیورسٹی نہیں آئی تھی۔ وہ بہت بور ہوئی تھی، اپنی کلاس فیلوز سے اس کی بات چیت رسمی سی تھی۔ اس نے فون کر کے گاڑی منگوالی تھی۔ وہ واپس گھر جا رہی تھی۔ ڈرائیور نے اسے دیکھ کر فوراً" گاڑی کا دروازہ کھولا تھا۔ وہ بڑھ کر گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ اپنی بکس اور بیگ ساتھ والی سیٹ پر رکھ لیے تھے۔ ڈرائیور گاڑی اسٹارٹ کر رہا تھا۔ اس نے ماتھے پر آئی لٹوں کو پیچھے کیا تھا اور کہنی گاڑی کی کھڑکی پر ٹکائے باہر کے منظر دیکھ رہی تھی۔ شہناز آفندی نے اس کا میک اوور کروایا تھا۔ وہ خاصی چینج ہو گئی تھی۔ پر وہ مطمئن نہیں ہوئی تھیں، وہ جانے اسے کیا بنانا چاہ رہی تھیں۔ شاید وہ اس کے لائف اسٹائل سے مطمئن نہیں ہو پا رہی تھیں۔ وہ چاہتی تھیں کہ وہ مکمل طور پر ان کے ماحول میں رچ بس جائے، پر یہ اتنا آسان نہیں تھا **عمنا** کے لیے۔

اس نے ساری زندگی پھپھو کے زیر اثر گزاری تھی۔ ان کی تربیت کا گہرا اثر تھا اس کی شخصیت پر۔۔۔

اسے لگتا تھا وہ جب سے یہاں آئی ہے اس میں اعتماد کی کمی ہو گئی ہے۔ حیا اور منال کے ساتھ گھنٹوں بے تکی باتیں کرنے والی عینا اب ضرورت کے تحت ہی بولتی تھی۔

حیدر آباد میں گزارے دن اس کی زندگی کے بہترین دن تھے۔ یہاں صرف ایک مائرہ ہی تھی جس سے اس کی تھوڑی بہت دوستی تھی۔ باقی آفندی ہاؤس میں رہنے والے افراد بظاہر تو ایک چھت تلے رہتے تھے پر ان کے بیچ صدیوں کا فاصلہ محسوس ہوتا تھا۔

عمار سوتیلا ہی سہی اس کا بھائی تو تھا' پر عمار کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ عمار گھر میں صرف شہناز آفندی سے ہی زیادہ تر بات کرتا تھا۔ وہ بھی اس صورت میں جب اسے پیسے چاہیے ہوتے تھے یا پھر موبائل چینج کرنا ہوتا تھا یا پھر بائیک کا ماڈل چینج کرنا ہوتا تھا۔ وجدان سے اس کی نفرت اس کے رویے سے ظاہر ہوتی تھی۔ وجدان کی اپنی الگ دنیا تھی' وہ سب سے کٹ کے رہتا تھا۔ خاموش' اداس' خفا خفا سا۔ وہ اتنے دن سے یہاں تھی ایک بار بھی وجدان سے بات نہیں ہوئی تھی۔

آفندی انکل بزنس ٹرپ پر جاتے رہتے تھے۔ وہ کم ہی گھر پر دکھائی دیتے تھے۔ گھر کا مکمل کنٹرول شہناز آفندی کے ہاتھ میں تھا۔

گاڑی آفندی ہاؤس کی جانب رواں دواں تھی۔ عینا باہر کے منظر دیکھنے میں مگن تھی' جب اچانک اسے ایک خیال آیا تھا۔ آج تیس اپریل ہے۔ آج منال کی برتھ ڈے ہے۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ آگئی تھی۔ منال نے سات آٹھ ماہ پہلے سب کو برتھ ڈے کے انویٹیشن دینے شروع کر دیے تھے اور ساتھ ساتھ گفٹس کی ہدایات بھی جاری کر دی تھی۔

"عینا تم اس برتھ ڈے پر مجھے گل احمد کا سوٹ لے کر دو گی۔"

"تمہیں شرم نہیں آئے گی' اب تم گل احمد کے کپڑے پہنو گی۔" عینا کے جواب پر کچھ دیر منال ایک لفظ نہیں بول پائی تھی' بلکہ حیرت سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"میرا مطلب ہے گل احمد کی لان۔۔۔" منال نے فوراً" بات کی وضاحت کی تھی۔

"ہاں تو ایسے بولو نا۔۔۔" عینا نے چہرے پر معصومیت سجاتے ہوئے کہا تھا۔

"لے کر دو گی نا؟" منال نے آس بھری نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ یوں ہی منتیں کر کر کے پھپھو اور حیا سے بھی کافی وعدے لے چکی تھی۔

"دیکھی جائے گی۔۔۔ ابھی اپریل میں کافی ٹائم ہے' چھ سات ماہ ہیں۔"

"تم تو ہو ہی کنجوس۔۔۔" منال نے خفگی سے کہا تھا۔

ہارن کی آواز پر وہ حال میں لوٹی تھی۔ وہ گھر پہنچ گئی تھی۔ چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔ گاڑی گھر میں داخل ہوئی تھی۔ اس نے طویل سانس لے کر اس عالی شان عمارت کو دیکھا تھا۔

گاڑی پورچ میں رکی تو وہ بے زاری سے اپنا بیگ اور بکس اٹھا کر گاڑی سے اتر گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ لنچ کے بعد سو گئی تھی۔ پانچ بجے کے قریب اس کی آنکھ کھلی تھی۔ چہرے پر پانی کے چھینٹے مار کر اس نے سستی کو دور بھگایا تھا۔ اس کا ارادہ مائرہ کی طرف جانے کا تھا۔ خود کو ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا تھا اور کیچر لگایا تھا۔ اپنے کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ ملازمہ نے اسے دیکھتے ہی چائے کا پوچھا تھا' پر اس نے انکار کر دیا تھا۔

اس نے گیٹ سے ملحق چھوٹے آہنی دروازے پر ذرا سا زور دیا تو وہ کھلتا چلا گیا تھا۔ ساتھ والا گیٹ مائرہ کے گھر کا تھا۔ مائرہ اسے لان میں ہی مل گئی تھی۔ وہ ثمینہ آنٹی کے ساتھ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ اسے دور سے دیکھ کر ہی وہ مسکرائی تھیں۔ اس نے نوٹ کیا تھا' ثمینہ آنٹی اسے شروع میں کچھ خاص پسند نہیں کرتی

تھیں۔ پر اب ان کا رویہ تبدیل ہو گیا تھا۔
"السلام علیکم۔" اس نے چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے سلام کیا تھا۔
"وعلیکم السلام کیسی ہو عمنا؟" ثمینہ آنٹی نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا تھا۔ "میں بالکل ٹھیک ہوں۔" عمنا چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔ "میں تمہارے لیے چائے بھیجتی ہوں۔" ثمینہ آنٹی اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ اس نے منع کرنا چاہا تھا' پر وہ اس کی سنے بغیر اندر چلی گئی تھیں۔
"تم آج یونی ورسٹی نہیں آئی' خیریت تھی؟" اس نے مائرہ سے وجہ جاننی چاہی تھی۔
"نہیں.... آج صبح سر میں بہت درد تھا' فلو بھی...."
"اوہ.... مجھے بتا دیتی.... میں بھی نہیں جاتی.... میں بہت بور ہوئی آج' اس لیے جلدی آگئی تھی۔"
"سوری.... سر میں اتنا درد تھا کہ مجھے خیال ہی نہیں آیا۔" مائرہ نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ کچھ ہی دیر میں ملازمہ چائے کے ساتھ مختلف لوازمات کی ٹرے لیے وہاں آئی۔
"ان سب کی کیا ضرورت تھی۔" اس نے حیرت سے ٹرے پر نظر دوڑاتے ہوئے کہا تھا۔
"یہ سب ماما نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔ انہیں تم بہت اچھی لگنے لگی ہوں۔" مائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔
"اصل میں جب تم شروع میں یہاں آئی تھی تو ماما کو لگا تھا کہ تم شہناز آنٹی جیسی ہو گی' پر حیرت انگیز طور پر تم ان سے بالکل مختلف ہو۔ شہناز آنٹی فیملی میں کسی سے بنا کر نہیں رکھتیں.... اور ہم سے تو کچھ زیادہ ہی خار محسوس کرتی ہیں۔ پتا نہیں کیا وجہ ہے۔" عمنا خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کیا وہ اس بات پر شکر ادا کرے کہ وہ اپنی ماں جیسی نہیں ہے۔
"اور عمار کو تو بہت بگاڑ دیا ہے انہوں نے.... اور وجدان کے لیے ان کے دل میں جتنی نفرت ہے وہ تو اندھے کو بھی نظر آجاتی ہے۔ پتا نہیں انکل کو کیوں نہیں نظر آتی۔" عمنا کو خاموش دیکھ کر مائرہ کو فوراً

احساس ہوا تھا۔
"تمہیں برا لگا میں نے شہناز آنٹی کو...." عمنا نے مائرہ کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی سر نفی میں ہلا دیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اگر اسے برا نہیں لگا تھا تو اچھا بھی نہیں لگا تھا۔ مائرہ کے اصرار کے باوجود اس نے صرف چائے پی تھی۔ مائرہ کے ساتھ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی۔ مائرہ اسے گیٹ تک چھوڑنے آئی تھی۔
"او کے پھر صبح ملیں گے۔" اس نے گیٹ سے قدم باہر نکالا تھا تو مائرہ کی آواز سنی تھی۔ وہ افسردہ سی آفندی ہاؤس کی طرف چل رہی تھی۔ دل بہت اداس تھا۔ گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی' کیا اس کا گھر ہے؟ یا پھر جو گھر وہ چھوڑ کر آئی ہے وہ اس کا گھر ہے؟ دونوں سوالوں کا جواب نفی میں تھا۔

بے ڈال کے پتے
شاخوں سے جدا' سائے سے انجان
جدھر ہوا لے چلے
ڈولتے چلے گرتے پڑتے چلے
رستوں سے بے خبر
منزلوں سے نا آشنا
بھیگتی بارشوں میں سر جھکا کر رو پڑے
جھلتی دھوپ میں چیخ کر رہ گئے
آندھیوں کے شور میں اپنی چیخیں دبائے
ہانپتے کانپتے ہوا کے ساتھ بھاگے چلے
اور جو ذرا دم لینے کو رکیں
ہوا کے تھپیڑے نہ ٹھہرنے دیں
نہ گلشن کے مکینوں سے شناسائی
نہ کسی دوست کی ہمراہی کا لطیف احساس
دوست ان کے ہوتے ہیں جن کا پتا ہوتا ہے
کوئی مکاں ہوتا ہے
ملنے کا پھر امکاں ہوتا ہے
بے ڈال کے پتے کیسے اپنا دوست بنائیں
خزاں نے انہیں بے گھر کر دیا
ہواؤں نے کچھ سوچنے نہ دیا

آج جو سوچنے بیٹھے
تو رنگ زرد پڑ گیا
اور یوں ہی کسی کے قدموں تلے
چر مرا کر رہ گئے... بے ڈال کے پتے

☼ ☼ ☼

کبھی راضی تو کبھی مجھ سے خفا لگتی ہے
بتا اے زندگی! تو میری کیا لگتی ہے

وہ چھت پر نظریں جمائے سوچ رہی تھی کہ اس کی زندگی اتنی بے مقصد کیوں ہو گئی ہے' دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا' وہ ایسے اپنوں کے بیچ رہ رہی تھی جن میں اپنا پن بالکل نہیں تھا۔

پردے کے پیچھے سے جھانکتا سورج دیکھ کر وہ بیڈ سے اتری تھی۔ روشنی ہماری زندگی کے لیے بہت ضروری ہے' پر روشنی کی اہمیت کا احساس ہمیں اندھیرے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ ایسے ہی جیسے کوئی ہماری زندگی سے چلا جائے تو ہمیں اس کی قدر محسوس ہونے لگتی ہے۔ اگر اندھیرا نہ ہوتا تو ہم روشنی کی قدر نہیں کرتے۔

اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا تھا۔ لان کے پچھلے حصے میں ایکسرسائز کرتے وجدان کو دیکھ کر اسے خاصی حیرت ہوئی تھی۔

"شاید وہ روز ایکسرسائز کرتا ہو' پر اس کی نظر آج پڑی ہو۔" اس نے وجدان کو دیکھتے ہوئے سوچا تھا۔

اسے اپنے اور عمار کے بیچ فاصلہ تو سمجھ میں آتا تھا کہ وہ اتنے سالوں بعد اچانک سے آجانے والی بہن کو قبول نہیں کر پا رہا تھا' پر وجدان اور عمار تو شروع سے ساتھ رہتے تھے' پھر بھی ان کے بیچ اتنا فاصلہ کیوں تھا۔

وہ بے شک الگ الگ ماں سے تھے' پر وہ دونوں ایاز آفندی کے بیٹے تھے' بھائی تھے' پر ان دونوں کے بیچ صدیوں کا فاصلہ تھا۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

اسی لمحے وجدان نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔ عمنا نے گھبرا کر پردہ چھوڑ دیا تھا اور وہاں سے ہٹ گئی تھی۔

"پتا نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچ رہا ہو گا۔"
اسے شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

"میں کیوں شرمندہ ہو رہی ہوں۔ میرے دل میں تو کوئی چور نہیں ہے۔" اس نے خود کو سمجھایا تھا اور ناشتا کرنے چل دی تھی۔

"آپ کے لیے ناشتا لگاؤں؟" اسے سیڑھیوں سے اترتے دیکھ کر ملازمہ نے سوال کیا تھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ آج ناشتے کے لیے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی تھی۔ کچھ دیر بعد وجدان ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تھا۔ ملازمہ اس کے لیے ناشتا لے آئی تھی۔

"رضیہ بوا! آج ماما اور عمار نہیں آئے۔" اس نے ملازمہ کو دیکھ کر سوال کیا تھا۔

"آج اتوار ہے بی بی جی' وہ دیر سے اٹھیں گے۔"

"اوہ... آج سنڈے ہے۔ میں بھی کتنی بھلکڑ ہوں۔" عمنا نے ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا تھا۔

وجدان خاموشی سے ناشتا کر رہا تھا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا تھا اور پھر سے ناشتے میں مصروف ہو گیا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ پھر سے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔

لنچ پر گھر کے تمام افراد ہی موجود تھے۔ ایاز آفندی کل رات ہی بزنس ٹور سے واپس آئے تھے۔

"کل مسز انصاری کا فون آیا تھا۔" شہناز آفندی نے ایاز آفندی کو مخاطب کرتے ہوئے بتایا تھا۔

"اچھا کیا کہہ رہی تھیں۔"

"عمنا کا رشتہ مانگ رہی تھی اپنے بیٹے کے لیے۔"
عمنا کی ساری توجہ کھانے سے ہٹ کر شہناز آفندی کی جانب مبذول ہو گئی تھی۔

"پھر... کیا سوچا تم نے..." ایاز آفندی نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں نے انکار کر دیا۔"

"فوراً" انکار کر دیا... سوچنے کا ٹائم لے لیتی۔ اچھی خاصی فیملی کا اچھا لڑکا تھا۔"

ایاز آفندی نے حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"اچھا تو تھا۔ پر اب میں اپنی بیٹی کو خود سے دور نہیں کرنا چاہتی۔" شہناز آفندی نے محبت پاش نظروں سے عمنا کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"عجیب بچوں والی بات کر رہی ہیں آپ۔ بیٹوں کو تو ایک نہ ایک دن جانا ہوتا ہے زمانے کی ریت ہے۔" ایاز آفندی مسکراتے ہوئے بولے تھے۔

"میں کچھ اور سوچ بیٹھی ہوں۔ ایسا عمنا کی شادی بھی ہو جائے اور وہ مجھ سے دور بھی نہ جائے۔" عمنا نے بے چینی سے انہیں دیکھا تھا۔ وہ جانے کیا سوچ بیٹھی تھیں۔

"کیا؟" ایاز آفندی نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔

"میں عمنا کی شادی وجدان سے کرنا چاہتی ہوں۔" وجدان کے ہاتھ سے چمچہ چھوٹ کر پلیٹ میں جا گرا تھا۔ عمنا نے اپنی حیرت بھلائے اسے دیکھے تھا' وہاں حیرت و بے یقینی کے ساتھ ساتھ غم و غصے کے تاثرات تھے۔ وہ فوراً" اٹھا تھا اور کرسی کھسکا کر وہاں سے جانے لگا تھا۔

"دیکھا۔۔۔ دیکھا کتنا بدتمیز ہے یہ۔۔۔ میں اور میری بات کی یہ اہمیت ہے اس کے نزدیک۔" شہناز آفندی نے شکوہ کناں نظروں سے ایاز آفندی کو دیکھا تھا۔

"وجدان۔۔۔" ایاز آفندی نے وجدان کو پکارا تھا۔ وہ رک گیا تھا۔

"یہ کون سا طریقہ ہے کھانے کی ٹیبل سے اٹھ کر جانے کا۔" وہ غصے سے پوچھ رہے تھے۔ وجدان نے مڑتے ہوئے انہیں دیکھا تھا۔

"آئی ایم سوری۔۔۔ میں ان کی بات نہیں مان سکتا۔ میں مائرہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔۔۔ تمہاری شادی وہیں ہوں گی جہاں میں چاہوں گا۔"

"اگر میں وہاں نہ کرنا چاہوں تو۔۔۔؟"

"میں تمہیں اپنی جائیداد سے عاق کر دوں گا۔" ایاز آفندی نے اٹل لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا تھا۔

"اپنی محبت سے تو عاق کر چکے ہیں۔ اب جائیداد سے بھی عاق کر دیں گے۔" وجدان کے لہجے میں دکھ نمایاں تھا۔ وہ وہاں سے چلا گیا تھا۔ عمنا بھی وہاں زیادہ دیر بیٹھ نہیں سکی تھی۔

"کیسے دو منٹ میں دو کوڑی کا کر کے رکھ دیا مجھے۔۔۔ میری بیٹی کا بھی دل توڑ دیا۔۔۔ کیا کمی ہے عمنا میں۔۔۔" شہناز آفندی نے دکھی لہجے میں ایاز آفندی سے مخاطب تھیں۔

"تم فکر مت کرو۔ وہی ہو گا جو تم چاہتی ہو۔۔۔ میں بات کروں گا وجدان سے۔" ایاز آفندی نے انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا تھا۔

☆ ☆ ☆

وجدان اب کھانے کی میز پر بھی نظر نہیں آتا تھا۔ عمنا نے اندازہ لگایا تھا کہ آفندی انکل اور وجدان کے بیچ تلخ کلامی ہوئی ہے شاید۔۔۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ دو ٹوک انداز میں ماما سے بات کرے گی۔ وجدان جب اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تو وہ لوگ کیوں زبردستی کر رہے ہیں اس کے ساتھ۔

وہ ان سے بات کرنے کے غرض سے ان کے کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ ان کے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اندر سے آتی شہناز آفندی کی آواز سن کر اس کے قدم وہیں رک گئے تھے۔

"اب مزا آئے گا۔۔۔ وجدان بری طرح پھنس گیا ہے وہ جو بھی فیصلہ کرے گا اس سے مجھے ہی فائدہ ہو گا۔ وہ انکار کرے گا' تو آفندی اسے جائیداد سے عاق کر دیں گے۔ اس گھر پر صرف میرا اور میرے بچوں کا راج ہو گا۔" عمنا کو اس وقت وہ کسی ڈرامے کا سازشی کردار لگی تھیں۔ اسے بہت افسوس ہوا تھا' اس کا جی چاہا تھا وہ واپس مڑ جائے۔ پر اس نے خود میں ہمت پیدا کرتے ہوئے دروازہ بجایا تھا۔

"اچھا زیبی' میں کچھ دیر میں تمہیں کال بیک کرتی ہوں۔" شہناز آفندی نے کہہ کر فون بند کیا تھا۔

"کون ہے؟" عمنا دروازہ کھول کر اندر آگئی تھی۔

"ارے عمنا... آؤ..." عمنا کو دیکھ کر وہ مسکرائی تھیں۔

"مجھے آپ سے بات کرنی تھی۔"

"ہاں... کہو۔"

"مجھے وجدان سے شادی نہیں کرنی۔"

"کیوں...؟"

"آپ کیوں اس کے ساتھ زبردستی کر رہی ہیں۔ مجھے اس گھر پر راج نہیں کرنا۔"

"تم فکر مت کرو... کوئی زبردستی نہیں ہو رہی اس کے ساتھ... ایاز اسے منالیں گے۔" انہوں نے اس کا دوسرا جملہ غور سے نہیں سنا تھا۔

"تم شادی سے انکار نہیں کرو گی۔ تم ہمیشہ میرے پاس رہو گی اب... میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں بیٹا۔" شہناز آفندی نے پیار سے اس کا گال چھوتے ہوئے کہا تھا۔

"محبت..." وہ حیرت سے انہیں دیکھے گئی تھی۔ یہ محبت تو ہرگز نہیں تھی۔ یہ تو سوتیلے بیٹے سے لیا جانے والا انتقام تھا شاید...

احساس و مروت سے نا آشنا لوگ
عجیب لگتا ہے جب محبت کی بات کرتے ہیں

"مجھے ابھی بہت اہم میٹنگ میں جانا ہے' ہم پھر بات کریں گے۔" وہ اپنی دانست میں اسے مطمئن کر کے چلی گئی تھیں۔

اگر وجدان' مائرہ سے محبت کرتا ہے تو مائرہ بھی وجدان سے محبت کرتی ہو گی' تب ہی وہ اتنے دنوں سے یونی ورسٹی نہیں آ رہی۔ نہ ہی اسے بلانے کے لیے پہلے کی طرح فون کرتی۔ وہ ٹہلتے ہوئے یہ ہی سوچ رہی تھی۔

اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس ساری سچویشن میں کیا کرے۔ اپنی ماں کے منہ پر کہہ دے کہ وہ اس کی اصلیت جان گئی ہے' وہ یہ سارا ڈراما بند کرے۔

پر نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی۔ وہ ایسا سوچتی تو اس کی ہمت جواب دے جاتی تھی۔ اسی لمحے اس کا فون بجا تھا۔ موبائل اسکرین پر مائرہ کا نام جگمگا رہا تھا۔

"ہیلو..." اس نے فوراً" کال ریسیو کی تھی۔

"عمنا... پلیز اسے روکو... وہ خودکشی کر رہا ہے۔" مائرہ کا گھبرایا ہوا پریشان لہجہ سن کر اسے کچھ سمجھ نہیں آیا تھا۔

"کون... کس کی بات کر رہی ہو؟"

"و... جدان... اس کا فون آیا تھا... وہ کہہ رہا تھا وہ خود... کشی کر رہا ہے۔" مائرہ رو رہی تھی۔

"تم... پلیز... اسے روکو... جاؤ' وہ کہیں وہ خود کو ختم نہ کرلے۔" عمنا فوراً" ہوش میں آئی تھی۔ اس نے فون بیڈ کی طرف اچھالا تھا اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی تھی۔

"وجدان... وجدان..." وہ اس کے کمرے کا دروازہ بجاتے ہوئے اسے آواز دے رہی تھی۔

جتنی دیر دروازہ نہیں کھلا تھا اسے یہ ہی خوف کھائے جا رہا تھا' اگر وجدان مر گیا تو اس کی موت کی ذمہ دار وہ ہو گی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھل گیا تھا۔

"کیوں آئی ہو یہاں؟" اس کے ہاتھ میں پکڑی پسٹل دیکھ کر عمنا دم بخود رہ گئی تھی۔ وہ واقعی خودکشی کرنے والا تھا۔

"تم خودکشی کر رہے تھے... تم اتنی سی بات کے لیے حرام موت کو گلے لگانے جا رہے تھے۔"

"اتنی سی بات..." اس نے طنزیہ لہجے میں کہتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"تم اور تمہاری ماں کے لیے یہ "اتنی سی بات" ہو سکتی ہے۔ تم بھی اپنی ماں جیسی ہو نا... تمہاری ماں جب کوئی چیز پسند کرے تو اسے پانے کے لیے آخری حد تک جا سکتی ہے۔ اس نے میرے باپ کو پانے کے لیے میری ماں کو طلاق دلوا دی تھی۔" عمنا کے لیے یہ انکشاف حیرت انگیز تھا۔

"تم بھی مجھے حاصل کرنے کے لیے ہر حد سے گزر جاؤ گی۔ تمہاری ماں نے میرے باپ کو میرے سامنے لا کھڑا کیا ہے' اسے یقین ہے' وہ کسی صورت نہیں ہارے گی۔ میری ہاں اور نہ دونوں میں ان کا فائدہ ہے۔ میں نہ تو اپنی محبت سے دستبردار ہو سکتا ہوں۔ نہ اپنے

باپ کی نفرت برداشت کر سکتا ہوں۔"
"تم غلط سمجھ رہے ہو۔ مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ نہ ہی میں نے تمہیں پانے کی خواہش کی کبھی۔"
عمنا نے اس کی غلط فہمی دور کرنی چاہی تھی۔ عمنا کے دل میں اس کے لیے ہمدردی تو تھی، پر محبت نہیں تھی۔ ہمدردی اور محبت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ وجدان نے اسے بے یقینی سے دیکھا تھا۔
"پھر تمہاری ماں کیوں کر رہی ہے ایسا؟" وجدان نے پسٹل بیڈ پر پھینکتے ہوئے جھنجلا کر پوچھا تھا۔
"وہ ہمیشہ میرے ساتھ یوں ہی کرتی ہے۔ اس نے عمار کو مجھ سے دور کر دیا۔ اس نے میرے باپ کو مجھ سے دور کر دیا۔ بہت محبت کرتے تھے وہ مجھ سے۔ اب مہینوں تک مجھ سے بات نہیں کرتے اور تم سے شادی نہ کرنے کی صورت میں وہ مجھے گھر سے نکال دیں گی۔"
وہ ہمیشہ میرے ساتھ یوں ہی کرتی ہیں۔ میں نے بہت کوشش کی کہ ان کے دل سے اپنی نفرت ختم کر سکوں، پر۔۔۔ وہ رو پڑا تھا۔
عمنا کو اپنا آپ مجرم لگ رہا تھا۔ وہ سخت شرمندہ تھی۔ وہ شہناز آفندی کی بیٹی ہے۔ ایک ایسی عورت کی بیٹی جو اپنی ضد اور انا کا پرچم سربلند رکھنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی ہے۔
اس نے فوراً" ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے، وہ کم از کم اپنی ماں جیسی نہیں تھی۔ وہ تو دوسروں کی خوشیوں کے لیے اپنی خوشیاں تک قربان کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔
"وجدان۔۔۔ میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ میرا جانا تمہاری مشکلات ختم تو نہیں کرے گا، پر کسی حد تک کم ضرور کر دے گا۔" وجدان نے جھٹکے سے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا، اس کی آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی تھی۔
عمنا اپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ اس نے گوہر کا نمبر ڈائل کیا تھا۔ تیسری بیل پر کال ریسیو کر لی گئی تھی۔
"ہیلو۔۔۔"
گوہر بھائی۔۔۔ کیا مجھے لینے آ سکتے ہیں؟" اس نے تعارف نہیں کروایا تھا، ایک مان تھا کہ گوہر پہچان لے گا۔ دوسری طرف خاموشی تھی۔ وہ خاموشی طویل ہوئی تھی۔ عمنا کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔
"سوری۔۔۔ شاید میں نے رانگ نمبر ملا دیا۔" عمنا کی آنکھیں بھر آئی تھیں، دل بری طرح ٹوٹ گیا تھا۔
"تم تیار ہو جاؤ۔۔۔ میں آ رہا ہوں۔" اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی گوہر بول پڑا تھا اور فوراً" کال ڈسکنکٹ کر دی تھی۔ عمنا بے یقینی سے موبائل کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے، پر لب کھل اٹھے تھے۔
اس نے اٹھ کر اپنا سامان پیک کیا تھا اور شہناز آفندی کے نام خط لکھ کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ وہ آج کسی پارٹی میں گئی ہوئی تھیں۔ رات دیر تک ان کی واپسی ہوتی تھی۔ اس نے ایک بار پھر کاغذ پر لکھی تحریر پڑھی تھی۔
السلام علیکم!
میں یہاں سے جا رہی ہوں ہمیشہ کے لیے۔
میں کسی کی خواہشوں اور حسرتوں کے مزار پر اپنے خوابوں کے محل تعمیر نہیں کر سکتی۔ ایسے محل پائیدار نہیں ہوتے۔ مزاروں سے نکلنے والی آہیں انہیں زیادہ دن ٹکنے نہیں دیں گی۔
مجھے اس گھر پر راج کرنے کی کوئی خواہش نہیں ہے۔ راج گھروں پر نہیں کیا جاتا راج تو دلوں پر کیا جاتا ہے۔
آپ نے شطرنج کی جو بساط وجدان کے لیے بچھائی تھی کہ وہ جو بھی فیصلہ کرے گا فائدہ آپ کا ہو گا۔ اس نے ان دونوں راستوں کو چھوڑ کر تیسرا راستہ چوز کر لیا تھا۔ "خودکشی"
اگر وہ مر جاتا تو میں نہ آپ کو کبھی معاف کرتی نہ خود کو۔۔۔ مجھے یہ جان کر بہت شرمندگی ہوئی کہ آپ نے وجدان کی ماں کو طلاق دلوائی تھی۔ خیر وہ آپ کی ماضی میں کی گئی غلطی تھی۔ ضروری نہیں ہے کہ اگر ماضی میں ہم نے غلطیاں کی ہیں تو ہم حال میں بھی کریں۔

"ہم حال میں نیکی اور اچھائی کریں گے تو امید کی جاسکتی ہے کہ ہماری ماضی میں کی گئی غلطیاں معاف کردی جائیں گی۔" "اگر معاف نہیں کریں گے تو بھول ضرور جائیں گے۔

خدا کے لیے وجدان کی شادی مائدہ سے کردیجیے گا۔۔۔ اسے اس کی مرضی سے اس کی زندگی گزارنے دیں اور اگر ہوسکے تو عمار کو ابھی سے کنٹرول کرلیں۔ وہ اسموکنگ کرنے لگا ہے۔ وہ آج اسموکنگ کررہا ہے' کل کو ڈرنک کرے گا۔ وہ عمر کے جس حصے میں ہے اسے پیسوں سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔ ایسا نہ ہو کہ پھرپانی سر سے گزر جائے۔

مجھے دوبارہ لینے مت آیئے گا۔۔۔ آپ کو مایوسی ہوگی میرے جواب سے۔۔۔ آپ کو برا لگا ہوگا نا۔۔۔ میں آپ کی بچھائی بساط الٹ کر جارہی ہوں۔ ہوسکے تو مجھے معاف کردیجیے گا۔

آپ کی بیٹی

عینا

☆ ☆ ☆

"عینا۔۔۔ عینا۔۔۔" گوہر نے اس کا بازو ہلاتے ہوئے اسے پکارا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی تھی۔

"گھر۔۔۔ آگیا۔" عینا نے خوش ہوتے ہوئے کہا تھا اور گاڑی سے اتر گئی تھی۔ گوہر نے سامان اتارا تھا۔ گیٹ پھپھا نے کھولا تھا۔ عینا کو دیکھ کر انہیں خوش گوار حیرت ہوئی تھی۔

"گوہر تمہیں تو صبح آنا تھا نا؟"

"جی صبح کا پروگرام تھا' پر وہ عینا کا فون آگیا تھا' تو سوچا ابھی آجاتا ہوں۔"

"عینا۔۔۔" عینا پر نظر پڑتے ہی حیا خوشی سے چلائی تھی اور دوڑتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی تھی۔

"عینا تم آگئیں۔۔۔" منال اتنی خوش تھی کہ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ پھپھو سو چکی تھیں' پر اس کی آمد کا سن کر وہ بھی فوراً آگئی تھیں۔ "تم نے بہت اچھا کیا جو آگئیں' میں تمہیں بہت یاد کرتی تھی۔"

"یا۔۔۔ آپ لوگوں کو میں ذرا یاد نہیں آئی۔۔۔ ایک بار بھی فون نہیں کیا۔۔۔" عینا خود کو شکوہ کرنے سے روک نہیں پائی تھی۔

"ہائیں۔۔۔ ہم نے فون تک نہیں کیا۔" وہ حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اس کا یہ شکوہ ان کے لیے غیر متوقع ہو۔

"بس اب سو جاؤ' یہ سارے شکوے شکایات صبح کرلینا۔۔۔ عینا بھی تھک گئی ہوگی۔" پھپھو وہاں سے اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔

"میں صبح تمہیں تفصیل سے بتاؤں گی کہ کیا کچھ ہوا ہے تمہارے بعد ابھی تم بھی سو جاؤ۔۔۔ صبح بات کریں گے۔" حیا سونے کے لیے لیٹ گئی تھی۔

عینا کو بھی نیند آرہی تھی۔ صبح کیا کچھ معلوم ہوگا۔ اس کا تجسس اپنی جگہ تھا' پر اسے اس وقت نیند آرہی تھی اس لیے وہ بھی سو گئی تھی۔

صبح حیا کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ انہوں نے کئی مرتبہ فون کیا تھا۔ کبھی ملازمہ اٹھاتی' تو کبھی شہناز آفندی' وہ ہر مرتبہ یہ کہہ کر فون رکھ دیتیں کہ عینا بزی ہے اور اس وقت بات نہیں کرسکتی۔ بات یہیں تک نہیں تھی' بلکہ پھپھو نے گوہر کے ہاتھ اس کے لیے تحائف بھیجے تھے پر شہناز آفندی نے وہ بھی لوٹا دیے تھے کہ یہاں ان کی بیٹی کے پاس ہر چیز موجود ہے۔

"حیا۔۔۔ مجھے تو ملازمہ نے یا ماما نے کبھی بتایا ہی نہیں تمہارے فون کالز کا۔"

"مجھے تم پر اتنا غصہ آیا تھا۔۔۔ تم نے خود بھی ایک بار بھی فون نہیں کیا تھا۔۔۔ نہ ہی اپنا موبائل نمبر دیا۔" حیا نے اسے گھورتے ہوئے کہا تھا۔

"میں تو یہ سوچ رہی تھی کہ تم لوگ شاید اب مجھ سے رابطہ رکھنا ہی نہیں چاہتے۔ تم لوگ میرے جانے پر شکر منا رہے ہوگے۔"

"تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو۔۔۔ تمہیں ہم ایسے نظر آتے ہیں؟" حیا نے صدمے سے اسے دیکھا تھا۔

"ہم نے تو ممانی سے گوہر بھائی کے لیے تمہارا رشتہ

بھی مانگا۔ مت پوچھو کتنا بے عزت کیا انہوں نے۔۔۔ کہنے لگیں کہ ہماری نظر تمہارے گھر اور جائیداد پر ہے۔ ہم تم سے نہیں تمہارے پیسے سے محبت کرتے ہیں۔" حیا دکھ سے بتا رہی تھی۔ عینا ان انکشافات پر حیران پریشان تھی۔ اسے نہیں معلوم تھا یہ سب کب ہوا۔

"عینا ہم نے تو ہمیشہ تم سے محبت کی ہے۔ خدا کی قسم کبھی تمہارے گھر اور جائیداد پر نظر نہیں رکھی۔"

"تمہیں قسم کھانے کی ضرورت نہیں حیا۔۔۔ مجھے تمہارا یقین ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ سب کب ہوا۔۔۔ مجھے تو کسی بات کی خبر ہی نہیں ہوئی۔۔۔ ورنہ میں ایسا کبھی نہ ہونے دیتی۔ تمہاری محبت اور تمہارے خلوص پر تو مجھے کبھی بھی شک نہیں رہا۔ مجھے یہ یقین تھا کہ میں جب واپس جاؤں گی تو سب ویسے ہی ہوں گے' وہی حیا اور منال۔۔۔ اور وہی پھپھو' جو اپنی بیٹیوں سے بڑھ کر' مجھے چاہتی ہیں۔۔۔ تم لوگوں کا ظرف تو اتنا بڑا ہے کہ اتنا سب ہو جانے کے باوجود بھی میری آمد پر اتنا خوش ہو۔۔۔ میں ان محبتوں کا قرض کبھی نہیں چکا سکتی۔ کبھی بھی نہیں۔۔۔" عینا کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ بچپن سے ساتھ ہنسنے والی حیا اسے اکیلے رونے کیسے دے سکتی تھی۔ اسی لمحے منال کچن میں داخل ہوئی تھی۔

"تم لوگ یہاں اموشنل ڈراما کری ایٹ کیے بیٹھی ہو۔ گوہر بھائی کے لیے ناشتا کون بنائے گا۔ انہیں آفس سے دیر ہو رہی ہے۔" ان دونوں نے آنسو صاف کیے تھے۔

"ہاں بنا رہی ہوں۔" حیا نے ابلتے ہوئے پانی میں پتی اور چینی ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

"تم تیار نہیں ہوئیں اب تک۔۔۔" عینا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تھا۔ "میں آج کالج نہیں جا رہی۔"

"کس خوشی میں۔۔۔؟" حیا نے غصے سے اسے دیکھا۔

"عینا کے آنے کی خوشی میں۔" منال نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔ عینا کے ساتھ ساتھ منال بھی ہنس پڑی تھی۔ اس کے انداز پر۔۔۔

"حیا تم نے اسے وہ بات نہیں بتائی اب تک؟" منال نے حیا کو معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

"کون سی بات؟" عینا کو تجسس ہوا تھا۔

"ہے ایک بات۔۔۔ ان تمام دکھی باتوں کے بیچ ایک خوشی کی خبر۔۔۔" منال کی بات پر اس نے حیا کو دیکھا تھا۔

"خوشی کی خبر۔۔۔" اس کی آنکھیں چمکی تھیں۔

"جلدی بتاؤ۔۔۔" عینا نے بے چینی سے کہا تھا۔

"بتا دوں۔۔۔ ہائے اللہ میں مشرقی لڑکی۔۔۔ مجھے اپنے منہ سے ایسی باتیں بتاتے حیا آتی ہے۔" حیا نے دوپٹے کا پلو انگلی پر لپیٹتے ہوئے کمال اداکاری کی تھی۔ عینا اور منال دونوں ہنس پڑی تھیں۔

"اب بتا بھی دو۔" حیا کا ڈراما طویل ہوا تھا' عینا کو جھنجلاہٹ ہوئی تھی۔

"پھپھو یاد ہیں تمہیں' جن کے گھر ہم گئے تھے۔" حیا نے مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں وہ بھی یاد ہیں اور وہ کارنامے بھی یاد ہیں جو تم ان کے گھر کر کے آئی تھیں۔" عینا نے معنی خیزی سے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

"وہ۔۔۔ انہوں نے۔۔۔" حیا بتاتے بتاتے رک گئی تھی۔ "منال تم بتاؤ۔۔۔ حیا کو اپنے منہ سے ایسی بات بتاتے حیا آتی ہے۔" حیا نے شرماتے ہوئے اپنے نام کا خوب صورت استعمال کیا تھا۔

"پھپھو نے شایان بھائی کے لیے حیا کا رشتہ مانگا تھا' ہم نے ہاں کر دی ہے۔ اب بہت جلد پھپھو منگنی کی رسم کرنے آئیں گی۔"

"ہائیں۔۔۔" عینا کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔

"ویسے ہے تو یہ خوشی کی خبر۔ پر مجھے شایان سے ہمدردی محسوس ہو رہی ہے۔" عینا نے شرارت سے کہا تو پراٹھے کے لیے پیڑا بناتی حیا نے کھا جانے والی

نظروں سے اسے دیکھا۔

"اس منال کی بچی نے تو میرا گھر بننے سے پہلے توڑنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی' اب تم بھی....."

"کیا کیا منال نے؟"

"اس نے اس معافی نامے میں لکھا تھا کہ مجھے نیند میں چلنے کی عادت ہے اور یہ ہی نہیں میں نیند میں بولتی بھی ہوں اور کھانا بھی کھاتی ہوں۔" حیا کی بات سن کر عمنا کو ہنسی آگئی تھی۔ اس نے سامنے کھڑی منال کو دیکھا تھا جو خجل سی ہوگئی تھی۔

"حیا اس وقت مجھے کیا پتا تھا کہ شایان سے تمہاری منگنی ہوگی..... یا پھپھو شایان کے لیے تمہارا رشتہ مانگیں گی۔ یقین کرو اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا تو میں ایسا کبھی نہ کرتی۔" منال نے چہرے پر مسکینیت طاری کرتے ہوئے کہا تھا۔

"منال..... جلدی ناشتا لے آؤ' مجھے دیر ہو رہی ہے۔" جیسے ہی گوہر کی آواز آئی حیا کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے تھے۔

"لاؤ میں آملیٹ بناتی ہوں۔" عمنا نے آملیٹ کے لیے انڈا اٹھاتے ہوئے کہا تھا۔ پراٹھے بناتی حیا نے مشکور نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کھانا کھائیں گے۔" پھپھو اور حیا نماز پڑھ رہی تھیں۔ گوہر کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے پوچھا تھا۔ گوہر نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا اور اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

عمنا نے کھانا گرم کرکے ٹرے میں برتن رکھے اور سیڑھیاں چڑھتی ہوئی گوہر کے کمرے میں آئی تھی۔ گوہر شاید نہا رہا تھا۔ اس نے کھانا ٹیبل پر رکھتے ہوئے اس کے کمرے کا جائزہ لیا۔ وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ بس بک شیلف میں کتابوں کی تعداد مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑی گوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے اس سے معافی مانگنی تھی۔ شہناز آفندی نے جانے کیا کہا ہوگا

اسے۔ جب وہ پھپھو کے دیے تحائف لے کر آیا ہوگا۔

گوہر اسے یوں کھڑا دیکھ کر ٹھٹک گیا تھا۔ اسے کھانا رکھ کر چلے جانا چاہیے تھا۔ وہ کیوں کھڑی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"گوہر بھائی میں بہت شرمندہ ہوں.... مجھے نہیں پتا کہ اس دن ماما نے آپ کو کیا کچھ کہا ہوگا.... یقین کریں اگر مجھے...."

"اٹس اوکے.... مجھے اندازہ تھا کہ تمہیں نہیں معلوم ہوگا۔" گوہر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ عینا کو خوشی ہوئی تھی کہ گوہر نے اس کے بارے میں ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا تھا۔

وہ جانے کے لیے مڑی ہی تھی کہ گوہر نے اسے پکارا تھا۔ "عینا" وہ رک گئی تھی اور مڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"تمہیں پتا چل گیا ہوگا کہ امی نے ممانی سے رشتے کی بات کی تھی۔" گوہر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ اس کا لہجہ بہت عام سا تھا' پھر بھی عینا کو عجیب سا لگا تھا اس کی نظریں گوہر سے ہٹ کر سامنے ٹیبل پر ٹک گئی تھیں۔

"ہاں جی.... مجھے حیا نے بتایا تھا۔ یہ صرف پھپھو کی خواہش تھی یا...." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ اسے حیا نے جب سے یہ بات بتائی تھی وہ تب سے حیران تھی۔

"میں نے امی سے کہا تھا۔" وہ بہت سادہ سے لہجے میں اعتراف کررہا تھا۔

عینا کو بہت حیرت ہوئی تھی۔ وہ اتنا عرصہ یہاں رہی تھی' پر اسے کبھی اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ گوہر اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ وہ اسے ہمیشہ حیا اور منال کی طرح ٹریٹ کرتے تھے۔ اسے اس قدر حیران دیکھ کر اس کے لب مدھم سا مسکرائے تھے۔

"میں جانتا ہوں تمہیں خاصی حیرت ہورہی ہوگی۔ یہ سب بالکل بھی اچانک نہیں ہے۔ میں اچانک تمہاری محبت میں مبتلا نہیں ہوا۔ مجھے شروع سے تم اچھی لگتی تھی۔ اظہار بھی اس لیے نہیں کیا کیونکہ میں بے وقت اظہار کا قائل نہیں ہوں۔ رشتوں کا تقدس اور ان کا احترام کرنا جانتا ہوں۔

میں تمہارا فیصلہ جاننا چاہتا ہوں' تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟ پھپھو منگنی کے ساتھ ہی شادی کی ڈیٹ فکس کرنا چاہتی ہیں اور امی چاہتی ہیں کہ حیا کے ساتھ ہی میری شادی بھی کردیں۔" عینا کو خاموش دیکھ کر اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پھر سے اپنا سوال دہرایا تھا۔

"تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟" عینا نے نفی میں سرہلایا اور فوراً کمرے سے نکل گئی تھی۔

اسے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ گوہر تو گوہر نایاب تھا۔ وہ اگر محبت کرنا جانتا تھا تو اسے رشتوں کا احترام کرنا بھی آتا تھا۔ اسے اس تپتی دوپہر میں "بہار کی آمد" کا احساس ہوا تھا۔ "گرمی میں بہار" وہ ہنسی تھی۔

سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے نیچے سے منال کی تیز آواز آرہی تھی۔ اس نے اندازہ لگایا تھا کہ وین خراب ہوگئی ہوگی۔ تب ہی اسے آنے میں اتنی دیر ہوگئی اور وہ ابھی ڈرائیور کی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہوگی۔ وہ بے پناہ خوش تھی۔ حیا اور شایان کی شادی ہوجائے گی۔ منال کی شوخیاں اور شرارتیں.... محبت کرنے والے پھپھا اور پھپھی اور گوہر.... جو ہرگز بھی اظہار کے معاملے میں کنجوس نہیں.... بس بے وقت اظہار کا قائل نہیں ہے۔"

☆ ☆

حمیرا نوشین

میں نہ جانوں ہار

بھئی بڑے بڑے مقابلے دیکھے مخالفوں کو ایک دوسرے کو زیر کرتے دیکھا مگر یہاں تو کوئی ہار ماننے کو ہی تیار نہیں ہے۔ چلو مقابلہ جوتی کپڑے گھریلو اشیاء کی خرید تک محدود رہتا تو پھر بھی ٹھیک تھا مگر یہاں تو مقابلہ برائے طفلان مابین رفعت و عشرت تھا۔

مقابلے کی فضا تو ان دونوں کی درمیان شادی سے پہلے کی قائم تھی۔ دونوں کزنز ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور برتر رہنے کی غرض سے نجانے کیا کچھ جتن کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ جب پھوپھی جہاں آراء بیگم نے رفعت کا رشتہ اپنے کماؤ بیٹے داؤد کے لیے مانگا تو ماموں نے بھی اس کی شرافت و لیاقت دیکھ کر فوراً" ہاں کر دی۔ عشرت کو جب پتا چلا کہ رفعت صاحبہ پھوپھی کے گھر کو رونق بخشنے جارہی ہیں بھلا وہ کیوں پیچھے رہتی۔ داؤد سے چھوٹے سلیم پہ ایسی نظریں جمائیں کہ اسے عشرت کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ اماں سے صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ شادی کروں گا تو صرف عشرت سے ماں کو بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا ایک بھتیجی لی تھی دوسرے بھائی کی بیٹی کو بھی گھر میں لے آئیں۔ دونوں بیٹے دونوں بھتیجوں پہ قربان کر دیے۔

رفعت کی شادی چونکہ عشرت کی شادی سے کچھ ماہ قبل ہوئی تھی اس لیے خوب خدمت سے پھوپھی کا دل جیت لیا تھا۔ نندیں آتیں تو پرتپاک استقبال کرتی کئی کئی ڈشز پہ اپنا ہنر آزماتی۔ چلچلاتی گرمی میں کہ پرندے بھی اپنے گھونسلوں سے سر نہ نکالیں' وہ کچن میں گھسی بارہ مسالوں کی جو بریانی بناتی تو سب انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ چند ماہ میں ہی سب کی زبانوں پہ رفعت رفعت کا نعرہ گونجنے لگا۔

عشرت بھی آتے ہی میدان میں کود پڑی' روزانہ ساس کے سر کی مالش کرتی رات کو پاؤں دابتی۔ سسر کی منہ سے نکلتے ہی فرمائش پوری کرنا اس نے اپنے لیے فرض اولین سمجھ لیا تھا۔ دونوں کے مجازی خدا بھی انہیں اپنے والدین کی اس طرح خدمت کرتے دیکھتے تو ان کے واری صدقے ہو جاتے۔ سب کچھ ٹھیک تھا' مگر دونوں میں ہر ہر موقع پر مقابلے کی ٹھنی رہتی۔

"رفعت نے گہرے جامنی رنگ کی لپ اسٹک بینگنی کلر کے سوٹ پہ لگائی ہے تو مجھے بھی ویسی ہی لپ اسٹک کا کلر چاہیے۔" عشرت سلیم کے سر ہو جاتی اور وہ بے چارا اسے لے کر بازار میں خوار ہوتا رہتا جب تک مطلوبہ چیز نہ مل جاتی اس کی خلاصی ممکن نہ ہوتی۔

ادھر رفعت داؤد کے کان کھا رہی ہوتی "جیسا عشرت نے تو تے کلر کا پرنٹ پہنا ہے مجھے بھی ہو بہو پرنٹ چاہیے۔ کیسے میرے سامنے اترا اترا کر پھر رہی ہے میں بھی اس کو ویسا ہی سوٹ پہن کر جلاؤں گی۔" وہ اپنی ہی ہاتھ پہ ہاتھ مار کر بولی۔

"مگر میری چپٹی ناک والی بیگم میں کہاں سے لاؤں گا ویسا ہی سوٹ۔ وہ سوٹ تو اس کی دوست نے کوئٹہ سے اسے تحفے میں بھیجا ہے۔" وہ اسے باور کراتا۔

"تو کیا تم میرے لیے کوئٹہ بھی نہیں جا سکتے یہ کوئٹہ رہا۔" اس نے ہاتھ سے ایسے اشارہ کیا گویا اگلی گلی میں کوئٹہ شہر اور بازار ہی تو آباد رہے' داؤد بے چارا سر پکڑ کر رہ گیا۔ سارے بازار چھان مارے کہیں سے بھی مطلوبہ کلر اور پرنٹ نہ ملا۔ آخر کچھ دنوں کی محنت رنگ لے ہی آئی' ہو بہو پرنٹ تو نہ ملا مگر انیس بیس کے فرق سے ایک سوٹ نظر آیا تو اس نے فوراً" خرید لیا اور اس کی جان بخشی ہوئی۔ وہ بھی سوٹ پا کر کھل اٹھی اور فوراً" ہی سی کر پورے ایک ہفتہ تک وہی سوٹ پہن کر عشرت کا دل جلاتی رہی اور وہ برے برے منہ بنا کر اس کے سوٹ کو کھا جانے والی نظروں سے گھورتی رہی۔

بات یہیں تک رہتی تو ٹھیک تھا' مگر اب تو مقابلے کی نوعیت ہی بدل گئی تھی۔ شادی کے نویں مہینے رفعت جٹھانی نے 'خوب صورت گل گوتھنے بیٹے کو جنم دیا تو عشرت کے دل میں بھی ماں بننے کی خواہش نے انگڑائی لی اور سلیم کے منع کرنے کے باوجود کہ ابھی ہماری شادی کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ وہ اسے لے کر ڈاکٹروں کے پاس جلے پیر کی بلی کی طرح پھرتی رہی اور

جس دن ڈاکٹر نے اسے ماں بننے کی خوشخبری سنائی مانو اس کے بے چین دل کو قرار آگیا۔

"ہونہہ بیٹے کی اماں بن کر بڑا غرور آگیا ہے ایسے اکڑ کر پھرتی ہے جیسے بیٹا تو صرف ایک یہی پیدا کر سکتی ہے اب دیکھنا نویں مہینے اللہ میری بھی گود بیٹے سے بھر دے گا۔" وہ وثوق سے کہتی۔

"بری بات ہے ایسے نہیں کہتے اور تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ ہمارے ہاں بیٹا ہی ہو گا اللہ رحمت سے بھی تو نواز سکتا ہے۔" سلیم کو اس کی بات بری لگی۔

"جیسی امید رکھو گے اللہ ویسی ہی مراد دے گا بھئی میرے دل میں تو بیٹے کی خواہش ہے اللہ میری ضرور سنے گا اور تم نے دیکھا نہیں رفعت نے پورے کمرے میں لڑکے کی تصویریں لگا رکھی تھیں ہر وقت کمرے میں پڑی انہی کو دیکھتی رہتی تھی میں بھی کمرے میں چاروں طرف بچے (لڑکے) کی تصویریں لگاؤں گی دن رات تصویریں تکا کروں گی تم دیکھنا بیٹا ہی ہو گا۔"

اس کی اپنی ہی ایک سوچ تھی اور سلیم تاسف سے سر ہلا کر رہ گیا۔ اگلے ہی دن کمرا رنگ برنگی تصویروں سے اسٹوڈیو کا منظر پیش کر رہا تھا۔ اسے قوی امید تھی کہ اس کے ہاں بیٹا ہی ہو گا اور اللہ نے اس کی سن لی تھی، وہ بہت ہی خوب صورت اور صحت مند بیٹے کو جنم دے کر گویا رفعت کے مقابل آگئی تھی اس کے بعد تو یہ سلسلہ ایسا شروع ہوا کہ دونوں پیٹ بھرے ہی رہتیں۔ کوئی سال خالی نہ جانے دیتیں۔ ہر سال ایک نیا ماڈل دونوں کے ہاں تیار ملتا۔ "اب بس کر دو یہ سلسلہ، تین بچے ہی کافی ہیں۔" سلیم بچوں کی پے درپے آمد سے گھبرا گیا تھا۔

"ارے واہ کیسے سلسلہ بند کر دوں، رفعت کے چار ہیں اور میرے تین۔ چوتھا بھی لازمی آئے گا ہمارے ہاں اور دیکھنا اسی سال آئے گا۔۔۔" اس نے سینہ ٹھونک کر کہا اور وہ جلبلا کر رہ گیا۔

ساس سسر بچے کھلا کھلا کے تنگ آگئے۔ کبھی ایک بہو بچہ گود میں پکڑا جاتی، "پھوپھو منے کو پکڑنا میں کپڑے استری کر لوں۔ وہ بچے کو ہلا ہلا کے تھک جاتیں مگر وہ سارے کپڑے استری کر کے ہی ان کی طرف رخ کرتی۔

ایک سے جان چھوٹتی تو دوسری اپنا لیے آجاتی "پھپھو جلدی سے پکڑیں اسے گرمی سے جان نکلی جا رہی ہے میں نہا کر آتی ہوں اور اگر نہانے میں دیر ہو جائے تو فیڈر بنا کر دے دینا" وہ کہتی ہوئی چھپاک سے باتھ روم میں گھس جاتی اور وہ چاروناچار بچہ سنبھالنے میں مصروف ہو جاتیں وہ بھی ایسی باتھ روم میں گھستی کہ گھنٹہ ہو جاتا نکلنے کا نام ہی نہ لیتی۔

"پورے سال کی میل آج ہی اتارے گی" وہ بڑبڑا کر رہ جاتیں اور اپنے کندھے خود ہی اپنے ہاتھوں سے دابنے لگتیں، جو بچوں کو ہلا ہلا کر دکھنے لگتے تھے۔ اب تو دونوں بہوئیں دو گھڑی ساس کے پاس بیٹھ کر ان کا حال تک نہ پوچھتیں۔ ان کی اپنی پوری نہیں پڑتی تھی تو ساس کا خاک خیال آتا۔

"سسر کے بھی بچوں کے سارے چاؤ ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ سارے بچے مل کر وہ دھما چوکڑی مچاتے کہ انہیں اپنے لیے کوئی جائے پناہ نظر نہ آتی۔ کوئی کندھے پہ چڑھا ہے تو کوئی باہر لے جانے کی فرمائش کر رہا ہے، کسی کو پیسے چاہئیں تو کوئی ٹانگوں سے لپٹا پڑا ہے۔ اور دونوں چھوٹے تو داڑھی کے بال مٹھیوں میں ایسے بھینچتے کہ انہیں چھڑانے کی سعی میں کئی بالوں کی قربانی دینی پڑتی اب تو گھنی ڈاڑھی کی جگہ خشخشی داڑھی نے لے لی تھی۔ چھوٹے ذرا بڑے ہوتے تو ان کی جان میں جان آتی داڑھی کے بالوں کی مالش کر کے اصلی حالت میں لے آؤں گا، مگر پھر ایک منا وارد ہو کر ان کے ارادوں کو خاک میں ملا دیتا۔ اب تو انہوں نے گھنی داڑھی کا خیال ہی دل سے نکال پھینکا تھا۔ بعض اوقات تو ایسا بد خیال غالب آتا کہ پوری داڑھی ہی منڈالوں مگر پھر اپنی سوچ پہ لاحول پڑھ لیتے۔

☆ ☆ ☆

"رفعت کو پھر الٹیاں لگ رہی ہیں مجھے لگ رہا ہے نیا مہمان آنے والا ہے۔" عشرت تاڑ میں رہتی۔

"لگنے دو اب' خدا کے لیے تم نہ کوئی نیا چاند چاندنی اس گھر میں لے آنا یہ گھر کم بچوں کا جنجال پورہ زیادہ لگتا ہے۔" سلیم نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔

"کیا ہو گیا ہے آپ کو کیوں اللہ کی نعمتوں کی ناشکری کر رہے ہیں۔" وہ تپ گئی۔

"ناشکری نہیں کر رہا شکر ادا کر رہا ہوں کہ اس نے نعمتیں اور رحمتیں دونوں سے گھر بھر رکھا ہے بس اب اللہ کرے تمہارا جی بھر جائے۔"

وہ سچ میں عاجز آگیا تھا اور عاجز بھی کیوں نہ آتا دونوں بھائیوں کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ گیا تھا۔ آئے دن بچوں کی ولادت کے خرچے' ہر بچے کی آمد پر بہنیں آکر بھابھیوں کا چلہ کرواتیں تو انہیں بہت کچھ دے دلا کر رخصت کرنا پڑتا پھر بچوں کی دواؤں' فیسوں کے خرچے' کپڑا لتا دونوں گھن چکر بن کر رہ گئے تھے۔ دونوں اپنے اپنے طور انہیں سمجھا سمجھا کر تھک چکے تھے مگر کوئی بھی میدان چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔

"ہمارا نہیں تو اپنا ہی کچھ خیال کر لو حالت دیکھو اپنی صدیوں کی بیمار لگتی ہو رنگ کیسا پیلا پڑ گیا ہے" داؤد رفعت کو آئینے کے سامنے لے کر کھڑا ہو جاتا۔ چند لمحے تو وہ واقعی اپنی حالت پہ افسردہ ہو جاتی مگر عشرت کا خیال کر کے اسے کے ارادوں کو پھر تقویت مل جاتی کہ کہیں وہ مجھ سے سبقت نہ لے جائے۔

سارا دن وہ گھر کے کاموں میں کولہو کے بیل کی طرح جتی رہتیں۔ پرات بھر بھر آٹے کی گوندھتیں صبح کا ناشتا ختم تو دوپہر کی تیاری شروع ہو جاتی۔ دوپہر کے کھانے سے فراغت ملتی تو رات کی فکر ستانے لگتی۔ بڑا سا دیگچا گوشت کا صبح ہی چڑھا دیتیں۔ دن بھر بچے کھاتے رہتے بھی کسی کو بھوک ستانے لگتی تو کبھی کسی کو۔

جس دن واشنگ مشین لگتی موٹر اور مشین بھی پناہ مانگتی تھیں لائٹ جاتی تو دونوں مشینوں کو آرام نصیب ہوتا۔ گھر کی صفائی ستھرائی بچوں کے کام پھوپھی کو ان پر ترس آجاتا' مگر وہ اپنے اوپر ترس نہ کھاتیں۔ وہ دن رات انہیں دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتیں۔ کئی کئی دن ہو جاتے دونوں کو کنگھا کرنے کا ہوش تک نہ ہوتا۔ الجھے بکھرے بال' ملگجے حلیے میں پھرتی رہتیں ہاں بچوں کے پہناوے پہ پوری توجہ ہوتی۔ ایک سے بڑھ کر ایک کپڑا دونوں کے بچوں کے تن پہ سجا رہتا اور ان کے باپ بے چارے کما کما کر ہلکان ہوتے رہتے۔

ایک بھو بچے پیدا کر کر کے سوکھ کے کانٹا ہو رہی تھی کپڑے پہنے ایسی لگتی جیسے بانس پہ لٹکے ہوں اور دوسری "جھارا پہلوان" کی جانشین بننے پر تلی ہوئی تھی' مگر اپنی حالتوں سے بے خبر بچوں کی گنتی پوری کرنے میں مصروف عمل تھیں۔ اب تو محلے والے بھی فقرے کسنے لگے تھے۔ بچوں کی فوج ظفر موج لے کر جب دونوں بھائی گھر سے نکلتے تو دونوں شرمندہ ہو ہو جاتے۔ کوئی دبی دبی ہنسی ہنستا تو کوئی بے باک ہنس کر فقرہ ہی اچھال دیتا "بھئی سلیم میاں اب تو گھر کی کرکٹ ٹیم مکمل ہو گئی" اور وہ بے چارے کھسیانی سی ہنسی ہنس کر رہ جاتے' گھر آکر اپنی بیگموں پہ برس پڑتے۔

"اور کتنا ذلیل کرواؤ گی ہمیں۔ اب تو باہر نکلتے بھی شرم آتی ہے۔ موٹر سائیکل پہ بٹھا کر گھمانے لے جاؤ تو لوگ ہماری کیسی ہنسی اڑاتے ہیں کہ بائیک کو کیا کار سمجھ لیا کندھوں تک پہ بچے چڑھے ہوتے ہیں۔ تمہارے ساتھ جب کہیں جانا ہوتا ہے تو رکشے والے اتنی سواریاں دیکھ کر ہی بٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں کہ بھئی رکشہ الٹنے کا خطرہ ہے۔ منت سماجت کر کے منہ مانگے داموں لے کر نکلنا پڑتا ہے۔ جیبیں خالی کرا دیں تم نے تو ہماری' ہمارے کاروباری ساتھیوں نے پلازے کھڑے کر لیے کوٹھیاں بنالیں مہنگی کاروں میں بچوں کو لے کر گھومتے پھرتے ہیں۔ ہم دن رات محنت کر کر کے گھس گئے مگر اب تک وہیں کے وہیں کھڑے ہیں بلکہ پہلے والے حالوں سے بھی گئے۔ دو چار اور نمونے آگئے تو سڑک پر لے آؤ گی ہمیں۔"

وہ سچ مچ رونے والے ہو جاتے مگر وہ دونوں کان لپیٹے نظریں چرائے بچوں کی نیپیاں دھونے میں ایسی مصروف نظر آتیں کہ ہماری بلا سے جو چاہے بولو' ہمارا

تو جو کام ہے وہی کریں گی اور وہ دونوں غصے میں ٹھوکریں مارتے گھر سے نکل جاتے 'مگر انہیں پروا کب تھی۔ ایک ماں ہی تھی جو اپنے بیٹوں کی حالت زار پہ آنسو بہا کر رہ جاتیں۔ اتنا ضرور سنا دیتیں۔

"بھئی انسان وقت اور حالات دیکھے 'بچے ہم نے بھی پیدا کیے مگر یہ نہیں کیا کہ گھر اور باہر والے تنگ آجائیں۔"

"کیا کہہ رہی ہیں پھوپھی آپ گھر والے باہر والے کس بات پر تنگ آئیں گے 'آپ کی اولاد کی اولاد ہے آپ کی نسل بڑھ رہی ہے۔ کمانے والے ان کے باپ 'پیدا کرنے والی ان کی ماں 'رزق دینے والی اللہ کی ذات 'پھر باہر والوں کو کیا پڑی جو ہمارے بچے ان کی آنکھوں میں کھٹک رہے ہیں" رفعت اکڑ کر سامنے آجاتی۔

"آنکھوں میں نہیں کھٹک رہے 'تمہارے حوصلے کی داد دیتے ہیں۔ مہنگائی آسمان سے باتیں کر رہی ہے 'ان کے خرچے پورے کرتے کرتے میرے بچوں کے کندھے وقت سے پہلے جھکتے جارہے ہیں 'مگر تمہیں احساس نہیں ہے۔" وہ جل کر بولتیں۔

"بس پھوپھی رہنے دیں آپ یہ مہنگائی وہنگائی کی فضول باتیں۔ آنے والا اپنا رزق خود اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور آپ شاید بھول رہی ہیں کہ آپ کی اماں مرحومہ نے آپ کی شادی کے بعد ایک عدد بیٹے کو جنم دیا تھا ان کا چھلہ کروانے بقول آپ کے آپ بڑے ذوق و شوق سے گئی تھیں اور اس بھائی کی شادی آپ کے بچوں سے بھی بعد ہوئی ہے۔" عشرت حساب رکھنے میں ماہر تھی' اس کی بات سن کر انہوں نے چپ سادھ لی کیا کہتیں کہ وہ۔

"سادہ وقت تھا دو وقت کی روٹی کے لیے لوگ محنت کرتے تھے 'بچے پیدا کرنے بھی آسان تھے اور پالنے بھی۔ یہ آج کل کے چاؤ چونچلے نہیں تھے کہ پورا بازار خرید کر بچوں کے سامنے ڈھیر کر دو اور پھر ناشکری کا کلمہ زبان پر رہے گا۔" وہ دل ہی دل میں دعا کرتی رہیں کہ اللہ انہیں عقل دے دے۔

☼ ☼ ☼

رفعت کے ہاں ساتویں بچے کی آمد آمد تھی' وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گئی تھی خون کی شدید کمی تھی۔ ڈاکٹر ہر مرتبہ بے نقط سنائی "کون سے دور میں رہ رہی ہیں آپ بچے پیدا کرنے کے شوق میں اپنی جان نہ گنوا دینا۔"

مگر اس پر رتی برابر اثر نہ ہوتا اب کی بار اس کی حالت بڑی نازک تھی۔ ڈاکٹر نے صاف لفظوں میں بتا دیا تھا کہ بچے اور ماں دونوں کی جان کو خطرہ ہے ہم اپنی طرف سے پوری کوشش کریں گے باقی اللہ کی مرضی۔

ان دنوں وہ مکمل بیڈ ریسٹ پر تھی۔ بیٹی کچھ بہن بھائیوں کا خیال رکھ لیتی اور کچھ عشرت اس کے بچوں کا دھیان رکھتی دونوں میں ایک صفت پائی جاتی تھی کہ لڑائی جھگڑے کی فضا سے دونوں دور رہیں ایک دوسرے کا احساس بھی کرتیں۔ بچے لڑتے جھگڑتے مگر آپس میں کبھی تو تکار نہ ہوئی ہاں مقابلے کی دوڑ ان کی سرشت میں تھی' اس سے چھٹکارا کسی طور ممکن نہ تھا۔ ڈلیوری کا وقت قریب آیا تو بڑی آپا کے نام قرعہ فال نکلا مگر انہوں نے صاف کہلوا بھیجا۔

"بھائی میرے گھر میں ضرورت کی ہر شے تمہارے بچوں کے توسط سے آچکی ہے منجھلی کی طرف دیکھ لو شاید اس کے ہاں کسی چیز کی کمی ہو" منجھلی کی طرف سے بھی صاف انکار ہو گیا چھوٹی کی طرف آس لگائی تو اس نے بھی ٹکا سا جواب دے دیا۔

"بھئی بھائی برا نہ ماننا بچے تمہارے ہوتے ہیں شرمندگی ہمیں اپنے سسرال میں اٹھانی پڑتی ہے۔ ہر سال ایک نئے بچے کی آمد پر میرے سسرال والے کیسی باتیں کرتے ہیں یہ میں ہی جانتی ہوں۔ دل چاہتا ہے کہیں منہ چھپا کر پڑی رہوں اور ہاں اب کے بیٹا ہو یا بیٹی میرے سسرال ہرگز مٹھائی نہ بھیجنا ورنہ پھر مجھے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑے گا۔" اور بڑا بھائی نظریں جھکائے بہن کی باتیں سننے پر مجبور تھا۔

اب تو دونوں کے میکے والے بھی اتنی تواتر سے بچوں کی آمد پر پریشان رہنے لگے تھے۔ دو تین بچوں تک تو میکے سے چھٹی بڑی سج دھج سے آتی رہی' بعد

میں ہر بچے کی مرتبہ یہ سلسلہ کم سے کم ہوتا چلا گیا اور اب تو یہ حال تھا کہ مبارک باد دینے کا بھی اگلے سال پر ٹال جاتے کہ اگلے بچے کی آمد پر دونوں کی مبارک باد دے دیں گے۔ کوئی شرمندگی سی شرمندگی تھی' داؤد کا تو مارے خفت کے برا حال تھا۔ جوں جوں ڈلیوری کے دن قریب آ رہے تھے رفعت کی حالت بگڑتی جا رہی تھی آخر بڑی بہن نے ہمدردی دکھائی اور بڑی بیٹی کو مائی کا چھلہ کرانے بھیج دیا اور عشرت رفعت کی حالت دیکھ کر سوچتی رہتی کہ اس کی تو سات بچوں پر بس ہوگئی بس میرے ہاں بھی دو کی کمی رہ گئی ایک تو اس سال کے آخر تک آجائے گا اور دوسرا وہ بھی ان شاء اللہ جلد آکر سات کی گنتی پوری کردے گا۔ اس کی حالت دیکھ کر بجائے سبق پکڑنے کے اس کے ارادے اور بھی جوان ہوگئے تھے۔ اللہ اللہ کر کے رفعت کی جان بچی اور اس نے ایک کمزور سے بچے کو جنم دے کر فل اسٹاپ لگالیا۔

اب عشرت صاحبہ کی باری تھی جو خیر سے چھٹے بچے کو جنم دینے کا اعزاز حاصل کر رہی تھی۔ سلیم نے تو آخری دو چھوٹوں کی مرتبہ سے اسے ڈاکٹر کو دکھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کوئی دوائی کوئی اضافی خوراک اس کے لیے نہ آتی مگر وہ بھی ایسی ڈھیٹ تھی کہ سب کچھ چھوڑ دوں گی مگر رفعت سے ہار نہ مانوں گی۔ رفعت باتوں ہی باتوں میں اسے سنا دیتی کہ ''اپنی صحت کی فکر کرو ڈاکٹر نے تمہیں ابھی احتیاط کرنے کو کہا ہے اللہ رکھے میرے سات ہیں تمہارے چھ ہو جائیں گے صرف ایک ہی کا تو فرق ہے۔'' عشرت اس کے چھپے طنز کو پی جاتی اور دل میں مصمم ارادہ کرلیتی کہ ''جان دے دوں گی مگر چھٹے کے بعد ساتواں ضرور لاؤں گی یہ میرا اپنے آپ سے وعدہ ہے۔''

کچھ دنوں سے اس کی حالت بڑی سخت خراب ہو رہی تھی۔ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا اس کے لیے محال تھا' وہ ساری رات کمرے میں ہائے ہائے کرتی رہتی اور وہ فراٹے سے خراٹے لیتا رہتا۔ نواں مہینے کا اخیر تھا وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی کہ کمزوری کے باعث ایسا چکر آیا کہ لڑکھڑا کر نیچے ایسی آگری گویا کوئی دیوار زمیں بوس ہوگئی ہو۔ گرتے ہی وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو چکی تھی' وہ تو شکر تھا کہ دونوں بھائی گھر پر موجود تھے' جلدی سے ایمبولنس منگوائی اور اسپتال کی طرف دوڑے ڈاکٹر نے بڑی پیچیدہ صورت حال بتائی کہ فوری آپریشن کرنا پڑے گا' خون کا بندوبست کریں ورنہ جان کو خطرہ ہے اور سلیم بے چارہ تھکے قدموں سے بندوبست میں لگ گیا۔

رفعت اس کی صحت و سلامتی کی دعائیں کرنے لگی اور دل میں ایک کمینی سی خوشی بھی محسوس ہو رہی تھی کہ عشرت کا چھ بچوں پر ہی سلسلہ موقوف ہو جائے گا اور میرا پلڑا بھاری رہے گا۔ آخر کار جیت میری ہی ہوئی بس اللہ اس کو زندگی دے گھر میں رہنے کا اصل مزا تو اب آئے گا۔ وہ اپنی برتری کے احساس سے خوش ہوتی رہی۔ عشرت کو آپریشن تھیٹر میں لے جایا جا چکا تھا پھوپھی گھر پر بیٹھی وظیفے کر رہی تھیں ایک نند اسپتال میں تھی' دوسری گھر میں بچوں کے پاس۔ رفعت مسلسل اسپتال میں تھی اس کے لیے فکر مند بھی تھی اور خیریت سے آپریشن ہونے کی دعائیں بھی کر رہی تھی۔

''کتنا سمجھایا تھا بھابھی کو کہ اپنی صحت کی طرف دیکھ لو جو بچے ہیں ان کی طرف دھیان دو اگر خدانا خواستہ کچھ ہو گیا تو باقی بچوں کا کیا بنے گا۔'' نند کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور سلیم سوچوں میں گھرا چپ چاپ ان کی باتیں سن رہا تھا۔

''جاؤ رفعت پتا کرو دو گھنٹے ہوگئے ابھی تک کوئی خبر نہیں آئی اللہ خیر رکھے۔'' انہوں نے رفعت کو آپریشن تھیٹر کی طرف دوڑایا تو' وہ اسی سائیڈ چل دی راستے میں ہی نرس اسے اپنی طرف آتی دکھائی دی۔

''مبارک ہو! آپریشن کامیاب ہوا ہے سب ٹھیک ہیں آپ لوگ پیشنٹ سے مل سکتے ہیں انہیں ہوش آ چکا ہے اور روم میں منتقل کر دیا ہے۔''

نرس نے اطلاع دی تو وہ سب عشرت کے روم کی طرف لپکے۔ کمرے میں داخل ہوئے تو عشرت نقاہت

کے باوجود بہت کھلی ہوئی لگ رہی تھی اس کے اطراف دو ننھے منے وجود کپڑوں میں لپٹے پڑے تھے۔

"مبارک ہو اللہ نے آپ کو دو جڑواں بیٹوں سے نوازا ہے۔ رب کا بڑا کرم ہوا ہے اس کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے جس نے ماں اور بچوں کو زندگی بخشی۔ ان کی کنڈیشن ایسی تھی کہ ان کا اور بچوں کا بچ جانا کسی معجزے سے کم نہیں ان کا بہت زیادہ خیال رکھنا خون کی ڈرپ لگی ہوئی ہے ایک بوتل کا اور انتظام کر دیں" ڈاکٹر سلیم کے قریب کھڑی اسے مبارک باد دے رہی تھی اور صورت حال سے آگاہ کر رہی تھی۔

"جڑواں بچے" رفعت نے دم سادھ لیا۔

اس کا مطلب میرے بھی سات عشرت کے بھی سات۔

آگے کے لیے دونوں کا سلسلہ ہی موقوف۔ آہ! یہ کیا ہوا عشرت پھر میرے مقابل آ گئی اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا، رنگت میں ایک دم سے زردی کھنڈ گئی، جیسے آپریشن عشرت کا نہیں رفعت کا ہوا ہو۔ وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی لگی تھی کہ جلدی سے دیوار کا سہارا لیا نگاہیں عشرت سے ٹکرائیں تو اس کے چہرے پر بڑی اطمینان بخش مسکراہٹ رقصاں تھی جیسے کہہ رہی ہو۔

"دیکھ لیا میں پیچھے رہنے والوں میں سے نہیں ہوں تمہاری ٹکر کی ہوں۔ جو بھی چیلنج تم نے مجھے دیا اس پر ہمیشہ پوری اتری۔ اب بھی میری حالت دیکھتے ہوئے میرے رب نے ایک ساتھ دو بچوں کو دنیا میں بھیج کر تمہارے مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ میرے بھی سات تمہارے بھی سات نہ تم جیتیں نہ میں ہاری" عشرت اس کی طرف دیکھ کر مسلسل مسکرائے جا رہی تھی اور رفعت اس کی مسکراہٹ سے گھبرا کر بولی۔

"عشرت میں تمہارے لیے گھر جا کر یخنی بنا کر لاتی ہوں" اور جھپاک سے کمرے سے نکل گئی وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کی پلکوں کے نم گوشے دیکھ کر اپنی کامیابی پر مزید اترائے۔

سبقت لے جانے کے چکروں میں دونوں نے اپنی صحت اور شب و روز کی بڑی قربانی دی تھی۔ جوانی میں بڑھاپے کو آواز دے کر خود بلایا تھا مگر مقابلہ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر اپنے اختتام کو پہنچا۔ رفعت کا برتری کا خوش کن احساس پل بھر میں ختم ہو کر رہ گیا اس کے ذہن میں بس ایک ہی بات گردش کر رہی تھی "میرے بھی سات عشرت کے بھی سات"

فرحین اظفر
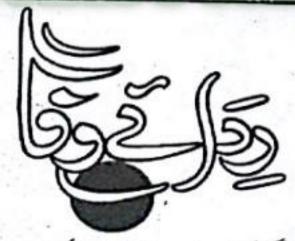
سوہا اور رابا دونوں بہنیں اپنی ماں کے ساتھ گھر کی اوپری منزل میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے والد کی وفات ان کے بچپن میں ہی ہوگئی تھی۔

گھر کی نچلی منزل میں ان کے تایا اور تائی اپنی دو بیٹیوں عفت اور نائلہ کے ساتھ رہتے ہیں۔ تایا اکثر بیمار رہتے ہیں۔

حدید' انس' عفت اور نائلہ کے خالہ زاد ہیں۔ نائلہ' انس میں دلچسپی رکھتی ہے۔ مگر انس' سوہا سے شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنی پسندیدگی کا اظہار اپنی خالہ اور سوہا کی تائی کے سامنے کردیتا ہے۔ خالہ کو بے پناہ دکھ کا احساس ہوتا ہے' مگر بظاہر راضی خوشی اس کا رشتہ لے کر اپنی دیورانی کے پاس جاتی ہیں۔ سوہا کی والدہ یہ رشتہ خوشی خوشی قبول کرلیتی ہیں۔

نائلہ باقاعدگی سے اپنے والد کو اسپتال لے کر جاتی ہے۔ وہاں اسپتال کے کلرک شبیر حسین عرف شبو سے روابط بڑھ جاتے ہیں کہ اچھے برے کی تمیز کو بھول جاتی ہے۔

سوہا اور انس کی شادی کی تقریبات بہت اچھے طریقے سے انجام پاتی ہیں اور سوہا رخصت ہوکر انس کے گھر آجاتی ہے۔

حدید کسی کو ڈراپ کرنے جاتا ہے اور اس کا ایکسیڈنٹ ہوجاتا ہے۔

سوہا کے اکیلے پن کی وجہ سے عفت اس کے پاس رک جاتی ہے۔ گھر کے کاموں کے علاوہ حدید کا بھی خیال رکھتی ہے۔

حدید' عفت کے دل میں اپنے لیے پسندیدگی کو جان لیتا ہے اور سوچ لیتا ہے کہ اس بار خالہ کو مایوس نہیں کرے گا۔

نائلہ' شبیر حسین سے ملنا نہیں چھوڑتی اور آخر کار اپنی عزت گنوا بیٹھتی ہے' جس کا اندازہ اس کی ماں کو بھی ہوجاتا ہے اور وہ اپنی عزت بچانے کے لیے حدید کے ساتھ نائلہ کی شادی کا فیصلہ کرلیتی ہیں اور اس بات کا اظہار انس اور ماہا سے بھی کردیتی ہیں۔
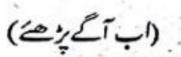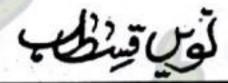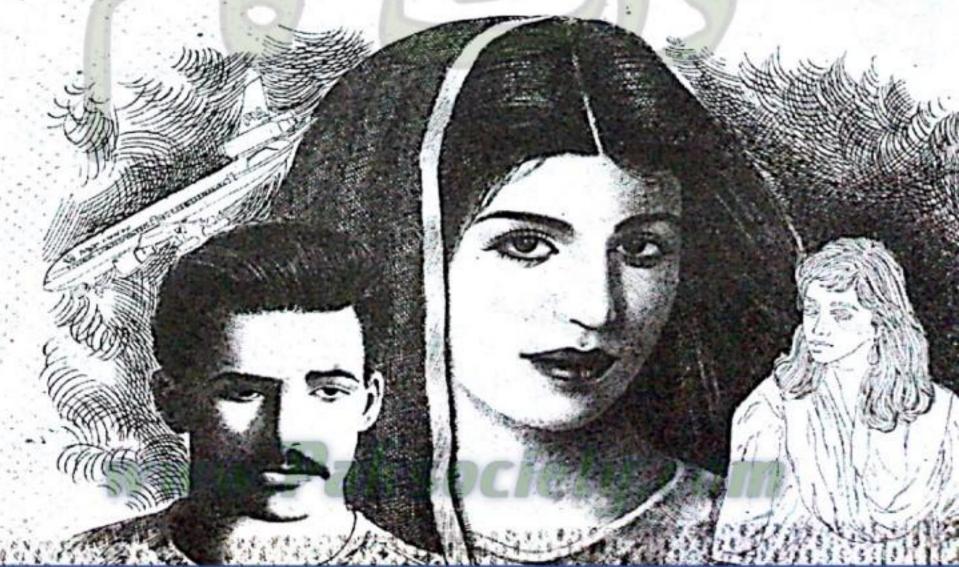
(اب آگے پڑھیے)

نویں قسط

"نائلہ! نائلہ... کیا ہوا تم ٹھیک ہو۔" وہ پوچھ رہی تھی۔
"فون کب سے بج رہا تھا۔ بند ہو گیا۔ تمہیں آواز نہیں آئی۔"
اس نے گہری سانس لے کر خود کو کمپوز کیا۔ فون بہر حال بند ہو چکا تھا اور سوہا کی پہنچ سے بہت دور تھا۔ اس نے دروازے کی کنڈی کی طرف ہاتھ بڑھایا' جبھی دروازے کے دوسری طرف سے رنگ ٹیل دوبارہ سنائی دی۔ بے حد قریب دروازے کے بالکل دوسری طرف سے۔

"پھر آرہا ہے فون کسی... شبانہ... کا ہے۔"
سوہا اب فون کرنے والے کا نام پڑھ رہی تھی۔ نائلہ کے اعصاب ایک پل میں ایسے جھنجھنائے جیسے بربط کے تار انگلیوں کی حرکت پر جھنجھنا جاتے ہیں۔
"میں ریسیو کر کے بتا دوں۔"
اس کی طرف سے مسلسل خاموشی پر اس نے نتیجہ اخذ کیا تھا۔ جو یقیناً" بہت بھیانک تھا۔ نائلہ نے کرنٹ کھا کر دروازہ کھولا اور بجلی کی سی تیزی سے سوہا کے ہاتھ سے موبائل جھپٹ لیا۔ "نہیں۔"
"کیا ہوا۔" سوہا اس حرکت کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس کا منہ کھل گیا۔
"نہیں وہ... کچھ نہیں بس۔"
اس نے جلدی سے لائن کاٹی۔ پھر فون آف ہی کر دیا۔ اور سوہا کی حیران پریشان نظروں سے بچنے کے لیے جلدی سے اس کے سامنے سے ہٹ کر بیڈ کی طرف چلی گئی۔
سوہا نے مڑ کر اسے فون تکیے کے نیچے گھسیڑتے دیکھا۔
"اگر کوئی پرائیوٹ بات کرنی ہے تو کر لو۔ میں تو یوں بھی اوپر جا رہی ہوں۔"
"پرائیوٹ بات مجھے؟... مگر کس سے...."
موبائل رکھ کر سیدھا ہوتے ہوتے اس نے خود کو کافی حد تک سنبھال لیا تھا۔
"پتا نہیں۔ مگر مجھے لگا کہ تم میری وجہ سے...."
اس کی بات نائلہ کے طنزیہ تاثرات دیکھ کر ادھوری رہ گئی۔
"سوہا میڈم پلیز۔ آپ میری جاسوسی کرنے کی فکر چھوڑیں اور اپنے کام سے کام رکھیں تو بہتر ہو گا۔" اس کا انداز بے حد تضحیک آمیز تھا۔
"یہ تم کس طرح بات کر رہی ہو مجھ سے۔ میں نے ایسا بھی کیا کہہ دیا۔"
"تو میں نے تمہیں ایسا کیا کہہ دیا۔ جو تم اتنا برا مان گئیں۔ صرف یہی تو کہا ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ جیسے رکھتی رہی ہو اب تک... اچانک سے تمہیں میری اتنی فکر کیوں ہونے لگی۔" سوہا کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔
"مجھے کوئی ضرورت نہیں تمہاری فکر میں گھلنے کی۔ غلطی کی جو پوچھنے چلی آئی۔ میری فکر کے لیے میرا شوہر ہی کافی ہے۔ تمہاری طرح نہیں کہ میاں کب آرہا ہے' کب جا رہا ہے۔ کوئی پروا نہ کوئی فکر...."
سوہا کا ضبط جواب دے گیا۔ جب ہی اس نے ایک کی چار سنا ڈالیں۔ نائلہ تلملا کر ابھی کچھ اور بھی کہتی' لیکن سوہا وہاں رکے بغیر سیڑھیاں چڑھتی کمرے میں آگئی۔ نائلہ کی بولتی تو اس نے بند کر دی تھی۔ لیکن کمرے تک آتے آتے اپنے آنسوؤں پر بند نہ باندھ سکی۔ اور بیڈ پر گر کر سسک اٹھی۔
دوسری طرف نائلہ پیچ و تاب کھاتی' یہ سوچ رہی تھی کہ سوہا کتنی گھنی ہے۔ بظاہر معصوم اور انجان بنی رہتی ہے۔ مگر اصل میں ہے نہیں۔

جانے انجانے میں سوہا کی بات نے اس کے اندر کوئی الارم سا بجا دیا تھا۔

عفت کے سسرال والے زیادہ ہی جلدی مچا رہے تھے۔ جبھی منگنی کے بجائے تیسرے ہی دن نکاح کا عندیہ کہلا بھیجا۔ اماں کے ہاتھ پاؤں جو پھولے سو پھولے' اوپر ماہا' امی اور سوہا بھی اپنی اپنی جگہ پر کچھ بوکھلا سی گئیں۔ لڑکے والوں کا شدید اصرار تھا کہ ہفتے کے آخر میں اتوار والے روز نکاح رکھ لیا جائے۔ تاکہ رخصتی بھی جلد از جلد عمل میں لائی جا سکے۔

بھلے مانس لوگ ہی تھے۔ جو جہیز کے نام پر ایک تنکا بھی لینے سے صاف انکار کر دیا۔ ان کے بقول انہیں تو بس ایک خاتون خانہ کی ضرورت تھی۔ جوان کے بیٹے اور پوتے کو اپنی محبت کا سہارا دے اور سنبھال لے۔

"انہیں بھلا کیا معلوم جس کا اپنا دل محبت کے جذبے سے خالی ہو چکا۔ وہ بھلا اپنے کھوکھلے وجود اور جھوٹے لفظوں سے کیا کسی کو سنبھالا دے گی۔"

عفت نے ایک گہری آہ بھر کر سوچا۔ پھر ہاتھ میں تھاما فون اماں کی طرف بڑھا دیا۔ نائلہ کی کال آ رہی تھی۔ اس نے دانستہ بات کرنے سے گریز ہی کیا۔

اس میں ہمت نہیں تھی کہ نائلہ کی باغیانہ' اکساتی ہوئی سوچوں کا مقابلہ کر سکتی۔ اسے یاد تھا نائلہ کو رنڈوے اور دوہا جو مردوں کے رشتوں سے کتنی چڑ تھی' وہ انس کو دل سے پسند کرتی تھی۔ جبھی وہ نہیں تو اس جیسا ہی دوسرا چاہتی تھی اور قدرت نے اس کے دل کی خواہش پوری بھی خوب کی۔ وہ نہیں لیکن ہو بہو اس جیسا ہی دوسرا عطا کر دیا۔ اب یہ نائلہ کی ناشکری ہی ہوتی اگر وہ اس پر بھی خوش نہ ہوتی تو......

"کہہ رہی تھی۔ خوامخواہ میں دیر مت کریں۔ اگر لڑکے والے کہہ رہے ہیں تو' نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جب بارات لے کر آئیں گے۔ تب بھی تو کرنا ہی ہے ناں! نیک کام میں دیر نہ کریں۔"

فون بند کر کے اماں نے خوشی خوشی نائلہ کی بات دہرائی۔

عفت نے بے حد خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھا اور اس کے دل میں برف گرنے لگی۔

"سنیچر کو آ رہا ہے۔ انس! وہی دیکھ لے گا سب انتظامات۔ نائلہ کہہ رہی تھی۔ وہ خود بات کرے گی انس سے۔ حدید آج کل آفس میں بہت مصروف ہے۔ صبح کا نکلا رات گئے آتا ہے۔ وہ تو شاید نکاح میں بھی نہ آ سکے۔" اس کا وجود منوں وزنی برف کے نیچے دب کر گھٹنے لگا۔

"یہی ہو گا اب زندگی کا رنگ شاید... سفید بالکل سفید۔"

اس نے ماہا کو ہاتھ میں کسی چیز کا پیالہ اٹھائے اپنے برابر میں بیٹھتے دیکھا۔ وہ اسے دیکھ کر ہولے سے مسکرائی تھی۔

"چلو۔ بہتر ہے... سیاہ تو نہیں ہو گا نا!"

اپنی فطرت اور عادت کے عین مطابق اس نے ٹھٹھرتے ہوئے دل کو کسی تسلی کی آنچ دینے کی کوشش کی تھی۔

☼ ☼ ☼

ہفتے کے روز شام تک انس نے کراچی آنا تھا۔ سوہا صبح سے ہی اڑی اڑی پھر رہی تھی۔ آتشی گلابی اور فیروزی کنٹراسٹ کے بھڑکتے رنگوں والا سوٹ میچنگ جیولری اور لپ اسٹک اس نے پہلے ہی تیار کر کے ڈریسنگ پر سجا لیے تھے۔ گلابی اور فیروزی چوڑیاں جو جانے کب سے اس کی ایک نظر التفات کی منتظر تھیں۔ اپنی قسمت جاگنے پر کھنک اٹھیں۔

اس کے لبوں پر ایک مستقل مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔ جسے جدا کرنا خود اس کے اپنے ہی بس سے باہر تھا۔ وہ

کتنی ہی دیر تصور میں انس سے باتیں کرتی آپ ہی آپ تنہائی میں مسکراتی رہی۔
"میں نے آپ کو بہت یاد کیا۔ ہر پل' ہر لمحہ' ہر منٹ' ہر دن' بس آپ کی یاد میں گزرا۔"
خیالوں میں انس سے باتیں کرتی وہ اتنی دور نکل گئی کہ نائلہ کب کمرے میں آئی اور کب تک اسے یوں خود سے باتیں کرتے دیکھ کر اندر ہی اندر جلتی کلستی رہی۔ اسے ذرا بھی خبر نہ ہوئی۔ چونکی تو وہ تب' جب نائلہ نے دروازہ بجایا۔ وہ پلٹی۔ پھر نائلہ کو کھڑا دیکھ کر اس کے مسکراتے لب سکڑ گئے۔ خود نائلہ کے تاثرات بھی ایسے ہی تھے۔

"میں ذرا بازار تک جا رہی ہوں۔ کل کے لیے کچھ چیزیں لینے۔ دروازہ بند کرلینا۔"
ایک گہری جتاتی ہوئی نگاہ اس کے سامان' تیاری اور وجود پر ڈال کر وہ رکی نہیں۔ فورا" پلٹی اور پھر تیزی سے صحن پار کر گئی۔
سوہا نے فورا" اس کے پیچھے جانے کے بجائے کچھ دیر رک کر انتظار کیا اور جب یقین ہو گیا کہ اب نائلہ گھر سے باہر جا چکی ہوگی۔ تب ڈریسنگ کے سامنے سے ہٹی۔ وال کلاک پر نگاہ ڈالی۔
"اف اللہ! ابھی صرف تین ہی بجے ہیں۔ کتنے گھنٹے باقی ہیں۔ انس کے آنے میں۔"
مرے مرے قدموں سے دروازے پر آکر لاک لگایا اور نیچے لاؤنج میں ہی صوفے پر گر سی گئی۔ پورے گھر کی خاموشی اور سکون نے اس کے اعصاب پر خوشگوار اثر ڈالا اور اسے نیند میں جاتے دیر نہیں لگی۔

☼ ☼ ☼

موسم بدل رہا تھا۔
شام کے سائے تیزی سے گہرے ہونے لگتے تھے۔ ابھی بھی بھری دوپہر کا وقت تھا۔ لیکن دوپہر کے چہرے پر زردی کھنڈنے لگی تھی۔ اور خود اس کے اپنے چہرے پر جیسے کسی نے سفیدی پوت دی تھی۔ وہ بالکل کسی مردے کی سی بے تاثر آنکھوں سے باہر دوڑتے بھاگتے مناظر پر نگاہ جمائے بیٹھی تھی۔ آدھا چہرہ سیاہ چادر میں چھپا تھا۔ جسے ایک سرے سے اس نے الٹے ہاتھ میں سختی سے دبوچ رکھا تھا۔ جبکہ سیدھا ہاتھ برابر میں چپک کر بیٹھے مرد کے ہاتھ میں دبا تھا۔
ٹیکسی کا سفر بڑے آرام سے جاری تھا۔ اور اس کا دل ٹیکسی کی رفتار سے دگنی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ خدا خدا کرکے سفر تمام ہوا۔ ایک جھٹکے سے ٹیکسی رکی۔ اس نے باہر نگاہ دوڑائی۔
"آہ۔" ایک زخمی سانس اس کا کلیجہ چھلنی کرتے ہوئے باہر نکلی۔
یہ وہی جانی پہچانی جگہ تھی۔ جہاں آج سے کئی مہینوں پہلے اس نے خود پر سیاہ بختی کے دروازے اپنے ہاتھوں سے کھولے تھے۔ لمحہ بھر کو اس کا دل چاہا کہ بھوکی شیرنی کی طرح برابر میں بیٹھے شخص پر جھپٹ پڑے۔ اپنے لمبے ناخنوں سے اس کی شہہ رگ پکڑ کر خون پی جائے۔ اور جب اس کی روح جسم سے پرواز کر جائے تو اس کا چہرہ کھسوٹے' وجود بھنبھوڑے اور بوٹی بوٹی کر ڈالے۔ لیکن.....
اسے اپنے انسان ہونے پر ہی افسوس ہونے لگا۔ ہائے رے کم عقل انسان.....
جو فتنہ بھی ہے اور فرشتہ بھی۔ جو عابد بھی ہے اور ابلیس بھی۔ سیانا بھی ہے اور سودائی بھی۔
پوری زندگی اپنے بننے اور بگڑنے سے اپنے رب کو نہیں پہچان پاتا اور نہیں جان پاتا کہ جن چیزوں پر ماتم بپا کر رہا ہے۔ ان کا شکر واجب ہے اور جن راہوں سے زندگی میں بچ کر چلنا ہے۔ ان ہی راستوں پر منزل کی تلاش میں دوڑا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ زندگی تھک جاتی ہے۔ ہار کر گر پڑتی ہے اور پھر ساکت ہو جاتی ہے۔

زندگی۔۔۔ جو کسک بھی ہے اور کسوٹی بھی۔ جو خواہش بھی ہے اور خلش بھی۔ یہی زندگی۔۔۔ اگر انسان چاہے تو ’توبہ بن جائے‘ ورنہ تماشا بنتے دیر نہیں لگتی۔

جیسے نائلہ کا بن رہا تھا۔ تماشا‘ بنا تماشائیوں کے۔ اس نے توبہ کرنے میں شاید دیر کردی تھی۔ وہ ہاتھ جوڑے سسک رہی تھی۔ اور ایک ابن آدم اس کی حالت سے حظ اٹھا رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

جانے کتنی دیر گزری تھی۔

اسے خود اندازہ نہیں تھا کہ وہ کتنی گہری نیند میں چلی گئی تھی کہ جب اٹھی تو بے طرح ہڑبڑا کر خود پر جھکے وجود کو پرے دھکیلا۔

آنے والا بھی شاید اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لڑکھڑاتے ہوئے سنبھلا اور پھر ہنس دیا۔

”ارے ارے کیا ہو گیا بیگم صاحبہ! کیا گرانے کا ارادہ ہے۔“

وہ صوفے پر سے اٹھ کر کھلے منہ سے بے یقین آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اسے تو شام میں آنا تھا۔ لیکن وہ وقت سے پہلے ہی آگیا تھا۔

سوہا کو یقین کرنے میں ذرا دیر لگی۔ لیکن جیسے ہی یقین آیا۔ ایک چیخ مار کر بے تابانہ اس سے لپٹ گئی۔

محبت کے اظہار کا بڑا بے اختیار سا انداز تھا۔ اس نے بھی کنجوسی نہیں دکھائی۔ کتنا سمے گزرا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ دل کر رہا تھا کہ وقت یہیں تھم جائے اور کائنات ان دو لوگوں پر بس ہو جائے۔ نہ کوئی غم رہے باقی۔ نہ کوئی فکر نہ کوئی خیال نہ پروا۔۔۔

”کھانا کھا چکے ہیں۔ یا کھائیں گے۔“ کافی دیر کے بعد اسے خیال آیا تھا۔

”ابھی نہیں کھایا۔“ اس نے فرصت سے پاؤں پسارے۔

”میں لے کر آتی ہوں ابھی۔۔۔“ اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے اسے ہاتھ تھام کر روک لیا۔

”ابھی مت جاؤ۔ میرے پاس بیٹھو‘ باتیں کرو۔“ وہ مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

گہرا ہوتا اندھیرا دن ڈھل جانے کی چغلی کھا رہا تھا۔

اس نے جلتی ہوئی آنکھوں کو مسلا۔ پھر سامنے پڑی ہوئی چینک سے باقی ماندہ ٹھنڈی چائے پیالی میں انڈیل کر لبوں سے لگالی۔

ایک ٹھنڈا بدمزا مائع لبوں سے حلق کے راستے اندر اترتا چلا گیا۔

جانے کتنی دیر گزر گئی تھی۔ اس ہوٹل میں تنہا بیٹھے وقت برباد کرتے۔ اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ نہ وہ اندازہ کرنا ہی چاہتا تھا۔ وہ تو بس اسی طرح یہاں وہاں چھپتے فرار کی راہوں پر دوڑتے ہوئے زندگی تمام کر دینا چاہتا تھا۔

”میری شریک حیات میری پسند نہیں اور اس کو بھی میں پسند نہیں۔ یہاں تک کہ اسے میری قربت بھی پسند نہیں۔ میرا نزدیک آنا پسند نہیں۔ میں تو اسے قبول کرنے کو تیار تھا۔ پر اسے ہی سمجھوتے کی راہ پر چلنا منظور نہیں۔ اب کریں تو کیا کریں اور جائیں تو جائیں کہاں۔ بس۔۔۔ یہ ہے میری زندگی کا۔۔۔“

”حدید!“

اس کی نہ صرف سوچیں ادھوری رہ گئیں۔ بلکہ بڑی زور کا جھٹکا لگا۔ اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھے

اسے پکارنے والا کوئی اور نہیں۔ انس تھا۔ حدید ایک دم گھبرا سا گیا۔
"انس تم یہاں!"
"یہ بات تو مجھے تم سے پوچھنی چاہیے۔ تم اور یہاں۔"
اس نے بے حد عام سے انداز میں ادھر ادھر دیکھتے ہوئے استفسار کیا اور اس کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ یہ ایک تیسرے درجے کا چائے والا ہوٹل تھا۔ جو گھر کے نزدیک ہی تھا۔ وہ اور حدید کبھی کبھار یہاں چائے پینے آجاتے تھے۔ لیکن کچھ عرصے پہلے یہاں غلط قسم کے لوگوں کی محفلیں جمنے کے بعد سے چھوڑ دیا تھا۔
حدید نے جواب دینے کے بجائے سر جھکا لیا۔
"تمہارے ساتھ مسئلہ ہے۔ مجھے معلوم ہے۔ اس لیے پوچھنے کی تو ضرورت نہیں۔ لیکن ایسا بھی کیا مسئلہ ہے بھائی جو گھر پر حل نہیں ہو سکتا۔ یا جو مجھے بھی بتایا نہیں جا سکتا۔"
حدید کو پتا تھا۔ وہ بس تب تک ہی چھپ سکتا تھا۔ جب تک انس سے سامنا نہیں ہو جاتا۔ ایک بار اس نے پکڑ لیا تو اگلوا کر ہی چھوڑے گا۔ اس کے اعصاب پہلے ہی تھکن زدہ تھے۔ اس لیے مزاحمتیں لڑائی سے پہلے ہی دم توڑ گئیں۔
یہ محبت بھرا پر حدت لمس اس بات کی ڈھارس تھا کہ وہ جو بھی بات کہے۔ انس اسے سن لے گا۔ آرام سے تحمل سے۔ وہ وہاں سننے کے لیے ہی آیا ہے۔ اسے حدید سے معلوم کرنا ہے کہ اسے کیا چیز پریشان کر رہی ہے۔ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے اور آخر ہے کیا مسئلہ۔ کہ وہ اپنے بھائی تک سے کہنے میں متامل ہے۔
سوہا نے اسے بہت تفصیل اور فکر مندی سے حدید کے گھر سے غائب رہنے اور نائلہ کے عجیب و غریب رویے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ بات گھر کی ہی ہے اور ان دونوں کے درمیان کی ہی ہے۔
"بول بھی دو اب۔ اتنا بھی کیا سوچنا۔"
حدید ہنوز اپنی انگلیاں آپس میں جوڑے انگوٹھوں کو ایک دوسرے سے دھیرے دھیرے مسلتا رہا۔ انس نے کچھ دیر اس کے بولنے کا انتظار کیا۔ پھر اس کے ہاتھوں پر رکھے اپنے داہنے ہاتھ کو تھپتھپایا۔
"میں سن رہا ہوں حدید!"
حدید نے ایک گہری سانس لے کر اپنے وجود کی عمارت کو ڈھاتا ہوا محسوس کیا۔ اسے یوں لگا۔ جیسے اسے اسی ایک جملے کا انتظار تھا۔ اسے ایک سامع کی تلاش تھی۔ اسے ایک کھوجی چاہیے تھا۔ وہ ایک سراغ رساں ڈھونڈ رہا تھا۔
ایک شخص جو اس کا انتظار ختم کر دے۔ اسے سنے۔ اس کا کھوج لگائے اور اس کی بے چینی و بے کلی کا سراغ پالے۔
اس نے فیصلہ کن انداز میں سر اٹھایا۔
"انس! میں۔۔۔ نائلہ کے ساتھ نہیں رہ سکتا میں اسے طلاق دینا چاہتا ہوں۔"
الفاظ اس کے لبوں سے تیر کی طرح نکلے اور انس کی سماعتوں میں پیوست ہو گئے۔ اس کے ہاتھ کی گرفت فوری طور پر ڈھیلی پڑ گئی۔
حدید کے چہرے پر اس قدر شکست و ریخت کے آثار تھے کہ اصل تحریر پڑھنا ناممکن ہی تھا۔ اسے یقین کرتے ہی بنی۔
"لیکن۔۔۔ کیوں۔" بمشکل تمام انس کے لبوں سے لفظ خود کو چھڑا کر پھڑپھڑاتے ہوئے نکلے۔
"کیونکہ میں عفت کو اپنانا چاہتا ہوں۔"

دھماکا اب ہوا تھا اور یہ دھماکا' دنیا کے ان خاموش ترین دھماکوں میں سے ایک تھا۔ جو سب سے خطرناک اور سب سے زیادہ تباہی پھیلاتے ہیں۔ اور جن کے نتائج سب سے زیادہ حتمی سب سے بڑھ کر منفی' سب سے دیرپا اور دوررس ہوتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

نائلہ کی واپسی اتنی دیر سے ہوئی تھی کہ سوہا کے ذہن سے یہ بات ہی نکل گئی تھی کہ وہ مارکیٹ کا کہہ کر نکلی تھی اور اب مغرب کی اذانیں ہو رہی تھیں۔

جتنی دیر میں اس نے جاکر دروازہ کھولا وہ جلدی جلدی تین بار دھڑ دھڑا چکی تھی۔ سوہا نے خود کو ایک بار پھر اس کی تلخ ترش سننے کے لیے تیار کرلیا۔ لیکن حیرت انگیز طور پر وہ بنا کچھ کہے نظریں جھکائے سیدھی اپنے کمرے کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ سوہا نے بمشکل تمام خود کو اس کے پیچھے جانے سے باز رکھا۔ لیکن دل میں آئی کھٹک کو نکالنے سے وہ مکمل طور پر قاصر تھی۔

نائلہ کا حلیہ قابل اعتراض تو نہیں لیکن قابل تعجب ضرور تھا۔ کیونکہ اس نے کالے رنگ کی شال کا نقاب سختی سے چہرے کے گرد لپیٹ رکھا تھا۔

دوسری بات یہ کہ صرف لحظہ بھر ہی اس نے جھانک کر سوہا کی آنکھوں میں دیکھا تھا اور پھر نظریں جھکالی تھیں۔ سوہا نے اس لحہ میں اس کی آنکھوں کی سرخی اور سوجن نوٹ کرلی تھی۔ اور تیسری اور سب سے اہم بات یہ کہ نائلہ اس طرح نظریں جھکا کر جانے والی عورت کبھی بھی نہیں تھی۔ وہ ہمیشہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دلیری اور بے باکی سے بات کرتی تھی۔ کہاں اب نظریں چرا کر گزر جانا۔

حدید بھی سارا سارا دن گھر سے غائب رہنے لگا تھا۔ اسے اب اس بات کا خیال آرہا تھا کہ اس نے کئی دنوں سے دونوں کو ایک دوسرے سے بات تک کرتے نہیں دیکھا تھا۔

مٹھی میں دبے سیل کی بیپ نے اس کا دھیان ہٹادیا۔

"کتنی دیر میں آؤگی۔" ماہا کا مسیج جگمگا رہا تھا۔

اسے اور انس کو آج رات امی کی طرف جانا تھا۔ ان کا رات کا کھانا وہیں تھا۔ اسے آج رات رکنا بھی امی کے گھر تھا۔ انس البتہ اسے چھوڑ کر واپس آجاتا۔ لیکن ذرا دیر پہلے انس کسی کام کا کہہ کر نکلا تھا۔ اور ابھی واپس نہیں آیا تھا۔

"کچھ پتا نہیں ہے' پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں یہ۔"

جواب دیتے وقت اسے اچانک ہی جھنجلاہٹ نے گھیرا۔ وہ بے اختیار ہی انس کو فون ملانے لگی۔

کافی دیر بیل جاتی رہی۔ لیکن فون ریسیو نہیں کیا گیا۔ اس نے شدید بے زار ہو کر لائن کاٹ دی۔

☆ ☆ ☆

عشاء کے بعد کا وقت تھا۔ گھر میں ایک خاص قسم کی چہل پہل کا احساس تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ماہا اور سوہا دونوں ہی ایک دوسرے کے ساتھ مل کر گھر کے نچلے پورشن میں رونق لگائے بیٹھی تھیں۔

ماہا عفت کے چہرے پر جانے کس چیز کا مساج کر رہی تھی۔ سوہا ہر تھوڑی دیر کے بعد کوئی نہ کوئی چٹکلا چھوڑ دیتی۔ ماہا کھل کر ہنستی۔ جبکہ عفت پر کچھ بھی بولنے کی پابندی تھی۔ یوں بھی اس کا بولنے یا بات کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔

مستقبل کے جن اندیشوں اور خوف سے لڑکیاں پریشان ہوتی ہیں۔ وہ اس کے پاس بھی نہیں کھٹکتے تھے۔ بلکہ

اس کے بجائے ایک عجیب اور نا محسوس سے اداسی اور اکتاہٹ اس کی گرد حصار باندھے رکھتی۔

"نائلہ کو بھی لے آتیں نا! تم۔"

ان لوگوں کی کھلکھلاہٹ کو' تائی اماں کی آواز نے بریک لگایا۔

"وہ تائی امی ہم نے تو کہا تھا۔ لیکن اس نے حدید بھائی کی وجہ سے منع کر دیا۔" چند لمحوں بعد سوہانے ہی وضاحت پیش کی۔

"عجیب لڑکی ہے۔ مجھے تو اس کی سمجھ نہیں آتی۔ بہن کی بات چیت طے ہو گئی کل نکاح سر پر کھڑا ہے۔ اور یہ ہے کہ کوئی خیر خبر ہی نہیں۔"

وہ بڑبڑاتے ہوئے آکر بیڈ پر بیٹھیں۔ ان کے ہاتھ میں نکاح کے جوڑے اور زیور کے ڈبے تھے۔

"سامان آگیا تھا عفت کا آج دوپہر میں۔"

"ارے واہ! تم نے بتایا تک نہیں۔"

ماہا بھی لاعلم تھی۔ اس نے اپنائیت سے عفت کو گھورکا۔ عفت کی نظریں پھریں۔ لحہ بھر کے لیے ماہا کے چہرے سے ٹکرائیں۔ اس کے ہونٹ ذرا کی ذرا دائیں بائیں پھیلے اور پھر واپس اپنی جگہ پر آگئے۔

ماہانے نگاہوں کے اس لحہ بھر کے ٹکراؤ سے دل کی کیفیت بدلتے محسوس کی۔

"ارے تم سو رہی تھیں۔ میں نے ہی منع کر دیا اور پھر' صرف بڑی بہن ہی آئی تھیں اس کی اپنی بچی کے ساتھ' زیادہ دیر بیٹھی بھی نہیں کہہ رہی تھیں۔ گھر پر بھی بہت کام ہیں۔"

تائی اماں تفصیل بتا رہی تھیں۔ ان کے تھکن زدہ لہجے میں بھی ایک عجیب سی خوشی اور اطمینان جھلک رہا تھا۔

سوہانے ڈبا کھول کر سوٹ نکالا۔ ہلکے سرمئی اور گلابی رنگ کے کنٹراسٹ کے ساتھ ہلکے کام سے مزین سوٹ ایک نظر دیکھنے میں ہی اچھا لگ رہا تھا۔

"ہم..... م..... م سوٹ تو بہت پیارا ہے بھئی عفت!" وہ دوپٹا خود پر پھیلا کر دیکھنے لگی۔

"اوہ! میچنگ سینڈل' جیولری' چوڑیاں..... ماشاء اللہ ہر چیز ہی آئی ہے اور سب کچھ ہے بھی بہت اچھا۔" اس کی نظروں میں ہی نہیں' لہجے اور آواز میں بھی ستائش بولنے لگی۔

"چلو اس سے ایک فکر تو کم ہوئی۔ بری اِن شاءاللہ اچھی ہو گی۔"

ماہانے بھی ہاں میں ہاں ملا کر عفت کو دیکھا۔ اس کے لبوں پر ایک بھولی بسری مسکراہٹ آن ٹھہری تھی۔

"کیسا لگا تمہیں۔" تائی اماں عفت کے منہ سے بھی تعریف سننا چاہتی تھیں۔ یا پھر..... جانے کیا سننا چاہتی تھیں۔

"اچھا ہے..... سب کچھ۔" اس نے دھیرے سے کہہ کر سر جھکا لیا۔

تائی اماں نے یک لخت اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کو سینے میں بھینچ لیا اور سسک پڑیں۔

"میری بیٹی خود بھی بہت اچھی ہے۔ اللہ میری بچی کے نصیب اچھے کرے۔"

ان کے رندھے ہوئے گلے سے ممتا کے پھول جھڑے۔ اور سب کی آنکھیں نم کر گئے۔ ماہا اور سوہانے ایک دوسرے کو دیکھ کر اپنی اپنی آنکھیں صاف کیں۔ پھر سب سے پہلے ماہا ہی خود کو سنبھال کر تائی اماں کی جانب بڑھی تھی۔ لمحوں کی خاموشی صدیوں سے زیادہ وزنی تھی۔

"ارے تائی امی کیا ہو گیا آپ کو۔ یہ کیا کیا آپ نے۔ خوشی کے موقع پر آنسو کیوں بھئی۔ اور یہ دیکھیں ذرا....."

اس نے عفت کو پیچھے کر کے تائی اماں کے دوپٹے پر لتھڑا ہوا ماسک دکھایا۔

"تم نے اپنے بوتھے کے ساتھ ساتھ تائی امی کے دوپٹے کا بھی فینشل کر ڈالا۔" سوہا ایک بار پھر کھلکھلا اٹھی۔
دوسرے کمرے میں تایا ابو کے پاس بیٹھا ان سے خیر خیریت پوچھتا انس چونک گیا۔ برابر والے کمرے سے یہاں ساری آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ اور ان آوازوں سے سب سے واضح آواز سوہا کے بار بار ہنسنے کی تھی۔ ماہا بھی بول رہی تھی۔ البتہ عفت کی ایک بار بھی آواز سنائی نہیں دی تھی۔ وہ بات کرتے کرتے یک لخت خاموش ہو گیا۔
اسے کچھ یاد آگیا تھا۔ کوئی بات 'کوئی چہرہ' کوئی انکشاف.... اس کے دل میں راکھ جھڑنے لگی۔
وہ چاہنے کے باوجود حدید کو 'عفت کے نکاح کے بارے میں نہیں بتا پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

نکاح کی تقریب جاری تھی۔ آج نائلہ بھی وقت سے پہلے آکر ان لوگوں کے ساتھ تیاری میں شریک ہو گئی تھی۔ انس نے اس سے حدید کا پوچھا تھا۔ حسب توقع اس کا جواب یہی تھا کہ وہ صبح ناشتے کے بعد آفس چلے گئے تھے۔ اتوار کو اوور ٹائم کرنے۔ پھر اس کے بعد جب شام تک واپسی نہیں ہوئی تو مجبوراً" نائلہ کو رکشے میں اکیلے ہی آنا پڑا۔ کیونکہ تائی اماں نے فون کر کے اسے عاجز کر رکھا تھا۔ بقول خود اس کے۔ انس پوری بات سن کر چپ سا رہ گیا۔ اب جب کہ وہ حدید کے دل کے حال سے واقف ہی ہو چکا تھا تو کیا کہتا۔
تمام انتظامات احسن طریقے سے مکمل ہو چکے تھے۔ نائلہ اور عفت کے ننھیال میں ایک ان کی خالہ ہی تھیں۔ انس اور حدید جن کے بچے تھے۔ اور ددھیال میں سوہا اور ماہا اور ایک عدد دور کی پھوپھی تھیں۔ جو اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ تشریف لا چکی تھیں۔
عفت کے سسرال والے بھی آچکے تھے۔ چھوٹے سے گھر میں وہ ہلچل اور رونق تھی۔ کہ بس۔ ماشاء اللہ۔
آج تو بات بے بات تائی اماں کے لبوں سے مسکراہٹ پھوٹ رہی تھی۔ ماہا نے بصد اصرار اس کا میک اپ اپنی ایک اسکول کولیگ کو بلا کر کروایا تھا۔ عفت اس وقت تقریب کی مناسبت سے بے حد پرکشش لگ رہی تھی۔ نہ تو اس کا میک اپ دلہنوں کی طرح بھاری اور گہرا تھا۔ نہ کپڑے۔
جس نے بھی دیکھا بے ساختہ تعریف کی۔
تب ہی خوشگوار ہلچل کے درمیان ذرا سا شور بلند ہوا۔ مولوی صاحب آگئے تھے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی جب ابا' انس' اور پھوپھو کے بیٹے کے ساتھ چند اور دوسرے لوگوں نے کمرے میں قدم رکھا۔ ان سب سے آگے اماں تھیں۔ اور ان سے ذرا پیچھے مولوی صاحب بھی۔

☼ ☼ ☼

گھر پر تالا پڑا ہوا تھا۔ اس نے تعجب سے دیکھا۔ پھر تالے کو مٹھی میں دبا کر کچھ دیر وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا۔
"کہاں چلے گئے سب۔ اور نائلہ بھی۔"
لگتا تو یہی تھا کہ چونکہ انس پورے ایک ہفتے بعد حیدر آباد سے واپس آیا تھا تو سوہا کو لے کر اس کے گھر چلا گیا ہوگا۔ لیکن نائلہ کہاں جا سکتی ہے۔ اور وہ بھی اکیلی۔
اس نے کل رات بھی پیش رفت کی تھی۔ اور پہلے ہی کی طرح اپنے کمرے میں اکیلی رہ گئی تھی۔ حدید رات میں اٹھ کر ٹی وی چلا کر بیٹھ گیا تھا اور چونکہ سوہا اور انس کے دیکھ لیے جانے کا ڈر نہیں تھا۔ اس لیے اس نے نہ صرف نائلہ کی منتیں کرنے پر اس کو بری طرح جھڑک دیا تھا بلکہ اس کا ہاتھ بھی اٹھ گیا تھا۔ وہ تو آخری لمحات میں جانے کس چیز نے اسے تھام لیا۔ ورنہ وہ ہاتھ یقیناً پوری قوت سے نائلہ کے منہ پر پڑتا۔ شاید اس کی نظروں میں

نائلہ کا پہلے سے ورم زدہ چہرہ اور ہلکی سرخی لیے ہوئے آنسوؤں بھری آنکھیں آگئی تھیں۔ اور وہ جہالت کا مظاہرہ کرتے کرتے رک گیا تھا۔

"اُف!" سارا دن کی آوارہ گردی کے بعد حال برا تھا۔

پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ تھکن اور بھوک دھمال ڈال رہی تھیں۔ اس نے چند لمحے سوچ و بچار میں ضائع کیے۔ پھر عفت کو ایک نظر۔ صرف ایک نظر دیکھنے کی خواہش ہر چیز پر غالب آگئی۔ بہانہ اچھا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو گھر پر نہ پاکر سسرال چلا آیا۔ کوئی اعتراض بھی نہ کرتا اور بات بھی بن جاتی۔

اور انسان کو ایسے وقت سے اللہ بچائے۔ جب پاسبان عقل دل کا ساتھ چھوڑے۔ اور وہ کسی مسافت کو لاحاصل جان کر بجھ کر بھی بے سمت راہوں پر دیوانوں کی طرح دوڑتا چلا جائے۔

جیسے اس وقت حدید دوڑ رہا تھا۔ اس کی بائیک ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ لاپرواہی اور بے احتیاطی اپنے عروج پر تھی۔ دل کی رفتار اس سے بھی دگنی ہو چکی تھی۔ بس نہیں چلتا تھا کہ اڑ کر جائے اور اپنے اور اس کے درمیان موجود دوریاں بھسم کر ڈالے۔

جب اس نے گلی کا موڑ مڑا۔ تو گھر میں کسی ہلچل کے آثار نہیں تھے۔ لیکن جوں جوں گھر نزدیک آتا گیا۔ اس نے دروازے سے کئی ایک لوگوں کو نکل کر برابر والے گھر میں داخل ہوتے دیکھا۔ اور جب تک وہ گھر کے بالکل نزدیک پہنچا۔ تب تک برابر والے گھر کا دروازہ بند تھا۔ لیکن خالہ جان کے گھر میں جلتی ایکسٹرا لائٹس، کمروں میں بکھی چاندنیاں اور گلاب کی پتیاں اس کی توجہ پوری طرح کھینچ چکی تھیں۔

پورے گھر میں ایک عجیب سا سناٹا بھی تھا۔ اور سانس لیتی زندگی بھی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی خوشی اور ملن کے گیت گاتے گاتے درمیان سے اٹھ کر چلا گیا ہے۔ اور ابھی واپس آنے والا ہے۔

اس نے ایک کمرے میں قدم رکھا۔

یہاں موجود پھیلاوا کسی تقریب کے شور شرابے کی چغلی کھا رہا تھا۔ اس کا دل جیسے ڈوب سا گیا۔ اس نے صحن میں نکل کر چاروں طرف نظر ڈالی۔ ایک خاموشی سے جیسے ہر چیز سے ہمکلام تھی۔ اس کے قدموں کی سرسراہٹ تک اسے کانوں میں دھڑکتی سنائی دے رہی تھی۔ کوئی آہٹ اسے یوں سنائی دے رہی تھی۔ جیسے اس کے نہ چاہنے کے باوجود اس کی سماعتوں میں انڈیلی جا رہی ہو۔

اس نے بہت دھیرے سے، بے حد آہستگی سے کمرے میں یوں قدم رکھا تھا۔ جیسے وہاں کوئی بھوت بیٹھا ہو۔ اور حدید کو اس کی موجودگی کا پہلے سے علم ہو۔ کمرے میں صرف ایک ہی ذی نفس تھا۔ جس کی اس کی طرف پشت تھی۔ اور جو بنا آہٹ ہوئے اسے پہچان چکا تھا۔ شاید۔ کسی شناسا خوشبو سے۔ یا کوئی مانوس احساس۔

اس نے رخ پھیرا۔ اور حدید کی حالت ایسی ہوگئی۔ جیسے اس نے واقعی میں کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔

☆ ☆ ☆

مہمانوں کے لیے کھانے کا انتظام برابر والے گھر میں کیا گیا تھا۔ کیونکہ ان کے اپنے گھر میں اتنی گنجائش نہیں تھی۔ پڑوسیوں نے اس موقع پر اپنی خدمات پیش کرتے ہوئے حق ہمسائیگی ادا کیا تھا۔ یہاں بھی چاندنیاں تھیں۔ اور ان پر بچھے لمبے لمبے دسترخوان۔

مہمان گو کہ بہت زیادہ نہیں تھے۔ لیکن پھر بھی جب سب کو ایک ساتھ سرو کرنے کا وقت آیا تو صرف سوہا، ماما اور انس ہی لگے رہے۔ نائلہ دیگ میں سے بریانی کی ٹرے بھر بھر کر نکالتی رہی۔ انس کو اس نے یہ کام کرنے سے خود ہی منع کر دیا تھا۔ اور اب لان کے سادہ سے سوٹ میں پسینے پسینے ہوتی پڑوسیوں کے باورچی خانے میں بیٹھی

تھی۔
انس اپنے سفید جھک 'کھڑکھڑاتے کرتے کو چکنائی اور چاول کے دھبوں سے بچاتا کچن اور کمروں کے درمیان آنا جانا کر رہا تھا۔ یہی حال ماہا کا تھا۔ جبکہ سوہا نے کچن میں نائلہ کی موجودگی کے باعث وہاں جانے سے گریز کرتے ہوئے پانی 'پلیٹیں' اور دوسری چیزوں کی کمی بیشی پر نظر رکھنے کو ترجیح دی تھی۔ وہ صرف دسترخوان اور مہمان نوازی تک محدود تھی۔

اس مصروفیت اور شور شرابے کے عالم میں جب سب کو ہی مہمانوں کی اچھی طرح تواضع اور مدارت کا خیال تھا۔ گھر کے بزرگ بھی لڑکے اور اس کی ماں بہنوں کے ساتھ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ برابر والے گھر میں اکیلی رہ جانے والی دلہن پر کیا گزر رہی ہے۔ اور اس وقت کیا وہ واقعی وہاں اکیلی ہے بھی؟

☼ ☼ ☼

ان دونوں پتھر کے بتوں کے درمیان محض چند قدم کا فاصلہ تھا۔ جو آج یا شاید آج سے کئی مہینوں پہلے ہی ہزاروں نوری سالوں تک محیط ہو چکا تھا۔ اس کے جوڑے کا رنگ سرخ نہیں تھا۔ پھر بھی اس نے ساری سرخی' اس کی آنکھوں میں اترتے دیکھی تھی۔ جو اپنے قدموں پر ایسے کھڑا تھا۔ جیسے اب گرا کہ تب۔
ایک طرف آنکھوں میں لالی تھی۔ تو دوسری طرف سمندر۔ لبوں پر مہر بند خاموشی۔ اور بولتی تنہائی۔ اس نے شاید زندگی میں بھی کسی دلہن کو دیکھ کر دل میں اتنا درد محسوس نہیں کیا تھا۔
"عفت!" اس نے پکارنا چاہا۔ لیکن سوکھتے لبوں پر صرف پپڑیاں تڑخنے لگیں۔ کتنی دیر گزری ایک دوسرے کو یوں عالم بے یقینی میں تکتے اور اپنے خزاں نصیب پر ایمان لاتے۔
یہ وہ دو لوگ تھے۔ جنہوں نے ساتھ جینے مرنے کی قسمیں نہیں کھائی تھیں۔ جنہوں نے ایک دوسرے سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔ ایک دوسرے کو کوئی آس نہیں دلائی تھی۔ نہ بچی نہ چھوٹی لیکن۔ لیکن پھر بھی۔
بہت بار دونوں کے دل ایک ساتھ دھڑکتے تھے۔ انہوں نے بنا کہے' بنا سنے ایک دوسرے کو جانا تھا۔ سمجھا تھا۔ لبوں سے نہیں لیکن متعدد بار نظروں میں ایک دوجے کے لیے محبت دیکھی تھی۔ پسند دیکھی تھی۔ اور کسی رسمی سے اشارے کے بغیر کسی بات چیت کے بغیر ایک دوسرے کا انتظار کیا تھا۔
مگر افسوس یہ انتظار۔ انتظار لاحاصل ہی رہا تھا۔
"یہ۔ یہ سب کیا ہے۔"
بمشکل تمام اس کے لبوں کی جنبش سے چند الفاظ نے رہائی پائی۔ اس کی نگاہیں جھک گئیں۔
"یہ جنازہ ہے میرے خوابوں کا' میرے دل کی میت اور میری آرزوؤں کی بے گوروکفن لاش ہے یہ۔"
اس کا دل چاہا کہ وہ چیخ اٹھے۔ اپنا زرتار آنچل تار تار کر ڈالے۔ اور سامنے کھڑے شخص کا گریبان جھنجھوڑ کر پوچھے۔
"کہاں تھے اب تک۔ اور کیوں آئے ہو اب۔ میرا تماشا دیکھنے۔"
اس کے لب جو خاموشی کا قفل لگائے بیٹھے۔ خاموش ہی رہے۔ وہ اب کسی اور کی عزت تھی۔ اور اس عزت کے تقاضے وفا کی ردا اوڑھے اس سے کچھ اور تقاضا کر رہے تھے۔
"یہ سب وہی ہے۔ جو آپ دیکھ رہے ہیں۔"
حدید نے اسے دیکھا اسے سنا۔ لیکن شاید کچھ سمجھا نہیں۔ یا شاید سمجھنا ہی نہ چاہا۔

"لیکن۔۔۔ لیکن عفت یوں۔۔۔ اتنی اچانک۔۔۔ کسی نے مجھے بتایا تک نہیں۔"

الفاظ ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلے اور اس کی کرچیاں سامنے کھڑی دلہن کی آنکھوں میں پیوست ہو گئیں۔

"آپ۔۔۔ آپ کو بتانے کا فائدہ بھی کیا تھا۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے ایک شکوہ نکل ہی گیا۔ حدید کا دل جیسے کسی مٹھی میں دبا دیا۔

"عفت! میں۔۔۔"

وہ ایک دم بڑھ کر عفت کے قریب ہوا۔ اس کے ہاتھ بے ساختہ عفت کے ہاتھ تھامنے کو اٹھے۔ مگر وہ اسی

طرح رخ موڑ گئی۔

"اگر کسی کو آپ کی یہاں آمد کا علم نہیں۔ تو بہتر ہو گا کہ واپس لوٹ جائیں۔" وہ جہاں تھا وہیں تھم کر رہ گیا۔

"آپ کا حلیہ چیخ چیخ کر اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ آپ میرے نکاح میں شریک ہونے نہیں آئے۔"

"نکاح!؟"

اس کی بے آواز سرگوشی میں کتنی تکلیف بھری حیرت تھی۔

"میں کسی اور کی امانت ہوں اب۔ اور آپ بھی کسی اور کے محرم ہیں۔ ہم دونوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ اپنے اپنے مرکز کی طرف لوٹ جائیں۔"

وہ اس کی طرف سے پشت کیے کھڑی تھی۔ اس کا کاجل پھیل چکا تھا۔ سنگھار بہہ رہا تھا۔ آنکھیں بھرتی تھیں۔ پھر خالی ہو جاتی تھیں۔ پھر بھرتی تھیں۔

وہ ہارے ہوئے جواری کی مانند اپنا سب کچھ لٹا کر نامراد وہاں کھڑا تھا۔ جہاں کھڑے رہنے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔

بنا پلٹے وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ عفت نے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اسے ضرورت تھی بھی نہیں۔

حدید کچھ لمحے یونہی اسے دیکھتا رہا۔ نائلہ کے زندگی میں آجانے کے بعد بھی اس نے کبھی اپنے اور اس کے درمیان موجود فاصلوں کو اہمیت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ لیکن آج۔ آج وہ اسے کتنی اجنبی، دور اور پرائی لگ رہی تھی۔

اس نے کبھی اس نہج پر سوچا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ یہ کتنی عام سی بات تھی۔ جیسے وہ کسی اور کا ہو گیا۔ ویسے ہی آج عفت بھی کسی اور کی۔

اس سے آگے سوچنا محال تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں میں بڑھتی دھندلاہٹ کو پوروں پر سمیٹا اور وہاں سے نکلتا چلا گیا۔

عفت اس کے نکلنے کے بعد پلٹی۔ تیزی سے بڑھ کر دروازے کی دہلیز تک آئی تو وہ بیرونی دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ وہ دروازے سے لپٹ کر سسک پڑی۔

پیار ہے یا سزا! اے میرے دل بتا!
ٹوٹتا کیوں نہیں درد کا سلسلہ!

☼ ☼ ☼

سوہا بہت دیر سے امی کو بے چین سا دیکھ رہی تھی۔

موسم تو خیر گرم ہی تھا لیکن، انہیں حد درجے پسینے آ رہے تھے۔ اس نے امی کی طبیعت کو کچھ بہتر محسوس نہیں کیا تو ماما سے یہ کہنے کے لیے نظریں دوڑائیں کہ امی کو گھر لے جائے۔

تقریباً" سب ہی لوگ کھانا ختم کر چکے تھے۔ پڑوسیوں کی ایک چھوٹی لڑکی بہت منع کرنے کے باوجود دستر خوان سمیٹنے میں مدد کر رہی تھی۔ جب کچن سے نائلہ نکلی۔ سوہا نے دیکھا وہ سر سے پیر تک پسینے میں شرابور تھی۔

اپنی پرخلوص فطرت کے تحت اس کے دل میں فوراً" ہی اس کے لیے ہمدردی جاگی۔ اتنے میں اسے نزدیک آتا دیکھ کر اس نے نظریں پھیر لیں۔ وہ اس سے ہمدردی اور محبت کے چکر میں کئی بار منہ کی کھا چکی تھی۔

نائلہ دانستہ یا غیر ارادی طور پر اس کے برابر میں ہی آکھڑی ہوئی۔ سوہا نے خود کو فوراً" ہی سخت بے آرام محسوس کیا۔ اس نے دوسری طرف رخ پھیرا تو انس پر نظر پڑی۔ جو معراج کے پاس بیٹھا فرائض میزبانی ادا کر رہا تھا۔ معراج یقیناً" اچھے مزاج کا شخص تھا۔ چند سال پہلے شادی ہو جانے کی وجہ سے وہ انس سے عمر میں بڑا دکھ رہا تھا۔ لیکن اتنا زیادہ نہیں۔

انس اس سے بات کر کے اٹھا تو سوہا کو خود کو گھورتا پا کر فوراً" ہی نزدیک آیا۔

"کیا بات ہے۔ نظر لگاؤ گی کیا۔" سوہا ایک دم جھینپ کر مسکرا دی۔

"میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔"

"اچھا مثلاً" کیا۔" وہ ایسے اترا کر پوچھنے لگا جیسے اسے یقین ہو کہ سوہا محبت بھری نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی اور اب بات بنا رہی ہے۔

"او ہو ایسا کچھ خاص نہیں۔" اس نے ٹالنا چاہا۔

"یہ کہو ناں کہ اب جھوٹ بول کر بات بنائی نہیں جا رہی۔"

"ہیں....؟.....جی نہیں۔" سوہا اس کی بات سن کر کھلکھلائی۔

اسی لمحے نائلہ نے پلٹ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ وہ اور انس، سوہا کے دائیں بائیں قدرے فاصلے سے کھڑے تھے۔ بلکہ انس تو پھر بھی تھوڑا نزدیک تھا۔ لیکن نائلہ کے آنے کے بعد سوہا خود ہی اس سے ذرا دور کھسک کر دوسری طرف رخ پھیر کر کھڑی ہو گئی تھی۔

نائلہ کے اس طرح سے پلٹنے پر اس کی نظریں سیدھی انس کی نظروں سے ٹکرائیں اس ایک لمحے کے تصادم میں نائلہ کے دل میں حسرت بھری ایک ٹیس سی ابھری، اور سراپا اسے اپنی لپیٹ میں لے کر سسکنے لگی۔

اس ایک لمحے میں اس کی آنکھوں میں کیسا ترسا ہوا تاثر ابھرا تھا۔ انس جو مسکرا کر سوہا کی بات سن رہا تھا۔ اسے ہنستا ہوا دیکھ کر اس کا تروتازہ چہرہ اپنی آنکھوں میں جذب کر رہا تھا۔ وہیں کا وہیں رہ گیا۔ نائلہ نے اس کے مسکراتے لب سکڑتے ہوئے دیکھے اور بجلی کی سی تیزی سے اپنی نظریں پھیر لیں۔

اس کا دماغ اسی لمحے کی زد میں آکر پورے ماحول سے کٹ گیا اور کٹی پتنگ کی طرح کئی چہروں کے درمیان ڈولنے لگا۔

"سب سے پہلے ابھرنے والا چہرہ انس کا تھا۔ پھر ابا.... اماں.... سوہا سے پھر اس کی ذہنی رو بھٹک کر انس سے ٹکرائی پھر.... شبیر حسین.... اور.... اور....

"نائلہ!" ابھی اس کے جملہ حقوق اپنے نام کرنے والا ذہن تک رسائی بھی نہیں پایا تھا کہ اس کے نام کی پکار پڑی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی آنکھیں زور سے بند کر کے کھولیں۔

ان لبوں سے اس استحقاق کے ساتھ اپنا نام سننے کی خواہش میں اس نے اپنی زندگی اپنے ہاتھوں سے اجاڑی تھی۔ بلکہ صرف زندگی نہیں، اس نے اور بھی بہت کچھ اجاڑ ڈالا تھا۔ اپنی ماں کا بھروسہ، اپنی بہن کی محبت، حدید کی رفاقت اور.... اور اپنی کوکھ بھی تو....

اسے بے اختیار ایک جھرجھری سی آگئی۔

بالکل سامنے ہی وہ کھڑا تھا۔ کبھی جس کی ہو جانے کے خوابوں نے اس کی آنکھیں جلائی تھیں۔ ان جلی ہوئی آنکھوں کی راکھ آج بھی دل کے کسی سونے دالان میں اڑتی پھرتی تھی۔

"کہاں گم ہو۔۔۔ میں پوچھ رہا ہوں۔ تم نے حدید کو بتا دیا تھا۔" اس کا سر جھکا پھر نفی میں ہلا۔

"کیوں۔" اب کی بار اس نے خفگی دکھائی۔

یہ سچ تھا کہ وہ خود سے حدید کو نہیں بتا پایا تھا۔ لیکن وہ نائلہ سے اس لاپروائی کی امید نہیں کر سکتا تھا۔

"صبح کے گھر سے نکلے وہ شام تک آتے ہی نہیں۔ نہ میرا فون ریسیو کیا۔" مردہ سے لہجے میں بول کر وہ انس کو مزید بات کرنے کا موقع دیئے بغیر مہمانوں سے ایک خیر مقدمی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر ملنے لگی۔ اور انہیں اپنی معیت میں لے کر باہر کی طرف بڑھ گئی۔

معراج کی ماں اور بہنیں کھانے سے فارغ ہو کر روانگی کا قصد کرنے سے پہلے ایک بار عفت سے ملنا چاہتی تھیں۔ نائلہ انہیں لے کر اپنے گھر چلی گئی۔

سوہا سب کے نکلنے کے بعد تیزی سے امی کی طرف آئی۔

"امی مجھے آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آپ چل کر آرام کریں۔"

اس نے بولتے ہوئے تائیدی انداز میں انس کو دیکھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تائی اماں اور تایا ابو مہمانوں کے ساتھ گھر جا چکے تھے۔ ماہا کچن میں برتن وغیرہ سمٹوا کر باقی بچا ہوا کھانا محفوظ کر رہی تھی۔

"میں نے پروین کو کہلوا دیا تھا پہلے ہی۔ وہ آتی ہوگی برتن وغیرہ دھو دے گی۔" پڑوس والی خاتون سے امی کی اچھی سلام دعا تھی۔ انہوں نے اپنی ملازمہ کا حوالہ دے کر امی کی تسلی کروا دی۔

امی چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے ذرا پھیکا سا مسکرائیں۔

"امی بس آپ فوراً گھر چلیں اور سیدھی اوپر چلی جائیے گا۔ نیچے بہت حبس ہوگا۔"

سوہا ایک دم گھبرا سی گئی۔ جلدی سے انس کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر امی کو تھام لیا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی انس کے ساتھ باہر کی طرف بڑھ گئیں، سوہا ماہا کو بتانے کچن میں چلی آئی۔

"تم بھی چلی جاؤ ساتھ ہی۔ میں بس یہ کھانا لے کر آ رہی ہوں۔" ماہا نے پوری بات سن کر مصروفیت میں جواب دے دیا۔

"اور سنو! یہ میرا موبائل بھی لیتی جاؤ۔"

٭ ٭ ٭

امی کا بلڈ پریشر غیر متوقع طور پر بہت ہی زیادہ لو ہو گیا تھا۔ وہ کچھ عرصے پہلے ہی اس مرض میں مبتلا ہوئی تھیں۔ سوہا خفگی کا اظہار کرتی انہیں دوا کھلانے لگی۔ انس باہر نکل آیا۔ صحن سے جھانک کر نیچے لگنے والی رونق کا اختتامی منظر با آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ معراج کی والدہ جانے سے پہلے اپنی بہو کے واری صدقے جا رہی تھیں۔

اس کا ذہن حدید کی غیر حاضری کو سوچ کر اتنا الجھا ہوا تھا کہ وہ وہیں باہر کھڑا ان لوگوں کی آوازیں سنتا رہا اور معراج کو خدا حافظ کہنے تک نہیں گیا۔

"کیا بہانہ کیا ہوگا نائلہ نے سب سے حدید کے نہ آنے کا۔"

سیل فون سے حدید کا نمبر ملاتے ہوئے وہ مستقل یہی سوچتا رہا۔ فون بند تھا۔ وہ "حقیقتاً" بری طرح جھنجلا گیا اور ایک گہری سانس بھر کے موبائل فون جیب میں ڈال لیا۔ مہمان جا چکے تھے۔ اس نے منڈیر پر کہنیاں ٹکائیں اور دونوں ہاتھوں کی مٹھی بنا کر اس پر اپنی ٹھوڑی رکھ لی۔

دور آسمانوں پر پھیلی سیاہی میں کہیں کہیں تاروں کی ٹمٹماہٹ تھی اور پوری فضا میں ایک گہری محسوس کی جانے والی خاموشی سی چھا گئی تھی۔ دھیمے دھیمے چلتی ہوا میں کوئی اسرار تھا۔ اداسی تھی۔ یا خالی پن۔ اس کا الجھا ہوا ذہن پہچان نہیں پایا۔ ہاں البتہ وہ خوشبو کے اس جھونکے کو ضرور پہچان گیا تھا۔ جو کسی مانوس وجود سے لپٹ کر اس تک پہنچا تھا۔

"کیا ہوا۔ کیا سوچنے لگے۔"

بکھری ہوئی سوچوں کو سمیٹ کر اس نے چونکے بغیر رخ پھیرا۔ سوہا کا سجا سنورا وجود اور مہکا مہکا تر و تازہ چہرہ سامنے ہی تھا۔ اس کے اپنے جسم میں اندر تک تازگی اور توانائی سی بھر گئی۔

"پتا نہیں۔"

"پتا نہیں؟" اس نے تعجب سے دہرایا۔

"ہاں پتا نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ تمہیں دیکھ کر سب بھول گیا۔"

اس نے بازو اس کے شانے پر پھیلایا اور محبت بھری گمبھیرتا سے کہتے ہوئے اسے خود سے قریب کر لیا۔

سوہا بھی بنا مزاحمت کے نزدیک آکر اس کے برابر میں کھڑی ہو گئی اور منڈیر سے نیچے جھانکتے ہوئے بولی۔

"شکر ہے عفت کا بھی ڈھنگ کی جگہ رشتہ ہوا۔ ورنہ تائی امی تو بس کسی بھی راہ چلتے کو پکڑ کر اسے بیاہنے والی تھیں۔"

اس کے لہجے میں بہنوں والی مخصوص محبت اور خلوص تھا۔

"امی کی طبیعت ٹھیک ہے۔" انس کی بات بالکل الگ تھی۔

"ہاں میں نے دوا کھلا کر لٹا دیا ہے۔ بی پی لو ہو گیا تھا گرمی سے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تو پھر گھر چلیں۔" اس نے شرارت سے سوہا کو دیکھا۔

"کیوں بھئی کیوں۔" حسب توقع وہ اچھل پڑی۔

"میں تو نہیں جاؤں گی آج۔"

"چلو صبح مجھے نکلنا ہو گا۔ تو کیا میں وہاں سے اکیلا چلا جاؤں گا۔"

"تو آپ کیوں جا رہے ہیں۔ آپ بھی مت جائیں نا!"

وہ بات سمجھ کر بھی انجان بننے لگی۔ انس کو بھی اس کی شرارت سمجھ آ رہی تھی۔

"تو میں رکوں گا کہاں۔"

"یہیں، دوسرے کمرے میں۔"

"پاگل ہو گیا۔ چلو۔ جا کر سامان سمیٹو جلدی۔" اس نے سوہا کے شانوں پر پھیلے بازو کو جھٹکا دیا۔

"جی نہیں۔ نہ میں جا رہی ہوں نہ آپ۔ یہیں سوئیں گے ہم۔"

"سمجھا کرو جانو! یہاں سونے میں وہ بات نہیں ہے جو۔۔۔" اس کا بازو سوہا کے شانے سے پھسل کر کمر میں رینگ گیا۔

"اوں ہوں۔۔۔ ہٹیں پیچھے ماہا آ رہی ہے۔" اس نے سیڑھیوں پر چاپ سن لی تھی۔

انس نے ایک مصنوعی آہ فضا کے سپرد کی اور شرافت سے پیچھے ہٹ کے ماہا کو دیکھنے لگا۔ جس کے ہاتھ میں بڑا سارا دو پٹہ تھا۔

وہ اوپر آکر ان دونوں کو دیکھ کر مسکرائی۔ پھر سیدھی کچن میں چلی گئی۔

"تمہیں ماہا کی ہیلپ کروانی چاہیے تھی۔"

"اوہ میں تو امی کی وجہ سے آگئی تھی۔" سوہا نے وضاحت دی پھر کچن سے نکل کر نیچے جاتی ماہا کو پکارا۔
"اب کہاں جارہی ہو۔"
"میٹھے کا ڈونگہ رہ گیا ہے۔ سیڑھیوں کے پاس ہی ہے۔" اس کا سانس پھول رہا تھا۔ انس بے ساختہ بولا۔
"تم رہنے دو۔ میں لا تا ہوں۔" وہ سیڑھیاں اتر گیا۔
ماہا تکلف میں اسے منع کرتی، لیکن اتنے میں اس کا فون بجنے لگا۔ وہ انس کو دیکھ کر سرہلاتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔

☆ ☆ ☆

عفت بہت خاموشی اور سنجیدگی سے اپنے پیروں کی نیل پالش صاف کررہی تھی۔ اماں اور ابا میں مزید جاگنے کی سکت نہیں تھی۔ اس لیے وہ سب کے جاتے ہی لمبے لیٹ چکے تھے۔
نائلہ کمرے میں داخل ہوئی۔ عفت نے ایک نظر اسے دیکھا۔ اور پھر سے نیل پالش صاف کرنے لگی۔
اس کا خیال تھا کہ نائلہ کوئی بات کرے گی۔ مگر وہ خاموشی سے اپنا چہرہ تولیے سے رگڑتی کسی سوچ میں گم تھی۔
اس کے بعد تولیہ ایک طرف ڈال کر بستر کی چادر ٹھیک کرنے لگی۔ اسے نائلہ کی خاموشی چبھنے لگی تو بول پڑی۔
"ماہا نے بھی کتنا تیار کردیا تھا مجھے۔ پیروں تک پر کیو ٹیکس لگا ڈالی۔" اس نے یونہی بات برائے بات کی۔
نائلہ نے رک کر اس کا جائزہ لیا۔ اس نے کپڑے تبدیل کرلیے تھے۔ البتہ میک اپ ابھی تک فریش تھا۔ بال سے پنیں نکالنے اور سلجھانے کی کوشش میں بکھرے بکھرے تھے۔ پھر بھی اس کے سراپے میں ایک عجیب سی کشش اور نکھار محسوس ہو رہا تھا۔
"ہوں۔" وہ ایک ہنکارا بھر کر پھر سے پلٹ کر چادر جھاڑنے لگی۔
عفت نے اس کے یک لفظی جواب کو بہت محسوس کیا لیکن جب تک وہ اپنے احساس کو زبان دیتی۔ نائلہ باہر نکل چکی تھی۔
عفت نے خاموشی سے ریموور کا کیپ لگایا اور اس کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگی۔ نائلہ چند لمحوں بعد واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں جھاڑو تھی۔
"چچ..... اب صبح کرلینا صفائی۔ اس وقت ضروری ہے۔"
"صبح میں چلی جاؤں گی جلدی اور..... سب جگہ صاف کردی ہے۔ بس یہی کمرا رہ گیا ہے۔"
"صبح جلدی کیوں جاؤ گی۔ رک جانا۔"
"حدید کو جانا ہو گا آفس۔"
اس کے منہ سے ایک حرف ممنوعہ نکلا تھا جیسے۔ عفت کو ایک دم چپ لگ گئی اور جیسے چند لمحے قبل عفت کو اس کی چپ چبھ رہی تھی۔ ویسے ہی اس وقت نائلہ کو اس کی خاموشی بہت کھلی۔
عفت ایک دم چپ ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ بھی بظاہر پورے دھیان سے جھاڑو لگانے لگی۔ پنکھا بند ہونے کی وجہ سے کمرے میں گرمی سی بھر گئی تھی اور بے حد سناٹا سا معلوم دینے لگا۔ جس میں جھاڑو کی کھس کھس بے انتہا نوکیلی سی لگنے لگی۔ عفت کو دوبارہ سے اس کی خاموشی نے ایک غیر محسوس سی بے چینی میں دھکیل دیا۔
"تمہیں کیسے لگے معراج!" اسے اپنے لبوں سے اپنے ہی محرم کا نام عجیب سا لگا۔
"یعنی میرا مطلب ہے وہ اور ان کے گھر والے اچھے تو ہیں نا!" زبردستی بنائی جانے والی باتیں زیادہ بدشکل ہوتی ہیں۔

"ہاں اچھے ہی ہیں۔۔۔" نائلہ کا لہجہ سنجیدہ اور دوٹوک تھا۔
"لیکن حدید سے زیادہ نہیں۔" اس نے ایک گہری نظر عفت پر ڈالی اور دوبارہ سے جھاڑو پھیرنے لگی۔ عفت کے دل پر کسی نے جلتا ہوا موم انڈیلا۔
"حدید!۔۔۔ ان کا یہاں کیا ذکر۔" بے وجہ کی الکن بھی چور بناتی ہے۔ نائلہ کے لبوں پر ایک طنزیہ ہنسی آن رکی۔

"ان کا نہیں تو اور کس کا ذکر کروں۔ آخر وہی میرے شوہر ہیں۔"
وہ بڑی انجان سی بنی فٹ میٹ جھاڑنے لگی۔ اور جب فٹ میٹ سے نکلنے والی گرد ان دونوں کے درمیان شور مچا کر ذرا سکون سے بیٹھی تو عفت کا چہرہ بھی گرد گرد ہو رہا تھا۔
"اسی لیے ان سے کمپیئر کر کے کہہ دیا۔۔۔ کیوں تمہیں کیا لگا۔"
وہ جانے کس چیز کا بدلہ عفت سے لے رہی تھی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ عفت سے کوئی جواب نہیں بن پڑا۔ جبکہ نائلہ ہنوز انتظار میں کھڑی تھی۔ عفت نے اپنے روم روم میں سرسراتی بے بس کیفیت کو پوری جان سے محسوس کیا۔

☼ ☼ ☼

فون کئی بار بج کر بند ہو چکا تھا۔ اس نے غنودگی میں جاگتی امی کو دیکھا۔
ان کا بایاں ہاتھ تکلیف دہ انداز میں سیدھا بیڈ سے باہر آ رہا تھا۔ وہ قریب گئی۔ بے حد آہستگی سے ان کا ہاتھ اٹھا کر کہنی سے موڑا اور ان کے سینے پر رکھ دیا۔
سیدھا ہوتے ہوئے اس کی نظر ان کے چہرے پر پڑی۔ وہ بے اختیار گہری تشویش میں گھر گئی۔
یہ صرف معمولی بلڈ پریشر کے اتار چڑھاؤ کا مظہر نہیں تھا۔ ان کا چہرہ خطرناک حد تک رنگ بدل رہا تھا۔ وہ چند لمحے کھڑی وہیں انہیں دیکھتی رہی۔
دفعتاً" اس کے فون کی رنگ پوری زور و شور سے پھر گونجی۔ اب کی بار اس نے فوراً" ہی امی کی نیند خراب ہونے کی وجہ سے فون کاٹ دیا۔ کیونکہ وہ فون کی آواز پر کسمسا کر بے آرام ہو رہی تھیں۔
پھر دروازے کے نزدیک آ کر اس نے کال لاگ کھول کر دیکھا۔
"اوہ مائی گاڈ۔"
مزنہ کی بے شمار اور لاتعداد مسڈ کالز تھیں۔
رات کافی گزر چکی تھی۔ یقیناً" چند لمحے قبل آنے والی کال بھی ان کی ہی تھی۔ اگر وہ اتنی رات کو اسے فون کر سکتی تھیں۔ تو یقیناً" ابھی جاگ رہی ہوں گی۔ اس نے سوچا خود سے فون کرلے یا ان کی کال کا انتظار کرے۔
اسی وقت فون پھر بج اٹھا۔ اس نے امی کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے فوراً" ہی ریسیو کر لیا۔
"السلام علیکم مزنہ آپی کیسی ہیں آپ! خیریت ہے۔"
مزنہ آپی بھری بیٹھی تھیں۔
انہوں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ بلکہ جواب میں جو خبر سنائی۔ وہ ماہا کے حواس سن کرنے کے لیے کافی تھی۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

☼ ☼

فاخرہ گل

خالہ سالا اور پوڑوا

جب دل کا موسم برا ہو تو آئینہ بھی برا لگنے لگتا ہے،
بس یہی حال اب "تکرار ہاؤس" کے مکینوں کا بھی تھا۔ ابا اور خالہ کا غیر متوقع رشتہ کیا طے ہوا، سب ہی بگڑے بگڑے سے نظر آنے لگے تھے۔ اوپر سے گرمی اور لوڈ شیڈنگ نے بھی مکمل طور پر کسر نکال دی تھی۔ ضمیر بھائی اپنے کلینک سے اٹھ کر گھر پر آئے اور فریج میں ٹھنڈا پانی موجود نہ پا کر وہ بھی گرم ہو گئے۔

"اف چینا۔ آج پھر فریج میں پانی نہیں ہے۔"

"ہاں تو فریج ہے ناں کوئی پانی کا ٹینکر تھوڑی ہے۔ جو ہر وقت پانی سے بھرا رہے، اب چینا کو کیا پتا کہ کسی نے پانی بھر کے رکھا بھی کہ نہیں۔" وہ پہلے ہی غصے میں تھی جب ہی سخت جواب دیا۔

"تم ٹینکر کو گولی مارو میں پانی مانگ رہا ہوں۔"

"ارے بینکر نے کیا بگاڑا ہے جو اسے گولی مارنا چاہ رہے ہو؟" کھیرے، گاجر اور آلو کا کچومر سلاد بناتیں خالہ نے خوامخواہ حصہ لینا چاہا تو چینا نے ٹیڑھی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔

"خالہ آپ تو بس چپ ہی رہا کریں اور چپ رہ کر صرف کچومر سلاد بنایا کریں، دوسروں کے دماغ کا کچومر نہ بنایا کریں۔"

"آئے ہائے میں نے کیا کہہ دیا۔ تم تو ایسے باتیں کر رہی ہو جیسے تمہاری پلیٹ سے میں نے بوٹی اٹھا لی ہو۔"

خالہ کو بھی غصہ آگیا تھا۔ دھم سے چھری پلیٹ پر دے ماری۔ اسی دوران منہ پھلائے چندا بھی کچن میں داخل ہوئی، خالہ کو دیکھا تو اسے خود ہی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ خوشی کا اظہار کرے یا افسوس۔ چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ سجا کر انہیں دیکھا اور پھر منہ پھلا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تمہارا منہ چینا کو پھولا ہوا لگ رہا ہے یا ہے ہی ایسا؟"

"ایسا تھا تو نہیں، لیکن ابا کی روز روز کی باتوں سے ہوتا جا رہا ہے ایسا۔" چندا نے ایک بار پھر جھوٹی مسکراہٹ کے ساتھ سامنے موجود خالہ کو دیکھا۔

"ان کی تو باتیں نہ۔۔۔ بس۔۔۔ کیا بتاؤں۔" خالہ نے سر جھکا کر شرمانے کی مشق شروع کی۔

"لیکن ایسا کیا کہہ دیا ہے اب انہوں نے؟" ضمیر بھائی نے تجسس بھرے انداز میں پوچھا۔

"کہتے ہیں کہ چونکہ اب ہونے والی ہے ان کی شادی، اس لیے ہمیں گانوں کی پریکٹس کرنی چاہیے۔"

"اف اللہ۔ چندا تم بھی ناں میرے سامنے تو ایسی باتیں نہ کرو، قسم سے شرم آتی ہے۔"

خالہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپائے، سر جھکائے ہنستے ہوئے کچن سے چلی گئی تھیں، باقی رہ جانے والے تینوں نے حیرت سے انہیں جاتے ہوئے دیکھا۔

"چیک کرنا تھا چندا، تمہارے ابا کا دماغ تو اپنی جگہ پر ہے۔" چینا تلملائی۔

"چینا ٹھیک کہہ رہی ہے، یعنی شادی کی بات کرنی تھی تمہاری اور علی کی اور وہ منگنی کر کے بیٹھ گئے ہیں اپنی، آخر کچھ تو خیال کرنا چاہیے تھا انہیں کہ نہیں۔"
ضمیر بھائی نے گرم پانی پینے پر ہی اکتفا کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں پتا، لیکن آپ لوگوں نے بھی تو شادی کی بات نہیں چھیڑی، جیسے ہی انہوں نے کہا اور

میری ماں بننے والی خالہ کو انگوٹھی پہنائی آپ سب آ گئے اٹھ کر، چلے آئے وہاں سے“

”ضمیر یہ چینا نے غلطی تو نہیں کر دی؟“ مسکین منہ بنا کر چینا نے ضمیر بھائی کو دیکھا۔ ”اگر علی کی شادی نہ ہوئی تو چینا خود کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔“

”تمہیں تو کوئی بھی معاف نہیں کرے گا چینا، لیکن ہاں اب بھی ہم کچھ ایسا ضرور کر سکتے ہیں جس سے چندا اور علی کی شادی کی امید نظر آ جائے۔“ ضمیر بھائی نے عقل مندوں جیسا منہ بنایا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ سب سے پہلے تو ابا اور خالہ سے اس طرح خوش رہو جیسے ان کی منگنی سے پہلے ہوا کرتے تھے اور اگلا کام میرا۔“ ضمیر بھائی نے دونوں ہاتھ باندھ کر ابرو چڑھائے تو ان پر کسی زیرو زیرو سیون کا تاثر

نویں اور آخری قسط

نازی ولطیف

ابھرنے لگا۔

"کام اور تم؟ کرلو گے ناں؟" ضمیر کا جوش دیکھتی چینا پریشان ہوگئی تھی۔

"بس اب تم دیکھتی جاؤ' اور ہاں اگر ابا کی خواہش ہے کہ ان کی شادی پر گانوں کی پریکٹس کے بعد اچھے سے گانے گائے جائیں تو ان کی یہ خواہش بھی پوری ہونی چاہیے۔"

چندا اور چینا نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہوئے سرہلایا۔

☼ ☼ ☼

کرتا پاجامہ پہنے' منہ میں پان چباتا یہ شخص کوئی اور نہیں 'بلکہ ریاض تھا جو ایک مکمل طور پر سرکاری ماحول بنے' سرکاری دفتر میں داخل ہو کر حیران ہی رہ گیا 'جہاں چند افراد تو ایک بینچ پر بیٹھے عملے سے بات چیت کا انتظار کررہے تھے جبکہ عملے کے لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے 'کوئی اخبار پڑھ رہا تھا تو کوئی' چائے اور سگریٹ سے دل بہلا رہا تھا' کہیں پر آپس میں تبادلہ خیال جاری تھا تو کہیں فون پر گپ شپ کی جارہی تھی۔ چند لمحے ان سب کو دیکھنے کے بعد آخر وہ بینچ پر بیٹھے لوگوں سے مخاطب ہوا۔

"حضرات تسلیمات۔ یہاں بیٹھنے کی وجہ جان سکتا ہوں میں۔" ان کے یوں بات کرنے پر سب ہی نے اسے جل کر دیکھا' بیزاریت بھرے انداز میں ایک شخص بولا۔

"سرکاری تھیٹر دیکھ رہے ہیں آپ بھی دیکھیے۔"

"جی یہ تھیٹر تو ہماری اسٹریٹ لائٹس کی طرح سارا دن بند نہیں ہوگا۔"

"چلیں آپ رات کو....."

"اور رات کو لوڈ شیڈنگ کی وجہ سے ویسے ہی اندھیرا ہوجائے گا۔" اس نے بات کاٹی "بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ ضمیر ہی مرگیا ہے یہاں پر تو ورنہ....."

"ارے ارے کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" مرا ہوگا ریہ صغیر یا کبیر ہضمیر نہ کہیں میرا نام ضمیر ہے۔"

"اوہ تو آپ ضمیر ہیں۔ یعنی زندہ ہیں؟ تو پھر ملایئے ہاتھ۔"

یہ تھا ضمیر بھائی اور ریاض کے درمیان ہونے والا پہلا تعارف۔

ضمیر بھائی آج کل ابا کی ممکنہ جائیداد کا کھوج لگانے کے لیے دفتروں کے چکر کاٹ رہے تھے۔ اسی دوران سرکاری اہل کار نے ریاض کو بلالیا۔

"ہاں بھئی بولو ذرا' کون ہو تم؟ اور یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

"جناب میں ریاض ہوں اور مجھے یہاں میری بیوی نے بھیجا ہے۔"

"مجھے بیوی سے نہیں ہم سے مطلب ہے تمہارا پوچھ رہا ہوں۔"

"جناب دیکھنے میں آپ مطلبی لگتے تو نہیں ہیں۔" ریاض نے بڑی ہی بے تکلفی سے سامنے رکھی کرسی سنبھالی تو اہل کار اسے غصے سے گھورنے لگا' غصہ آنے کا باعث کرسی تھی یا اس کی بات؟ یہ البتہ معلوم نہ تھا۔ "نہیں وہ میرا مطلب تھا کہ دیکھنے میں تو آپ بیورو کریٹ لگتے ہیں تو بس مطلب سے ہی بات کرتے ہیں۔" اسی دوران فون کی بیل ہوئی اور وہ اہل کار فون پر بات چیت میں مصروف ہوگیا۔

"دیکھیں آپ مجھے۔"

"دیکھ نہیں رہے کہ سرکاری کام میں مصروف ہوں۔" اہل کار نے جھڑکا۔

"سرکاری کام؟ لیکن آپ تو اتنی دیر سے صرف فون ہی کررہے ہیں۔" ریاض حیران ہوا۔

"ہاں تو کیا فون گھر سے لایا ہوں میں؟ یہ بھی تو سرکاری ہے ناں۔" اس نے غصے سے ریاض کو جھڑکا اور پھر خوشگوار موڈ میں دوبارہ فون کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں میری سرکار۔ اب بتاؤ کیا کہہ رہی تھیں تم۔" ریاض نے ٹیڑھی نظروں سے ضمیر بھائی کو دیکھا جو دوسری میز کے سامنے سائل بنے کھڑے تھے۔ وہاں موجود سرکاری اہل کار کی آواز ریاض کو بھی سنائی دی۔

"دیکھیں ابھی کام کی کوئی بات شروع کرنے کا فائدہ نہیں ہے کیونکہ دس منٹ میں چائے کا وقفہ ہونے والا ہے اس لیے بہتر ہوگا کہ ہم ٹی بریک کے بعد بات کریں۔"

"وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن یہ بھی بتادیں کہ کام کا وقفہ کب ہوگا؟" ضمیر بھائی اس کلرک سے بری طرح چڑ چکے تھے لیکن اپنا چڑچڑاپن ظاہر نہ کرنے میں ہی عافیت تھی۔ لہٰذا لہجہ نرم رکھتے ہوئے بولے۔

"یار ایسی بات نہیں ہے' دراصل ہم تو بیٹھے ہی عوام کی خدمت کے لیے ہیں' کام اتنا ہوتا ہے کہ ہم اگر اوور ٹائم نہ لگایا کریں تو یقین کرو کوئی کام نہ ہوپائے۔"

ضمیر بھائی اور ریاض نے بے چارگی سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اور آخر کار ایک طرف بیٹھ کر پانچ بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ باقی افراد مایوس ہو کر چل دیئے تھے۔ اور وہ دونوں بیٹھ کر گپ شپ کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

چینا بڑے ہی ریلیکس موڈ میں صوفے پر بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ زکام ہونے کی وجہ سے ہاتھ میں ٹشو پیپر بھی موجود تھا۔ اسی دوران خالہ ہاتھ میں اپنے متوقع جہیز میں رکھے جانے والا ایک شوپیس اٹھا کر لائیں تو اسے میوزک ویڈیوز میں گم پایا۔

"چینا۔" خالہ نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا ہی تھا کہ اس نے ایک دم دوپٹے کے پلو سے آدھا منہ یوں ڈھک لیا کہ بس اس کی آنکھیں ہی نظر آنے لگیں۔

"آئے۔ ہائے یہ تمہیں برڈ فلو تو نہیں ہوگیا جو ہمیں بچانے کے لیے منہ پر کپڑا رکھ رہی ہو؟" خالہ ایک دم ہی اس سے دور ہوگئی تھیں۔

"ارے نہیں خالہ' دراصل یہ سونگ بارش میں پکچرائز ہوا ہے ناں اور چینا کو پہلے ہی زکام ہو رہا تھا بس اسی لیے مزید دوپٹا رکھ لیا تھا۔"

"ارے تو پھر دوائی لو ناں ایک ہفتے میں ٹھیک ہوجائے گا' ورنہ تو پورے سات دن یہی حال رہے گا۔"

"چینا کی بات چھوڑیں' لگتا ہے آپ کو انٹیکس سے بڑا پیار ہے' اور ہونا بھی چاہیے کہ بندے کو اپنی ایج گروپ ہی پسند آتا ہے ناں۔" چینا نے ان کی بات سے زیادہ ہاتھ میں پکڑے شوپیس پر توجہ دی تھی۔

"ارے نہیں چینا قسم سے' یہ تو بالکل نیا ہے' دکان والا بھی بتا رہا تھا کہ یہ صرف پہلا اور آخری پیس ہے جو اس نے کوم پنی (کمپنی) سے منگوایا ہے۔ اور پورے شہر میں اگر کسی اور کے پاس نظر آگیا ناں' تو وہ باقی ڈھائی سو کے ڈھائی سو پیسز ہی آدھی قیمت پر ہمیں دے دے گا۔"

"خالہ اب تو ابا کی صورت میں آپ کو چلتا پھرتا انٹیک مل گیا ہے' آپ کو کسی اور کی کیا فکر؟"

علی نے کمرے سے نکلتے ہوئے بظاہر مسکراتے لیکن حقیقتاً" سڑے ہوئے انداز میں بات کی اور سامنے ہی بیٹھ گیا خالہ کے منہ پر شرمانے سے اترنے والی لالی نکالی لگنے لگی تھی۔

"علی تم سامنے سے تو ہٹو چینا کو گانے کی آواز نہیں آرہی۔" چینا نے یہاں وہاں ہوتے ہوئے بے چینی ظاہر کی۔

"آپی' گانا آپ کانوں سے سنتی ہیں یا آنکھوں سے؟"

"بھئی اس طرح کے گانے سننے کے نہیں بلکہ دیکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ آ۔ آ۔ آچھو' اف یہ زکام کب چینا کی جان چھوڑے گا' ہائے۔۔۔ یہ فلو۔۔۔"

چینا نے جس طریقے سے ہائے کا ردھم باندھا تھا' علی حیران ہو کر اس کے نزدیک اور بہت نزدیک آکر یوں غور سے دیکھنے لگا جیسے پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔

"آپی یہ جو ابھی ہائے کا سر لگایا تھا یہ آپ تھیں یا ٹی وی سے آواز آئی تھی۔" علی نے اسی کی طرح سے ہائے کرتے ہوئے پوچھا تو وہ شرمندہ ہوگئی۔

"وہ سوری علی دراصل زکام کی وجہ سے۔ آ۔ آ۔ آچھو۔"

"ارے سوری نہیں یقین کریں زکام میں تو آپ کی

آواز کتنے ہی گلوکاروں سے ملنے لگی ہے' یقین کریں میں تو سچھائی دی سے آواز آرہی ہے۔ اور خالہ۔۔۔ خوش ہوجائیں اب آپ بھی۔۔۔" شادی کی بڑی بڑی ویڈیوز کو لوگ بھول جائیں گے۔ ایسے گانے کریں گے ہم۔۔۔

"ہٹو بھی علی' تم مجھے چھیڑا نہ کرو۔" خالہ نے شوپیس کے اوپر سر جھکا دیا۔ یہ بھی شرمانے کا انداز تھا۔

"لیکن ہاں علی کہہ تو ٹھیک رہا ہے کہ آج کل تو لوگ گانے سنا کر بیمار کردیتے ہیں اور تم نے بیمار ہو کر گانا سنا دیا بھئی واہ۔"

"ہاں گانا تو بچپن سے ہی آتا تھا بس چینا نے کبھی کسی کو بتایا نہیں تھا۔" وہ اترائی۔

"آپی بتانے کے قابل تو تھا بھی نہیں۔۔۔ اس لیے اچھا ہی کیا۔"

"لیکن ابا اور خالہ کی شادی کے گانے کا مزا تو تب آئے گا ناں جب ہم سب کو بھی آتے ہوں۔" چینا کی ہدایت کے مطابق علی اپنے کس بھی انداز سے ناراضی یا غصہ ظاہر نہیں کر رہا تھا۔

"چینا۔ تم سب کو سکھا تو دے لیکن' پھر چینا کا اپنا ریاض کرنے کا وقت ضائع ہو جائے گا ناں۔" وہ پل ہی میں آسمان پر جا پہنچی تھی۔

"ارے چھوڑو چھوڑو ہم کوئی گانا سکھانے والا استاد ڈھونڈ لیں گے" خالہ نے گردن جھٹکی۔

"یعنی اپنی شادی میں آپ خود گانے گائیں گی؟" چینا اور علی نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ میں اپنی شادی میں تھوڑی گاؤں گی' ہوسکتا ہے ساتھ چندا کی بھی کردیں۔"

"ہوسکتا ہے کا کیا مطلب ہے خالہ' چینا تو کہتی ہے کہ لگے ہاتھوں چندا کی بھی شادی کرہی دیں' کیونکہ آپ خود سوچیں ناں ایک تو خدا خدا کرکے آپ کی شادی ہورہی ہے اس پر شادی کے بعد آپ کو اور ابا کو پرائیویسی نہ ملے تو چینا کا تو خیال ہے پھر ایسی شادی سے تو بندہ کنوارا ہی رہ لے ناں۔"

"ہاں بات تو تم نے ٹھیک ہی کی ہے' واقعی وہ چوبیس گھنٹے ہمارے سروں پر مسلط رہا کرے گی نہ کوئی پرائیویسی ہوگی نہ بات چیت۔" خالہ کے دل پر چینا کی باتوں نے بہت گہرا اثر کیا تھا۔ علی' چینا کی چالاکی سمجھ چکا تھا جب ہی خوشی خوشی مسکراتا رہا۔

"خالہ' چینا آپی اور ہم تو بس یہ چاہتے ہیں کہ اگر اب آخر کار آپ کی شادی ہو ہی رہی ہے تو تم از کم یہ شادی صرف نام کی نہ ہو بلکہ آپ کو شادی شدہ زندگی کے تمام سکھ نصیب ہوں۔"

"اوہ خدایا' تم سب کتنے اچھے ہو اور کتنے خوش ہو میری شادی پر خوانخواہ ہی چندا کے ابا اور میں سمجھ رہے تھے کہ تم تینوں بلکہ چندا بھی' اس ہونے والی شادی پر خوش نہیں ہو۔"

"آپ دونوں کیا واقعی اتنے سمجھ دار ہیں؟ ہم تو سمجھے آپ کو پتا نہیں چلے گا۔" علی نے کہا۔

"کیا پتا نہیں چلے گا؟"

"ارے خالہ یہی کہ چینا اور باقی سب اتنے اچھے ہیں۔" چینا نے فوری طور پر بات سنبھالی۔

"بھئی میں تو شادی میں کروں گی خوب ہلہ گلہ' اور اگر لوگ باتیں بنانے کو تیار ہوئے تو میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ چندا کی بھی شادی کروا کے ہی چھوڑوں گی' اب ساس نند نہیں ہیں تو کیا! اس چندا کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہوں گی۔"

"نہیں خالہ نہیں' اسی لیے تو کہا ہے کہ اپنے ساتھ ساتھ چندا کو بھی بیاہ دو' ابا سے بات کرو اور ہاں اگر رشتے کا مسئلہ ہو تو چلو تمہاری خوشی اور آباد رہنے کے لیے علی کا رشتہ ڈال آئیں گے' تاکہ ابا کا کوئی بھی بہانہ نہ چل سکے' کیوں علی' دو گے ناں خالہ کی خاطر یہ قربانی؟" چینا نے علی کو دیکھا جس کے منہ پر پھوٹتے لشکارے صرف وہ ہی دیکھ سکتی تھی۔

"لیکن آپی وہ ثنا جو میرے ساتھ پڑھتی ہے۔ میں تو اس سے وعدہ کرچکا ہوں کہ آج کل میں اس کے گھر رشتہ لے کر آؤں گا' اسے بہت چاہتا ہوں میں۔"

"دیکھو علی' میں نے تمہیں بچپن سے لے کر اب تک پالا ہے۔ پھر تم' چینا کی شادی کے بعد جب جہیز کی

صورت میں ہمارے گھر چلے آئے پھر بھی تمہارا اسی طرح خیال رکھا جیسے لڑکیاں اپنے جہیز کی چیزوں کا رکھتی ہیں' آج اگر میرا مستقبل تم سے اپنے سکون اور آرام کی خاطر ایک قربانی مانگ رہا ہے تو کیا تم نہیں دو گے؟"

خالہ نے اسے جذباتی کرنے کی مکمل کوشش کی تھی اور وہ تو ویسے بھی یہ سب جھوٹ بول رہا تھا سو فوراً" ان کی بات مان گیا۔

"خالہ آپ کی خاطر تو میں بوتلیں بھی بھر سکتا ہوں' چندا سے شادی تو پھر ایک معمولی سا کام ہے۔"

"یعنی تم راضی ہو ناں؟"

"راضی نہیں بلکہ سو فیصد راضی ہوں' میری ایک اکلوتی چینا آپی کے واحد شوہر کی باقی رہ جانے والی پیاری خالہ' بس آپ خوش رہیں اور زندگی میں کچھ نہیں چاہیے مجھے۔"

خالہ نے بھی جذباتی ہو کر گلے لگا لیا تھا۔ چینا نے اپنے منصوبے کو اتنی آسانی سے مکمل ہوتا دیکھا تو وہ بھی خوشی کے مارے خالہ سے لپٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

"سر وہ میں پنشن کے لیے حاضر ہوا تھا۔" سرکار کے کام کرنے کے اوقات ختم ہوئے اور اوور ٹائم میں تمام عملہ چوکس ہو کر بیٹھا نظر آنے لگا تو ریاض نے عرض گزاری۔

"کمال ہے بھئی تمہیں پین شین چاہیے تھے تو بک شاپ پر جاتے یہاں کیا کر رہے ہو؟ صبح سے ادھر بنچ پر بیٹھ بیٹھ کر تم نے ہمارا وقت ضائع کیا۔"

اس کا دل تو چاہا تھا کہ پوچھے بینچ پر سارا دن میرے بیٹھے رہنے سے ان کا وقت کیوں ضائع ہوا لیکن سرکاری دفاتر میں جتنا کم بولا جائے اتنا ہی جلدی کام ہوتا ہے۔

"نہیں جی وہ دراصل مجھے پنشن کے کاغذات چاہیے تھے۔"

"وہ اچھا اچھا۔ چلو برتھ سرٹیفکیٹ لاؤ۔" ریاض نے کاغذات کے پلندے سے ایک کاغذ نکال کر انہیں پکڑایا جس کے اپنے اندر تین سوراخ ہو چکے تھے۔

"ڈیونگ سرٹیفکیٹ بھی دو۔"

"کپڑے کے تھیلے میں رکھے کاغذوں سے لیونگ سرٹیفکیٹ نکالا گیا۔"

"اپائنمنٹ لیٹر۔"

"یہ لیں جناب۔" سب سے اوپر رکھا پلاسٹک میں موجود پیپر ریاض نے نکال کر آگے کر دیا۔

"کیریکٹر سرٹیفکیٹ۔۔۔؟"

پان کھاتے ہوئے بڑے سخت انداز میں گھورتے ہوئے پھر ایک اور پرچہ دیا گیا۔

"برتھ سرٹیفکیٹ۔۔۔؟"

ریاض نے چند لمحے تو بے چارگی سے کبھی اسے اور کبھی اپنے کاغذات کے پلندے کو دیکھا پھر ہاتھ کے اشارے سے باہر پان کی پیک تھوکنے کی اجازت مانگی تو کلرک کو غصہ آگیا۔

"گھر پر تھوک کر نہیں آسکتے تھے کیا؟ پتا بھی ہے کہ ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے پھر بھی۔۔۔" ریاض نالائق بچوں جیسا چہرہ لیے وہیں کھڑا رہا تو اسے مزید غصہ آگیا۔

"اب جاؤ بھی۔۔۔ کھڑے کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو میرا۔۔۔ اور ہاں جلدی آنا۔ باقی بھی لمبی قطار لگی ہوئی ہے۔"

ریاض اجازت ملنے پر خوشی خوشی باہر گیا اور عین اس جگہ جہاں موٹے موٹے لفظوں میں تحریر تھا کہ "یہاں پان تھوکنا منع ہے۔" اسی عبارت پر تھوک کر اسی طرح خوشی خوشی واپس بھی آگیا۔

"ہاں بھئی اب جلدی سے نکالو برتھ سرٹیفکیٹ۔"

"وہ۔ برتھ سرٹیفکیٹ تو نہیں ہے میرے پاس۔"

ریاض نے چہرے پر ایسی مسکینی طاری کی کہ کلرک خود سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

"تو اتنی دیر تک مجھے انتظار کیوں کروایا؟"

"سر باقی تو سارے کاغذات مکمل ہیں صرف یہ برتھ سرٹیفکیٹ ہی نہیں ہے۔"

"مگر برتھ سرٹیفکیٹ کے بغیر سارے کاغذات فالتو ہیں۔"

"فالتو ہیں؟"

"ہاں اور تو کیا۔ بھئی گورنمنٹ کو کیا پتا کہ تم پیدا ہوئے بھی ہو یا گھوسٹ ہو۔"

سارے کاغذات اس کی طرف اچھالتے ہوئے اس نے سر جھکا' باقی کا تمام عملہ اوور ٹائم ہونے کی وجہ سے بڑی خاموشی اور دلجمعی سے کام کر رہا تھا۔ ریاض نے ضمیر بھائی کو کھوجا لیکن وہ بھی شاید جا چکے تھے۔ سو سارے کاغذات سمیٹ کر جب وہ جانے لگا تو پیچھے سے آواز آئی۔

"برتھ سرٹیفکیٹ مل جائے تو میڈیکل سرٹیفکیٹ بھی لے آنا' تاکہ ہمیں پتا چلے کہ جتنا عرصہ تم نے نوکری کی ہے زندہ ہی تھے۔"

ریاض نے بغیر مڑے اس کلرک کی بات سنی اور آئندہ کبھی نہ آنے کا سوچ کر چل دیا کہ اتنے سارے کاغذات بنواتے بنواتے شاید اس کے اپنے ہی چل چلاؤ کا وقت آجائے۔

☼ ☼ ☼

گرمی کے باعث بار بار چہرہ صاف کرنے سے ابا کے پاس موجود ٹشو پیپر گیلا ہو گیا تھا۔ اور اسے خشک کرنے کے لیے ابھی انہوں نے صوفے پر پھیلایا ہی تھا کہ چھوٹی موٹی سی خالہ کو لاؤنج میں داخل ہوتے دیکھ کر باچھیں کھلنے لگیں۔

"اوئے کیا میں خاب تے نئیں ویکھ رہا ناں؟"

"جی نہیں خواب نہیں بلکہ حقیقی زندگی میں' میں آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔"

"او جی تے فیر کھڑی کیوں ہو' بیٹھو ناں ادھر۔۔۔" ابا نے خود اٹھ کر خالہ کے لیے جگہ خالی کی۔

"اتنی خاموشی' تنہائی اور میں اور آپ۔۔۔ کتنا اچھا لگ رہا ہے ناں؟" خالہ مسکرائیں۔ تو ان کی بات اور ادا سے ابا کا دل اور جذبات ڈانواں ڈول ہونے لگے۔

"کیا یہی ماحول مجھے شادی کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نہیں مل سکتا؟"

"آہو جی آہو کیوں نئیں۔۔۔ گھر وچ صرف میں تے آپ ہی ہوں گے ناں' ہور دوجا کوئی وی نئیں۔"

"اور چندا؟ وہ بھی تو یہیں رہے گی ناں اور اس کی موجودگی میں بھلا ہم دونوں کو ہر وقت ایسا ماحول کہاں ملے گا؟" خالہ کی بات نے ابا کو چونکایا۔

"تے اگر میں اس کو پنڈ چھوڑ آوں؟"

"یہ مسئلے کا حل تو نہیں ہے ناں' آپ ایسا کریں اس کی شادی کر دیں؟"

"شادی؟ کس دے نال؟"

"کسی کے بھی ساتھ کر دیں بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ علی کے ساتھ چندا کی شادی کرنے سے خرچے میں بھی کمی ہو گی اور جس دن میں اوپر کی منزل میں آوں گی وہ بیاہ کر نیچے والی منزل میں چلی جائے۔"

خالہ کی باتیں ابا کو اچھی لگ رہی تھیں۔ جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ خرچے میں کمی کی باتیں تھیں اور دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ سب باتیں خالہ' یعنی ان کی ہونے والی زوجہ محترمہ کے منہ سے نکل رہی تھی۔ سو حسب توقع انہوں نے آمین کہتے ہوئے سر جھکا لیا اور بولے۔

"او جی میں نے بس آپ کی خوشی چاہتا ہوں' مینوں کوئی اعتراض نہیں جے ابھی رشتہ لے آئیں تے میں ابھی ہاں کر دوں۔"

"اوہ گاڈ۔۔۔! آپ اتنے اچھے ہیں' میں سوچ بھی نہیں سکتی۔" خالہ بے حد خوش تھیں۔

"یعنی جے آپ سوچ وی نئیں سکدی تے کر کیا سکتی ہو؟" ابا کو حیرت ہوئی مگر خالہ نے کوئی توجہ نہ دیتے ہوئے فوراً" سے موبائل اٹھایا اور چینا کو رشتہ لے کر آنے کو کہہ دیا۔

☼ ☼ ☼

ریاض' ضمیر بھائی کی بتائی گئی نشانیوں پر عین اس وقت ان کے گھر پہنچا جب وہ سب خالہ کے ایمرجنسی پیغام پر اوپری پورشن میں چندا کا رشتہ مانگنے جا رہے تھے۔ ضمیر بھائی نے یوں اچانک انہیں دیکھا تو بے حد حیران ہوئے۔

"ارے آپ یہاں؟"

"جی ہاں وہ دراصل یہاں سے گزرا تو سوچا آپ سے بھی ملاقات ہوجائے' لیکن شاید آپ کہیں جارہے ہیں؟" ریاض نے ان سب کی تیاری بغور نوٹ کی۔

"جی بالکل آپ ٹھیک سمجھے ہیں چینا اپنے بھائی کا رشتہ لینے جارہی ہے۔" چینا کا جوش قابل دید تھا تو علی کی بے چینی بھی عروج پر تھی۔ چندا اور خالہ ویسے بھی اوپر والے پورشن میں موجود تھیں۔

"لیکن کون لوگ ہیں وہ' یہ جانتی ہیں آپ؟" ریاض نے ماحول پراسرار بنانے کی کوشش کی تو ضمیر نے مختصراً" ان کے بارے میں بتایا۔

"اگر آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟" ریاض کے یوں اجازت مانگنے پر چینا علی اور ضمیر بھائی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"لیکن رشتہ میرا لینے جارہے ہیں تو اس میں آپ کا کیا کام؟ اور پھر ہم انہیں اچھی طرح جانتے ہیں' زمین جائیداد ہے ان کی گاؤں کے چوہدری ہیں۔ اور ہماری تو خوش قسمتی ہے کہ ان کے ساتھ ایک نہیں بلکہ دو رشتے بننے والے ہیں۔" علی نے ابا کی تعریفوں کے پل باندھنا شروع کردیے تھے۔

"مجھے اعتراض نہیں' لیکن شک ضرور ہے کہ دال میں کچھ کالا ہے۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں کہ آیا میرا شک درست ہے کہ نہیں۔"

"ٹھیک ہے آپ بھی آجائیں۔" ضمیر بھائی نے چینا اور علی سے چھپ کر ریاض کو آنکھ ماری اور پھر چاروں سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

☼ ☼ ☼

چینا' ضمیر بھائی اور علی بیٹھے اور ابا اور خالہ کے سامنے اپنے آنے کا مقصد بیان کررہے تھے جب طے شدہ پروگرام کے مطابق ریاض داخل ہوا۔ اور ابا کی

طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

''اوجی' تسی ہو کون؟ تے گھر کیوں آئے ہو؟'' ابا حیران تھے۔

''پہچانا نہیں آپ نے؟ میں ریاض ہوں' منشی ریاض۔۔۔ آپ کی زمین جائیداد کا سابقہ نگہبان۔'' ریاض نے فخریہ انداز میں سب کو دیکھا۔

''اچھا اچھا' تے فیر؟''

''پھر یہ کہ آپ جس روپے پیسے اور جائیداد کو سنبھالے رہے اور ایک ایک پائی خرچ کرنے سے پہلے کروڑہا مرتبہ سوچتے رہے' اپنی اور اپنی بیٹی کی بنیادی ضروریات کا گلا گھونٹ کر کنجوسی کے تمام ریکارڈز قائم کرتے رہے' اب گورنمنٹ نے اعلان کیا ہے کہ کیونکہ یہ ساری زمین جائیداد اور روپیا پیسا آپ کے کام کا نہیں اس لیے بحق سرکار ضبط کرلیا جائے۔''

''کیا؟'' ضمیر بھائی کے علاوہ سب ہی حیرت سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

''او نئیں نئیں' یہ بات تے غلط ہے' اودراصل میں تے سارا روپیا پیسا' چندا دی شادی کے لیے جمع کررہا تھا' تے اب آج میں نے علی تے چندا کی شادی پکی کردی ہے۔''

''کیا آپ نے چینا کے بھائی کا رشتہ چندا کے لیے قبول کرلیا ہے؟'' چینا حیران تھی۔

''آہو کیوں نئیں' رشتہ وی قبول تے جائیداد میں سے چندا کا حصہ بھی میں اس کے نام کرتا ہوں' تاکہ علی تے چندا اپنی زندگی خوشی نال گزاریں۔ تے میں تے چندا دی ہونے والی ماں وی اکٹھے ہنی مون تے جاکر زندگی دا مزا لیں۔''

''لیکن مہنگائی کے اس دور میں میاں بیوی دونوں ہنی مون پر کیسے جاسکتے ہیں؟ آپ اکیلے ہی چلے جانا۔'' خالہ نے ابا ہی کے الفاظ یاد دلائے مگر اب جائیداد ضبطی کے خوف سے نہ وہ ماحول تھا اور نہ پہلے جیسے ابا۔ جب ہی خوشی کے مارے سرخ پڑتے ابا بولے۔

''اوچھڈو جی کدی ہنی مون وی ایک بندے کا ہوا ہے؟''

''بلکہ چینا کا تو خیال ہے کہ ہم تینوں کپل ایک ساتھ ہنی مون پر جائیں کیا خیال ہے؟''

''یاہو چینا۔!'' ضمیر بھائی نے جوش سے نعرہ لگایا۔

چندا اور علی یوں اچانک سارے معاملات طے ہوجانے پر خوشی سے پھولے نہیں سمارہے تھے چینا اور ضمیر بھائی کے قہقہوں کی آوازیں بھی اس وقت بلند ہوگئیں جب ابا اور خالہ نے باہم مشورے کے بعد ریاض کو کچھ پیسے دے کر خاطر تواضع کا سامان منگوایا۔

ابا کی طرف سے پیسے نکالے جانا جو آج سے پہلے ناممکنات میں سے تھا اب ریاض اور ضمیر بھائی کی بدولت ممکن ہوا تھا۔ سو ضمیر بھائی نے اپنی جیب سے کچھ ہرے نوٹ نکال کر ریاض کی مٹھی میں دبادیے۔

اور اب سب ہی بڑے دوستانہ انداز میں ہنسی مذاق کرتے ہوئے شادی کے لیے شاپنگ کی لسٹ بنانے لگے تھے۔ کل سے ڈھولک رکھا جانا تھا۔ گانے بانیوں مہندی اور پھر شادی' ان سب کی زندگی بدل گئی تھی۔ خوشیاں مکمل تیاری کے ساتھ ان دونوں پورشنز میں اتری تھیں اور اب ابا سمیت سب ہی ان خوشیوں کو امر کرلینے کے خواہش مند تھے۔

☼ ☼

WWW.PAKSOCIETY.COM
نزہت جبیں ضیا
ناولٹ
رفاقتوں کے گلاب
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

"شعبہ! میری بلولائننگ کی ٹائی کہاں ہے؟" خضر نے کمرے سے اتنی زور کی آواز لگائی کہ کچن میں فرائی پین میں انڈا ڈالتے ڈالتے پہلے شعبہ کمرے کی سمت بھاگی۔

"خضر آہستہ بولیں' پری جاگ جائے گی تو مجھے تنگ کرے گی۔ وہ رکھی تو ہے سامنے سائیڈ بورڈ پر..." شعبہ نے آہستگی سے کہتے ہوئے سائیڈ بورڈ پر رکھی ٹائی کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ ٹائی رکھنے کی جگہ ہے بے وقوف عورت۔" خضر نے خفت مٹانے کے لیے شعبہ پر ہی الزام رکھ دیا۔

"کیوں؟ کوئی خاص جگہ ہوتی ہے کیا ٹائی کے لیے؟ میں روزانہ ہی آپ کی چیزیں اسی طرح رکھتی ہوں۔" شعبہ نے بھی جواباً" تیزی دکھائی۔

"بس... بس صبح صبح دماغ خراب مت کرو' جلدی ناشتا بناؤ' پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ مجال ہے جو کوئی کام بھی ڈھنگ کا ہو' ہر صبح میرا چیخنا چلانا نظر آجاتا ہے تمہیں۔ اپنی حرکتیں نہیں۔" ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے وہ بڑبڑا رہا تھا۔

"آپ کو تو عادت ہو گئی ہے' خوامخواہ چلانے اور ہنگامہ کرنے کی۔" وہ بھی کہتی ہوئی واپس پلٹی۔

"افوہ!" انڈا تو فرائی پین میں پڑا جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ جلدی سے جلا ہوا انڈا نکال کر سائیڈ پر رکھا اور فرائی پین صاف کر کے نیا انڈا فرائی کیا۔

"ارے کوئی مجھ بوڑھی کو پوچھے گا کہ نہیں؟" ٹیبل پر خضر کا ناشتا لگایا تو اماں نے اس کو دیکھ کر قدرے اونچی آواز میں احتجاج کیا۔

"مما میرا لنچ باکس؟" حاشر نے دودھ کا گلاس خالی کر کے میز پر رکھتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھا۔

"جی... جی یہ لو۔" اس نے سینڈوچ لنچ باکس میں رکھ کر بند کرتے ہوئے اس کے سامنے رکھا۔

"اور پانی تو ٹھنڈا بھرا ہے نا بوتل میں۔"

"ہاں بیٹا" وہ بولی... خضر آکر ناشتا اسٹارٹ کر چکا تھا۔

"ارے بھئی مجھ بڑھیا کا بھی خیال کر لو۔" اس بار اماں کی آواز میں کرختگی تھی۔

"لائی اماں!" وہ دوبارہ کچن کی سمت دوڑی حاشر کی اسکول کی وین آچکی تھی۔ وہ بیگ لٹکا کر باہر کی طرف چلا گیا۔ اماں کے لیے پراٹھا بنایا' ساتھ رات کا سالن گرم کرنے مائیکرو ویو میں رکھا اور اماں کو ناشتا دے کر آئی کہ پری کے رونے کی آواز آگئی وہ جاگ گئی تھی۔ وہ کمرے کی سمت جانے لگی۔

"پہلے مجھے چائے دے دو۔ اندر گئیں تو دو گھنٹے لگا دو گی۔" خضر کی طنزیہ آواز پر' وہ کمرے میں جاتے جاتے رک گئی اور واپس کچن کی طرف چلی گئی۔ خضر کو چائے دے کر' پری کی نیپی چینج کر کے فیڈر بنا کر دی خضر آفس چلا گیا۔

"بہو بیگم! ہمارے یہاں ناشتے میں چائے بھی پی جاتی ہے۔ مناسب سمجھو تو ایک پیالی چائے بھی ہمارے منہ پر دے مارو۔"

"افوہ! اماں کو تو طنز کرنے کا بہانہ چاہیے۔" وہ ہاتھ دھو کر دوبارہ کچن میں چلی آئی۔ اماں کو چائے دے کر ان کی ناشتے کی ٹرے لا کر کچن میں رکھ دی۔ پھر خضر کا بچایا ہوا آدھا پراٹھا اور اماں کا بچایا ہوا سالن لے کر ایک کپ چائے لے کر خود بھی ناشتے کے لیے بیٹھ گئی۔ ناشتے کے بعد ڈھیروں کام اس کے منتظر تھے۔ دوپہر کے لیے سالن بنانے کے لیے فریج سے قیمہ نکال کر رکھا برتن دھو کر شیلف میں رکھے۔

"بچی رو رہی ہے' اس کا پیمپر چینج کرو۔" اماں نے اپنے کمرے سے آواز لگائی بجائے یہ کہ جا کے پری کو گود میں لے لیتیں۔ انہیں تو پیمپر سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ ان کے خیال میں یہ آج کل کی خواتین کی کام چوری میں مزید اضافہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ بقول ان کے پہلے زمانے میں تو ہم بالٹیاں بھر بھر کے بچوں کے کپڑے دھویا کرتے تھے اور موئے آج کل کے لوگ... ادھر ایک لگایا کہ دوسرا تیار' اصل میں پیسوں کا درد جو نہیں آج کل کی عورتوں کو وہ بڑبڑاتا اپنا فرض

اونین بجتی تھیں۔

افوہ کمرا بھی عجیب مچھلی بازار کا نقشہ پیش کر رہا تھا اس نے کمرے میں آکر' ٹھنڈی سانس لے کر' جا بجا بکھری ہوئی چیزوں کو دیکھا اور پھر پری کے کپڑے چینج کرانے لگی' پھر اٹھ کر کمرے کو سمیٹنا شروع کیا۔ جب تک وہ کمرا صاف کر کے باہر آئی اماں حسب معمول چادر اوڑھے باہر جانے کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ یہ روز کا معمول تھا کہ وہ ناشتے کے بعد ضرور محلے کے مختلف گھروں کے چکر لگاتی تھیں۔ حالانکہ پری کو سنبھالتے ہوئے شجیعہ کے لیے گھر کے کام کرنا بہت مشکل ہوتا' مگر اماں کے کہنے کے مطابق ان سے بچوں کو سنبھالا نہیں جاتا اور پھر شجیعہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ خوامخواہ اماں کو پری گھمائے۔

"میں نے سبزی لے کر رکھ دی ہے' مٹر ڈال دینا قیمے میں' ہاں ساتھ میں رائتہ بھی بنا لینا۔" آرڈر دے کر وہ باہر نکل گئیں' شجیعہ سرہلا کر رہ گئی۔

"اف اللہ! اگر اماں بیٹھے بیٹھے سبزی بنا دیں تو ان کا کیا جائے گا۔" مٹر چھیلتے چھیلتے وہ سوچ رہی تھی۔ ایسے کام تو عموماً گھر میں موجود ساسیں' اماں' ہی کرتی ہیں' مگر یہاں تو اماں سارا گھر' ساری ذمہ داریاں اسے سونپ کر بھی مطمئن نہ تھیں۔ صفائی کر کے' کھانا تیار کر کے ظہر کی نماز کے لیے وضو کر کے آئی' تب حاشر اور ساتھ اماں بھی آگئے۔ حاشر فریش ہو کر آیا' تب تک وہ نماز پڑھ کر کھانا لگا چکی تھی۔ اماں نے ایک طائرانہ نظر کھانے پر ڈالی۔ قیمہ مٹر' بگھارے چاول' رائتہ' اچار... مگر سلاد نہ تھی۔ "سلاد نہیں بنائی آج..." انہوں نے پلٹ کر شجیعہ کو دیکھ کر سوال کیا۔

"اماں... پری بہت تنگ کر رہی تھی۔" جلدی سے صفائی دی۔ "مگر... ابھی تو سو رہی ہے مزے سے..." وہ کہاں ماننے والی تھیں۔

"ابھی سوئی ہے' کچھ دیر پہلے... آپ بیٹھیں میں بنا لاتی ہوں۔" وہ واپس کچن کی طرف پلٹ گئی۔

"بس یہ ہی بات بری لگتی ہے تمہاری... پتا نہیں کب تم ہمارے اس گھر کے رسم و رواج سمجھو گی۔"

اماں عادتاً" بڑبڑاتی رہیں۔

"ہمارے گھر..." وہ سلاد بناتے بناتے ہمارے گھر... میں الجھ گئی... "مطلب یہ سب ان کے ہیں... میرا کچھ نہیں... گزشتہ چھ سالوں سے اماں نے آج تک طنز اور چوٹ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ ہر وقت چوٹ' ہر بات میں طنز' قدم قدم پر تذلیل..." سلاد بنا کر وہ ٹیبل پر رکھ آئی اور خود کمرے میں آگئی' کھانے کا دل نہیں کر رہا تھا۔ آنکھیں نم ہونے لگی تھیں۔ اماں اور حاشر کھانے لگے۔ اماں نے اسے بلانا بھی مناسب نہ سمجھا۔

کھانا کھا کر اماں اپنے کمرے میں سونے چلی گئیں۔ حاشر بھی سو گیا اور پری بھی... وہ اٹھی اور اپنے لیے پلیٹ میں تھوڑے سے چاول اور سالن ڈال کر کمرے میں ہی آگئی۔ عجیب و غریب حالات کا سامنا تھا اسے۔ پچھلے چھ سالوں سے مسلسل خود کو مٹاتی چلی آئی تھی۔ مگر... مگر... آج تک نہ تو اماں نے اور نہ ہی خضر نے دل سے اس کی گرہستی کا اعتراف کیا۔ کبھی تعریف کے دو بول' کبھی ستائش کا ایک لفظ بھی تو نہ ملا تھا بدلے میں... بلکہ ہر بار' ہر وقت اور ہر لمحے اسے یہ احساسات دلایا جاتا کہ وہ جو کچھ کرتی ہے یا کر رہی ہے' وہ اس کا فرض ہے۔ کوئی انہونی یا قابل ستائش بات نہیں' بلکہ یہ وہ سارے حقوق ہیں جو اسے ہر حال میں پورے کرنے ہیں۔ جو ہر عورت پورے کرتی ہے۔ وہ کوئی احسان نہیں ہے۔ بہ مشکل دو چار نوالے کھائے اور پلیٹ واپس کچن میں رکھ آئی۔ کل کے دھلے کپڑے تہ کرنے بیٹھ گئی' ٹھیک چار بجے اماں کو چائے دینا ہوتی تھی۔

☼ ☼ ☼

"ارے! طفیل احمد پاگل ہو گئے ہو کیا۔ جو ایسی ایری غیری ان دیکھی لڑکی کو بہو بنانے کے لیے کہہ رہے ہو۔ میں تو زیتون آپا کی رومیصہ کو اپنی بہو بناؤں گی۔" میاں کی بات پر قدسیہ بیگم خاصی سیخ پا ہوئی تھیں۔

"ارے نیک بخت! تم اسے دیکھ لو' وہ اچھی سمجھ دار اور پڑھی لکھی بچی ہے اور سبحان میرا بہت اچھا دوست ہے۔ اور۔۔۔"

"دیکھو طفیل احمد!" قدسیہ بیگم نے ان کی بات کاٹی' بہو گھر میں لانے کا فیصلہ خالص میرا ہوگا۔ مجھے مغز ماری کرنی ہوگی اس کے ساتھ' اس کے لیے رومیصہ سے بہتر کوئی نہیں ہے۔ کیسے خالہ' خالہ کرکے آگے پیچھے گھومتی ہے میرے۔" قدسیہ بیگم کا لہجہ دوٹوک تھا۔

"ارے بھئی میں کون سا زبردستی کررہا ہوں۔ ایک نظر جا کر اس کے گھر کا ماحول اور بچیوں کو دیکھ لو۔ آگے تمہاری مرضی' تمہارا فیصلہ' مگر بنا دیکھے یوں منع کردینا اچھی بات نہیں۔" طفیل احمد کا لہجہ مصالحت آمیز تھا۔

تب ہی خضر آگیا اور ماحول کی گرماگرمی محسوس کی۔

"السلام علیکم! اماں' ابا جی' کیا ہوا' خیریت۔۔۔" سلام کے ساتھ ہی اماں کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں بیٹا! سب خیریت ہے۔ بس تمہارے ابا نے تمہارے لیے لڑکی پسند کرلی ہے اور چاہتے ہیں کہ تمہاری شادی اسی لڑکی سے ہو۔"

"اماں! اگر ابا جی نے کہا ہے تو دیکھ لینے میں حرج نہیں ہے۔" خضر نے معاملے کی نزاکت دیکھتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بھی چاہتے ہو کہ میں باہر کی لڑکی دیکھوں۔" قدسیہ بیگم نے ترچھی نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھ کر ذو معنی بات کی۔

"جی اماں! کیونکہ رومیصہ بہت ماڈرن اور کھلے مزاج کی لڑکی ہے۔ وہ یہاں ایڈجسٹ نہیں ہوسکتی۔" خضر نے اٹھتے ہوئے گویا اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ گویا آگے بات کرنے کا کوئی چانس ہی نہیں تھا۔

قدسیہ بیگم نے حیران نظروں سے بیٹے کو پھر قہر آلود نظروں سے میاں کو دیکھا۔ طفیل احمد بھی چپکے سے کھسک لیے۔ قدسیہ بیگم نے پکا سوچ رکھا تھا کہ وہ لڑکی کو ریجیکٹ کردیں گی۔ یہ ہی سوچ کر وہ باول ناخواستہ دو دن بعد سبحان صاحب کے گھر پہنچ گئیں۔

سبحان صاحب گورنمنٹ سرونٹ تھے۔ گھر اچھی طرز کا بنا ہوا تھا۔ گھر سے' رکھ رکھاؤ اور خاطر مدارات سے اندازہ ہورہا تھا کہ سبحان صاحب صاحب حیثیت ہیں پھر۔۔۔ جب اماں کو پتا چلا کہ ان کا بڑا بیٹا امریکا میں سیٹل ہے تو اماں کی آنکھیں کھل گئیں۔ غرض یہ کہ قدسیہ بیگم کو یہ لوگ بہتر لگے' پھر شجیعہ بھی پیاری کم عمر اور سیدھی سادی لگی۔ قدسیہ بیگم شاطر اور جہاندیدہ تھیں اندازہ لگا لیا شجیعہ کی تربیت کس نہج پر ہوئی ہے۔

اپنی شاطر طبیعت کی وجہ سے سسرال میں بھی نہ رہ پائی تھیں۔ تب ہی بہت جلد ہی طفیل احمد کو لے کر الگ ہوگئی تھیں اور طفیل احمد کے ساتھ گھر اور گھریلو امور پر مکمل قابض تھیں۔ طفیل احمد شروع سے خاموش طبع' نرم خو اور حلیم مزاج تھے۔ اس لیے بیوی کی باتوں کا جواب دینا مناسب نہ سمجھتے تھے۔ ہر بات خاموشی سے مان لیتے' کیونکہ قدسیہ بیگم روز اول سے ہی "میں نہ مانوں" کے فارمولے پر عمل پیرا تھیں۔

وہاں بیٹھے بیٹھے قدسیہ بیگم کو اندازہ ہوگیا تھا کہ شجیعہ کو جہیز بھی ٹھیک ٹھاک ملے گا اور۔۔۔ پھر امریکا کا اٹریکشن بھی تو تھا۔ وہ جو ارادہ کرکے آئیں تھیں کہ رشتہ ناپسند کردیں گی۔ بیٹھے بیٹھے ارادہ بدل لیا اور انہوں نے شجیعہ کے لیے رضامندی دے دی۔ خضر اور شجیعہ نے بھی ایک دوسرے کو دیکھا۔ دیگر امور طے ہوئے اور رشتہ پکا کردیا گیا اور قدسیہ بیگم کے چکر پہ چکر لگنے شروع ہوگئے۔ وہ جب جاتیں شجیعہ انہیں کھانے پر روک لیتی۔ اس کے ہاتھ کے بنے کھانوں کا مزا اماں کے منہ کو لگ چکا تھا۔ اماں کے کپڑوں کی سلائی بھی' شجیعہ نے کرنی شروع کردی تھی۔ اماں خاصی مطمئن تھیں اور ان کو مطمئن دیکھ کر خضر اور طفیل احمد بھی مطمئن تھے۔

قدسیہ بیگم جب جاتیں کوئی نہ کوئی بات' باتوں باتوں میں ایسی کہہ دیتیں کہ ان کے جانے کا مقصد بھی پورا ہوجاتا' وہ کہتیں۔

"ہمارے یہاں لڑکے والے پہناؤنی کے جوڑے

دیتے ہیں بہت بھاری اور لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے کی اماں اور بہن کو سونے کے جھمکے' چین' لاکٹ' جیسے بھی یا جیسی بھی حیثیت ہو۔ ارے بھئی کہیں تو لوگ پورے پورے سیٹ بھی دیتے ہیں۔" وہ باتوں باتوں میں ہنستے ہوئے دل کی بات زبان پر لے آئیں۔ ان کی بات پر شجیہ کی والدہ چونک جاتیں اور ان کا مقصد سمجھ جاتیں۔

اگر آدھ تولہ کی جھمکیاں بھی بنواؤ تو کم از کم 30 ہزار سے 35 ہزار تک کا خرچا آجاتا' شادی کے ہی ہزاروں اخراجات تھے۔ زبیدہ بیگم سوچ میں پڑ گئیں۔ قدسیہ بیگم آہستہ آہستہ کھلتی جارہی تھیں۔

"اب بھلا بتاؤ پہلے ہی میں نے ان کے لیے پانچ ہزار کا سوٹ لیا ہے اور انہوں نے جھمکوں کی فرمائش کر ڈالی ایسے جیسے کوئی سو دو سو کی چیز مانگ رہی ہوں۔" رات کو میاں کے سامنے انہوں نے متفکر لہجے میں کہا۔

"ہاں! طفیل احمد تو بہت اچھے اوصاف کے مالک ہیں یہ بھابھی کی فطرت لگتی ہے لالچی۔۔۔ انہوں نے بھی پرسوچ لہجے میں کہا۔

"دیکھتی ہوں کل جاکے کوئی انگوٹھی یا جھمکیاں وغیرہ۔" زبیدہ بیگم نے کہا۔

"تم فکر مت کرو اللہ بہتر کرے گا۔" سبحان صاحب نے بیگم کو تسلی دی' لیکن حقیقتاً" وہ خود بھی پریشان تھے۔ شجیہ بھی کوفت کا شکار تھی۔

☆ ☆ ☆

بہرحال شادی کی تیاریاں خوب زور و شور سے ہو رہی تھیں' کیونکہ ڈیٹ فکس ہو چکی تھی اور ٹائم بھی کم تھا۔ قدسیہ بیگم کی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے' زبیدہ بیگم اور سبحان صاحب کی کوشش یہ تھی کہ شجیہ کو اچھی اور معیاری چیزیں جہیز میں دیں گو کہ اس کے لیے انہیں قرض دار بھی ہونا پڑا تھا۔

شادی کا انتظام بھی شہر کے اچھے ہال میں کیا گیا تھا اور جب شادی کی سلامی دینے کا وقت آیا اور جب سبحان صاحب نے شادی کی سلامی میں بائیک کی چابی پکڑائی تو قدسیہ بیگم کا منہ بن گیا۔

"ارے! موٹر سائیکل تو ویسے بھی تھی۔ اس کے پاس ہم تو سمجھ رہے تھے کہ چھوٹی موٹی گاڑی ملے گی اے بھیا! ہمارے سوچیں تو ویسے بھی ساری تل لینے گئیں۔"

خضر کے ہاتھ میں چابی تھماتے تھماتے سبحان صاحب نے چونک کر سمدھن کی طرف دیکھا' یہ کیسی چھوٹی اور توہین آمیز بات کہہ دی تھی انہوں نے! خضر نے مڑ کر اماں کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں ندامت تھی جبکہ طفیل احمد کا سر شرم سے جھک گیا تھا۔

"اماں۔۔۔" خضر نے اماں کو دیکھ کر ہلکے سے کہا۔

"چلو بھئی چپ ہو جاتے ہیں۔۔۔ یہ میاں تو ہو گئے لٹو ابھی سے۔۔۔" اماں کی سرگوشی اتنی بلند تھی کہ لال گٹھڑی بنی شجیہ کا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔

یہ بھلا کونسا وقت تھا ایسی باتوں کا۔۔۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اماں کس نیچر کی مالک ہیں۔ سبحان صاحب کے ساتھ ساتھ زبیدہ بیگم کا چہرہ بھی پھیکا پڑ گیا تھا اتنا سارا جہیز دیکھ کر بھی سمدھن قطعی مطمئن نہ تھیں۔ ابھی بھی خلش اور گلہ تھا ان کو' شجیہ کے دل میں عجیب سے خدشات جنم لینے لگے تھے۔ رخصتی کے وقت شجیہ کا دل بری طرح بھر آیا۔

☆ ☆ ☆

"ہم زندگی کے اتنے سال جس گھر میں گزارتے ہیں' جہاں اماں' ابا کی انگلی تھام کر ہم اپنا پہلا قدم اٹھاتے ہیں' جہاں ہم پہلا لفظ اپنے لبوں سے ادا کرتے ہیں' جہاں ممتا کے ہاتھوں پہلا لقمہ ہمارے حلق میں اترتا ہے' جہاں باپ کے کاندھے پر سوار ہو کر گھومتے ہیں' بھائیوں سے جھگڑے' چھیڑ چھاڑ اور پھر بھائی کے بازوؤں میں منہ چھپا کر ہم ان سے ڈھیروں فرمائشیں کرتے ہیں' لڑائیاں نوک جھوک بے ایمانیاں بہنوں سے اپنے مسائل شیئر کرتے ہیں' راتوں کو جاگ

جاگ کر باتیں کرتا' مل کر تفریح کرتا اس گھر کا چپہ چپہ ہمارا غمگسار ہوتا ہے' وہ تکیہ ہمارا رازدار ہوتا ہے' جس پر عمر کے کئی سال ہم سر رکھ کر اپنے دکھ سکھ سناتے سناتے سوجاتے ہیں اور..... اور.....

پھر یہ سب اچانک ہی ہمیں چھوڑ کر نئے گھر' نئے ماحول اور نئے لوگوں میں ایڈجسٹ ہونا ہوتا ہے' وہاں کے رسم و رواج' طور طریقے اور دوسروں کے مطابق زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ جہاں نہ راتیں ہم اپنی مرضی سے سوسکتے ہیں اور نہ دن میں میکے کی طرح دل چاہے تو کام کریں' دل چاہے تو نا کریں..... یہ نہیں کرسکتے' جہاں ہمیں ایک ایک لفظ سوچ سمجھ کر ادا کرنا پڑتا ہے' ایک ایک قدم پوچھ کر اٹھانا پڑتا ہے' دوسروں کے احکامات کے منتظر رہنا پڑتا ہے گویا کہ آج سے تمہاری زندگی پر دوسرے کا حق زیادہ ہے۔" شجیہ نے طویل سانس لے کر یہ سوچتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔

چھوٹا سا کمرا تھا جو اس کی جہیز کے بھاری سامان سے کافی اچھا لگ رہا تھا۔ ابا جی نے کتنے جتن کر کر کے یہ سامان اکٹھا کیا تھا' راتوں کو وہ اور اماں سوتے نہیں تھے اسے خیال آیا تو آنکھیں نم ہونے لگیں اسی لمحے کمرے میں خضر آگیا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں اور سنبھل کر بیٹھ گئی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔

"السلام علیکم! کیسے حال ہیں جی آپ کے.....؟" لہجہ خوشگوار تھا۔

"وعلیکم السلام۔" شجیہ نے دھیرے سے کہا۔ کچھ دیر بعد خضر گویا ہوا۔

"شجیہ تم ایک پڑھی لکھی اور سمجھ دار لڑکی ہو اس لیے میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا بس اتنا ہی کہوں گا کہ گھر بنانے اور بگاڑنے میں سب سے بڑا کردار گھر کی عورت کا ہوتا ہے اور مجھے امید ہے کہ تم گھر کو بنانے میں میرا بھرپور ساتھ دوگی اور اماں مزاجا" تھوڑی تیز ضرور ہیں' لیکن تمہاری محبت اور درگزری یقیناً" انہیں تمہارا گرویدہ بنادے گی۔" میری طرف سے ان شاء اللہ تمہیں کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی۔

"میں بھی آپ کی امیدوں پر ان شاء اللہ پورا اتروں گی اور آپ کو بھی میری طرف سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔" خضر کی بات ختم ہونے پر شجیہ نے بھی سر جھکا کر دھیرے سے کہا تو خضر نے آگے بڑھ کر اس کے نازک ہاتھ تھام لیے..... اور محبت پاش نگاہوں سے اسے دیکھا۔

شجیہ نے خضر کے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیا ایک اچھی زندگی کی ابتدا ہوچکی تھی۔ خضر کی طرف سے وہ کافی مطمئن ہوگئی تھی گو کہ اماں کا رویہ اس کے لیے تھوڑا پریشان کردینے والا تھا۔ مگر اسے بھروسہ تھا کہ وہ ضرور اماں کا دل جیت لے گی۔

دھڑ دھڑ دھڑ..... دروازہ بری طرح سے بجایا جارہا تھا شجیہ گڑبڑا کر اٹھ گئی آنکھیں جھپک کر آس پاس محسوس کرنے کی کوشش کی' پاس ہی بے خبر سوتے ہوئے خضر کو دیکھ کر دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی' دھڑ دھڑ دھڑ..... دروازہ پھر بجا..... خضر بھی اٹھ گیا جلدی سے اٹھ کر دروازہ کھولا اماں کھڑی تھیں..... سر پر دوپٹا اوڑھ کر وہ جلدی سے اٹھ گئی اور اماں کو جھک کر سلام کیا' خضر سلام کرکے باہر نکل گیا۔

"وعلیکم السلام.....!" اماں نے لٹھ مارنے والے انداز میں جواب دیا۔

"بی بی! صبح ہوگئی ہے ہمارے یہاں اتنی دیر تک نہیں سویا جاتا۔" لہجہ خاصا تلخ تھا' اتنی دیر.....؟" شجیہ نے گھڑی دیکھی صبح کے سات بج رہے تھے۔ "ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو وہ لوگ فریش ہوکر سوئے تھے۔

"جی اچھا!" سر جھکا کر آہستہ سے جواب دیا۔

"اور ہاں! ہمارے یہاں یہ کام مردوں کے نہیں ہوتے کہ اٹھ کر دروازے کھولیں اور عورتیں ٹھاٹ سے پلنگ پر بیٹھی رہیں کل سے خیال رکھنا..... ناشتا کرنے آجاؤ۔" جاتے جاتے کہہ گئیں۔

یہ تھی سسرال میں شجیہ کی پہلی صبح ویسے تو اماں سے کچھ اچھی امیدیں نہ تھیں مگر دوسرے ہی دن ان کا ایسا ری ایکشن.....؟" شجیہ بیگم تیار کرلو خود کو آنے والے حالات کے لیے" اماں کے جانے کے بعد اس

نے دل میں سوچا اور سر پر دوپٹا ٹھیک سے لیتے ہوئے باہر آ گئی۔ کچن کے پاس برآمدے میں بچھے تخت پر خضر بیٹھا تھا اور وہیں دسترخوان پر ناشتا بھی رکھا تھا مکھن، ڈبل روٹی انڈا اور تھرموس میں چائے۔

"آجاؤ..." خضر نے اس کے لیے جگہ بنائی... وہ چپ چاپ آکر بیٹھ گئی۔

"سنو! تمہارے یہاں سے ناشتا نہیں آئے گا کیا؟" اماں نے پوچھا۔

"جی آئے گا۔" وہ بولی۔

"ابھی سات بجے ہیں ناں!"

"ہاں تو ناشتا صبح ہی کیا جاتا ہے اب دن کے بارہ بجے تو ناشتا نہیں ہوتا ناں...؟" مگر آج کل کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے یہاں تو گیارہ بجے سے پہلے لوگوں کی صبح نہیں ہوتی یہ سارے چکر ان شیطانی ایجادات کے ہیں موئے کیبل، ٹی وی اور یہ موبائل..." اماں نے شجیعہ کو موبائل پر میسج پڑھتے دیکھ کر چوٹ کی۔

"چلو بھئی ہم تو کر رہے ہیں ناشتا تمہاری مرضی کرو یا انتظار کرو۔" اماں نے کپ میں چائے نکالتے ہوئے کہا۔

خضر اماں کی باتوں پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا ابا جی بھی آ گئے تھے وہ مسجد سے تھوڑی دیر بعد واپس آتے تھے۔ شجیعہ نے انہیں بھی جھک کر سلام کیا ڈھیروں دعائیں دیتے ہوئے وہ بیٹھے...

"ارے..." ناشتا دیکھ کر شاید انہیں بھی اچھا نہیں لگا تھا بیٹے کی شادی کا دوسرا دن تھا اور یہ ناشتا! قبل اس کے کہ وہ کچھ اور کہتے شجیعہ کے گھر سے ناشتا آ گیا... بوائل انڈے، فرائی انڈے، گاجر کا حلوہ، پراٹھے، حلوہ پوری، کچوریاں، سموسے، مکھن، جیم، بریڈ...

"افوہ! اتنا سب کچھ لانے کی کیا ضرورت تھی یار!" طفیل احمد نے سبحان صاحب کے گلے لگ کر کہا۔" ابا کو دیکھ کر شجیعہ کی آنکھیں نم ہونے لگیں۔

دوسرے دن ولیمہ تھا۔ خیر سے ولیمے کی تقریب بھی ہو گئی۔ شادی کی تقاریب، مسلسل بیٹھنا، مووی کی روشنی اور پھر ذہنی ٹینشن بھی تھی اماں کی طرف سے

ان سب باتوں نے شجیعہ کو تھکا دیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ فجر کی اذان کی آواز کے ساتھ ہی اٹھ بیٹھی کیونکہ اماں کی تنبیہہ اسے یاد تھی۔ دروازہ کھول کر پردہ برابر کر کے وضو کیا اور نماز ادا کی۔ ابا جی کا تو ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا بس اماں اور اماں ہی تھیں۔ اماں بھی یقیناً" جاگ چکی تھیں خضر گہری نیند میں تھا۔ شجیعہ کو عجیب سا لگ رہا تھا لیٹنا بھی مناسب نہیں تھا کیوں کہ دروازہ کھلا تھا اور بیٹھ کر کیا کرتی وہ... وہ کرسی پر بیٹھ کر تسبیح پڑھنے لگی ٹیک لگایا تو ہلکی سی نیند کی جھپکی آ گئی... کہ اماں کی آواز پر گھبرا کر اٹھی...

"اے ہے کمبخت، جانے کہاں سے آ گئی منحوس ماری۔" وہ دوڑ کر باہر آئی تو اماں پیر پکڑے فرش پر بیٹھی تھیں اور چلا رہی تھیں۔ "کیا ہو گیا اماں...؟" اس نے انہیں تھام کر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ منحوس بلی روزانہ پتا نہیں کہاں سے آجاتی ہے اسے مارنے کو دوڑی تھی کہ پھسل پڑی۔" اٹھتے ہوئے بدستور جھنجلا رہی تھیں... شجیعہ کو ہنسی آ گئی... بھلا یہ عمر تھی دوڑیں لگانے کی۔

"زیادہ تو نہیں لگی۔" تخت پر بٹھاتے ہوئے شجیعہ نے ان کے پیر کو دیکھتے ہوئے پریشان لہجے میں کہا۔

"فجر میں ویسے ہی میری آنکھیں نہیں کھلتیں جب تک دو بوند چائے کے حلق میں نہ انڈیل لوں۔" انہوں نے شجیعہ کی بات نظرانداز کرتے ہوئے دل کی بات کہہ دی۔

"آپ بیٹھیں میں بنا دیتی ہوں۔" شجیعہ نے فوراً" ہی خدمات پیش کر دیں۔

شادی کا تیسرا دن تھا اور وہ صبح صبح کچن میں آ گئی تھی کیوں کہ اسے خود بھی اچھا نہیں لگتا تھا کہ وہ بیٹھی رہے اور اماں کام کریں۔ کچن خاصا گندہ اور بکھرا ہوا تھا، سلیب پر جا بجا چائے اور مختلف قسم کے دھبے پڑے تھے، روٹی بیلنے کی جگہ پر آٹا چپکا ہوا تھا، چولہے خاصے گندے تھے، برتن الٹی سیدھی اور بے ترتیب پڑی تھیں، سنک انتہائی گندہ تھا۔ اماں کام والی رکھنے کے حق میں نہیں تھیں تب ہی گھر ان کی بے ڈھنگی

طبیعت کا نمونہ پیش کر رہا تھا۔ چائے بنا کر اماں کو تھمائی اور خود بھی ناشتے کی تیاری میں لگ گئی۔ فریج خستہ حالت میں تھا۔ اس نے سوچا آج ہی خضر سے کہہ کر اپنا جہیز کا فریج کھلوا کر اسٹارٹ کروالے گی' چولہوں کی جگہ کوکنگ رینج لگوالے گی۔

ناشتے کے لیے اس نے پراٹھے' انڈے فرائی' سوجی کا حلوہ بنالیا۔ اماں نے کوئی مداخلت نہ کی ابا آگئے اور خضر بھی اٹھ گیا تو سب نے مل کر ناشتا کیا۔

"حلوہ تو اچھا بنا ہے یار۔" خضر نے حلوہ کھایا تو بے ساختہ تعریف کرڈالی..... وہ مسکرادی..... اماں نے خضر کو گھور کر دیکھا تو خضر سر جھکا کر جلدی جلدی حلوہ کھانے لگا۔

"تم لنچ مت بنانا میں باہر سے لے آؤں گا۔" ناشتا کرکے وہ کمرے میں آئی تو خضر نے اس سے کہا۔

"دو دن تو ہوئے ہیں شادی کو مجھے اچھا نہیں لگا مگر کیا کریں مجبوری بھی ہے۔" خضر نے اس کے حنائی ہاتھ تھام کر محبت سے کہا۔

"ارے نہیں خضر یہ گھر میرا ہے۔ پلیز' آپ ایسا مت سوچیں مجھے بھی سنبھالنا ہے ناں یہ سب کچھ میں بنالوں گی بس آپ مجھے سودا لا کردے دیں۔" شجیہ نے ملائمت سے کہا۔

"سو سوئیٹ جاناں!" خضر نے نثار ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا تو وہ شرماگئی۔

"اگر بیوی سے فرصت مل جائے تو بوڑھوں کا حال بھی پوچھ لینا۔" اماں کی آواز پر خضر چونکا اور باہر کی جانب چل دیا۔

"جی اماں!" دوسرے لمحے وہ اماں کے سامنے بیٹھا تھا۔

"ایک بات کان کھول کر سن لو لڑکے۔" اماں نے اسے دیکھ کر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"وہ تمہاری بیوی ہے اس کی حیثیت اپنی جگہ' لیکن میرے سامنے اس کی کوئی وقعت نہیں ہے اور بیویوں کو ہمیشہ بیوی سمجھ کر پیش آنا چاہیے۔ اگر بیویوں کو سر پر چڑھایا جائے تو وہ سر پر چڑھ کر چکی پیسنے لگتی ہیں۔ اس لیے غیر ضروری تعریفوں کے پل باندھنا' آگے پیچھے پھرنا اور بے وجہ ناز نخرے اٹھانا خاندانی مردوں کو زیب نہیں دیتا' مرد کو اپنا رعب' دبدبہ اور مقام بنا کر رکھنا پڑتا ہے۔ یوں بیویوں کے پیچھے دم ہلاتے پھرنا بہت معیوب ہے۔ ابھی سے قابو میں رکھو گے تو آگے چل کر پریشانی نہ ہوگی۔

بہتر یہ ہے کہ میری بات کو پہلی بار میں سمجھ لو اور عمل بھی کرو اور ویسے بھی سچ پوچھو تو میرا دل بہت برا ہو چکا ہے تمہارے سسرال والوں کی طرف سے..... کیسے منہ کھول کر بولا تھا کہ بیٹا امریکہ میں ہے..... اور دیا کیا؟ ٹھینگا..... ایک گاڑی تک تو دے نہ سکے ایک بیٹی تھی چاہتے تو کیا کچھ نہیں دے سکتے تھے' مگر چار ہلکے جوڑے' ہوا جیسے سونے کے سیٹ' اور بس دنیا دکھاوے کی چار چیزیں۔ دکھائے سبز باغ' کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا کے مصداق..... یہ تو چھوٹے چھوٹے گھروں کی عام لڑکیاں بھی لے جاتی ہیں جہیز کے نام پر..... یہ تو مقصود کی بہو بھی لائی ہے فریج' ٹی وی' چولہے اور پتا نہیں کیا کیا..... فیروزہ کی بھاوج یتیم لڑکی تھی وہ بھی یہ سب لائی' شگفتہ اور سکینہ نے بھی اپنی اپنی بیٹیوں کو یہ سب کچھ دیا ہے۔" انہوں نے اپنے خاندان کی کئی مثالیں ثبوت کے طور پر پیش کردیں۔

"اماں.....! کیا ہوگیا ہے آپ کو.....؟ یہ کیسی باتیں کررہی ہیں؟" خضر نے تھوڑے سے تیز لہجے میں کہا اسے ماں کی بات بہت ناگوار گزری تھی۔

"کیوں.....؟ کیا غلط کہہ دیا میں نے ہر ماں باپ یہی کرتے ہیں قرضہ لیتے ہیں' کمیٹیاں بھرتے ہیں اور اپنی بیٹیوں کو لاکھوں کا جہیز دے کر رخصت کرتے ہیں اور پھر ہم نے کون سی فرمائشوں کی لسٹیں تھمائی تھیں ان کو.....؟ کون سا کوئی شرط رکھی تھی ان کے سامنے اب سارے رشتہ دار تھو تھو کررہے ہیں ہم پر کہ لڑکی کا بھائی امریکا میں ہے اور سلامی میں گاڑی تک نہ دے سکے کیسے بھوکے ننگے لوگوں میں رشتہ کرلیا ہے۔"

"اماں! خدا کے لیے چپ ہوجائیں ایسی چھوٹی باتیں تو نہ کریں اگر شجیہ نے سن لیا تو کیا سوچے گی

وہ۔" خضر کا لہجہ خاصا بگڑا ہوا تھا۔ خضر کی بات پر تو اماں کو مزید پتنگے لگ گئے۔

"کیا سوچے گی....؟ جو سوچے! سوچے، مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔" اماں کی آواز مزید تیز ہو گئی۔ "اور میں ہرگز یہ برداشت نہیں کروں گی کہ تم زن مرید بن کر رہو۔" اماں کی آواز شجیہ تک باآسانی پہنچ رہی تھی۔ شجیہ کا دل بجھ گیا۔

اماں کتنی چھوٹی اور فضول باتیں کر رہی تھیں، احساس تو شجیہ کو پہلے سے تھا۔ مگر وہ تو باقاعدہ خضر کے کان بھر رہی تھیں، کتنی منفی سوچ تھی ان کی.... اب جو ہے جیسا ہے گزارا تو کرنا ہے۔ اس نے دل میں سوچا .... یہ بھی تو ایک امتحان ہوتا ہے ہر عورت کی زندگی میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ایسا مقام بھی آتا ہے جہاں اسے سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے اس کی اماں بتاتی تھیں کہ اس کی دادی بھی بہت سخت قسم کی خاتون تھیں، وہ تو ابا کو اماں کے پاس بیٹھنے تک نہیں دیتی تھیں۔ کھانے پینے پر بھی پابندی تھی۔

"اب جو میرا نصیب اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ پر یہ آزمائشیں ڈالی ہیں تو وہ حوصلہ بھی دے گا بس اللہ پاک خضر کو انصاف پسند رکھنا میں نہیں چاہتی کہ وہ اپنی اماں کے خلاف جائیں بس میرے ساتھ بھی ان کا رویہ مناسب ہو وہ میرے حقوق بھی ادا کرتے رہیں، ان کی سوچیں میرے لیے مثبت رکھنا میرے اللہ۔" وہ دل سے دعا کرنے لگی اور کچن کی طرف چلی گئی تاکہ کچن کی صفائی کرے پھر کھانا بھی بنانا تھا۔

"چل بھئی شجیہ! تیری زندگی کی ابتدا ہو چکی ہے، کٹھن، مشکل اور مصروف زندگی۔" اماں ناشتا کر کے محلے میں نکل گئیں۔ خضر سودا لے کر آیا اور پھر کسی کام سے باہر چلا گیا۔ ابا جی بھی گھر پر نہیں تھے۔ شجیہ نے دو گھنٹے کی انتھک محنت کے بعد کچن کو چمکا دیا تھا۔ شیلف سے لے کر چولھے، برتن، الماریاں، سلیب ہر چیز چھماچھم چمکنے لگی تھی۔ کچن سے فارغ ہو کر اس نے کچھ بنانا اسٹارٹ کیا جب اماں واپس آئیں تو چمکتے کچن کو دیکھ کر کچھ خاص ری ایکشن نہ دکھایا۔ ظہر کی نماز کے بعد جب اس نے دسترخوان لگایا تو دسترخوان پر چکن کڑاہی، ماش کی دال، بگھارے چاول، روٹی، سلاد اور رائتہ دیکھ کر ابا جی اور خضر حیرت زدہ رہ گئے۔

"اتنی جلدی اتنا عمدہ کھانا واہ جی مزا آگیا!" ابا جی نے کھانا کھا کر کھل کر تعریف کر ڈالی۔ اماں منہ بنا کر کھاتی رہیں منہ سے کچھ نہ بولا اور خضر بس نظروں نظروں میں شجیہ سے تعریف کا اظہار کرتا رہا شجیہ مسکراتی رہی۔ کھانے کے بعد اماں اور ابا جی کمرے میں چلے گئے تو وہ دونوں بھی کمرے میں آگئے، خضر لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔ شجیہ کے دماغ میں اماں کی بات گونج رہی تھیں۔

"بھائی امریکہ میں ہے۔" ہونہہ! بھائی وہ زیرلب بڑبڑائی وہ بھائی جس کو نہ ماں باپ کا خیال تھا نہ بہن کا اور نہ ہی گھر کی ذمہ داریوں کا، وہ تو بیوی کو پیارا ہو چکا تھا۔ اس نے شادی پر کچھ سمجھنا تو درکنار، ایک کال کر کے بہن سے بات تک نہ کی، رخصتی کے وقت محبت کے دو بول نہ بول سکا، باپ سے یہ پوچھنے کی زحمت بھی نہ کی کہ ابا جی شادی کے انتظامات کیسے ہو رہے ہیں.... کسی جہیز کی ضرورت تو نہیں....؟ لڑکا کیسا ہے؟ کیا کرتا ہے؟ شکیب کا خیال آیا تو اس کی آنکھیں بھیگنے لگیں اور گزرا ہوا وقت اس کی نظروں کے سامنے آگیا۔

☼ ☼ ☼

"اماں! میں امریکا جا رہا ہوں آفاق بھائی بلوا رہے ہیں مجھے۔" اس روز آفس سے آکر اچانک شکیب نے کہا تو اماں چونک گئیں۔

"ہائیں! یوں اچانک سے؟" اماں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"اچانک کہاں....؟" کافی دنوں سے کوشش کر رہا تھا میں۔" شکیب نے نہایت اطمینان سے اماں کو مزید حیران کر دیا۔ "مطلب سارے انتظامات، سارے مراحل اندر اندر طے ہوتے رہے اور اماں، ابا اور بہنوں کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔"

ویسے تو شکیب شادی کے بعد سے ہی بدل چکا تھا

اس کی لو میرج تھی۔ اماں ابا اور وہ کوئی بھی ضوباریہ کے لیے راضی نہ تھے۔ وہ پیسے والی فیملی کی امیر اور بگڑی ہوئی لڑکی تھی نہایت ماڈرن اور آزاد خیال ضوباریہ اور شکیب نے ساتھ ہی ایم بی اے کیا تھا۔ شکیب نے صاف لفظوں میں اپنا فیصلہ سنا دیا تھا کہ "ضوباریہ کے گھر جا کر میرا رشتہ طے کر دیں۔ مجھے وہیں شادی کرنی ہے۔" اماں منہ تکتی رہ گئیں مگر فیصلہ تو وہ کر چکا تھا اور اماں ابا صلح جو اور نرم مزاج تھے اپنا فیصلہ یا زبردستی چلانے کے حق میں نہیں تھے یوں نہ چاہتے ہوئے بھی ضوباریہ کو بیاہ کر لے آئے۔

ضوباریہ کے تو طور طریقے نرالے تھے نہ ساس کو خاطر میں لاتی نا سسر کو اور نہ ہی شجیہ سے سیدھے منہ بات کرتی۔ ہر وقت اپنی امارت کے نشے میں ہی رہتی۔ کھانا پینا اٹھنا بیٹھنا اور طرز زندگی کچھ بھی اس کی سوچ کے مطابق نہ لگتا تھا۔ بیک ورڈ لوگ دقیانوسی ماحول اور گھٹا ہوا پنجرے نما گھر اسے قطعی ناپسند تھا۔ بہ مشکل کچھ عرصہ ان کی ساتھ رہی اور آج شکیب نے امریکا جانے کا بھی سنا دیا تھا۔

اماں بے چاری منہ کھولے بیٹھی رہ گئیں۔ ابا بے چارے گھر کا بوجھ ڈھونے اکیلے رہ گئے اور شکیب اپنی زندگی کو مزید بہتر بنانے کے لیے امریکا چلا گیا اس روز اماں بہت روئی تھیں انہیں "یقین" تھا کہ بیٹا مکمل طور پر ہاتھ سے نکل گیا ہے یہاں تھا تو کم از کم نظروں کے سامنے تو تھا۔ ابا کی کمر مزید جھک گئی تھی مگر انہوں نے اماں کی ہمت بندھائی۔

"بیگم یہ سب کچھ تو ہوتا ہے زمانہ اسی کا نام ہے اور ہم بھی اسی زمانے کا حصہ ہیں۔ یہ کوئی اچنبھا یا نئی بات نہیں بس دعا کرو ہمارے بچے شاد آباد رہیں۔" یہ کہتے ہوئے ابا کی آواز بھی رندھ گئی تھی اور اٹھ کر باہر کی طرف چل دیئے ان کی کمر اور چال میں لڑکھڑاہٹ تھی شجیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

پھر آگے کے دن گزرے گھر چلاتا اور اس کے ساتھ ساتھ کچھ دن بعد شجیہ کے لیے خضر کا رشتہ بھی آ گیا تھا۔ ابا نے کتنی مشکلوں سے اس کے لیے جہیز کا انتظام کیا تھا۔ اپنی حیثیت سے زیادہ ہر چیز کی تھی کہ کہیں کوئی کمی نہ رہ جائے کوئی بات کوئی گلہ نہ ہو مگر .... مگر.... یہاں آ کر اماں کی دل چیرنے والی باتیں سن کر اس کو دلی صدمہ ہوا تھا کہ وہ جہیز سے قطعی غیر مطمئن تھیں۔ پچھلے تین دنوں میں وہ امریکا بھائی اور جہیز کے نام پر کئی بار طعنے دے چکی تھیں۔ وہ کیا بتاتی کہ کیسا بھائی ہے۔

☼ ☼ ☼

کچھ دن گزرے خضر کا رویہ اچھا تھا اور اکثر اماں کے رویے کی معافی بھی مانگ لیتا۔ شرمندہ ہو جاتا تو شجیہ اسے ٹوک دیتی۔

"آپ غلطی مت ہوا کریں مجھے عادت ہو گئی ہے۔" شجیہ نے مکمل طور پر گھریلو امور سنبھال لیے تھے اور خوش اسلوبی سے سارے کام کرتے بنا کچھ کہے بنا جھنجلائے۔

ابا جی وقتاً "فوقتاً" اس کے حق میں ایک آدھ بات کر لیتے اور پھر اماں کی غضبناک نگاہوں کا نشانہ بنے رہتے۔ اس روز فجر میں ابا جی نہیں جاگے اماں نے آواز دی تو کوئی جواب نہیں آیا۔ وہ چیخیں شجیہ اور خضر بھاگ کر گئے تو دیکھا کہ ابا جی تو ختم ہو چکے تھے نہ جانے رات کے کس پہر وہ سوتے سوتے ہی خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔ اماں کی چیخیں دل ہلانے لگی تھیں خضر تڑپ رہے تھے اور شجیہ کبھی اماں کو تو کبھی خضر کو سنبھالتی .... یہ اچانک سے سب کچھ ہو گیا تھا۔ اماں ذرا ہوش میں آئیں تدفین ہو گئی۔ اب تو اماں کو سنبھالنا اور مشکل ہو گیا تھا۔ ساری زندگی ابا جی سے سیدھے منہ بات نہ کرنے والی اماں کو ان کی کمی کا شدت سے احساس ہوتا۔ الٹی سیدھی اور بے تکی باتوں میں شجیہ کو ہی گھسیٹ لیتیں کہ جیسے یہ بھی شجیہ کی وجہ سے ہوا ہے۔

شجیہ سر جھکائے کسی روبوٹ کی طرح مصروف رہتی ہر کام وقت پر ہر چیز جگہ پر صاف ستھرے کپڑے الماریوں میں سجے ہوتے چم چماتے برتن

کچن میں جگمگاتے رہتے اس نے اپنے جہیز کی اکثر چیزیں نکال کر استعمال میں لے لی تھیں۔ جو دیکھتا تھا شجیہ کی تعریف کرتا' اماں کے انتخاب کی داد دیتا ایک بس اماں تھیں جو مہینے گزر جانے کے بعد بھی اس سے مطمئن نہ تھیں وہ تنک کر کہتیں۔

"اے بھلا! یہ بھی کوئی کام ہیں کرنے کے' ارے کام تو ہم نے کیے ہیں۔۔۔ عورتیں تو وہ بھی تھیں جو چکیاں پیستیں تھیں' بالٹیوں سے بھر بھر کر پانی لاتی تھیں۔ مسالے' مرچیں' ہلدی دھنیہ یہ سب گھر میں سل پر پیسا جاتا اوپر سے میاں کی گالیاں' تھو تھپڑ اور مار کٹائی بھی برداشت کرتی تھیں۔۔۔ آج کل کی لڑکیوں کی طرح ناز نخروں والی نہ تھیں وہ بھی تو عورتیں تھیں ناں۔۔۔ آج کل تو' توبہ توبہ چار کام کیے کہ میاں پیچھے پیچھے دم ہلاتے پھرنے لگیں۔ ناز نخرے اٹھانے لگیں مانو کہ پہاڑ ہی کھود ڈالے ہوں جیسے۔۔۔ ہائے اللہ آج کل کے لڑکوں کو شرم ہے' نہ لڑکیوں کو حیا ہے کہ ذرا سا لحاظ ہی کر ڈالیں بڑوں کا' سب کے سامنے ہی واری نیاری ہوئے جاتے ہیں اپنی اپنی بیویوں پر۔ توبہ ہے بھئی! لگتا ہے کہ جیسے بس یہ ملی کہ اس کے بعد تو جیسے دوسری مل ہی نہیں سکتی۔" وہ جان بوجھ کر اتنی زور سے کہتیں کہ کبھی کچن میں تو کبھی کمرے میں شجیہ تک ان کی آواز باآسانی پہنچ جاتی۔ ساتھ ہی اماں کے دل میں پوتا کھلانے کی حسرت بھی شدتوں سے جاگ پڑی تھی۔ ابھی پانچ ماہ ہوئے تھے ان کی شادی کو۔

شام کو خضر آفس سے لوٹا تو اماں برآمدے میں بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔

"السلام علیکم اماں۔" اس نے سلام کیا۔

"کبھی دو گھڑی اماں کے پاس بھی بیٹھ جایا کرو۔" سلام کا جواب دینے کی بجائے طنزاً" کہا۔

"جی جی اماں بیٹھ رہا ہوں۔" حالانکہ وہ روزانہ پہلے اماں سے ملتا پھر آگے بڑھتا تھا اماں کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے وہ سعادت مندی سے ان کے پاس بیٹھ گیا شجیہ بھی چائے لانے کی غرض سے باہر آگئی۔ خضر وہیں بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی محلے کا کوئی بچہ آیا تھا اس کے گھر اس کا چھوٹا بھائی آیا تھا وہ خوشی خوشی مٹھائی لے کر آیا تھا۔

"اپنی دادی کو میرا سلام کہنا اور مبارک باد بھی دینا۔" اماں وہیں سے بیٹھے بیٹھے قدرے اونچی آواز میں بولیں۔

"اچھا دادو۔" بچہ کہہ کر چلا گیا۔

"لو بھئی اکبر میاں کے ہاں بھی ماشاءاللہ چار بچے ہو گئے ہیں تین بیٹے اور ایک بیٹی۔۔۔ ہمارے ہاں بھی اب تو امید بندھ جانی چاہیے۔" اماں نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

"ان شاءاللہ اماں ہو جائے گا ابھی کتنا ٹائم ہوا ہے۔" خضر نے جلدی سے کہا۔

"ارے واہ جی! چھ ماہ ہونے کو آئے ہیں' تمہیں کیا پتا کتنی اکیلی محسوس کرتی ہوں خود کو میں تمہارے ابا کے گزر جانے کے بعد بس میرا دل کرتا ہے میرے گھر میں ڈھیر سارے بچے ہوں' میرے پوتے پوتیاں جن سے میرا گھر بھر جائے مگر آج کل کی عورتیں! اف توبہ ان کی نزاکتیں بھی ختم نہیں ہوتی ہیں ایک' دو پیدا کر لیے کہ سمجھو روم و شام فتح کر ڈالا۔ بس ہمتیں جواب دے جاتی ہیں۔"

"نہ اماں جی فکر مت کریں آپ کے ڈھیر سارے پوتے پوتیاں ہوں گے۔" شجیہ کو چائے لاتا دیکھ کر خضر نے شرارتاً" کہا تو شجیہ بھی زیر لب مسکرا دی۔

کچھ دن گزرے کہ شجیہ کی طبیعت خراب رہنے لگی اور لیڈی ڈاکٹر نے ماں بننے کی نوید سنائی۔ اماں کافی خوش ہوئیں' ڈھیر ساری ہدایات دیں مگر ان میں یہ نہیں تھا کہ تم کام کم کیا کرو۔ خضر اور شجیہ بھی بہت خوش تھے' نیا تجربہ اور انوکھا احساس شجیہ کے لیے بہت دلنشین تھا۔

گو کہ اس کا ہر وقت جی متلاتا رہتا' کچھ کھانے کے تصور سے بھی ابکائیاں اسٹارٹ ہو جاتیں' طبیعت بہت نڈھال اور سست رہتی' مگر وہ بڑی ہمت کے ساتھ خود کو کسی نہ کسی طرح مختلف کاموں میں مصروف رکھتی۔ ڈاکٹر نے اسے خاص طور پر کھانے پینے کی ہدایات دی

تھیں۔ اس روز خضر آفس سے آتے آتے اس کے لیے انار لے آیا اور سیدھا کمرے میں لے گیا۔ اماں کی عقابی نظریں شاپر پر جا ٹکی تھیں۔ اس وقت تو خاموش رہیں دوسرے دن صبح ناشتے کے بعد شجیہ نے ایک پلیٹ میں انار کے دانے رکھ کر اماں کے سامنے رکھے۔

"اے بی بی! رہنے دو مجھے عادت نہیں ہے جھوٹا موٹا کھانے کی، خود کھاؤ اور اپنے شوہر کو کھلاؤ جو اماں سے چھپا چھپا کر تمہیں عیش کروا رہا ہے۔"

"ارے اماں! جھوٹا کہاں ہے، میں نے ابھی چکھا بھی نہیں ہے۔" شجیہ اچانک ہونے والے حملے سے گھبرا کر جلدی سے صفائی دینے لگی۔

"اگر اماں کا اتنا ہی خیال ہوتا تو کل رات کو بھی لا کر اماں کو دے سکتی تھیں ناں، لیکن اس وقت کسی کو خیال نہ آیا اب مجھے ضرورت نہیں ہے میں کوئی گری پڑی یا بھکارن نہیں ہوں۔" اماں کی شدت پسندی عروج پر تھی شجیہ کی آنکھیں بھر آئیں۔

"اماں ڈاکٹر نے کہا تھا اس لیے....!" وہ منمنائی.... مگر اماں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی.....

"ارے تو لے جاؤ ناں پھر، تمہیں ضرورت ہے کیوں کہ تم انوکھا پیدا کرنے جا رہی ہو ناں ہم نے تو بھاڑ جھونکا.... جیسے مریض ویسے ہی ڈاکٹر، ادھر شادی ہوئی ادھر کمزوریاں شروع ہو گئیں۔ توبہ ہے بھئی توبہ! پہلے تو بارہ، بارہ بچے پیدا ہو جاتے مجال ہے کہ ذرا بھی پرچار ہو، مگر یہاں تو بچہ ایک پیدا ہو گا اور ٹام ٹام سارے خاندان میں ہو جائے گی۔ یہ دال روٹی بھی اگر پیٹ بھر کر کھالو ناں تو دوا کی ضرورت بھی نہ ہو، نہ یہ اللے تللے کرنے پڑیں۔" اماں کا لیکچر تو نان اسٹاپ تھا۔ شجیہ نے خاموشی سے انار کی پلیٹ اٹھائی اور فریج میں رکھ دی۔ اماں حسب عادت چادر اوڑھ کر محلے کے ٹور پر روانہ ہو گئیں۔

اللہ اللہ کر کے ٹائم گزرا اور پھر حاشر ان لوگوں کے درمیان آگیا، بیٹا سن کر اماں کی باچھیں کھل گئیں۔ شجیہ کے اماں، ابا بھی بہت خوش تھے۔ خضر بھی بے حد خوش تھا۔ شجیہ سے ملا تو شجیہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ بہت خوب صورت سا احساس تھا ماں بننے کا اور خضر کے لیے باپ بننا بھی بہت پیارا اور انوکھا سا احساس تھا دونوں بے حد خوش تھے تین دن بعد شجیہ گھر آگئی۔ اماں جو پوتا پوتا کرتے دم نہ لیتی تھیں اب ان سے پوتا سنبھالا نہ جاتا ذرا سا گود میں لیتیں تو تھک کر فوراً" شجیہ کے حوالے کر دیتیں اور انہیں سب سے زیادہ پرابلم تو حاشر کے ڈائپرز سے ہوتی کہ کیا ہر وقت بچے کو جکڑ کے رکھتی ہو۔

☼ ☼ ☼

زندگی رفتہ رفتہ معمول پر آنے لگی تھی۔ خضر کی آمدنی اتنی تھی جبکہ اخراجات کافی بڑھ گئے تھے حاشر کے اخراجات اچھے خاصے تھے پھر کام والی کے پیسے، وہ اوور ٹائم کرنے لگا تھا۔ حاشر ابھی تین سال کا تھا اسکول جانے لگا تھا شجیہ کی خواہش تھی کہ اس کی بنیاد اچھی ہو اسی وجہ سے اس کا ایڈمیشن، اچھے اسکول میں کروایا تھا پھر ان کی زندگی میں پری آگئی۔ حاشر کے اسکول کے اخراجات بھی کافی زیادہ ہو جاتے تھے۔ گھر کے اخراجات پورے کرنے کے لیے خضر کو زیادہ کام کرنا پڑ رہا تھا۔ کام کی زیادتی، اخراجات کا بڑھنا، بے آرامی نے اسے چڑچڑا بنا دیا تھا۔ اور سر پر چڑھتی ہوئی مہنگائی نے جان نکال کر رکھ دی تھی یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے شجیہ نے کام والی کو فارغ کر دیا تھا۔

دو، دو بچوں کے کام اور اوپر سے اماں کی چوبیس گھنٹے کی کل کل نے شجیہ کو بھی چڑچڑا بنا دیا تھا.... وہ خود سے بے نیاز بس گھر، بچوں خضر اور اماں کے کاموں میں الجھی رہتی۔ کئی کئی دن کپڑے نہ بدلتی، خود پر توجہ دینا بالکل چھوڑ دیا تھا.... خضر بھی جھگڑنے لگتا، کبھی کبھی شجیہ بھی جواب دے دیتی تو بات بڑھ جاتی عموماً" شجیہ خاموش ہی رہتی اوپر سے یاں کی طنزیہ باتیں اور چوٹ کرنے کی عادت ہنوز برقرار تھی۔

کوئی ایسا نہ تھا جو شجیہ کی تعریف کرتا، اس کو سراہتا بلکہ اماں جن کو ڈھیر سارے پوتے، پوتیاں کھلانے کی آرزو تھی وہ بھی اب بچوں کو سنبھالنا تو دور کی بات دو

گھڑی پاس بیٹھ کر بہلاتی بھی نہیں تھیں۔ کام کے ساتھ ساتھ پری کو سنبھالنا اسے کتنا دشوار لگتا' یہ وہ ہی سمجھ سکتی تھی اماں تو حسب معمول چادر سر پر ڈالے محلے میں نکل جاتیں۔ انہیں اس بات سے سروکار نہ تھا کہ پیچھے شجیہ' پری کے ساتھ گھر کے کام نپٹائے گی۔ انہیں تو غرض یہ تھی کہ جب وہ ظہر کے وقت لوٹیں تو کھانا تیار ہو اور ساتھ میں سلاد اور رائتہ بھی ضرور ہو.... شجیہ یہ سب کرتے کرتے نڈھال ہو جاتی خضر بھی بالکل بدل گیا تھا ہر وقت چیخ پکار' جھنجلاہٹ اور چڑچڑے پن کا شکار رہتا۔ وہ تو صاف کہتا۔

"تم جو کچھ کر رہی ہو یہ کوئی انوکھا نہیں ہے تم کوئی احسان نہیں کر رہی ہو' ہر عورت کرتی ہے کام' کام کے ساتھ ساتھ چار' چھ بچے بھی پالتی ہیں' نوکریاں بھی کرتی ہیں' شکر کرو کہ تم کو باہر کے کام نہیں کرنے پڑتے۔ ہوش ہی نہیں' چار چار دن تک نہ کپڑے بدلنے کی توفیق ہوتی ہے' نہ کبھی ڈھنگ سے تیار ہو کر صاف ستھری نظر آتی ہو' ماسیوں سے بدتر حالت میں رہتی ہو کہ تمہیں دیکھنے تک کو دل نہ کرے۔

دنیا کے لوگ دامادوں کے لیے کیا سے کیا کر دیتے ہیں اور ایک تم ہو.... تمہارا بھائی ہے.... بات نہیں کرتا مجھ سے.... کیا وہ کچھ نہیں کر سکتا ہمارے لیے؟ اگر وہ مجھے امریکہ بلوالیتا تو اس کی بہن کے لیے آسانیاں پیدا ہو جاتیں ناں۔" آخر کار خضر کے منہ میں اماں کی زبان آ ہی گئی تھی۔

"خضر....؟" شجیہ نے جھٹکے سے سر اٹھا کر خضر کی جانب دیکھا....

"میرا بھائی.... اونہہ! وہ اپنے ماں باپ کا نہیں بن سکا۔ ان کے لیے کچھ نہ کیا.... تو تم میں یا آپ کس گنتی میں ہیں؟" شجیہ کے لہجے میں دکھ بول رہے تھے۔

"یہاں پر بھی تم لوگوں کی ہی کوئی نہ کوئی غلطی ہو گی۔" خضر کی بات پر وہ چونکی۔

"کیا مطلب....؟" "مطلب یہ کہ کوئی وجہ تو ہو گی کہ تمہارا بھائی تم لوگوں کو نہیں پوچھتا۔"

"ہاں! ہماری ہی غلطی ہے کہ ہمارے نصیب ایسے ہیں کہ ہمارے نصیب میں پرخلوص اور سمجھنے والے رشتے نہیں ہیں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تلخی سے کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ خضر کی بات اس کے دل پر جا لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

زندگی یوں بھی گزرتی رہتی۔ لیکن پھر ان کی زندگی میں آئے صدیقہ بیگم اور ان کی بیٹی سویرا جو پڑوس میں اکبر صاحب کے گھر کرائے دار کی حیثیت سے شفٹ ہوئے تھے صدیقہ بیگم پچاس' پچپن سال کی تیز طرار اور شاطر خاتون تھیں اچھا خاصا فربہ جسم' پستہ قد اور کرخت چہرے والی صدیقہ بیگم جن کے جسم پر کپڑے اتنے کسے ہوئے ہوتے کہ جیسے جسم پر سیے گئے ہوں۔ سفید بالوں کو براؤن رنگ دے کر عجیب سا حلیہ بنایا ہوا تھا۔ چہرے پر میک اپ کی تہ ہر وقت جمی ہوتی۔ جب کہ ان کی بیٹی سویرا جس کی عمر کم از کم اٹھائیس سال ہو گی۔ وہ کسی آفس میں جاب کرتی تھی وہ تو ہر وقت اس طرح تیار رہتی جیسے کوئی ماڈل ہو۔ معمولی شکل اور سانولی سی رنگت والی سویرا بھی ہمیشہ میک اپ سے لیس ہوتی جدید انداز سے سیٹ کیے ہوئے بال تھے اور کپڑے بھی فیشن کے عین مطابق ہوتے۔ دونوں ماں بیٹی نہایت چرب زبان اور باتونی تھیں۔

اماں سبزی لینے گلی میں نکلیں عین اسی وقت صدیقہ بیگم اور سویرا رکشے میں کہیں سے آئی تھیں رکشے والے کو 500 کا نوٹ دیا تھا اور اس کے پاس کھلے پیسے نہیں تھے اس لیے وہ بحث کر رہا تھا۔

"آنٹی! آپ کے پاس 500 کا چینج ہو گا۔" سویرا نے ان کے پاس آ کر پوچھا! اماں نے کھلے پیسے دیے سلام دعا ہوئی تو صدیقہ بیگم نے اماں کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دے ڈالی۔ اماں نے جواباً" فراخدلی دکھا کر انہیں مدعو کر لیا۔

آج شجیہ نے گھر کی تفصیلی صفائی کی تھی اور کام سے فارغ ہوتے ہوتے شام ہونے کو آئی تھی۔ حاشر کو تیار کر کے ٹیوشن بھیجا اور پری کو سلا کر نہانے جانے کا

سوچ رہی تھی کہ ڈرائنگ روم میں صدیقہ بیگم اور سویرا کی آوازیں سن کر جھانکا۔۔۔ سلام کرکے غور سے دیکھا' دونوں ماں بیٹی فیشن اور تیاری میں ایک دوسرے کی استاد لگ رہی تھیں۔ گہرے جامنی سوٹ پر ایک طرف بے مقصد پڑے دوپٹے کے ساتھ صدیقہ بیگم عجیب سی لگ رہی تھیں جب کہ سویرا نے شاکنگ پنک چھوٹی سی کرتی پر جینز پہن رکھی تھی گلے میں رسی کی طرح دوپٹا پڑا تھا عجیب واہیات خواتین ہیں وہ سوچنے لگی۔

"بہو ہے میری۔" اماں نے کہا ان کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے کہ جیسے شجیہ کو اس طرح ماسیوں والے حلیے میں دیکھ کر وہ فیشن ایبل خواتین کیا سوچیں گی۔۔۔؟ کیوں کہ اماں ان کے بہ ظاہر حلیے سے خاصی مرعوب نظر آرہی تھیں۔

"اوہ! یہ ہیں آپ کی بہو۔۔۔؟" سویرا نے اسے اوپر سے نیچے تک غور سے دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔۔۔ "ہاں!" اماں کی آواز ہلکی اور بے جان تھی۔۔۔ دونوں ماں بیٹی نے عجیب سی چبھتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"یہ ہمارے پڑوس میں آئے ہیں نئے کرائے دار ہیں۔" اماں نے بے زاری سے دونوں کا تعارف کروایا۔

"اچھا آپ لوگ بیٹھیں میں ٹھنڈا لے کر آتی ہوں۔" شجیہ نے حق میزبانی کے آداب نبھاتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں تم جاکر نہالو پہلے۔" ان کے کہنے سے پہلے اماں نے کہہ دیا ان سے قطعی برداشت نہیں ہو رہا تھا کہ اکلوتی بہو اس غلیظ حلیے میں مہمانوں کے سامنے موجود رہے۔۔۔ وہ واپس پلٹ گئی۔ اسے دونوں ماں بیٹی ایک آنکھ نہ بھائے تھے۔۔۔ بہت چالاک لگ رہی تھیں۔

اماں کی زبانی ہی پتا چلا تھا کہ سویرا کسی آفس میں کام کرتی ہے اور ماہانہ تیس ہزار کماتی ہے تیس ہزار کہتے ہوئے اماں کی آنکھیں یوں پھیلی تھیں جیسے تیس ہزار نہیں تیس لاکھ کماتی ہو ویسے بھی اماں ان لوگوں سے خاصی امپریس ہو چکی تھیں خضر کے سامنے بھی سویرا کا ذکر کیا تھا اور تعریفیں بھی کی تھیں۔۔۔ نہ جانے ایسی کیسی دوستی ہو گئی تھی اماں کی صدیقہ بیگم سے کہ اب سارا محلہ چھوڑ کر صرف ان کے گھر آنا جانا ہوتا' ہر بات میں' ہر چیز میں سویرا کا تذکرہ ہوتا' اس کے ہاتھ کے پکائے کھانے اماں کو بہت پسند آتے اور اب تو ان کے یہاں سے کچھ نہ کچھ ضرور آنے لگا تھا۔ اماں کی تو زبان نہ تھکتی تھی صدیقہ بیگم کی تربیت اور سویرا کی تعریفیں کرتے کرتے۔

"بچی سارا دن آفس میں جان مار کر مغز کھپا کر آتی ہے اور آکر گھر کے سارے کام نپٹاتی ہے اس کی اماں تو مریضہ ہیں شوگر اور بلڈ پریشر کی' وہ تو کام کے قابل نہیں ہیں سب کچھ بچی نے سنبھال رکھا ہے۔ گھر کا دھندا بھی اور باہر کا دھندا بھی مرد کی طرح کماتی ہے اور عورت کی طرح گھر ہستی کرتی ہے ماہینہ تیس ہزار لاتی ہے مگر۔۔۔ مجال ہے جو کبھی جھنجلائے' جو رتی برابر بھی ماتھے پر شکن لائی ہو اپنے' ہر وقت ہنستی ہنساتی اور مسکراتی نظر آتی ہے صاف ستھری' نکھری نکھری' اللہ پاک اس کے نصیب اچھے کرے۔۔۔ واہ بھئی واہ! لڑکی ہو تو ایسی ہو۔۔۔ جس گھر میں جائے گی مالی مدد بھی کرے گی اور کام میں بھی لاجواب۔"

نہ جانے یہ ساری باتیں اماں خضر کے سامنے اتنی زور زور سے کیوں کرتی تھیں۔ ان کی آواز بہ آسانی کچن میں کام کرتی شجیہ کے کانوں میں پہنچتی تھی۔ اماں کا یہ سب کہنے کا کیا مقصد تھا؟ کیا ضرورت تھی ہر وقت سویرا نامہ پڑھنے کی یہ شجیہ کی سمجھ سے بالا تر تھا۔

سویرا بھی اکثر آجاتی کبھی کچھ پکا کر لاتی' کبھی کچھ اور خاص طور پر اس وقت جب کہ خضر گھر پر موجود ہوتا۔ تنگ کپڑوں' میک اپ زدہ چہرے کے ساتھ فریش فریش اور صاف ستھری سی۔۔۔ مرد تو مرد ہوتا ہے۔۔۔ ایسے میں ہر دم کام میں الجھی' خود سے لاپروا' گندے کپڑوں اور بکھرے بالوں والی شجیہ پر جب خضر کی نظر پڑتی تو سویرا کے مقابلے میں شجیہ اسے عجیب سی لگتی

گندی اور الجھی الجھی۔۔۔ اماں کو یہ بات بری نہیں لگتی تھی کہ وقت بے وقت سویرا منہ اٹھا کر کیوں چلی آتی ہے یوں جوان جہان لڑکیوں کا اس طرح آنا جانا کوئی اچھی بات تو نہ تھی۔ خضر سارا غصہ اور جھنجلاہٹ شجیہ پر نکالتا۔ اب باتوں میں جاب والی خواتین کا ذکر ضرور لے آتا۔ گھر اور گھر والوں کے پیچھے شجیہ پاگل بنی رہتی مگر کوئی صلہ' کوئی تعریف' کوئی انعام تو دور کی بات' اس پر جھنجلاہٹ ہی نکالی جاتی اس کے کاموں میں کیڑے نکالے جاتے' اس کے پلس پوائنٹ تو کبھی بھی نہ دیکھے جاتے بلکہ ہمیشہ کہیں نہ کہیں منفی پہلو نکال لیا جاتا۔

دسمبر کی ابتدا تھی ہلکی ہلکی سردی کا آغاز ہو چکا تھا دن میں تو ہلکی سردی ہوتی لیکن رات میں خنکی خاصی بڑھ جاتی تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی شجیہ کی آنکھ لگی تھی آج پری کی وجہ سے وہ جاگ رہی تھی ابھی ابھی پری سوئی تھی تو شجیہ کی بھی آنکھ لگی تھی دھڑ دھڑ دھڑ اچانک سے دروازہ بری طرح سے بجنے لگا۔ شجیہ کچی نیند میں بھی ہڑبڑا کر اٹھی' ٹائم کا صحیح اندازہ نہ ہوا۔۔۔ گھڑی دیکھی رات کے دو بج رہے تھے۔ آج کل کے حالات بھی خراب تھے الٹی سیدھی خبریں سننے میں آتی تھیں۔ شجیہ نے خضر کو آواز دی۔۔۔ خضر بھی اٹھ گیا اس وقت کون ہو سکتا ہے؟ وہ بھی آنکھیں ملتے ہوئے ٹائم دیکھنے لگا۔ دروازہ تھا کہ بے تحاشا بجایا جا رہا تھا۔

شجیہ نے شال اٹھا کر اوڑھی اور خضر نے پاس رکھی جیکٹ پہنی اور صحن عبور کر کے دروازے تک پہنچے دروازہ کھولا تو سامنے سویرا کھڑی تھی پریشان چہرہ لیے۔

"کیا ہوا خیریت؟" شجیہ نے اسے اندر آنے کا راستہ دیتے ہوئے پوچھا خضر بھی سائڈ پر ہو گیا۔

"وہ۔۔۔ وہ مما کی طبیعت اچانک بہت خراب ہو گئی ہے پلیز میری ساتھ اسپتال چلیے گا۔" اس نے کہا۔

"کیا ہو گیا انہیں۔۔۔" خضر نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"شاید بی پی شوٹ کر گیا ہے۔۔۔ وہ تقریباً" بے ہوش ہیں۔"

"اوہ اچھا! میں چلتا ہوں۔" شجیہ کے کچھ کہنے سے پہلے ہی خضر نے جلدی سے کہا ساتھ ہی ایدھی ایمبولینس کو کال کی۔۔۔ "تم اندر جا کر دروازہ بند کر لو" خضر نے شجیہ سے کہا اور سویرا کے ساتھ باہر نکل گیا' چلتے چلتے اس نے جیب میں والٹ اور سیل فون رکھ لیا تھا۔ شجیہ پھر بھی وہیں کھڑی رہی ایمبولینس آ گئی اور سویرا اور خضر صدیقہ بیگم کو لے کر ہاسپٹل روانہ ہو گئے۔ شجیہ بھی اندر آ کر لیٹ گئی اس نے ماں کو جگانا مناسب نہ سمجھا' شجیہ کو نیند نہیں آ رہی تھی رات کے تین بجنے والے تھے اماں بے خبر سو رہی تھیں وہ بچوں کے پاس لیٹی تھی مگر جاگ رہی تھی۔ عجیب سا خوف محسوس ہو رہا تھا خضر گھر پر نہ تھا تو تقریباً" رات کے چار بجے کے بعد وہ لوگ واپس آئے تھے۔ شجیہ نے ایمبولنس کے رکنے کی آواز سنی تھی پھر خضر کی مس کال بھی آ گئی۔ شجیہ نے دروازہ کھولا تو سویرا اور خضر صدیقہ بیگم کو سہارا دے کر لا رہے تھے۔

"کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" شجیہ نے پوچھا۔

"بہتر ہوں!" انہوں نے آہستہ سے جواب دیا۔

دفعتاً" شجیہ کی نظر سویرا پر پڑی تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں' سویرا خضر کی جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔ شجیہ کو عجیب سا لگا۔۔۔ غیر مرد کی استعمال کی ہوئی چیز کوئی جوان لڑکی اس طرح پہنے یہ تو بہت معیوب سی بات تھی۔ کم از کم شجیہ کی نظروں میں تو یہ اچھی بات نہیں تھی۔ وہ خاموشی سے پلٹی اور اندر آ گئی پیچھے خضر بھی آ گیا۔

"آپ جیکٹ پہن کر گئے تھے ناں کہاں ہے؟" کمرے میں آ کر انجان بنتے ہوئے سوال کیا۔۔۔

"ہاں وہ سویرا کچھ گرم پہن کر نہیں گئی تھی اسے سردی لگ رہی تھی تو میں نے اسے دی تھی پہننے کے لیے۔" خضر نے جلدی سے کہا۔

"واہ جی! اتنی ٹھنڈی میں رات کے دو بجے گھر سے نکلتے وقت سویٹر پہننا یاد نہ رہا حیرت کی بات ہے۔" اس بار شجیہ کا لہجہ طنزیہ تھا۔

"ارے واہ! کمال کرتی ہو تم بھی وہ بے چاری

پریشان تھی اس کی ماں کی طبیعت اتنی خراب تھی پریشانی میں بھلا کہاں سوجھتا ہے کچھ۔" خضر نے پلٹ کر قدرے تیز لہجے میں کہا۔ "کمال بات ہے اتنی پریشانی میں میک اپ کرنا یاد رہا مگر سویٹر پہننا بھول گئی بیچاری۔" شجیہ کا لہجہ بدستور طنزیہ تھا۔

"تمہارا مطلب کیا ہے ان فضول باتوں سے.... اور حد کر دی اتنی گہری نظر سے دیکھا تم نے اور اب ان سب باتوں کو میرے سامنے مینشن کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم؟" خضر کا لہجہ تلخ اور تیز تھا۔

"مطلب کیا ہوگا؟ عجیب سی بات ہے کہ کسی غیر مرد کے جسم سے اتری ہوئی چیز کوئی غیر لڑکی یوں بے فکری سے اپنا مال سمجھ کر پہن لے اور پھر واپس بھی نہ کرے۔"

"اُفوہ شجیہ! حد کرتی ہو تم بھی، کیسی جاہل عورتوں والی باتیں کر رہی ہو؟ کیا کیا الٹی سیدھی سوچیں پال رہی ہو؟ وہ پریشان تھی اسے سردی لگ رہی تھی۔ میں نے جیکٹ دے دی.... یہ کوئی اتنا بڑا ایشو نہیں ہے کہ جس پر اتنی بحث کی جائے.... پتا نہیں کیا ہوتا جا رہا ہے تمہیں....؟"

آپ کو اس قدر دل پر لے کر نیندیں حرام کرنے کی ضرورت نہیں ہے جو غلط ہے وہ غلط ہے۔" کہہ کر شجیہ نے منہ تک بلینکٹ لے لی۔ خضر بڑبڑ کرتا دوسری طرف کروٹ کر کے لیٹ گیا۔

دوسری صبح اماں کو صدیقہ بیگم کی طبیعت کا پتا چلا تو حسب معمول ناشتا کر کے ان کی طرف نکل گئیں اور شجیہ گھر کے کام نپٹانے لگی مگر رات والی بات اس کے دل میں اٹک کر رہ گئی تھی۔ سارے کاموں سے فارغ ہو کر وہ ظہر کا وضو کر کے آئی تو اماں بھی واپس آ گئی تھیں۔ آتے ہی سویرا نامہ اسٹارٹ ہو گیا تھا۔

"واہ بھئی واہ! کیا بچی ہے بھئی، ہر فن مولا، ہر کام میں ماہر اور پھر کمانے والی بھی، نہ جانے ایسی لڑکیاں کس کے نصیبوں میں ہوتی ہیں جو اپنے ساتھ لکشمی بھی لے کر آتی ہیں۔" اماں باآواز بلند ذومعنی باتیں کہہ رہی تھیں شجیہ خاموشی سے سنتی رہی۔

شام کو خضر آفس سے آیا ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ سویرا آ گئی۔ جیکٹ لا کر سیدھا خضر کے ہاتھ میں دی عجیب سا انداز ہوتا تھا اس کا جب وہ خضر کے سامنے آتی تو آنکھوں میں بھی خاص چمک ہوتی، ہونٹوں پر ہلکی مسکراہٹ۔

"بیٹھو بیٹی!" اماں نے فوراً محبت بھری پیش کش کر دی اور اس نے فوری عمل درآمد بھی کر لیا اور اسی تخت پر خضر کے قریب ٹک گئی۔ شجیہ سے تو سلام سے زیادہ بات نہ ہوتی۔ اماں اور پھر خضر پر خاص نظر عنایت ہوتی۔ کچھ نہ کچھ بنا کر گرم گرم لے آتی اور پھر اماں کھاتی بھی اور تعریفوں کے پل بھی باندھتی رہتیں شجیہ کو یہ سب کچھ قطعی اچھا نہ لگتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ خضر دو بچوں کا باپ ہے اور پھر کسی مرد کے اتنے آگے پیچھے پھرنے کا کیا مطلب تھا.... یوں اتنا زیادہ فرینک ہو جانا کوئی اچھی بات تو نہیں تھی خضر بھی اس کو دیکھتے تو موڈ بحال ہو جاتا۔ یہ سب انجانے خطرے کی علامت تھا۔

اس روز بھی ایسا ہی ہوا خضر آفس سے آیا تو تھوڑی دیر بعد ہی سویرا چلی آئی پلیٹ میں گرم گرم گاجر کا حلوہ تھا۔

"یہ لیں جناب آپ کا موسٹ فیورٹ گاجر کا حلوہ!" نہ سلام نہ دعا گاتے ہی پلیٹ خضر کے سامنے رکھتے ہوئے خود بھی بے تکلفی سے اس کے قریب بیٹھ گئی۔

"ارے واہ تھینکس!" خضر نے خوش دلی سے کہا.... شجیہ نے کچن سے دیکھا تو بری طرح جل گئی۔

"کیا بات ہے آج کل آفس چھوڑ کر کوکنگ کلاسز لے رہی ہو کیا؟" شجیہ نے آکر طنز سے پوچھا۔

"نہیں جی! ایسا کچھ نہیں ہے آفس اپنی جگہ اور شوق اپنی جگہ اور انسان کچھ کرنا چاہے تو وقت آپ ہی آپ نکل آتا ہے۔" وہ بڑی ادا سے پلٹ کر تڑ سے بولی۔

"جیتی رہو بیٹی!" اماں نے آکر بھی اس کی بلائیں لے لیں تو شجیہ منہ بنا کر کمرے کی طرف چلی گئی۔

اب تو شجیہ کی برداشت بھی ختم ہونے لگی تھی حد

ہوتی ہے کسی بات کی۔۔۔ اسی کو یوں بے دھڑک آکر یوں بے تکلفیاں دکھانا' خضر کے ساتھ گھنٹوں گپ شپ کرنا' خضر کا بھی موڈ بدل جانا' والہانہ انداز اور کچھ کہتی ہوئی آنکھیں۔۔۔ یہ سب کچھ شجیعہ کے لیے ناقابل برداشت تھا وہ تو اس گھر کے لیے' خضر کے لیے' اماں کے لیے اپنا آپ مٹا کر' خود کو بھول کر خدمتیں کر رہی تھی' نیند چین' آرام سب کچھ قربان کر رہی تھی اور۔۔۔ اور اسے قدم قدم پر ذلت دی جاتی' طنز اور ذومعنی باتوں سے اسے کچوکے دیے جا رہے تھے۔۔۔

رات کو شجیعہ اپنے کام نپٹا کر کمرے میں آئی تو خضر سونے کی بجائے موبائل پر میسج ٹائپ کر رہا تھا۔

"کس سے بات ہو رہی ہے اس ٹائم؟" شجیعہ نے پوچھا۔

"دوست سے۔" خضر لاپروائی سے بولا۔

"کون سا دوست ہے بھئی۔۔۔؟" شجیعہ کا لہجہ اس بار تیکھا تھا "مطلب کیا ہے تمہارا۔۔۔؟ پہلے تو اتنی جانچ پڑتال نہیں کی کبھی؟" خضر نے پوچھا۔

"ہاں پہلے حالات ایسے نہ تھے۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ کڑوا ہو گیا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو۔۔۔؟" اس بار خضر کا لہجہ سخت تھا۔

"جو کہنا چاہتی ہو صاف صاف اور کھل کر کہو؟" موبائل سائیڈ پر رکھ کر بولا۔

"صاف بات یہ ہے کہ مجھے سویرا کا اس طرح منہ اٹھا کے آنا اور خاص طور پر آپ کے سامنے آنا' آپ کے لیے کھانے بنا کر لانا اور اماں کا اس پر یوں قربان ہونا بالکل پسند نہیں ہے۔ ویسے تو اماں بڑی عقلمند بنتی ہیں مگر کمال کی بات ہے کہ انہیں یہ سب ناگوار نہیں گزرتا۔۔۔ انہیں تو بس سویرا' سویرا اور سویرا ہی نظر آتی ہے۔ اس کی اتنی تعریفیں کرنا' مجھے ستانا' آخر اماں کا ان باتوں سے کیا مقصد ہے۔۔۔؟ وہ آپ کے لیے کیوں بنا کر لاتی ہے کھانے؟"

"شجیعہ چپ کرو!" خضر نے درمیان سے اسے ٹوکا اور سخت لہجے میں بولا "تم فضول عورت ہمیشہ فضول بات ہی سوچتی ہو تمہیں پتا ہے مجھے گاجر کا حلوہ کتنا پسند ہے گاجر آکر کتنے دن ہو گئے ہیں تمہیں تو خیال نہ آیا کہ حلوہ بنا دو۔ ہمارے حالات آج کل ٹھیک نہیں مالی لحاظ سے میں کتنا پریشان ہوں تم مجھے مورل سپورٹ تو کر سکتی ہو ناں' صاف ستھری ہو کر میرے ساتھ کچھ ٹائم تو گزار سکتی ہو ناں؟ ہر وقت تمہارے پاس سے پیاز' لہسن کی بو آتی رہتی ہے۔ ماسیوں سے بدتر حالت بنائے رکھتی ہو اپنی۔ آئینے میں دیکھو ذرا خود کو چالیس برس کی عورت نظر آنے لگی ہو تم' خود پر دھیان دینا بالکل چھوڑ دیا ہے ہر وقت سر جھاڑ منہ پہاڑ پھرتی رہتی ہو۔

کبھی دل کرتا ہے تم سے بات کرنے کو تو تمہارے پاس میرے لیے ٹائم نہیں ہے۔ چھٹی والے دن آدھا آدھا دن میں کمرے میں پڑا رہتا ہوں تم تو مڑ کر کمرے میں جھانکتی تک نہیں کیونکہ تم۔۔۔ مصروف ہوتی ہو تمہیں احساس نہیں ہوتا کہ تمہارے شوہر کو تمہاری ضرورت ہے۔ چھ سال میں لگتا ہے تم نے چھ صدیاں گزار لی ہیں میرے ساتھ۔۔۔ اگر اس نے حلوہ بنا دیا تو تمہیں اتنا برا لگ گیا۔۔۔ بجائے یہ کہ دوسروں پر تنقید کرو خود میں خامیاں تلاش کرو۔۔۔ میں نے اس کے ساتھ کوئی ڈیٹیں نہیں ماری ہیں۔ وہ آتی ہے سب کے سامنے بیٹھتی ہے' باتیں کرتی ہے چلی جاتی ہے۔۔۔ اپنی چھوٹی سوچ کو اپنے تک محدود رکھو اور اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو کہ تم اپنے آپ سے اور مجھ سے کتنا انصاف کر رہی ہو؟" اسے بری طرح لتاڑ کر موبائل بیڈ پر پھینک کر خضر دندناتا ہوا کمرے سے نکل گیا اور جا کر ڈرائنگ روم میں لیٹ گیا۔۔۔ شجیعہ منہ کھولے آنکھیں پھاڑے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

غیر ارادی طور پر شجیعہ نے خود کو آئینے میں غور سے دیکھا۔۔۔ کتنے دن بعد آج' آج غور سے خود کو دیکھا۔۔۔ ملگجے کپڑے روکھے بے رونق الجھے بال' بے رونق چہرہ' تھکی تھکی سی سفید آنکھیں۔۔۔ کتنا عرصہ ہو گیا تھا وہ پارلر کی شکل بھی بھول گئی تھی۔ وہ چوبیس' پچیس سال کی تو کہیں سے نظر نہیں آرہی تھی' چالیس

بیالیس سال کی عورت لگ رہی تھی وہ۔۔۔ سویرا سے بھی چھوٹی تھی مگر۔۔۔ خود کو ڈھال لیا تھا۔۔۔ سویرا نے خود کو کتنا فٹ رکھا تھا کہ عمر سے بھی کم لگتی اور وہ۔۔۔ کئی بار ایسا ہوتا کہ خضر اشاروں کناروں میں کچھ کہنے کی کوشش کرتا مگر وہ جان بوجھ کر انجان بن جاتی۔۔۔ وہ کام میں الجھی رہتی اس وقت خضر پر غصہ بھی آتا کہ وہ دیکھ نہیں رہا کہ **شجیعہ** کس قدر مصروف ہے اور جب وہ اپنے کام نپٹا کر کمرے میں آتی اس وقت تک خضر سو چکا ہوتا۔۔۔ اور جب بھی وہ صبح گلہ کرتا تو **شجیعہ** جھنجلا جاتی۔

"خضر میں سارا دن گھر کے کاموں میں پاگل بنی رہتی ہوں۔۔۔ تھکن سے میرا پور پور، چور چور رہتا ہے۔۔۔ اور دل کرتا ہے کہ بستر پر لیٹتے ہی سو جاؤں آپ کو خیال کرنا چاہیے۔" اس کے ٹکے سے جواب پر خضر جھنجلا کر اپنا غصہ کسی اور بات پر نکالتا۔ یوں اکثر صبح صبح ہی لڑائی جھگڑوں اور چیخ پکار کا آغاز ہو جاتا۔

خضر آج بھی غصے سے ڈرائنگ روم میں سو چکا تھا۔ پری دوبارہ سو چکی تھی اب **شجیعہ** نے اپنی خامیوں پر نظر ڈالنی شروع کی تب آہستہ آہستہ اس پر یہ ادراک ہونے لگا کہ واقعی خضر کہیں نہ کہیں حق پر ہے۔ ایسا نہیں تھا کہ خضر اس سے پیار نہیں کرتا تھا۔ خضر تو شروع میں اسے بہت پیار کرتا تھا۔ بہت خیال رکھتا تھا اس کا، اماں کی زیادتیوں کی معافیاں مانگ لیا کرتا، آفس سے آتے وقت اس کے لیے موتیے کے گجرے ضرور لاتا، وہ شام کو تیار ہو کر خضر کی آمد کی منتظر رہتی، خضر گھر میں داخل ہوتے ہی اسے اس طرح بنا سنورا اور منتظر پاتا تو اس کی ساری تھکن کافور ہو جاتی۔۔۔ مگر آہستہ آہستہ یہ سب کم ہوتا چلا گیا حاشر اور پری کی پیدائش کے بعد اس حد تک مصروف ہو گئی کہ خضر کے سارے کام تو وقت پر کر دیتی اس کی ہر چیز تیار کر دیتی مگر۔۔۔ اسے وہ ٹائم نہ دے پاتی جس کی طلب خضر کو تھی۔۔۔ اور آہستہ آہستہ خود سے بھی بے پروا ہوتی گئی۔۔۔ خضر آفس سے تھکا ہارا آتا تو وہ کچن میں مصروف رہتی کتنی دیر تک خضر اس کا منتظر رہتا بس آتی اور چائے کا کپ اسے تھما دیتی۔ بلکہ اکثر کہتی۔

"خضر جلدی پکڑیں چولھے پر سالن لگ جائے گا۔" خضر اسے دیکھتا رہ جاتا۔۔۔ کیسا حلیہ ہوتا کہ وہ چپ نہ رہ پاتا۔

"**شجیعہ** یہ تم نے کیا حالت بنا رکھی ہے۔۔۔ کب سے نہائی نہیں تم؟" تنگ آکر وہ کہہ دیتا۔

"کیسے نہاؤں۔۔۔؟ باتھ روم میں جاتے ہی پری ہنگامہ کھڑا کر دیتی ہے اور اماں کہتی ہیں گیلے بالوں سے فیڈ مت کرواتا۔۔۔ اور اماں تو پری کو ہاتھ لگانا بھی گناہ سمجھتیں ہیں ان کا گھومنا پھرنا ضروری ہے۔ سبزی تک نہیں بنا سکتیں، وہ جیسے ساری ذمہ داری میری ہی ہے۔" ٹکا سا جواب دے کر باہر کی جانب بھاگتی کیوں کہ سالن کے جلنے کی بو آرہی ہوتی ہے۔۔۔ خضر تاسف سے اسے جاتا دیکھتا رہ جاتا۔۔۔ وہ بھی مرد تھا۔ دن بھر آفس میں مغز کھپا کر گھر آتا تو گھر میں۔ میلی کچیلی سی بیوی اس کی منتظر ہوتی جس کے پاس اس کے پاس بیٹھ کر ایک کپ چائے پینے کا بھی ٹائم نہ ہوتا۔ اوپر سے اماں کے طعنے اور شکایتیں خضر کرتا بھی تو کیا کرتا۔۔۔ چڑچڑا ہو گیا تھا۔۔۔ خضر نے کئی بار باتوں باتوں میں **شجیعہ** کو احساس دلایا، مگر **شجیعہ** نے کبھی اس طرف دھیان نہ دیا۔

آہستہ آہستہ دونوں کے درمیان خلیج حائل ہوتی گئی اور ایسے میں سویرا کی آمد اور اتنا زیادہ انٹرسٹڈ ہونا، خضر سے ہنسی مذاق کرنا اور خضر کی بے تکلفی بھی **شجیعہ** کے لیے خطرے کی علامت تھی۔ پھر اماں تھیں کہ سویرا کے قربان جاتی تھیں۔ جہاں تک اماں کا تعلق تھا چلو وہ تو ساس تھیں۔۔۔ لیکن جب **شجیعہ** نے اسی رات اپنا احتساب کیا اپنے اندر خامیاں تلاش کی تو اسے احساس ہوا کہ یہاں 90٪ غلطی اس کی اپنی تھی۔ خضر کے معاملے میں، خضر اسے حق پر لگا۔ اماں کی بات الگ تھی اماں تو ویسے بھی روز اول سے جہیز کو لے کر شاکی تھیں۔ ان کا رویہ تو پہلے دن سے ہتک آمیز تھا۔ ویسے بھی عموماً" ساسیں ایسی ہوتی ہیں اور خاص طور پر جہاں بیٹا اکلوتا ہو تو وہاں مائیں ضرورت سے زیادہ ہی پچی ہو

جاتی ہیں انہیں بہو آنے کے بعد یہ احساس ہو جاتا ہے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا گیا ہے اور بیٹا بھی انہیں بدلتا ہوا نظر آتا ہے۔ اماں بھی ان ہی ساسوں میں سے تھیں لیکن خضر۔۔۔ خضر نے کبھی کوئی غلط بات نہ کی تھی۔ کبھی کبھی اماں سے جھگڑے بھی کیے تھے اس کی وجہ سے۔۔۔ اتنی کم آمدنی کے باوجود ماسی رکھنے کے لیے بھی کہتا تھا بچوں کے معاملے میں کبھی کوتاہی نہ کی' ان کی ضروریات کا ہمیشہ خیال رکھا۔ جب کہ دیکھا جائے تو اصل معنوں میں مظلوم خضر تھا وہ ہمیشہ سے خود کو مظلوم سمجھتی آئی تھی اس کے خیال میں زیادتیاں اس کے ساتھ ہوئی تھیں لیکن خضر بے چارہ تو اس کے اور اماں کے درمیان پھنسا ہوا تھا۔ ماں کے خیال میں وہ بیوی کا زیادہ خیال رکھتا تھا اور شجیعہ سوچتی تھی کہ خضر اماں کے اشاروں پر منہ بند کر کے ناچتے ہیں۔ خضر کی بات پر اسے یاد آیا کہ اس کی اماں ہمیشہ سے ابا کے سامنے صاف ستھری اور نکھری نکھری سی رہتیں کبھی ایسا نہ ہوتا کہ صبح شام انہوں نے بال نہ بنائے ہوں۔ ابا کے آنے سے پہلے وہ سارے کام نپٹا لیتی تھیں اور ابا کے آنے کے بعد کتنی دیر ان کے ساتھ بیٹھ کر گھر کی' خاندان کی' محلے کی' حتیٰ کہ ملک کے حالات پر بھی بات چیت کرتیں' ہمیشہ ابا کے ساتھ چائے پیتیں اور ان کے ساتھ ہی کھانا کھاتیں جب ابا نماز کے لیے اٹھتے تب اماں بھی اٹھتی تھیں۔ ابا کے چہرے پر کتنا اطمینان ہوتا۔۔۔ اپنا موازنہ کیا اماں سے اس کے برعکس جب خضر آفس سے لوٹتا وہ کسی نہ کسی کام میں الجھی ہوتی۔۔۔ خضر کبھی اکیلا کبھی اماں کے ساتھ بیٹھ کر چپ چاپ چائے پی لیتا۔ اسے یوں گندی مندی شجیعہ کو دیکھ کر کوفت ہوتی ہوگی۔

"ہائے اللہ! نہ جانے آفس میں کتنی اسمارٹ' اسمارٹ اور خوب صورت لڑکیاں ہوں گی جنہیں خضر سارا دن دیکھ دیکھ کر آتے ہوں گے۔۔۔ اور گھر آکر مجھے دیکھتے ہوں گے تو۔۔۔ اگر خدانخواستہ دل میں کبھی الٹا سیدھا خیال آجائے۔۔۔ یا سویرا؟" توبہ توبہ اللہ نہ کرے!" تمام تر باتیں اپنی جگہ مگر۔۔۔ خضر کے بغیر جینے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ خضر اس کی زندگی میں آنے والا پہلا اور آخری مرد تھا جسے شجیعہ نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔۔۔ لیکن اب۔۔۔ اتنی دوریاں۔۔۔ فاصلے اور یہ چپقلش۔۔۔؟ یہ سب اس کے اپنے پیدا کردہ تھے۔ گزشتہ چند سالوں سے وہ زندگی کا صرف ایک رخ' ایک ہی پہلو دیکھتی چلی آئی تھی۔۔۔ گھر گرہستی' اور اس میں خود کو مظلوم سمجھتی۔۔۔ لیکن آج۔۔۔ آج اسے احساس ہو چلا تھا۔۔۔ اسے جھرجھری سی آگئی خضر کے دور ہو جانے کے تصور سے آنکھیں نم ہونے لگیں۔

"نہیں نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہوگا۔۔۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

تب ہی پری اٹھ گئی تو وہ خیالات سے چونکی اف کافی رات گزر چکی تھی اور چار بج رہے تھے۔ لیکن اس کے اوپر سوچ کا نیا در وا ہو چکا تھا۔ اس کو احساس ہو گیا تھا اور پھر دل میں عزم کر کے اس نے اپنے آپ کو کس حد تک مطمئن کر لیا تھا۔ اچانک خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگی تھی گزشتہ کچھ سالوں سے' جو ہر وقت کام کی ٹینشن اور ذہن پر منوں ٹنوں بوجھ رہتا تھا وہ کافور ہو چکا تھا بہت ہلکی محسوس کر رہی تھی اپنے آپ کو وہ اور خاصی مطمئن بھی تھی۔

☼ ☼ ☼

جب صبح شجیعہ نیند سے بیدار ہوئی تو روز کی طرح سر پر کام کا بوجھ اور بھاگم دوڑ کی ٹینشن کی بجائے وہ فریش تھی اس نے سوچ لیا تھا کہ آج سے زندگی کو نئے انداز سے گزارنا ہے۔۔۔ خضر جاگ گیا تھا اس وقت وہ فریش ہو کر واش روم سے نکل رہا تھا۔

"گڈ مارننگ ہیو اے نائس ڈے۔" وہ مسکرا کر بولی تو خضر نے آنکھیں پھاڑ کر حیرت سے اسے دیکھا کیونکہ یہ تو شادی کے اولین دنوں کی بات تھی جب ہر صبح اٹھ کر وہ ضرور اسے وش کرتی تھی۔۔۔ خضر نے کاندھے اچکا کر اسے دیکھا اس کے چہرے پر اطمینان تھا اور خاصا خوشگوار موڈ بھی خضر خاموشی سے کنگھا اٹھا کر بال بنانے لگا۔ شجیعہ نے ہاتھ دھو کر پہلے پری کی فیڈر بنا کر

اس کے سرہانے رکھ دی تاکہ جب وہ اٹھے تو شجیہ کو
کچن سے بھاگ کر نہ آنا پڑے... ساتھ ہی حاشر کو بھی
جگا دیا کہ بار بار آکر اسے اٹھانا پڑتا تھا۔

"گڈ بوائے! جلدی سے منہ دھو کر آجاؤ۔" اس
نے مخاطب حاشر کو کہا تھا مگر نگاہیں روٹھے روٹھے سے
خضر پر تھیں۔ اماں بھی اٹھ چکی تھیں... حاشر اور خضر
کے تیار ہو کر آنے تک اس نے اماں کو ناشتا دے دیا
تھا۔ اور دونوں کا ناشتا بھی ریڈی کر کے ٹیبل پر لگا دیا
تھا۔ یہ سارے کام بڑی آسانی اور اطمینان سے کر رہی
تھی۔ نہ آج حاشر نے کچھ کہا نہ اماں نے طنز کے ساتھ
ناشتا طلب کیا اور نہ ہی خضر نے چیخ و پکار کی۔ دونوں
ناشتا کر کے چلے گئے اور اماں بھی کچھ دیر لیٹ گئیں کہ
پھر انہیں اٹھ کر محلے میں نکلنا ہوتا تھا۔ اتنی دیر میں
پری جاگی تو پری کا منہ دھلا کر اس کو چینج کروایا اور فیڈر
دے کر خود ناشتے سے فارغ ہوئی۔ کچن سمیٹ کر برتن
دھوئے اماں اٹھیں اور سبزی لا کر حسب معمول کچن
میں رکھ دی "پالک خریدی ہے میں نے گوشت اور
میتھی کے ساتھ بنا لینا ساتھ میں مرچ کی چٹنی بھی پیس
لینا' حسب معمول آج کا مینو سیٹ کر کے اس کو
ہدایات دے کر باہر نکلنے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔

"اماں!" اس نے انہیں آواز دے کر روکا... اماں
اس کی آواز پر ناگواری سے پلٹیں! "یہ پالک کھول کر ذرا
اچھی طرح سے دیکھ کر کاٹ دیں پہلے 'پھر چلی جائیے
گا..." اس کے کہنے پر اماں نے اسے ایسے گھورا جیسے
وہ پاگل ہو گئی ہو۔

"کیوں تمہیں کیا کرنا ہے؟" تیکھے چتون سے سوال
کیا۔

"بہت سے کام ہوتے ہیں اماں گھر کے اور پھر پری
کو سنبھالنا بھی ہوتا ہے ناں... اس نے پالک کا شاپر
اور ٹرے میں چھری رکھ کر ان کے ہاتھوں میں رکھ دی
اور پلٹ گئی... نہایت مطمئن انداز تھا اس کا... اور
اماں کے لیے یہ سب نہایت حیران کن 'کیونکہ اس
نے اس سے پہلے تو کبھی بھی ایسا نہ کیا تھا۔ چپ چاپ
سارے کام کیے جاتی تھی۔ چاروناچار اماں سبزی لے
کر بیٹھ گئیں اور شجیہ پری کے پاس کمرے میں چلی
گئی۔ اماں نے پالک صاف کر کے کاٹ کر رکھ دی تب
تک اس نے گوشت بگھار دیا تھا "یہ لیں... یہ پودینہ
بھی توڑ دیں ذرا سا..." اماں کے اٹھنے سے پہلے ہی وہ
پودینے کی گڈی بھی ان کے سامنے رکھ کر جا چکی تھی
اور اماں منہ پھاڑے بس اس کی پیٹھ کو دیکھ رہی تھیں۔
وہ دل ہی دل میں مسکرا رہی تھی اور مسکراتی ہوئی کام کر
رہی تھی۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اماں تھوڑی دیر
لیٹ کر اٹھیں تو وہ چائے بنا کر لے آئی... اماں چائے
پی چکیں تو اس نے پری لا کر اماں کی گود میں تھمادی۔

"ہائیں! یہ کیا...؟" اماں نے پوچھا۔

"ارے پری ہے ناں آپ کی پوتی..." قہقہہ لگا کر
اس طرح بولی کہ اماں جیسی طرار خاتون کھسیا گئیں...
"میں ذرا پارلر تک جا رہی ہوں حاشر ٹیوشن جا چکا
ہے تب تک وہ آئے گا میں آجاؤں گی دو گھنٹے تک۔"
قبل اس کے کہ اماں کچھ کہتیں اس نے کہا۔ "دو گھنٹے"
اماں نے آنکھیں پھیلا کر قدرے حیرت سے پوچھا۔
"دو گھنٹے میں پری تو مجھے تنگ کر کے رکھ دے گی مجھ
سے کہاں سنبھالا جائے گا؟"

"نہیں کرے گی تنگ میں نے اسے کھلا پلا دیا ہے۔
بس دو گھنٹے کی تو بات ہے آپ کا دل بھی بہلا رہے گا۔"
وہ چادر اوڑھتے ہوئے بولی۔

"کیوں کہیں جانا ہے کیا تمہیں 'شادی ہے کیا میکے
میں؟" اماں نے منہ بنا کر پوچھا۔

"نہیں تو! بس ویسے ہی بہت مہینے ہو گئے ہیں مجھے
پارلر کی شکل دیکھے اپنی شکل دیکھنے کا بھی ٹائم نہیں تھا
میرے پاس لیکن اب... اب ایسا نہیں ہوگا۔" پرعزم
لہجے میں کہتی ہوئی وہ جواب کا انتظار کیے بنا کمرے سے
نکل گئی اماں منہ کھولے اسے تکتی رہ گئیں۔

ایسا کر کے وہ خود بھی مطمئن تھی کوئی فکر 'کوئی
پریشانی یا الجھن نہیں تھی اسے 'یہ گھر سب کا تھا اور
سب کو اپنے اپنے طریقے سے اس کے لیے کچھ نہ کچھ
کرنا تھا خضر کماتا تھا' وہ سارے دھندے نبٹاتی تھی تو
اماں کم از کم اتنا تو کر سکتی تھیں جو عام طور پر ہمارے

بڑوں میں نانیاں اور دادیاں کرتی ہیں، بیٹھ کر سبزی بنانا، بچوں کو کھانا کھلانا، سلانا، بچوں کے ساتھ وقت گزارنا یہ سب کام ایسے تھے جو اماں کو کرنے چاہیے تھے مگر سارا قصور شجیہ کا اپنا تھا کہ اس نے کبھی کچھ کرنے نہ دیا اور اماں بھی خود کو بری الذمہ سمجھنے لگیں کہ سب کچھ کرنے کی ذمہ داری صرف شجیہ کی ہی ہے انہیں تو بس "ساس گری" دکھائی تھی حکم چلا کر، طنز کر کے اور نوکرانیوں کی طرح کام کروا کے....

دو گھنٹے بعد وہ گھر لوٹی تو خاصی فریش تھی۔ وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور فریش محسوس کر رہی تھی۔ پہلے جب کبھی بھی پارلر جاتی تو ڈری سہمی سی رہتی، اماں کی نظروں سے خائف سی رہتی تھی مگر..... آج، آج..... وہ بالکل نئی الگ الگ محسوس کر رہی تھی۔ نہ جانے کہاں سے اتنا اعتماد آگیا تھا اس کے اندر اماں بھی منہ کھولے صبح سے اس کی تبدیلیاں محسوس کر رہی تھیں آج نہ جانے کیوں ان کی بولتی بھی بند تھی۔ وہ شجیہ کے بدلتے رویئے سے کہیں نہ کہیں خوفزدہ ضرور تھیں۔ انہیں لگ رہا تھا جیسے سیر پر سوا سیر ہونے والا ہے۔

شاید یہ شجیہ کی ہی غلطی تھی اس کی خاموشی، ہر دم ہر حکم بجالانا، اور چپ چاپ سب کچھ کر لینا اس کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ اس کی ان ہی حرکتوں کی وجہ سے اماں شیر بن کر اس پر قابض رہتیں اسے اتنا دبا کر رکھا کہ وہ صحیح کو صحیح بھی نہ کہہ سکی۔ اماں کو اندازہ نہ تھا کہ شجیہ ایسا بھی کر سکتی ہے اور اب انہیں یہ بھی غنیمت لگ رہا تھا کہ بجائے اس بات پر کوئی ہنگامہ کریں یا شجیہ کو مزید دبائیں اس کے ساتھ مل جل کر سمجھوتہ کر لینا بہتر ہے۔ ورنہ کل کو اگر بیٹا بھی بدل گیا تو آگے کے لیے مشکلات کا سوچ کر ماں دل ہی دل میں کانپ گئیں۔ آج اس نے خضر کے آنے سے پہلے ہی سارے کام نپٹا لیے اور شام کو نہا کر فیروزی اور پنک کلر کا کاٹن کا سوٹ پہن لیا۔ سیٹ کیے ہوئے بال کافی اچھے اور گھنے لگ رہے تھے۔ فیشل کروانے سے چہرے پر نکھار آگیا تھا ہلکا سا میک اپ کر کے خود کو آئینے میں دیکھا..... تو مسکرا دی واقعی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اتنے دن بعد خود کو یوں سجانا سنوارنا اچھا لگ رہا تھا اماں بھی اسے دیکھے جا رہی تھیں۔ خضر کے آنے سے پہلے اس نے چائے تیار کر کے تھرموس میں رکھ لی تھی اور چائے کے ساتھ پکوڑے بھی بنا لیے تھے تاکہ آج اس کے ساتھ بیٹھ کر آرام سے چائے پی سکیں اور کچھ ٹائم اس کے ساتھ گزار سکے۔ اماں کی چپ سے شجیہ کو ہنسی بھی آرہی تھی۔ مطلب اماں کو سوا سیر بن کر دکھانا ہی پڑے گا..... ہائے اماں معصوم..... دل ہی دل میں مسکرا دی۔

حسب معمول خضر آیا تو پہلے باہر اماں سے ملا اور پھر کمرے میں آیا اسے پتا تھا یہ وقت حاشر باہر کھیلنے جاتا ہے اماں برآمدے میں چائے پی رہی ہوتی ہیں اور شجیہ ماسیوں کی حالت میں کچن میں مصروف ہوتی ہیں۔ تھکا تھکا سا کمرے میں آیا تو..... شجیہ ڈریسنگ

تیبل کے سامنے کھڑی ہو کر بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔۔۔۔ خضر کی نظر اس پر پڑی تو۔۔۔۔ پلکیں جھپکا جھپکا کر اسے دیکھتا رہا' یہ کیا۔۔۔۔ کاٹن کا استری شدہ نیا صاف ستھرا سوٹ' خوب صورت اسٹائل سے سیٹ کیے بال' ہلکے میک اپ اور فریش نکھرے نکھرے چہرے کے ساتھ وہ۔۔۔۔ بالکل نئی نویلی جیسی لگ رہی تھی۔

"تم۔۔۔۔ تم۔" حیرت اور خوش گوار سے احساس سے وہ اس کے قریب آگیا۔

"شجیہ یہ تم ہو۔۔۔۔؟" بے تکا سا سوال کر ڈالا۔

شجیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہی موتیوں جیسے چمکیلے خوب صورت' دانت اور معصوم سی بھرپور ہنسی' جس کو سنے ہوئے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا محویت اور حیرت کے ساتھ۔

"کیا ہو گیا آپ کو؟" شجیہ نے ہنستے ہوئے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا۔" خیالات سے چونک کر کہا وہ ابھی تک بے یقینی کی کیفیت میں تھا۔

"خضر آئی ایم سوری! واقعی میری غلطی تھی کہ میں ہمیشہ صرف گھر اور گھر کے کاموں میں الجھی رہی اور اس وجہ سے خود سے بھی اور کسی حد تک آپ کے احساسات سے بھی لاپروا ہوتی چلی گئی۔ میں نے ہمیشہ گھر کے کاموں کو ایک ٹینشن کی صورت میں لیا ہے' تب ہی تو ہر وقت مصروف اور الجھی رہی' ہمیشہ ذہن میں بس یہ ہی رہا کہ سب کچھ مجھے کرنا ہے کس طرح اور کیسے کروں گی؟ کبھی ٹھنڈے دل دماغ سے نہیں سوچا۔

اماں صرف حکم چلانے کا کام کرتیں اور میں سر جھکا کر سنتی رہتی ایک بار انہوں نے پری کو لینے سے انکار کیا تو میں نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور پھر پری کو صرف اپنی ذمہ داری سمجھ کر اماں کو دینا ہی چھوڑ دیا۔ اماں نہ کسی چیز میں دلچسپی لیتیں اور نہ میں کوشش کرتی کہ وہ گھر کے کسی بھی کام کو ہاتھ لگائیں کیوں کہ مجھے ان کے غصے سے ان کی چیخ و پکار سے اور ان کے طنز اور طعنوں سے ڈر لگتا تھا لیکن اب میں نے سوچا ہے کہ

اماں سارا دن فالتو رہتی ہیں تب ہی جب کچھ کام کرنے کو نہ ہوتا تو وہ سوچ سوچ کر میری غلطیاں اور خامیاں نکالتی رہتی ہیں۔ اس وجہ سے میں نے آج انہیں بھی مصروف رکھا اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آج صبح سے اماں نے ایک الٹی بات نہیں کی نہ طعنہ' نہ طنز کچھ بھی نہیں بس حیرت سے مجھے دیکھے گئیں یعنی انہیں ایسی بہو کی ضرورت تھی جو ان پر بھی کچھ حق جما سکے۔ ان کو عادت ہے ناں' شروع سے ہی انہوں نے حکم چلایا ہے پہلے ابا جی پر آپ پر اور پھر مجھ پر بس تھوڑی سی کلاس لینے کی ضرورت تھی ان کی' اور میں نے آج پہلی کلاس لے لی۔" وہ خاصے خوش گوار اور شرارتی موڈ میں خضر کو سب کچھ بتا رہی تھی معصوم سے لہجے میں ۔۔۔۔ خضر ایک ٹک اسے بولتا دیکھ رہا تھا کتنی معصوم لگ رہی تھی وہ۔۔۔۔!

"اور دیکھیں آج۔۔۔۔ آپ کے آنے سے پہلے میں نے رات کے لیے سالن بھی بنا لیا' خود بھی تیار ہوں گھر بھی صاف ستھرا اور سب سے بڑی بات۔۔۔۔ اماں بھی چپ۔" آخری جملہ کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس دی بے فکر اور خوب صورت ہنسی خضر اسے تکے جا رہا تھا۔

"اب بتائیں کیا؟ اور میں کیسی لگ رہی ہوں؟" اتراتے ہوئے سوال کیا۔

"تم۔۔۔۔ تم اتنی پیاری لگ رہی ہو کہ دل چاہ رہا ہے کہ۔۔۔۔" خضر والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر اس پر جھکتے ہوئے بولا۔

"ارے۔۔۔۔ ارے۔" شجیہ نے گھبرا کر اسے پیچھے دھکیلا۔

"زیادہ تنگ کیا ناں تو۔۔۔۔ تو۔۔۔۔ ابھی سویرا کو میسج کردوں گا۔" خضر نے جیب سے موبائل نکالتے ہوئے شریر لہجے میں کہا۔

"اوئے! قتل کردوں گی اسے۔۔۔۔" شجیہ نے گھور کر اسے دیکھتے ہوئے کہا' تو خضر نے آگے بڑھ کر اسے بانہوں میں بھر لیا۔ شجیہ مطمئن ہو کر اس کے سینے سے جا لگی۔

☼ ☼

رابعہ افتخار

ادارہ

س : "آپ کا نام اور گھر والے کیا کہہ کر پکارتے ہیں پیار سے؟"

ج : "رابعہ افتخار۔۔۔ سب ربی کہہ کر بلاتے ہیں' پیار کا کوئی خاص نام نہیں ہے۔"

س : "کبھی آئینے نے یا آپ نے آئینے سے کچھ کہا؟"

ج : "آئینہ کچھ بھی تو نہیں کہتا۔۔۔ بس خاموشی چھائی ہوئی ہوتی ہے اور خاموشی کی زبان سمجھنے کی صلاحیت سے نا آشنا ہوں۔"

س : "آپ کی سب سے قیمتی ملکیت؟"

ج : "بچپن کی یادیں۔۔۔ اس میں بتائے ہوئے پل۔۔۔ بہت بے فکری اور سچی خوشیوں کے دن تھے جو میرے پاس یاد کی شکل میں موجود ہیں۔۔۔! اور کچھ نہ سہی چہرے پر ہنسی ضرور بکھیرتے ہیں جب بھی ہیں یاد کروں اور میرے والدین۔۔۔!"

س : "گھر آپ کی نظر میں؟"

ج : "ایک محفوظ پناہ گاہ۔۔۔ ہماری حکمرانی کی وہ پرسکون سی جگہ جہاں ہمیں ہماری ذات کا بہت "خاص" ہونے کا احساس سا ہوتا ہے۔"

س : "آپ کے لیے محبت کیا ہے؟"

ج : "محبت ایک بے حد نورانی جذبہ۔۔۔ جو ہمارے دلوں میں وحی کی مانند ہو کر رگ و پے میں سرائیت کرتا جاتا ہے۔۔۔ ایک میٹھا سا احساس بھی ہے اور ایک دردناک حادثہ بھی۔"

س : "اپنے آپ کو بیان کریں؟"

ج : "اپنی رائے بتاؤں تو میرے پاس اپنے لیے "بہت [illegible]" ہونے کا احساس نہیں ہے۔۔۔ میرے اندر بہت کچھ ایسا ہے جو مجھے دوسروں کی نظروں میں اچھا نہیں بننے دیتا۔۔۔ اور لوگوں سے اپنے لیے ایک لفظ بہت سنا ہے کہ "تم بہت عجیب ہو ربی۔"

س : "مستقبل قریب کوئی منصوبہ جس پر آپ نے عمل کرنا ہو؟"

ج : "نہیں اب منصوبے نہیں بناتی۔۔۔ بہت سے بنائے' جو ایک خوب صورت خواب بن کر ایک ٹوٹی پھوٹی تعبیر کی شکل میں سامنے آن کھڑے ہوئے اور اپنا آپ منوایا تب سوچا کہ ہم کون ہوتے ہیں بھلا منصوبے بنانے والے ہم تو بس تقدیر کے ہاتھوں کٹھ پتلیاں ہیں جیسا سامنے آئے گا کرتے جائیں گے۔"

س : "پچھلے سال کی کوئی کامیابی جو آپ کو ملی ہو؟"

ج : "کوئی خاص نہیں۔۔۔ بس برداشت کی آخری حد تک پہنچ کر بھی صبر کرنے کی کوشش کی۔۔۔ پتا نہیں کامیاب ہو پائی بھی کہ نہیں۔۔۔"

س : "آپ کی کمزوری اور طاقت؟"

ج : "طاقت۔۔۔ اللہ جی پر یقین اور یقین یہ کہ اللہ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے اور کمزوری شاید کچھ بھی نہیں۔"

س : "خوشگوار لمحات کیسے گزارتی ہیں؟"

ج : "نارمل سی زندگی ہے۔۔۔ خوشی ملی بھی تو ہنس کر گزار لیتی ہوں یا پھر ڈائری کے کچھ ورق اللہ جی سے گلوں شکوں سے پر ہو جاتے ہیں۔"

س : "آپ کے نزدیک دولت کی اہمیت؟"

ج : "بس اتنی سی اہمیت کہ میری ہر خواہش ضرورت بننے سے پہلے پوری ہو جائے۔۔۔ دولت کی بدولت تشنہ لب رہ جانا ایک عجیب سی اذیت دیتا ہے۔۔۔ اس لیے اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔"

س : "کیا بھول جاتی ہیں اور معاف کر دیتی ہیں؟"

ج : "بھول جانا بہت ناممکن لگتا ہے مجھے۔۔۔ معاف

کر دیتی ہوں... بس معاف کیے گئے شخص کو پھر کبھی نہیں ملنا چاہتی... اس کے کہے گئے الفاظ جوں کے توں میرے کانوں میں زہر انڈیلتے ہیں اور مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔"

س : "کوئی عجیب خواہش؟"

ج : "اک کف دست میدان ہو اور میں بالکل اکیلی چلتی جاؤں... بس صرف راستہ ہی راستہ ہو... اس راستے کی کوئی منزل نہ ہو۔"

س : "برکھا رت کو کیسے انجوائے کرتی ہیں؟"

ج : "بس دور سے دیکھتی ہوں... اس میں بھیگ جانے کے احساس سے بھی الجھن ہوتی ہے۔"

س : "آپ جو ہیں وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتیں؟"

ج : "پتا نہیں اب کیا ہوں... کچھ بھی تو خاص نہیں... تب بھی کچھ نہ ہوتی۔"

س : "آپ کو کیا چیز متاثر کرتی ہے؟"

ج : "بے تحاشا بیٹیوں سے محبت کرنے والے باپ بہت بہت متاثر کرتے ہیں... محبت کے سچے قصے جہاں محبت "امر" ہو جاتی ہے بہت متاثر کرتے ہیں۔"

س : "کوئی ایسا ڈر جس نے آج بھی خوف زدہ کیا ہوا ہو؟"

ج : "غلط فہمیوں کے بل پر فیصلہ سنانے والے سفاک لوگوں سے ڈر لگتا ہے اور اب بہت خوف آتا ایسے لوگوں کا مزید اپنی زندگی میں سوچنا بھی۔"

س : "کیا آپ نے وہ پالیا جو پانا چاہتی ہیں؟"

ج : "زندگی کے ان 17 سالوں میں میں نے بہت کچھ کھویا... لیکن میں نے پایا یہ کہ میری زندگی میں کہیں بھی "ناشکری" کا لفظ نہیں ہے قسمت سے کوئی شکوہ نہیں اور نہ ہی اللہ کے بندوں سے کوئی شکوہ ہے۔"

س : "متاثر کن کتاب، مصنف، مووی؟"

ج : "پیر کامل، دیمک زدہ محبت، نمرہ احمد" مقدر کا سکندر۔"

س : "مطالعہ کی اہمیت؟"

ج : "بہت زیادہ اہمیت ہے ہماری سوچوں کو نئی راہیں ملتی ہیں... آگہی و شعور کے نئے نئے در کھلتے ہیں۔"

س : "آپ کا غرور؟"

ج : "بھلا کسی چیز پر غرور بھی کیا جا سکتا ہے... کب ہم سے کیا چھین جائے ہم نہیں جانتے... تو کیسا غرور... میں نہیں کرتی... مجھے خوف آتا ہے اس کا انجام دیکھنے سے... گر کر خالی ہاتھ رہ جانے سے۔"

س : "پسندیدہ شخصیت؟"

ج : "آپ صلی اللہ علیہ وسلم، مولانا طارق جمیل"

س : "پسندیدہ مقام؟"

ج : "زیادہ گھومی پھری نہیں ہوں۔ لیکن اسلام آباد کی خوب صورت، پہاڑیوں پر ڈوبتا سورج اور وہاں کا سر سبزہ جو شام کے مدھم اجالوں میں بہت دلکش لگتا ہے۔"

✡ ✡

کچھ موتی چنے ہیں

ادارہ

گلے شکوے

اوروں کا حال تو معلوم نہیں، لیکن اپنا تو یہ نقشہ رہا کہ کھیلنے کھانے کے دن پانی پت کی لڑائیوں کے سن یاد کرنے اور جوانی دیوانی نپولین کی جنگوں کی تاریخیں رٹنے میں کٹی۔ اس کا تعلق تمام عمر رہے گا۔ جو راتیں، سکھوں کی لڑائیوں کے سن حفظ کرنے میں گزار دیں، وہ ان کے لطیفوں کی نذر ہو جاتیں تو زندگی سنور جاتی۔

محمود غزنوی لائق صد احترام سہی لیکن ایک زمانے میں ہمیں اس سے یہ شکایت رہی کہ سترہ حملوں کے بجائے اگر جی کڑا کر کے ایک ہی بھرپور حملہ کر دیتا تو آنے والی نسلوں کی بہت سی مشکلات حل ہو جاتیں بلکہ وہ پیدا ہی نہ ہوتیں۔ (ہمارا اشارہ مشکلات کی طرف ہے۔)

مشتاق احمد یوسفی کی کتاب سے انتخاب)

سیدہ نسبت زہرا۔ کہروڑ پکا

آسمان

ذرا نظر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھو کتنا اونچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی اس پر سے گرے تو بہت چوٹ آتی ہے۔ بعض لوگ آسمان سے گرتے ہیں تو کھجور میں اٹک جاتے ہیں۔ وہیں بیٹھے کھجوریں کھاتے رہتے ہیں۔ لیکن کھجوریں بھی تو کہیں کہیں ہوتی ہیں۔ ہر جگہ نہیں ہوتیں۔

کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں آسمان اتنا اونچا نہیں ہوتا تھا۔ غالب نام کا شاعر جو دو سو سال پہلے ہوا ہے۔ ایک جگہ کسی سے کہتا ہے۔ کیا آسمان کے برابر نہیں ہوں میں۔ جوں جوں چیزوں کی قیمتیں اونچی ہوتی گئیں۔ آسمان ان سے باتیں کرنے کے لیے اوپر اٹھتا گیا۔ اب چیزوں کی قیمتیں نیچے آئیں نہ آسمان نیچے اترا۔ ایک زمانے میں آسمان پر صرف فرشتے رہا کرتے تھے۔ پھر ہما شما جانے لگے۔ جو خود نہیں جا سکتے تھے ان کا دماغ چلا جاتا تھا۔ یہ نیچے دماغ کے بغیر ہی کام چلا لیتے تھے۔ بڑی حد تک اب بھی یہی صورت حال ہے۔ پیارے بچو۔ راہ چلتے آسمان کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے تاکہ ٹھوکر نہ لگے۔ جو زمین کی طرف دیکھ کر چلتا ہے اسے ٹھوکر نہیں لگتی۔

(ابن انشاء کی کتاب اردو کی آخری کتاب سے اقتباس)

نوال افضل گمن۔ گجرات

مشکل مرحلہ

انسان کے لیے سب سے مشکل مرحلہ وہ ہوتا ہے جب اس کا دل کسی چیز کی گواہی دے رہا ہو مگر اس کی زبان خاموش ہو، جب اس کا دماغ چلا چلا کر کسی چیز کی صداقت کا اقرار کر رہا ہو مگر اس کے ہونٹ ساکت ہوں۔"

(عمیرہ احمد)

نزہت۔ لاہور

غم کا پیمانہ

"وہ غم کا پیمانہ کیا ہے کوئی اس راز کو نہیں سمجھ سکتا۔ غم میں گھرے انسان کو اپنا دکھ ہی سب سے بڑا نظر آرہا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس سے زیادہ دکھی تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔"

(عنیزہ سید)

لائبہ نور۔ کراچی

تقدیر اور تدبیر

انسان دو پاؤں کا جانور ہے۔ اس کا ایک پاؤں تدبیر سے اٹھتا ہے اور دوسرے قدم کو اس کی قسمت اٹھاتی ہے۔ تمہارے ڈی این اے نے یہ بات طے کر دی تھی کہ تمہاری آنکھوں اور بالوں کا رنگ کیا ہوگا۔ یہ بات بھی طے ہے کہ تمہارا قد اتنا ہی ہوگا۔ یہ تمہاری قسمت ہے۔

اور ان بالوں کو اس رنگ کو اور اس قد کو جو چار چاند میک اپ اور ہیل والی جوتیاں لگاتی ہیں وہ تدبیر ہے۔

قسمت گندھی ہوئی مٹی ہے کوئی اس سے اینٹیں بناتا ہے۔ کوئی کوزہ تیار کرتا ہے۔ کوئی اس مٹی میں پھول لگاتا ہے۔ ٹوب روز کے۔

(اشفاق احمد۔۔۔ من چلے کا سودا)

حمراواجد۔ کراچی

حلال روزی

"کیا تو اتنا بھی نہیں جانتا کہ پاک رزق سے لہو میں ایسی مثبت لہریں ہوتی ہیں جن سے روح میں کوئی مغایرت پیدا نہیں ہوتی۔ جس وقت حلال رزق پیٹ میں پہنچتا ہے تو انسان رب کی ثناء اور اس کے احکامات کا خود بخود پابند ہو جاتا ہے۔ لیکن جب رزق حرام جسم کے اندر داخل ہوتا ہے تو منفی لہروں کا جال لہو میں پھیل جاتا ہے اور ہر جرثومہ کی زندگی منفی طور پر متاثر ہوتی ہے اور وہ وقت سے پہلے ٹوٹنے لگتا ہے۔"

(بانو قدسیہ۔۔۔ راجا گدھ)

طیبہ سعدیہ عطاریہ کنھالہ

پاکستان

پاکستان وہ واحد ملک ہے جو دنیا سے اللہ کے نام پر لیا گیا تھا۔ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے کیوں کہ اللہ کے نام پر دی گئی چونی اٹھنی بھی ضائع نہیں ہوتی کوئی ملک کیسے ہوگا۔

عہد الست۔۔۔ تنزیلہ ریاض

صبا کرن اسلم۔ ٹھٹھہ گلاب سنگھ گجرانوالہ

اختیار

کچھ بھی برباد کرنے کی طاقت انسان کے ہاتھ میں ہے نہ اختیار میں۔۔۔ حکم "کن" اور عمل (فیکون) رب کی خوبی ہے اس کے بندوں کی نہیں۔

(یارم۔۔۔ سمیرا حمید)

شازیہ ارجاز۔ فیصل آباد

ڈسپلن

فوج ڈسپلن کا نام ہے کہتے ہیں اصلی فوجی وہ ہے جسے افسر دس روپے دے کر کہے۔

"جاؤ۔۔۔ اس کی پجارو خرید کر لاؤ۔" تو آگے سے یہ بھی نہ پوچھے۔

"سر۔۔۔ کتنی لانی ہیں؟"

یس سر۔۔۔ یس سر۔۔۔ کہہ کر لینے نکل جائے۔

حالانکہ ہمارے خیال میں وہ بھی اصل فوجی نہیں ہے۔ اصلی جوان وہ ہے جو دس روپے میں پجارو لے بھی آئے۔

یونس بٹ۔۔۔ عکس بر عکس

وثیقہ زمرہ۔ سمندری

بیڑیاں

یہ پازیب زیور ہے مگر لگتا ہے زیور کی شکل میں عورت کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ عورت کے پیروں میں لوہے کے بجائے سونے چاندی کی بیڑیاں ڈال دی جاتی ہیں۔ کتنی چالاک ہے یہ مردوں کی ذات جیولر بھی تو مرد ہی ہوتا ہے۔ آرائش کا نام دے کر عورت کو جکڑ دیتے ہیں۔ یہ مرد۔۔۔

(اقبال بانو۔۔۔ گونگے دکھ)

صائمہ۔ واپڈا ٹاؤن

✲ ✲

شعاع عمیر

فرمان الٰہی

★ اور (اے مسلمانوں) کافروں کے تعاقب میں سستی نہ کرو، اگر تم تھک گئے ہو تو بے شک جیسے تم تھکے ہو وہ (بھی) تھک چکے ہیں اور (تم کو اتنی قوت بھی ہے کہ) تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں (اور) اللہ دانا اور حکمت والا ہے۔

★ بے شک (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے (یہ مقدس) کتاب تمہاری طرف سچائی کے ساتھ اتاری ہے، تاکہ تم اس موافق جو اللہ نے تمہیں تعلیم کیا ہے لوگوں (کے جھگڑوں) میں فیصلہ کرو اور (خبردار) تم خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بننا۔

(سورہ النساء، آیت نمبر 104-105)

رشیدہ فیض۔۔۔ جام پور

ارشادات نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

☆ ایمان دار آدمی کو جب خوشی حاصل ہوتی ہے تو وہ شکر کرتا ہے، اسے دکھ پہنچتا ہے، تو صبر کرتا ہے اور یہ دونوں باتیں اچھی ہیں۔

☆ جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا۔ اسے آخر کار دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔

☆ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ اچھا عمل کون سا ہے؟ فرمایا۔۔۔ کھانا کھلانا اور واقف، ناواقف کو سلام کرنا۔

☆ جس علم سے فائدہ نہ اٹھایا جائے، وہ اس خزانے کی طرح ہے، جو کہیں خرچ نہ ہو۔

☆ ہر منزل کا جس طرح راستہ ہے، اسی طرح جنت کا راستہ علم ہے۔

☆ اگر تم دوسروں کی مدد نہیں کر سکتے تو برے کاموں سے بچے رہو اور نیکی کی تعلیم دو، یہ ہی تمہارا صدقہ ہے۔

☆ کسی نے آپ صلی اللہ علیہ سے پوچھا نجات کس طرح مل سکتی ہے، فرمایا زبان پر قابو رکھنے سے، آوارہ نہ پھرنے سے اور گناہوں پر آنسو بہانے سے۔

☆ سب سے بڑا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔

امینہ شریف۔۔۔ کراچی

نفس پر قابو

حضرت ابو حازم ایک روز قصاب کے قریب سے گزرے۔ آپ نے گوشت کی طرف دیکھا۔ تو قصاب نے کہا۔ "لے لیجیے اچھا عمدہ اور فربہ ہے۔" فرمایا۔
"میرے پاس قیمت نہیں ہے۔" قصاب نے کہا۔
"لے لیجیے۔ میں مہلت پر دیتا ہوں جب پیسے ہوں ادا کر دیجیے گا۔" حضرت ابو حازم نے فرمایا۔
"میں اپنے نفس کو مہلت دے دوں گا۔"

فوزیہ ثمربٹ۔۔۔ گجرات

لفظوں کے موتی

☆ دعا اپنے لیے مانگنا عبادت ہے اور دعا دوسروں کے لیے مانگنا خدمت ہے۔ عبادت سے جنت ملتی ہے اور خدمت سے خدا ملتا ہے۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ)

☆ تجربہ ہی سب سے بڑا استاد ہے (حضرت سفیان ثوری رحمتہ اللہ علیہ)

☆ جب فقیر کامل ہوتا ہے تو بس اللہ ہوتا ہے۔
(حضرت سلطان باہو رحمتہ اللہ علیہ)

☆ اچھا انسان تو وہ ہے جو کسی کا دیا ہوا دکھ تو بھلا دے مگر کسی کی دی ہوئی محبت کبھی نہ بھلائے۔ (حضرت علی رضی اللہ عنہ)

☆ جس کو تم چاہو اس کو کبھی آزمانا مت کیونکہ اگر وہ بے وفا بھی نکلا تو دل تمہارا ہی ٹوٹے گا۔

سدرہ وزیر..... خوشاب (چیل)

خلیل جبران نے کہا

1 بے شک وہ ہاتھ جو کانٹوں کے تاج بناتے ہیں۔ ان ہاتھوں سے بہتر ہیں، جو کچھ نہیں کرتے۔

2 جس چیز کا ہمیں اشتیاق ہو اور وہ ہمیں نہ حاصل ہو۔ وہ ہمارے دل کو اس چیز سے زیادہ محبوب ہوتی ہے جو ہمیں حاصل ہو۔

3 تمہیں اندیشہ ہے جبکہ فکر تمہارے گھر کی مشرقی دیوار کا ایک نیا روشن دان ہے۔

دعائے سحر..... فیصل آباد

مال صدقے

دنیا میں تین قسم کے مرد پائے جاتے ہیں۔

1 "یورپین مرد" ان کی ایک بیوی اور ایک گرل فرینڈ ہوتی ہے اور یہ زیادہ پیار اپنی بیوی سے کرتے ہیں۔

2 "امریکن مرد" ان کی بھی ایک بیوی اور ایک گرل فرینڈ ہوتی ہے لیکن یہ زیادہ پیار اپنی گرل فرینڈ سے کرتے ہیں۔

3 "پاکستانی مرد" ان کی ایک بیوی اور چار گرل فرینڈ ہوتی ہیں لیکن یہ زیادہ پیار اپنی ماں سے کرتے ہیں۔

حمرا واجد..... کراچی

یاد رکھیے

☆ بد صورت چہرہ بہتر ہے بد صورت دماغ سے۔

☆ کامیابی کے دو زینے لگن اور خود اعتمادی ہیں۔

☆ محبت کرنے والا دل ہمیشہ جوان رہتا ہے۔

☆ تکلف کی زیادتی محبت کی کمی کا باعث بنتی ہے۔

☆ انسان کی فطرت اس کے چھوٹے چھوٹے کاموں سے معلوم ہوتی ہے۔

☆ بد ترین شخص وہ ہے جو توبہ کی امید پر گناہ کرے اور زندگانی کی امید پر توبہ نہ کرے۔

☆ ایک ایسی غلطی جو آدمی میں عاجزی پیدا کر دے وہ اس کارنامے سے بہتر ہے جو غرور پیدا کرے۔

☆ گناہ کسی نہ کسی صورت دل کو بے چین رکھتا ہے۔

☆ ہروقت کی سوچ بھیانک رخ اختیار کر لیتی ہے لہٰذا ہروقت سوچنا چھوڑ دو۔

☆ یادیں تلخ بھی ہوتی ہیں اور شیریں بھی۔

فوزیہ..... گجرات

پرورش کے گہوارے

ایک عورت کی گود میں جب "بچہ" آتا ہے تو اس پر نبیوں جیسی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ ایک ایسا فرض جس میں غفلت کی گنجائش نہیں ہوتی۔

جب ایک انسان کو پرورش کے لیے دوسرا انسان دیا جاتا ہے تو گویا ساری انسانیت کی لگامیں اس کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہیں کہ چاہو تو اسے ابلیس بنا دو کہ کل کو ساری انسانیت کے لیے وبال بن جائے..... اور چاہو تو وہ بندہ بشر بنا دو جو اپنے آگے پیچھے اور دائیں بائیں خیر کی روشنی بکھیرتا چلا جائے۔

سارے انسان "خیر" ہوتے ہیں..... بس ان کی پرورش کے گہوارے ان کو یا تو پھول بنا دیتے ہیں یا پتھر۔

اذکی..... فیصل آباد

بچپن کی یادیں

امی کی گود اور ابو کے کندھے
نہ روزگار کی سوچ نہ زندگی کے ہنگمے
نہ کل کی فکر نہ مستقبل کے سپنے
لیکن.....!
اب کل کی ہے فکر اور ادھورے ہیں سپنے
مڑ کر دیکھو تو بہت دور ہیں اپنے
منزلوں کو ڈھونڈتے ہوئے کہاں کھو گئے ہم؟
کیوں اتنی جلدی بڑے ہو گئے ہم.....؟

سونیا عامر..... کراچی

بُشریٰ محمود

امینہ ملک، کی ڈائری میں تحریر

پیارے وطن کے حوالے سے ایک خوبصورت نظم

کسی نے سچ کہا ہے یہ،

محبت اور کہانی میں کوئی رشتہ نہیں ہوتا
مگر میری محبت تو
کہانی ہی کہانی ہے
محبت کی کہانی میں
کوئی راجہ نہ رانی ہے
نہ شہزادہ نہ شہزادی
محبت کی کہانی تو
مسافت ہی مسافت ہے
محبت کی مسافت اور
ضرورت کی مسافت میں
مسافر واپسی کے سارے امکان پاس رکھتا ہے
محبت کی مسافت میں
مسافر کے پلٹنے کا کوئی رستہ نہیں ہوتا
جو ساری کشتیاں اپنی
جلا دیتے ہیں ساحل پر
کہ ناامید ہونے پر
پلٹنا بھی اگر چاہیں
تو واپس جا نہیں پائیں
وہیں غرقاب ہو جائیں
محبت کی کہانی میں مسافت کی بشارت تھی
مسافت طے ہوئی تو پھر
جلا ڈالی تھیں میں نے بھی
وہیں سب کشتیاں اپنی

جہاں پہلا پڑاؤ تھا
شکستہ جسم تھا میرا
مرے سینے میں گھاؤ تھا
بھڑکتا اک الاؤ تھا
کسی کی چاہ میں سب کچھ لٹا کر
آ گیا تھا میں
کہاں پر آ گیا تھا میں
جہاں پہچان کا اپنی
حوالہ ہی نہیں ملتا
حوادث کے تھپیڑوں سے
سنبھالا ہی نہ ملتا تھا
شب تیرہ سے نکلا تھا
اجالوں کی تمنا میں
مگر مجھ کو کسی جانب
اجالا ہی نہ ملتا تھا
مگر ہمت نہیں ہاری
یہاں تک آ گیا ہوں میں
جہاں ہر سو اُجالا ہے
مری پہچان ہے اپنی، وطن میرا حوالہ ہے
مجھے اس نے سنبھالا ہے
اسے میں نے سنبھالا ہے
یہی میرا حوالہ ہے
یہی میرا حوالہ ہے

• **ظلِّ ہما، کی ڈائری میں تحریر**

فرحت عباس شاہ کی غزل

لاکھ دوری ہو مگر عہد نبھاتے رہنا
جب بھی بارش ہو میرا سوگ مناتے رہنا

تم گئے ہو تو سرِ شام یہ عادت ٹھہری
بس کنارے پہ کھڑے ہاتھ ہلاتے رہنا

جانے اس دل کو یہ آداب کہاں سے آئے
اس کی راہوں میں نگاہوں کو بچھائے رہنا

ایک مدت سے یہ معمول ہوا ہے اب تو
آپ ہی روٹھنا اور خود ہی مناتے رہنا

تم کو معلوم ہے فرحت کہ یہ پاگل پن ہے
دور جاتے ہوئے لوگوں کو بلاتے رہنا

اقصیٰ ناصر، عذرا ناصر، کی ڈائری میں تحریر
حکیم ناصر کی غزل

وقتِ رخصت زندہ رہنے کی سزا دے جائے گا
زندگی کی وہ مجھے آ کر دعا دے جائے گا

اس سے مل کر یاد وہ بیتے ہوئے دن آ گئے
یہ خبر کب تھی کہ شعلوں کو ہوا دے جائے گا

بے وفائی کی وہ مجھ پر لاکھ رکھ کر تہمتیں
جانے والا یہ محبت کا صلہ دے جائے گا

کب خبر تھی ظلم ایسا بھی کرے گا چارہ گر
زہر کے بدلے وہ ظالم پھر دوا دے جائے گا

وقت بھی جس کا نہ مرہم ہو سکے گا سوچ لو
زخم ایسے بھی وہ ناصر بے وفا دے جائے گا

ثوبیہ رفیق، کی ڈائری میں تحریر
خالد ایاز ساحل کی غزل

ایسے میں کوئی ہجر کی صورت نہیں رہتی
جب طالبِ دیدار کو حاجت نہیں رہتی

گل کر دیا یہ سوچ کے ہر ایک دیئے کو
وہ ہوں تو چراغاں کی ضرورت نہیں رہتی

جس دور میں نفرت کی زباں عام ہو یارو
اس دور کے لوگوں میں محبت نہیں رہتی

موسم کی طرح لوگ بدلتے ہیں یہاں پر
اک جیسی ہر اک شخص کی عادت نہیں رہتی

اب دیکھتے ہیں روکتا سلطان ہے کیسے
پابند سلاخوں میں محبت نہیں رہتی

ہر شخص کی فطرت میں بدل جانا ہے ساحل
تا دیر کسی سے بھی عداوت نہیں رہتی

فرح بشیر، کی ڈائری میں تحریر
سحر علی کی نظم

اک ادھوری دعا

شب کی دہلیز پر ماند ہوتے ہوئے
ہر ستارے نے دیکھا اسے
رات روتے ہوئے
آنسوؤں کی نمی بھیگے رخسار پہ
سر سے ڈھلکی سبز سی اوڑھنی
ماتمی ہے فضا اس کے سنگھار پہ
طاق راتوں میں اس نے ہے ڈھونڈا بہت
جس کو شدت سے اس نے بھی مانگا بہت
اک ادھوری دعا
اس سے گم ہو گئی

شگفتہ سلیمان

سیدہ نسبت زہرا ________ کہروڑ پکا

بے وجہ نہیں روتا کوئی عشق میں محسن
جسے خود سے بڑھ کر چاہو وہ رلاتا ضرور ہے

گڑیا شاہ ________ کہروڑ پکا

میرے خالی ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا ہوتا !
منزل بن کر منزل تک تو ساتھ دیا ہوتا
مجھ کو کھو کر چپ کیوں بیٹھے ہو
اک بار تو رب سے مجھ کو مانگ لیا ہوتا

حورین زینب ________ کہروڑ پکا

میں چاہتا ہی نہیں تھا اسے لاجواب کرنا
ورنہ جواب میرے پاس اس کے ہر سوال کا تھا
اس کی جیت سے ہوتی ہے خوشی مجھ کو
یہ جواز میرے پاس اپنی ہار کا تھا

نوشابہ منظور ________ بھریا روڈ

بچھڑنے والے تجھے دیکھ کر سوچتی ہوں
تو پھر ملے گا تو کتنا بدل چکا ہوگا

طاہرہ ملک، رضوانہ ملک ________ جلال پور پیر والا

ہر دل میں درد چھپا ہوتا ہے
بیان کرنے کا انداز جدا ہوتا ہے
کچھ لوگ آنکھوں سے درد بہا دیتے ہیں
اور کسی کی ہنسی میں درد چھپا ہوتا ہے

صائقہ شیرازی ________ بوتالہ جھنڈا سنگھ

محبت زندگی کے فیصلوں سے لڑ نہیں سکتی
کسی کو کھونا پڑتا ہے اور کسی کا ہونا پڑتا ہے

مدیحہ نورین مہک ________ برنالی

رکھ لو دل میں سنبھال کر تھوڑی سی یاد میری
رہ جاؤ گے جب تنہا تو کام آئیں گے ہم

حنا فرحان ________ راجن پور

تم کب تھے قریب اتنے میں کب دور رہا ہوں
چھوڑو نہ کرو بات کہ میں تم سے خفا ہوں
رہنے دو کہ اب تم بھی مجھے پڑھ نہ سکو گے
برسات میں کاغذ کی طرح بھیگ گیا ہوں

صدف خان ________ کوئٹہ

تیرے طریق محبت پہ بارہا سوچا
یہ جبر تھا کہ تیرے اختیار کا موسم

اقصیٰ ناصر ________ کراچی

آج پھر ساون ٹوٹ کے برسا ہے
آج پھر کسی کے لہجے میں نمی ہے
پھر سے وحشتوں کے ہالے میں ہوں مقید
آج پھر یادوں کی محفل جمی ہے

صوفیہ ________ کراچی

کھو گیا کھیلتے بچوں کی طرح
وقت کی بھیڑ میں اک پل میرا

یاسمین رؤف ________ کراچی

دل لہو کرتے ہیں کس طرح سخن گوئی میں
تم بھی اس کرب سے اک بار گزر کر دیکھو
سلگتی ترچھی ہیں لکیریں کہ لہو ہے دل کا
رنگ اخلاق کا تصویر میں بھر کر دیکھو

انیسہ ادریس ________ قصور

زندگانی کا سفر تنہا کٹ ہی جاتا
کس لیے راہ محبت کی دکھائی تم نے
کوئی رنجش تھی اگر تم کو تو مجھ سے کہتے
بات آپس کی تھی کیوں سب کو بتائی تم نے

سعدیہ، مریم ___ حیدرآباد

مجھے کیا پتا دکھوں کی قیمت صاحب
میرے اپنے تو مجھے مفت میں دیتے ہیں

حنا کرن ___ پتوکی

کیسے انہیں تلاش کیا جائے عمر بھر
وہ لوگ جو ہواؤں میں آثار ہو گئے
بن، جن کے ایک پل میں کھنڈر ہوا ہے شہر
دل میں کچھ ایسے تم درو دیوار ہو گئے

عذرا ناصر ___ کراچی

غلط اندازے کر رکھے تھے میری خوش گمانی نے
نکل کر خود سے دیکھا تو تنہا ہر طرف میں ہوں

رفعت جبیں ___ ملتان

دو گھڑی کے لیے ایک سا انداز نہیں
دل سے بڑھ کر کوئی دنیا میں دغا باز نہیں

فرح بشیر ___ پھول نگر

قسمت میں جو لکھا ہے وہ آخر ہو کر رہتا ہے
چند لکیریں الجھی سی، اور ہاتھوں میں کیا رکھا ہے

نمرہ، اقرا ___ کراچی

کیوں چپکے سے وہ لوگ اتر جاتے ہیں دل میں
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں ملتے

عذرا ناصر ___ کراچی

کیوں مانگ رہے ہو کسی بارش کی دعائیں
تم اپنے شکستہ درو دیوار تو دیکھو

ندا یوسف ___ فیصل آباد

نہ وفا کا ذکر ہوگا نہ وفا کی بات ہوگی
اب محبت جس سے ہوگی مطلب کے ساتھ ہوگی

مدیحہ فہیم ___ کراچی

یہ میرا حال ہے جس پر ہنسی آ گئی تمہیں
اکثر اسی حال نے ہنستے ہوؤں کو رلا دیا

عائشہ ___ گوجرہ

کسی کے ساتھ پیار سے مذاق ضرور کرنا
مگر کبھی کسی کے ساتھ مذاق سے پیار نہ کرنا

صائمہ حبیبی ___ کراچی

ہر شخص نہیں ہوتا ہر شخص کے قابل
ہر شخص کو اپنے لیے سوچا نہیں کرتے

ثمینہ تاج ___ کراچی

آنکھوں کا ہے فریب یا عکس جمال ہے
آتی ہے کیوں نظر تیری صورت جگہ جگہ

فضہ ___ لاہور

تم تو اپنے ہو تمہیں دل سے نکالیں کیسے
ہم تو دشمن کو بھی بے گھر نہیں ہونے دیتے

آسیہ جاوید ___ علی پور چٹھہ

تم بن نہیں ہے کوئی بھی ہمارا
اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہو نا تم

تحریم ___ محراب پور

اس کے لہجے کے بولنے کی کہانی کو سمجھ کر
اب بھی اسے دل اسے چاہو تو تمہاری مرضی

بشریٰ انیس ___ کراچی

میرے دل کی تسلی کے لیے فقط اتنا ہی کافی ہے
ہوا جو تم کو چھوتی ہے میں اس میں سانس لیتا ہوں

نمرہ، اقرا ___ کراچی

اک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

مریم، درخشندہ ___ کراچی

تم ساتھ تھے تو ہم بھی تھے منزل سے آشنا
اب تم نہیں تو لگتے ہیں رستے عجیب سے

مدیحہ، ندا ___ فیصل آباد

منزلیں ان کا مقدر کہ طلب ہو جن کو
بے طلب لوگ تو منزل سے گزر جاتے ہیں
جن کی آنکھوں میں ہوں آنسو انہیں زندہ سمجھو
پانی مرتا ہے تو دریا بھی اتر جاتے ہیں

صائمہ حبیبی ___ کراچی

ماحول کی تپش کا تقاضا ہے بس یہی
سائے کو دیکھ لوں نہ تناور شجر کو دیکھ
ہاں یہ ضروری شرط ہے منزل کے واسطے
راہ سفر نہ دیکھ شریکِ سفر کو دیکھ

نسرین یوسف ___ گوجرہ

ہر اک پاؤں مجھے ڈھونڈتا ہوا گزرا
نہ جانے کون سی منزل کا مسافر ہوں میں

روبینہ شریف

مبالغہ آرائی

استانی نے بچوں سے پوچھا کہ ایسے جانور کا نام بتاؤ جو بہت تیزی سے بڑھتا ہے۔ ایک بچے نے کھڑے ہو کر کہا۔

"مچھلی۔"

استانی نے کہا۔ "شاباش! کیا تم اس کے بڑھنے کی رفتار بتا سکتے ہو؟"

جی ہاں مس! "پچھلے ہفتے ابو جان نے ایک مچھلی پکڑی تھی' اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ روزانہ دو تین انچ کا اضافہ کر دیتے ہیں اور ابھی اسی رفتار سے اضافہ جاری ہے۔" بچے نے کہا۔

اریبہ محمود۔۔۔ لاڑکانہ

چھٹی

ساس نے اپنے فوجی داماد کو خط لکھا کہ۔۔۔ "میری بیٹی کو گھر میں اکیلا چھوڑ کر تم سرحد پر موج مستی کر رہے ہو' شرافت سے میری بیٹی کے پاس آجاؤ چھٹی لے کر' کوئی بھی بہانہ بنالو۔"

فوجی داماد نے ساس کو ایک ہینڈ گرنیڈ بھیجا اور ساتھ خط میں لکھا۔ "ڈیئر ماں جی! اگر آپ اس کی پن کھینچ لیں تو مجھے تین دن کی چھٹی مل جائے گی۔"

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

لیکچر

ایک شرابی کو پولیس نے رات تین بجے روک لیا۔

پولیس۔۔۔ "اتنی رات کو کہاں جا رہے ہو؟"

شرابی۔۔۔ "میں شراب' سگریٹ نوشی اور ان کے انسانی جسم پر پڑنے والے برے اثرات پر لیکچر سننے جا رہا ہوں۔"

پولیس۔۔۔ "واقعی؟ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے اس وقت یہ لیکچر دے گا کون؟"

شرابی۔۔۔ "میری بیوی جناب!"

مریم ریاض۔۔۔ سبی

تحقیقات

دو سیٹوں والا ہیلی کوپٹر قبرستان میں گر کر تباہ ہو گیا۔ گورنمنٹ نے ایک سردار آفیسر کو تحقیقات کے لیے بھیجا۔ دو گھنٹے بعد اس نے اطلاع دی کہ۔

"931 لاشیں مل چکی ہیں' مزید کھدائی جاری ہے۔"

عائشہ بشیر۔۔۔ بھائی پھیرو

دھماکا

گرلز کالج کے باہر بم بلاسٹ کے بعد نیوز رپورٹر زخمی لڑکی کے پاس پہنچا اور اس سے پوچھا۔

"جب بم گرا تو کیا وہ ایک دم سے پھٹ گیا؟"

زخمی لڑکی نے غصے سے کہا۔ "جی نہیں! وہ رینگتے ہوئے میرے قریب آیا اور نہایت باادب ہو کر پیار سے بولا۔ "باجی۔۔۔ ٹھاہ۔۔۔"

نورین ظفر۔۔۔ کوٹ مٹھن

دعا

بیوی نے نماز پڑھ کر ہاتھ اٹھائے' لیکن دعا مانگے بغیر ہی نیچے کر لیے۔

شوہر۔۔۔ "یہ کیا؟ دعا کیوں نہیں مانگی؟"

بیوی۔۔۔ مانگنے لگی تھی کہ اللہ آپ کی تمام

پریشانیاں ختم کردے۔ لیکن پھر خیال آیا کہ وہ کہیں میں ہی نہ مرجاؤں۔"

صائمہ خان..... راجن پور

پولیٹکس

بیٹا! "ابو یہ پولیٹکس کیا ہے؟"

باپ..... "تمہاری ماں گھر چلاتی ہے' اسے حکومت مان لو۔ گھر کی ماسی کو وزیر مان لو۔ میں کماتا ہوں مجھے مزدور مان لو..... تم اپنے آپ کو ملک کی عوام مان لو۔ چھوٹے بھائی کو ملک کا مستقبل مان لو۔"

بیٹا! "کل رات میں نے دیکھا کہ وزیر مزدور کے ساتھ کچن میں تھا۔ حکومت سو رہی تھی' عوام کی کسی کو فکر نہیں تھی اور ملک کا مستقبل رو رہا تھا۔"

شائستہ..... چکوال

بیوپار

ایک یہودی ایک فرانسیسی کے پاس ایک قالین بیچنے کے لیے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے قالین کی ضرورت نہیں۔" فرانسیسی نے کہا۔

"جناب یہ بہت عمدہ' لیکن بہت سستا قالین ہے۔" یہودی نے ترغیب دی۔

"پھر بھی میں اسے نہیں خریدوں گا۔"

"مگر جناب کیوں۔"

"تمہارے قالین سے بو آتی ہے۔" فرانسیسی نے کہا۔

یہودی یک دم طیش میں آگیا اور بولا۔ "آپ جھوٹ بول رہے ہیں بو قالین سے نہیں مجھ سے آرہی ہے۔"

ثنا کاشف..... کراچی

عبادت

مالک مکان کرائے دار سے کرایہ لینے آیا تو کرائے دار نے جملہ شکایات میں سے ایک اہم شکایت کی طرف مالک کی توجہ مبذول کراتے ہوئے کہا۔

"جناب بڑے کمرے کا شہتیر رات کے وقت کڑکڑ کی آوازیں نکالتا ہے براہ مہربانی فرما کر شہتیر بدلوا دیں۔"

مالک مکان نے کرائے دار کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"آپ گھبرائیے مت یہ شہتیر اللہ کی عبادت کرتا ہے' آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ گھر میں برکت رہتی ہے۔"

کرائے دار نے برجستہ جواب دیا۔ "جناب مجھے تو خدشہ ہے کہ جوش عبادت میں اتنی تڑپ نہ پیدا ہوجائے کہ کہیں یہ سجدے میں آجائے۔"

غزل..... ملتان

انتخاب

مہوش: "پاپا نے کہا ہے کہ اگر اس دفعہ بی ایس سی میں فیل ہوئی تو شادی کردوں گا۔"

ناز نے پوچھا۔ "تو پھر تم نے کتنی تیاری کی؟"

مہوش نے جواب دیا۔ "بس ولیمہ کا سوٹ رہ گیا ہے۔"

ثناء کاشف۔ کراچی

بھولا پن

ایک لڑکا بڑی محبت سے لڑکی سے کہتا ہے۔

"تمہارے دل میں آجاؤ!!!"

لڑکی غصے سے۔

"چپل اتاروں کیا؟"

لڑکا معصومیت سے کہتا ہے۔

"پگلی ایسے ہی آجاؤ مسجد تھوڑی ہے۔"

کرن سعید۔ راجن پور

دریافت

بیوی اپنے (شوہر سے) "میں حیران ہوں کہ شادی سے پہلے تم کہا کرتے تھے کہ پیاری میری دنیا تم ہو۔"

شوہر نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "جب میں اپنی دنیا کہا کرتا تھا اس وقت میں نے جغرافیہ نہیں پڑھا تھا اب تو میں کئی دنیائیں دریافت کرچکا ہوں۔"

بیا اسامہ انجم۔ فیصل آباد

کرن کا دسترخوان

خالدہ جیلانی

مغلئی چکن

اشیاء :

چکن بون لیس	500 گرام
ادرک لہسن	دو کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
سرخ مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
بھنا ہوا زیرہ	ایک کھانے کا چمچہ
بھنا کٹا دھنیا	ایک کھانے کا چمچہ
ٹماٹر	پانچ عدد باریک کٹے ہوئے
کوکونٹ ملک پاوڈر	تین کھانے کے چمچے
پسے ہوئے بادام	تین کھانے کے چمچے
فریش کریم	آدھا کپ
ادرک	دو چمچے باریک کٹی ہوئی
ہرا دھنیا	تین کھانے کے چمچے (کٹا ہوا)
ہری مرچ	چار عدد
گرم مسالا	آدھا چائے کا چمچہ (پسا ہوا)
آئل	آدھا کپ

ترکیب :

ایک پین میں تیل گرم کریں ادرک ' لہسن ڈال کر فرائی کرلیں۔ اب اس میں چکن ڈال کر فرائی کریں۔ پھر اس میں چاپڈ ٹماٹر اور مسالے ڈال کر پکائیں یہاں تک کہ چکن گل جائے۔ اب اس میں کوکونٹ پاوڈر تھوڑے سے پانی میں حل کر کے ڈالیں ساتھ پسے ہوئے بادام ڈال کر پانچ منٹ ہلکی آنچ پر پکائیں۔ آخر میں ہری مرچ ' ہرا دھنیا ' ادرک اور گرم مسالا ڈال کر مکس کریں اور چولہا بند کردیں۔ ڈش میں نکال کر فریش کریم ڈالیں اور شیرمال کے ساتھ پیش کریں۔

قصوری کھڑا مسالا چکن

اشیاء :

چکن (8 ٹکڑے کروالیں)	ایک کلو
دہی	3/4 کپ
پیاز (چوپ کرلیں)	3 کھانے کے چمچے
ٹماٹر (چوپ کرلیں)	2 کھانے کے چمچے
ادرک پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ثابت لال مرچ	چار ' پانچ عدد
لال مرچ	1 چائے کا چمچہ (پسی ہوئی)
دھنیا (پسا ہوا)	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
بڑی الائچی	3-2 عدد
چھوٹی الائچی	3-2 عدد
دار چینی	2-1 اسٹک
لونگ	4-3 عدد
ہری مرچ	3 عدد
قصوری میتھی	دو کھانے کے چمچے
کریم	دو کھانے کے چمچے
تیل	5-4 کھانے کے چمچے

ترکیب :

چکن کو دہی اور نمک ملا کر 1/2 گھنٹے تک رکھیں۔ ایک کڑاہی میں تیل گرم کریں۔ زیرہ ڈالیں ' ثابت لال مرچ ہاتھ سے توڑ کر ڈالیں ' ثابت گرم مسالا ڈالیں ' کڑکڑانے لگے تو پیاز ڈالیں گولڈن براؤن کریں۔ ادرک ' لہسن ڈالیں ' ایک منٹ بھون کر آنچ ہلکی کر کے لال مرچ ' پسی ہری مرچیں ' پسا دھنیا ڈالیں مکس کریں ' ٹماٹر ڈالیں بھون لیں۔ ٹماٹر گل جائیں اور تیل الگ ہو جائے تو چکن ڈالیں تین منٹ تیز آنچ پر بھون لیں ' رنگ بدل جائے تو 4-3 کپ پانی ڈالیں ڈھک کر چکن کو گلا لیں۔ تیل الگ ہو جائے اور گریوی بن جائے تو قصوری میتھی ' کریم مکس کریں اور ڈش میں نکال کر ادرک ' ہرا دھنیا چوپ کر کے اوپر ڈالیں گرم گرم سرو کریں۔

سندھی بریانی

اشیاء :

بکرے کا گوشت یا چکن بوٹی ایک کلو

چاول	ایک کلو
(دھو کر بیس منٹ کے لیے بھگو دیں)	
دہی	ایک پیالی
لال مرچ	ایک کھانے کا چمچہ
دھنیا پاؤڈر	دو کھانے کے چمچے
ادرک لہسن پسا ہوا	ایک کھانے کا چمچہ
گرم مسالا پسا ہوا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
آلو بخارے	ایک پیالی
(اسے ایک پیالی گرم پانی میں بھگو دیں)	
پودینہ	ایک گڈی (باریک کٹی ہوئی)
ہری مرچ	6 عدد
لیموں	4 عدد
تیج پات	3 عدد
آلو	آدھا کلو

ہلکی سی بھانپ دے کر چار چار ٹکڑے ڈیپ فرائی کر لیں

ٹماٹر	4 عدد (باریک کٹی ہوئی)
پیاز	چار ڈلی
گرم دودھ	چوتھائی چائے کا چمچہ
زردہ کا رنگ	چوتھائی چائے کا چمچہ
تیل	ایک پیالی

ترکیب :

سب سے پہلے ایک بڑے پیالے میں گوشت ' دہی ' گرم مسالا ' ہلدی ' مرچ ' دھنیا ' نمک ' ادرک لہسن اچھی طرح ملا کر رکھ لیں۔ ٹماٹر کے بھی چار چار ٹکڑے کر کے Shallow فرائی کر لیں۔ ایک دیگچی میں تیل گرم کریں پیاز ڈال کر گولڈن براؤن کر لیں۔ جب گولڈن براؤن ہو جائے تو آدھی نکال کر اخبار پر پھیلا دیں تاکہ Crisp ہو جائے۔ آدھی میں مسالا ملا ہوا گوشت ڈال دیں ہلکی آنچ میں ڈھکن ڈھانپ کر پکنے دیں۔ جب پانی خشک ہونے لگے تو بھیگے ہوئے آلو بخارے کے بیج نکال کر ڈال دیں ہلکا سا بھون لیں پھر تلے ہوئے آلو ' ٹماٹر اوپر رکھ کر دم پر رکھ دیں۔ تین ہری مرچ تھوڑا سا پودینہ ' دو لیموں کا رس ڈال دیں اب ایک الگ دیگچی میں پانی گرم کریں۔ ساتھ میں ہری مرچ تیج پات پودینہ ڈال کر پانی کو ابال لیں ' پھر بھیگے ہوئے چاول ڈال کر نمک ایک کھانے کا چمچہ سفید سرکہ ڈال کر چاول دو کنی ابال لیں۔ جب دو کنی ابل جائیں تو پانی چھان لیں۔ اب چاول والی دیگچی میں نیچے ذرا سی چکنائی لگا کر آدھے چاولوں کی تہ لگائیں پھر گوشت کی تہ ' تھوڑی سی تلی پیاز ' پھر باقی چاول کی تہ پھر گرم دودھ میں زردہ کا رنگ ملا کر ڈالیں۔ تلی پیاز اور دو لیموں کا رس ڈال کر توے کے اوپر تیز آنچ میں دم لگا دیں۔ دس منٹ بعد ہلکی آنچ کر دیں دس سے پندرہ منٹ بعد سندھی بریانی تیار۔ گرم گرم بریانی دہی کے رائتے کے ساتھ سرو کریں۔

مُدیرہ کرن

اس ماہ کا خط

فوزیہ ثمروٹ ام ہانیہ عمران..... گجرات

زندگی آ بیٹھ ذرا بات تو سن.....
دوست بھول بیٹھے ہیں کچھ تو مشورہ دے

دل نادان روٹھا روٹھا سا محبوب (کرن) سے اس قدر بے وفائی کی امید نہ تھی' بنا کسی قصور کے تحت محفل سے نکال کر محفل سجالی۔ بھلا پوچھے ان سے کوئی ہماری شرکت کے بغیر ان کی محفل میں رنگوں کی بہار کہیں ہو سکتی ہے۔ روٹھے دل اور ٹوٹے دل کے ساتھ شکوے بھری نگاہوں سے جولائی کے ٹائٹل کو دیکھا۔ دونوں ماڈل پیاری لگیں۔ مگر دونوں کے ڈریس کے کلرز ذرا بھی پسند نہیں آئے۔ باقی تو ہر چیز ان پہ جچ رہی تھی۔ "انٹرویو" میں میری فیورٹ فنکارہ صنم سعید سے ملاقات اچھی رہی۔

"میرا پہلا روزہ" میں حیا بخاری سے مل کر خوشی ہوئی ادنی سی اک خواہش ہے کبھی روبرو فیس ٹو فیس کسی رائٹر سے ملاقات ہو جائے۔ "میری بھی سنیے" میں کیا فواد خاں نہیں آسکتے؟ فیروز خان کا انٹرویو تو ہم ہر جگہ پڑھ رہے ہیں۔

سارے گلے شکوے مٹا کر (محبوب کرن سے) نفیسہ سعید کا "ایک ساگر ہے زندگی" کو پڑھا جس کا بے تابی سے انتظار تھا۔ نفیسہ نے دل کو افسردہ کر دیا۔ بے شک اس تحریر کا اختتام ایسا ہی ہونا تھا اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ فرہاد کی موت کا جہاں دکھ تھا وہاں یہ انکشاف کہ وہ زینب سے محبت کرتا ہے حیرانگی کا باعث تھی۔ جن سے امیدیں وابستہ ہوں ان کے تلخ رویے' لاپروائیاں رولا ڈالتی ہیں۔ زینب بے چاری پر بے تحاشا ترس آیا۔ وہاں وجاہت جیسے مرد کے لیے شاباشی کے جملے ہوتے ہیں ایسے بھی مرد ہیں' جو محبت کو اس انداز سے بھی نبھاتے ہیں۔ حبیبہ کے زین شاہ سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ مجھے بھی دل و جان سے اچھا لگا۔ ماں سے محبت کا اتنا تو حق ادا کر سکتی تھی۔

سلسلہ وار ناول "ردائے وفا" مجھے شکایت ہے فرحین اظفر سے یہ کیا بات ہوئی نائلہ بے شک بری تھی۔ غلطی ہوئی اس سے 'اب یہ کیا؟ اس غلطی کی سزا دہرائی جاتی ہے۔ بشیر حسین درندہ' دن دہاڑے بنت حوا کو روند کر چلا گیا۔ نائلہ کو سزا کسی اور طریقے سے ہو سکتی ہے اور یہ کیا عفت کی شادی! اب اتنا ظالم نہ بنیے۔ حسیب کومے میں چلا گیا ماہا تو یہی سمجھے گی کہ وہ دبئی میں بیٹھا عیش کر رہا ہے۔ حدید پوری تحریر میں مظلوم بندہ لگتا ہے نبیلہ ابر راجہ کا "میں گماں نہیں یقین ہوں" چلو نجات ملی ذیان کو وہاب سے۔ عورت عزت و احترام کے لائق ہے نہ کہ تمہارے ناپاک ارادوں کی تکمیل کے لیے۔ چلو جی کہانی میں تھوڑا ٹوئسٹ آیا۔ یہ رنم اور ذیان دیکھتے ہیں ایبک دونوں میں کس کا ہوتا ہے میرا ووٹ تو ذیان کی طرف ہی ہوگا۔ زرنین آرزو "یاری تو میں تیری" بالکل بھی پسند نہیں آیا۔ ہیروئن صاحبہ کے تو نخرے ہی ختم نہیں ہو رہے۔ ساری اسٹوری بس اس کے گرد گھومتی رہی۔ بے چاری خود ساختہ سوچوں پہ عمل کر کے اپنی زندگی خراب کرنے لگی تھی۔ چلیے ہیپی اینڈ پہ ہمیں بھی ہیپی ہی ہونا پڑا' ورنہ (زرنین جی نے ناراض ہونا تھا)۔

ناولٹ میں "ایمرجنسی عیدی" اچھا لگا۔ صد شکر شازیہ کو عقل شریف آہی گئی زبردستی کے بندھن زیادہ مضبوط نہیں ہوتے؟ پھر کسی کے دل کو ویران کر کے وہاں خود کی خوشیوں کے محل کہاں تعمیر ہو سکتے ہیں۔ حرمت کی سننے والی عادت اچھی لگی اور باسط میاں پر بے انتہا کا غصہ۔ شکر ہے حرمت کا بھرم نہیں ٹوٹا' باسط کے سامنے۔

فائزہ جی کا "شاید" اس بار فلسفہ بہت کم تھا۔ مزا نہیں آیا۔ ایک بات ہے سعد کا پر لطف انداز میں بات کرنا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دیتا ہے قسم سے فائزہ جی! سعد پر یہ ظلم مت کرنا 'ام ہانی بس سعد کی ہے تو بس ہے اور سالار تو ویسے بھی خود پسندی کا مارا شخص ہے 'ام ہانی نازک کلی۔ مجھے نہیں لگتا سالار 'سعد جتنا خوش رکھ سکے گا 'ام ہانی کو اور ہاں! فائزہ جی مہ پارہ کا کچھ کیجیے نا 'بے چاری کا غصہ ہمیشہ سوا نیزے پر رہتا ہے۔ اپنی طنزیہ باتوں کے تیر سے 'دوسرے کے سینے زخمی کرتی رہتی ہے کریں کچھ ان کا بھی بندوبست۔

نایاب جیلانی کا "چاند رات" وقت کی کمی کے باعث نہیں پڑھا۔ افسانے تینوں اچھے اور کچھ نہ کچھ درس لیے ہوئے تھے۔ "چھوٹی سی خواہش" پہ دل دکھی ہوا کیسے لوگ پل بھر میں دوسروں کی خوشیاں چھین لیتے ہیں اور پھر خوشیاں ڈھونڈتے ڈھونڈتے سالوں لگ جاتے ہیں۔

کرن کا نیا سلسلہ وار ناول "راپنزل" ابھی نہیں پڑھا۔ مصنفہ بذات خود ایک تعریف ہیں۔ پڑھے بغیر یقین ہے کہ یہ بھی ایک یادگار ناول ہوگا۔ تنزیلہ ریاض کے قلم کی خوب صورتی سے کسی کو انکار ہو سکتا؟۔ مستقل سلسلے اس بار صفحات کم اور پھیکے پھیکے لگے۔

میرے خیال میں ہونے بھی چاہئیں.... وجہ! ما بدولت کی کہیں بھی شرکت نہیں تھی۔ "کچھ موتی چنے ہیں" میں نے بھی کچھ اقتباس بھیجے تھے۔ شامل نہیں کیے 'جس کا مجھے افسوس ہے۔ "نامے میرے نام میں" نہ میری مدیرہ کی غلطی ہے اور نہ ڈاکیا کی۔ یہ میرے دل جان (اف وہ نہیں) میرے پیارے بھائی عمران صاحب کی غلطی شریف ہے۔ موصوف میرا خط ہی پوسٹ نہیں کرتے ہیں اور اپنے بینک کی میز کی دراز میں چھپا کر رکھ دیتے ہیں۔ یعنی کہ یاد نہیں رہا جناب کو۔ نشا نورین اور سویرا قریشی (بنوں) شکر ہے تم دونوں نے میری (کرن میں) کمی محسوس کی۔ حرا قریشی پہ رشک آیا اتنا اچھا خط لکھنے پر۔ بے شک خط آپ کو لیٹ ملے گا مگر شامل ضرور کیجیے گا ورنہ.... اگلے ماہ پھر سے لکھوں گی اور تب تک لکھوں گی جب تک آپ کی محفل میں شرکت نہیں کر لیتی مجھے..... والسلام۔

ج۔ فوزیہ ثمر جی! آپ نے کرن پر سیر حاصل تبصرہ کیا 'بہت اچھا لگا۔ ہمیں اپنے قارئین کی کرن سے یہی وابستگی تو اچھی لگتی ہے۔ آپ کا شکوہ سر آنکھوں پر 'لیکن آپ کا اقتباس "کچھ موتی چنے ہیں" کے لیے ہمیں موصول ہی نہیں ہوا ورنہ ہم ضرور شائع کرتے کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کے بھائی صاحب کی دراز میں رہ گیا ہو۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا دی گئی ہے۔

صبا کرن اسلم.... ٹھٹھہ گلاب سنگھ گجرانوالہ

جولائی کا شمارہ تپتی گرمی میں سکون بن کے آیا۔ سب سے پہلے "نامے میرے نام" میں انٹری دی پر یہ کیا ہمارا تو نام ہی غلط لکھ ڈالا آپ نے 'خیر! دل کو تسلی دے کے قسط وار ناولز پہ چھلانگ لگائی۔ "شاید" فائزہ جی "تسی گریٹ ہو" آپ لفظوں کی پرنسز ہیں۔ تنزیلہ ریاض کا نام دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ مکمل ناول کمال کے تھے۔ "انٹرویو" میں صنم سعید کو پڑھ کر اچھا لگا۔ "کچھ موتی چنے ہیں" بھی کمال کا سلسلہ شروع کیا ہے آپ نے 'اللہ ہمارے کرن کو اور کرن کی پوری ٹیم کو ہمت اور صحت عطا فرمائے 'جو ہمارے لیے اس شاہکار کو ہر ماہ لے کے آتے ہیں۔

ج۔ صبا! ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں کہ آپ کا نام غلط شائع ہو گیا۔ کرن اور ہمارے لیے آپ کی دعاؤں کا بہت شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کی دعا قبول فرمائے۔ (آمین)۔

وثیقہ زمرہ.... سمندری

کیا حال ہے سب ٹھیک ٹھاک ہیں۔ سب سے پہلے ہماری شکایت سنیں کہ کرن 10 '11 کو ملتا تھا اب 13 تاریخ کو ملنے لگا ہے بھئی انتظار جو نہیں ہوتا۔ اس کے بعد "میرا پہلا روزہ" سروے پسند آیا۔ اپنے فیورٹ اداکار فیروز خان سے ملاقات اچھی لگی۔ "مقابل ہے آئینہ" پروا کرن صدیقی آئینہ دیکھتی اچھی لگی۔ "کچھ موتی چنے ہیں" لاجواب۔ "اک ساگر ہے زندگی" 12 اقساط اور وہ بھی زبردست۔ "ردائے وفا" حسیب کے ایکسیڈنٹ سے شاید ماہا کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

"راپنزل" ابھی پہلی قسط ہے تھوڑے سے کردار کے ساتھ کہانی اچھی لگی آگے دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ "میں گماں نہیں یقین ہوں" پڑھتے ہی کھٹ سے فیصلہ کر دیا کہ رنم اور معاذ 'ایک اور ذیان کی جوڑیاں بنی چاہئیں۔ اب دیکھتے

ہیں کہ ہمارا فیصلہ مانا جاتا ہے یا نہیں۔ "چاند رات" نایاب جیلانی لکھیں اور پسند نہ آئے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ "ہاری تو میں تیری" بھی اچھا تھا۔ "شاید" پڑھ کر لگا کہ ہانی سالار سے واپس سعد کے پاس آئے گی۔ "ایمرجنسی عیدی" پسند آیا۔ افسانے تینوں ہی اچھے لگے۔

ج۔ وثیقہ جی! آپ کا 'کرن' کو پسند کرنے کا بے حد شکریہ۔ آپ کا فیصلہ سر آنکھوں پر' دیکھتے ہیں کہ رائٹرز کا فیصلہ کیا ہے۔

نشا نورین..... بوتالہ جھنڈا سنگھ

اس دفعہ کرن کا دیدار بہت دیر سے ہوا۔ اب آتی ہوں کرن کی طرف' دونوں ماڈل اپنے لباس کی نمائش کرتیں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ پھر "حمد باری تعالیٰ"، "نعت شریف" پڑھی' اس کے بعد آخری قسط نفیسہ کا ناول "اک ساگر ہے زندگی" پڑھا۔ ویل ڈن نفیسہ جی! مکمل ناول میں نایاب جیلانی کا مکمل ناول دیکھ کر دل خوشی سے جھوم اٹھا اور نبیلہ جی پلیز ناول کو اینڈ کریں کچھ سمجھ نہیں آرہی ناول کی۔ اور ہمیشہ کی طرح فائزہ جی دل جیت لیتی ہیں کیا بات ہے...

کرن کے باقی سلسلے اچھے تھے۔ افسانے ابھی پڑھ نہیں پائی کیوں کہ کرن بہت لیٹ ملا اور خط نہیں لکھ سکی اور تھینکس' ہمیشہ کی طرح میری غلطیوں کو اپنے قلم سے سنوار کر حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔

ج۔ نشا جی! آپ کا بے حد شکریہ کہ آپ کرن کو پسند کرتی ہیں اور بس اسی طرح ہمیں اپنی رائے سے آگاہ کرتی رہیں۔

صائمہ..... واپڈا ٹاؤن

نفیسہ سعید صاحبہ کا ناول "اک ساگر ہے زندگی" بڑا معیاری اور سبق آموز ہے' لیکن آخری قسط کا انجام مایوس کن ہے پلیز وضاحت کریں کہ ملک صاحب کون ہیں جنھوں نے حبیبہ کی زندگی سنوار دی۔ سارے ناول میں کسی ملک خاندان کا ذکر نہیں ہے' ملک صاحب سالار ہے یا صمد یا کوئی اور.....

مرحومہ فرحانہ ناز کا ناول "شام آرزو" بہت اعلا معیار کا تھا جو بد قسمتی سے ادھورا رہ گیا۔ اس کی جگہ "ردائے وفا" اس کا خلا پر نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ ابھی تک بے مقصد لگ رہا ہے۔ پچھلے شمارے میں عتیقہ ملک کی کہانی بہت دلچسپ اور معیاری تھی۔

ج۔ صائمہ جی! آپ نے شاید پوری توجہ سے نفیسہ سعید کا ناول نہیں پڑھا' ورنہ آپ کو معلوم ہوتا کہ ملک صاحب' صمد صاحب تھے جن کے بیٹے ایشال کا نکاح حبیبہ سے ہوا تھا۔ "شام آرزو" کا ہمیں بھی بہت افسوس ہے۔ اپنی رائے سے آگاہ کرنے کا بہت شکریہ۔ آپ نے افسانوں پر تو تبصرہ کیا ہی نہیں۔ ہمیں آپ کی رائے کا انتظار رہے گا۔

صوبیا ظفر..... کبیر والا

میں کرن میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں' میں کرن کو چار سال سے پڑھتی آرہی ہوں۔ کرن کے ذریعے ہمیں

بہت رہنمائی ملتی ہے؟ انٹرویو سب کے اچھے تھے۔ فائزہ افتخار کا ناولٹ بہت اچھا جارہا ہے اور جناب "ردائے وفا" فرحین اظفر کا ناول بھی اچھا ہے۔ امید کے ساتھ خط لکھا ہے پلیز میرا خط ضرور شائع کریں گی آپ اور مایوس نہیں لوٹائیں گی۔

ج۔ صوبیا جی! ہم آپ کو "نامے میرے نام" میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ کرن کو پسند کرنے کا شکریہ۔ امید ہے کہ آئندہ آپ تفصیل سے اپنی رائے کا اظہار کریں گی۔

عاصمہ ابراہیم... خانیوال

کرن اس بار کچھ تاخیر سے ملا۔ شاید عید کی وجہ سے' کرن میرا پسندیدہ رسالہ ہے' میں کرن کی خاموش قاری ہوں۔

نایاب جیلانی کا مکمل ناول "چاندرات" بہت پسند آیا۔ "ہاری تو میں تیری" بس ٹھیک تھا۔ فائزہ افتخار کا ناولٹ "شاید" اور صدف آصف کا ناولٹ "ایمرجنسی عیدی" دونوں اچھے لگے۔

نفیسہ سعید صاحبہ "اک ساگر ہے زندگی" کا اینڈ تو کچھ اچھا کرتیں۔ "ردائے وفا" میں نائلہ کا کردار بالکل بھی پسند نہیں۔

ج۔ تبصرہ کرنے کا شکریہ' آپ "نامے میرے نام" میں شریک ہوتی رہا کریں۔

افشاں راجپوت... شورکوٹ

کرن سے وابستہ ہوئے پتا نہیں کتنا عرصہ گزر گیا ہے' مگر کرن سے تعلق بہت اچھا لگتا ہے۔ ہر ماہ کرن کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔

کرن کے ٹائٹل زیادہ تر اچھے ہی ہوتے ہیں اسی طرح انٹرویوز بھی کبھی بہت اچھے اور کبھی ایویں ہی ہوتے ہیں' مگر "مقابل ہے آئینہ" اس لیے اچھا لگتا ہے کیوں کہ ہر ماہ ہم قارئین میں سے ہی کسی نہ کسی ایک بہن سے ملاقات ہوجاتی ہے' میری بھی خواہش ہے کہ میں بھی اس میں شرکت کروں۔

ناول میں نفیسہ سعید کے بعد تنزیلہ ریاض تشریف فرما ہیں بہت خوشی ہوئی ہے اور امید ہے کہ تنزیلہ ریاض کا ناول "راپنزل" ہم سب کی پسندیدہ تحریر ہوگی۔ فرحین اظفر "ردائے وفا" نہ تو بہت اچھا ہے اور نہ بہت برا۔ ہاں اس میں لڑکیوں کو اچھا سبق دیا جارہا ہے کہ اگر ہم کو ہماری پسند کے مطابق نہیں ملتا تو ناامید ہو کر غلط راستے پر چلنے کا انجام نائلہ جیسا ہی ہوگا۔ اس لیے جو نہیں ملتا اس میں اللہ کی کوئی نہ کوئی مصلحت ہوتی ہے۔

نایاب جیلانی بہت عرصے بعد نظر آئیں۔ "چاند رات" مکمل ناول بہت خوب نایاب جی آپ کی یہ تحریر بھی اے ون رہی خاص طور پر ہیروئن کا نام "روپی"۔

زرنین آرزو کا مکمل ناول "ہاری تو میری تیری" انوشے کی بے زاری جرار سے بے کار ہی تھی کیوں کہ ہمارے بڑے جو فیصلہ کرتے ہیں وہ سوچ سمجھ کر ہی کرتے ہیں اور وہ فیصلہ مان لینے میں ہی بھلا ہوتا ہے۔

فائزہ جی کا "شاید" کی تو کیا بات کروں ہر ماہ انتظار رہتا ہے کہ آگے کیا ہوگا۔

صدف آصف کا ناولٹ "ایمرجنسی عیدی" بہت خوب۔ کوئی چاہے کتنی کوشش کرے ہمارے حصے کی خوشیاں چھیننے کی' مگر ہماری قسمت میں جو خوشیاں لکھ دیں جاتی ہیں وہ مل کر رہتی ہیں۔ حرمت کی خوشیوں کو اس کی تائی اماں' نانی نے بہت چاہا کہ حرمت کو یہ خوشیاں نہ ملیں بلکہ شازیہ کو مل جائیں' مگر وہ خوشیاں حرمت کی تھیں اور اس کو ملیں۔

اب آتے ہیں افسانوں کی طرف ندا حسنین کی "میں' تم اور چاند رات" اچھی تحریر تھی۔ نتاشا نے ایک غلطی کی' مگر اس کی دوست' ماں اور سب سے بڑھ کر شامیر نے بہت اچھے طریقے سے اس کی غلطی کا احساس دلایا۔

دیا شیرازی اور تمثیلہ زاہد کا افسانے بھی بہت اچھے رہے اور مستقل سلسلے تو ہم قارئین کے ہی ہیں سو ہم ان سلسلوں کے لیے جتنا اچھا بھیجیں گے یہ سلسلے اتنے ہی اچھے ہوں گے۔

ج۔ پیاری افشاں! تبصرہ کرنے کا شکریہ۔ آپ ہر کہانی کو توجہ سے پڑھتی ہیں اس سے ہی آپ کی کرن سے وابستگی کا پتا لگتا ہے۔ آپ اسی طرح تبصرہ کرتی رہا کریں۔